قیمت سالانہ چھ روپے　　رجسٹرڈ نمبر ایل ۱۴۱۴　　قیمت ششماہی سے ہم فی پرچہ ۱۰

ہزار داستان

آنریری ایڈیٹر: حکیم احمد شجاع بی۔ اے (علیگ)
ایڈیٹرز:-
ابوالاثر حفیظ جالندھری۔ محمد اسمٰعیل نعیم

جلد ۵　　اشاعت ماہ اگست ۱۹۲۴ء　　نمبر ۲

نمبر شمار	مضمون	اثر خامہ	نمبر صفحہ
٠	تصویر:- مرزا غالب مرحوم		٠
۱	مرزا غالب ...	علامہ سر اقبال مدظلہ	۸۲
۲	سہاگ کی رات	ابوالاثر حفیظ جالندھری	۸۳
۳	برسات ...	"	۹۱
۴	سازِ زندہ	جناب ہری چند شرما اختر بی۔ اے آنرز	۹۳
۵	آتش بجام	جناب پرویز شاہی ...	۱۰۳
۶	افکارِ آزاد	جناب آزاد انصاری ...	۱۰۴
۷	خیالِ خام	جناب اثر صہبائی ...	"
۸	دولتمند جوگی	جناب حامد اللہ افسر بی اے	۱۰۵
۹	سرابِ قسمت	جناب رمزی پانی پتی	۱۰۶
۱۰	سوز و ساز	جناب حامد علیخاں بی۔ اے نیشنل	۱۱۸
۱۱	کویل سے خطاب	جناب دلی بینی	۱۱۹
۱۲	جذباتِ وارث	جناب وارث	"
۱۳	رودادِ محبت	جناب ابوالفاضل سیدراز چاندپوری	۱۲۰
۱۴	آنسو ...	جناب جوش ملسیانی	۱۳۷
۱۵	انتقام	جناب پورن سنگھ ہنر	۱۴۰
۱۶	اقسامِ غم	جناب تلوک چند محروم بی۔ اے	۱۴۷
۱۷	آخری ارمان	جناب شمیم لاہوری و سلیم ندودی	۱۴۸

(ابوالاثر حفیظ جالندھری پرنٹر اور پبلشر نے مرکنٹائل پریس لاہور میں چھپوا کر دارالاشاعت ادبیات چیمبرلین روڈ لاہور سے شائع کیا)

مرزا غالب

فکرِ انساں پر تیری ہستی سے یہ روشن ہُوا
ہے پرِ مرغِ تخیل کی رسائی تا کجا

تھا سراپا روح تو بزمِ سخن پیکر تیرا
زیبِ محفل بھی رہا محفل سے پنہاں بھی رہا

دید تیری آنکھ کو اس حسن کی منظور ہے
بن کے سوزِ زندگی ہر شے میں جو مستور ہے

محفلِ ہستی تیری بربط سے ہے سرمایہ دار
جس طرح ندی کے نغموں سے سکوتِ کوہسار

تیرے فردوسِ تخیل سے ہے قدرت کی بہار
تیری کشتِ فکر سے اُگتے ہیں عالم سبزہ وار

زندگی مضمر ہے تیری شوخیِ تحریر میں
تابِ گویائی سے جنبش ہے لبِ تصویر میں

نطق کو سو ناز ہیں تیرے لبِ اعجاز پر
محوِ حیرت ہے ثریا رفعتِ پرواز پر

شاہدِ مضموں تصدق ہے تیرے انداز پر
خندہ زن ہے غنچۂ دلی گلِ شیراز پر

آہ تُو اُجڑی ہُوئی دلی میں آرامیدہ ہے
گلشنِ ویمر[1] میں تیرا ہمنوا خوابیدہ ہے

لطفِ گویائی میں تیری ہمسری ممکن نہیں
ہو تخیل کا نہ جب تک فکرِ کامل ہم نشیں

ہائے اب کیا ہو گئی ہندوستاں کی سرزمیں
آہ اے نظارہ آموزِ نگاہِ نکتہ بیں

گیسوئے اُردو ابھی منت پذیرِ شانہ ہے
شمع یہ سودائیِ دلسوزیِ پروانہ ہے

اے جہاں آباد اے گہوارۂ علم و ہُنر
ہیں سراپا نالۂ خاموش تیرے بام و در

ذرہ ذرہ میں تیرے خوابیدہ ہیں شمس و قمر
یوں تو پوشیدہ ہیں تیری خاک میں لاکھوں گہر

دفن تجھ میں کوئی فخرِ روزگار ایسا بھی ہے؟
تجھ میں پنہاں کوئی موتی آبدار ایسا بھی ہے؟

علامہ اقبال مدظلہ

[1] ویمر میں جرمنی کا مشہور شاعر گوئٹے مدفون ہے

دولتمند جوگی

(۱)

دُنیا میں اللہ کا بندہ ایسا بھی اک دیکھا ہے　　جو سچی دولت کا مالک تھا جس پہ امیری ہنستی تھی
اس کی حضوری میں حاضر تھی ایک سمندر کی دیوی　　سیپوں والی موتیوں والی بیٹھی مالا جپتی تھی
لعل و جواہر دامن بھر بھر لیکے سمندر سے آتی　　دُنیا اس پر عاشق تھی جوگی کیلئے وہ تڑپتی تھی

(۲)

ایک سنہری چادر اوڑھے سر سے لیکر پیروں تک　　نکلیں سونے کی پریاں کچھ ڈرتی ڈرتی کانوں سے
ایک سہیلی تھی روپہلی ایک سہیلی مٹیالی　　لے کے زمین کے مال خزانے آتی تھیں سب تہ خانوں سے
لیکن یہ اللہ کا بندہ پاس نہ تھا جس کے کچھ بھی!　　دیکھا ان میں سے نہ کسی کو آنکھ اٹھا کر بھی اس نے
فرق اتنا تو اسکے سکوں میں بیشک میں نے پایا ہے　　دیکھ کے چاروں سمت کو اپنے آہ تو کھینچی تھی اس نے

(۳)

صبح نے کھول کے اپنا خزانہ گھر گھر سونا بانٹ دیا　　پتہ پتہ سونے کا تھا کونپل کونپل سونے کی
موتی ہی موتی بکھرے پڑے تھے سارے کھیت کے پتوں پر　　گویا کھیت میں سونے کے تھی فصل یہ موتی بونے کی

(۴)

شب بھر چاندی کے دریا میں صبح نہا کر نکلی تھی　　سونے کے پیٹ میں جگمگ کرتے تارے لگا کر نکلی تھی
قدر نہ جانی مال کی اسکے اکثر سونے والوں نے　　صبح اسی لئے جوگی کے گھر سیدھی آکر نکلی تھی
افسر یہ اللہ کا بندہ پاس نہ تھا جس کے کچھ بھی　　عاشق تھا سچے دل سے فطرت کی عیش پسندی کا
دیکھ کے چاروں سمت کو اپنے کسب سکون کیا اس نے　　دولت اسکو حاصل تھی احساس تھا دولتمندی کا

حامد اللہ افسر

سرابِ قسمت

شام کے وقت جب لندن کے کوچوں اور بازاروں میں برقی قندیلیں روشن ہونے لگیں۔ تو ذیل کے پُراسرار مضمون نے شام کو شائع ہونے والے اخبارات کی مانگ حد سے زیادہ بڑھا دی۔

"ایڈگر روڈ سے آگے ماربل آرچ سے سترہ میل کے فاصلہ پر ایک سنسان گلی ہے۔ اور گلی کے عقب میں ایک وسیع الفضا میدان ہے۔ اس میدان کے عین وسط میں ایک نیا مکان ہے۔ جس کے سات کمرے بالکل خالی ہیں۔ کمروں کی ناگفتہ بہ حالت زبانِ حال سے بتا رہی ہے کہ اس مکان میں مہینوں سے کوئی مکین نہیں۔ آٹھویں کمرہ میں ایک میز ہے۔ جس کے گرد چھ کرسیاں ہیں۔ دیواریں بالکل عریاں ہیں۔ کسی کھڑکی میں پردہ کا نام نہیں۔ صرف ایک کھڑکی میں پُرانا ساز رد پردہ لٹکا ہوا ہے۔ میز پر ایک برقی لیمپ رکھا ہے۔ بھدے سے میز پوش پر دسترخوان بچھا ہے۔ مختلف الالوان سُراحیوں سے بوتلیں بھری رکھی ہیں۔ گوناگوں فواکہ سے طشتریاں بھری ہیں۔ بوقلموں کھانے چُنے ہوئے ہیں۔ خالی گلاس اور طشتریاں ہر کرسی کے سامنے رکھی ہوئی ہیں۔ میز کے ایک کنارے پر خوانِ صدر رکھا ہوا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ کسی کی شادی کی تقریب ہے۔ یہ خوان بالکل اچھوتا ہے۔ لیکن باقی سب کھانوں میں ہاتھ پڑا ہوا ہے بعض بوتلیں بھی ایسی ہیں۔ جو کھولی جا چکی ہیں۔ پانچ کرسیاں بالکل خالی ہیں۔ چھٹی کرسی میز کے اُس گوشہ پر رکھی ہوئی ہے جو کھڑکی کے مقابل ہے۔ پانچ مہمان جس پُراسرار طریقے سے آئے اُسی طرح غائب ہو گئے۔ چھٹی کرسی پر ایک آدمی دریائے تفکر میں غرق بیٹھا ہوا ہے بوقلموں نعمتیں مطلق اُس کی توجہ اپنی جانب منعطف نہیں کر سکتیں۔ گو وہ برقی لیمپ کی جانب ٹکٹکی لگائے دیکھ رہا ہے۔ لیکن ایسی تیز روشنی اُس کی آنکھوں میں چکا چوند پیدا نہیں کر سکتی۔ اس آخری مہمان کی پیشانی پر پستول کی ایک گولی کا نشان ہے۔"

مندرجہ بالا مضمون کی اشاعت سے چھ مہینے پیشتر لارڈ فرانسس گولڈی اور میں ایک ریسٹورنٹ میں چائے پی رہے تھے۔ دفعتہً اُس کی زبان پر یہ الفاظ آئے۔

"بابو تمہیں یاد ہے کہ ہم نے اس شخص کو جو ہم سے پیچھے چوتھی میز پر بیٹھا ہوا ہے۔ کہاں دیکھا ہے"

میں اپنی حس مشترک پر ہر ممکن دباؤ ڈال رہا تھا۔ تاکہ

وہ خزانہ خیال سے اس شخص کی شبیہ پیش نظر کر دے کہ
میرے ساتھی نے بے صبری سے کہا۔ کیا تم ریڈرف کو
بھول گئے۔"

میں۔ "ریڈرف۔ ریڈرف"

فرانسس۔ ہاں۔ ہاں جس کو ہم نے انقلاب روس کے
بعد ماسکو میں دیکھا تھا۔ جب وہاں قتل و غارت کا بازار
گرم تھا۔ اور جب ہمیں بھی اپنی جانوں کے لالے پڑے ہوتے
تھے۔ تو اس نے نہایت آسانی سے اپنے ساتھ ہم دونوں
کی جان بچانے کا بھی انتظام کر دیا تھا۔ معلوم ہوتا تھا کہ یہ
وہاں ایک ذی اثر ہستی ہے۔ گو ابتک یہ راز نہیں کھلا کہ اس
کو وہاں اتنا اقتدار کیوں اور کس طرح حاصل ہو گیا تھا۔ اور
ہاں تعجب کی بات تو یہ ہے کہ آجکل میں اسے اس شان و شوکت
سے زندگی بسر کرتے دیکھتا ہوں۔ اس کی حرکات سے معلوم
ہوتا ہے۔ گویا قارون کا خزانہ اس کے ہاتھ لگ گیا ہے۔

میں۔ اگر میرا اندازہ صحیح ہے تو وہ اپنی موجودہ حالت سے
مطمئن نہیں معلوم ہوتا اور پریشان بھی نظر آتا ہے۔

فرانسس۔ میں تو ریڈرف کو ان لوگوں میں سے سمجھتا ہوں
جو ہماری طرح افلاس کی تنگ و تاریک گھاٹیوں میں سے
گذر کر امارت کے بہترین دلخوش کن مناظر کی سیر سے لطف اندوز
ہونے کے لئے پیدا ہوتے ہیں۔ میرا خیال ہی نہیں۔ بلکہ
یقین ہے۔ کہ آج شام کو یہ ضرور ہم سے ملنے آئیگا۔ کیونکہ
اس کے دل میں ایک راز ہے۔ اور اسے مجھ سے کہے بغیر
نہ بنیگی۔ اور میں تمہیں یہ بھی بتائے دیتا ہوں کہ وہ راز اس
انگوٹھی کے متعلق ہے۔ جسے آج وہ خلاف معمول زیب انگشت
کئے ہوئے ہے۔

ہم فارغ ہو کر واپس مکان پر پہنچے۔ فرانسس تو سو گیا
لیکن میں کبھی تو اس کی اصابت رائے پر انگشت بدنداں تھا
اور کبھی پچھلے واقعات کو خیال میں مربوط کر کے اچانک
کہہ اٹھتا تھا۔ کہ فرانسس کو اس قسم کی عقدہ کشائیوں میں
کمال حاصل ہے۔ اس کی سراغرس طبیعت سے بعید نہیں
کہ اس نے ریڈرف کے متعلق پوری معلومات حاصل کر لی
ہوں۔

میں خود ہزارہا اندازے لگاتا تھا۔ لیکن ایک خیال
دوسرے کو فوراً مسترد کر دیتا تھا۔ اس مایوسی کی بنا پر میں
پورے شوق سے شام کی آمد کا منتظر تھا۔ کیونکہ شام کی آمد
ریڈرف کی آمد اور اس راز سربستہ کے انکشاف کی
مترادف تھی۔

بارے شام ہوئی ریڈرف آیا اس کی عمر [illegible]س سال
کے لگ بھگ معلوم ہوتی تھی۔ اس کا صبیح چہرہ [illegible] سے
کندن سا دمک رہا تھا۔ اس جوان رعنا کا ہر عضو اتنا متناسب
تھا کہ نگاہیں حیران ہو کر ٹھٹک جاتی تھیں۔ وہ آتے ہی
کرسی پر بیٹھ گیا۔ اور سیگار کا ایک لمبا کش لیکر بولا۔

"فرانسس میں تمہیں نہایت دولتمند معلوم ہوتا ہونگا۔ واقعی میں خود بھی سمجھتا ہوں۔ کہ دُنیا کے خزانوں پر میں تنہا قابض ہوں لیکن یہ میں خود بھی نہیں سمجھتا کہ کس طرح چند ماہ پیشتر میں نہایت تنگدستی کے عالم میں تھا۔ نہ میرا کوئی دوست تھا نہ مددگار۔ مجھے میرا مستقبل نہایت تاریک معلوم ہوتا تھا۔ ایک صبح مجھے ایک رجسٹرڈ لفافہ ملا جس میں پانسو پونڈ کے نوٹ ملفوف تھے۔ ساتھ ہی ایک رقعہ بھی تھا۔ جس پر نہ تو بھیجنے والے کا پتہ مرقوم تھا اور نہ ہی کسی کے دستخط ثبت تھے۔ بلکہ ٹائپ کی ہوئی ایک سطر تھی جس کا مضمون یہ تھا

"ہر ماہ کی ساتویں تاریخ کو پانسو پونڈ کی رقم بلاناغہ تمہارے پاس پہنچتی رہیگی۔ مطلق فکر نہ کرو"

فرانسس (نہایت متعجب ہوکر) کیا واقعی

ریڈرف۔ یقیناً جب میں یہ محسوس کرتا ہوں کہ اچانک دستِ غیب نے مجھے حضیض افلاس سے نکال کر اوجِ امارت پر متمکن کردیا ہے۔ تو آپ میری خوشی کا اندازہ نہیں لگا سکتے۔

میں۔ اور تمہیں یہ رقم ماہ بماہ وصول ہوتی رہتی ہے۔

ریڈرف۔ ساتویں تاریخ کی صبح کو پہلی ڈاک سے بصیغہ رجسٹری معہودہ رقم وصول ہوجاتی ہے۔ اور ایک ٹائپ شدہ سطر بھی ہوتی ہے۔ لیکن اُس کا مضمون پہلے سے مختلف ہوتا ہے۔

"بلاخوف وخطر خرچ کرتے رہو۔ بھیجنے والے پر بھروسہ رکھو۔ مستقبل پر امید باندھے رہو"

اس کے متعلق تمہارا کیا خیال ہے

فرانسس۔ عجیب پُراسرار عطیہ ہے

ریڈرف۔ اگر تم میری جگہ ہوتے تو تم اس رقم کو خرچ کرتے یا نہیں۔

فرانسس۔ کوئی وجہ نہیں معلوم ہوتی کہ کیوں خرچ نہ کریں

مفت راچہ گفت

میں۔ ریڈرف تم بڑے خوش قسمت ہو۔

فرانسس۔ میں تمہیں مبارکباد دیتا ہوں اور ہاں کیا تم اپنے ہر دوست سے یہ واقعہ بیان کردیتے ہو۔

ریڈرف۔ نہیں۔ صرف تم ہی ایک ایسے شخص ہو جس سے میں نے یہ ذکر کیا ہے۔ نہیں معلوم کیوں خواہ مخواہ میرا دل چاہتا ہے کہ میں تمہیں اپنا رازداں بنالوں۔ کم از کم ایک شخص پر ضرور یہ راز افشا ہونا چاہئے۔ تاکہ آڑے وقت پر آڑے آئے۔ کیا تم بھی یہی مشورہ دیتے ہو۔ کہ خوب اللے تللے رہیں۔

فرانسس۔ یقیناً میں تو یہی مشورہ دُونگا۔

ریڈرف کے چہرہ سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ مُدت سے جس دودلی میں مبتلا تھا۔ اب اُسے اس سے نجات مل گئی تھی اور اس لئے وہ خوش خوش واپس چلا گیا۔

ریڈرف کے چلے جانے کے بعد فرانسس فوراً میری طرف

مخاطب ہوا۔ "بابو تمہارا اس کے متعلق کیا خیال ہے؟"

مَیں۔ میری عقل مطلق کام نہیں کرتی۔ ایک نامعلوم شخص سے ایسی معتدبہ رقم کا ہر ماہ وصول ہونا' حیرت افزا ہے۔

فرانسس۔ موجب حیرت تو ضرور ہے لیکن تمہارا اندازہ کیا ہے؟

مَیں۔ ایک راز ہے۔ جس سے غالباً آخر میں خوفناک نتائج پیدا ہونگے۔

فرانسس۔ تمہارے شکوک نہایت گہرے ہیں۔

مَیں۔ کیا تمہارا یہ خیال نہیں۔

فرانسس۔ نہیں۔ میرا خیال تو یہ ہے کہ کوئی شخص جو ریڈرف کی سود و بہبود کا متمنی ہے۔ اُس کی دوستی کا حق ادا کر رہا ہے یا اُس نیکی کا جو کبھی اُس نے کی ہو اتنے کھُلے دل سے بدلہ دے رہا ہے۔ بہت ممکن ہے کہ بھیجنے والی ایک متمول عورت ہو اور وہ اس کی محبت میں غرق ہو۔ اور عنقریب وہ اس راز کا انکشاف کردے۔ میرا اپنا خیال تو یہ ہے کہ اُس نے ضرور کوئی نہ کوئی ایسا کام کیا ہوگا جس سے وہ اس گرانبہا صلہ کا مستحق ہوگیا۔ واللہ عالم بالصواب۔

تین مہینے گذر گئے۔ ممکن نہیں کہ ایک شخص تین ہزار پونڈ سالانہ خرچ کرے۔ اور انگشت نما نہ ہو۔

ریڈرف سوسائٹی کے اعلےٰ ترین طبقہ سے ربط ضبط رکھنے لگا۔ عمائد شہر اُس کی گرمجوشی سے آؤ بھگت کرنے لگے۔

ایک شب کو لارڈ فرانسس اور مَیں ویسٹ اینڈ تھیٹر میں اُس سے دوچار ہوئے۔ سلسلۂ گفتگو کو اس نے خود ہی اس طرح شروع کیا۔

لارڈ فرانسس غالباً اب تم مجھے اور زیادہ قابل مبارکباد تصوّر کروگے۔ کیونکہ گورنمنٹ نے خود بخود مجھے ایک اعلیٰ عہدے پر ممتاز کردیا ہے۔ اور بلاشبہہ اس عہدہ پر فائز ہونا ایک قابلِ رشک مستقبل کا پیش خیمہ ہے۔

فرانسس۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ کسی زبردست ذی اثر ہستی کا طفیل ہے۔ کیا تم بتا سکتے ہو۔ کہ تم اس کے لئے کس کے رہینِ منت ہو۔

ریڈرف خاموش ہوگیا۔ اور چاروں طرف دیکھنے لگا۔ فرانسس نے اس سوال کو دہرایا۔ تو اُسے جواب ملا۔

ریڈرف۔ مَیں کچھ نہیں کہہ سکتا۔ یہ محض عطیۂ آسمانی ہے

فرانسس۔ خوب۔ مگر یہ تو ظاہر ہے کہ کوئی تمہارا دوست ....

فرانسس کو اسی اثنا میں ایک لیڈی کے سلام کا جواب دینا پڑا۔ ریڈرف نے بھی نظر اٹھا کر اُس کی طرف دیکھا۔ معاً اس کے چہرے کا رنگ فق ہوگیا۔ وہ کبھی اُس کو اور کبھی فرانسس کو دیکھتا تھا۔ بدقت تمام اُس نے انتہائے ضبط سے کام لیکر یہ سوال کیا۔

فرانسس کیا تم اس حسینہ کو جانتے ہو۔

فرانسس۔ کچھ یونہی سی واقفیت ہے۔

ریڈرف۔ یہ کون ہے۔

فرانسس۔ مَیں اس کے سوا اور کچھ نہیں جانتا کہ اس کا نام ڈیفرسٹ ہے۔ اور وہ دریائے حسن کی ایک گوہرِ نایاب ہے۔ اور حد سے زیادہ متین بلکہ کچھ غمگین بھی رہتی ہے۔ تم اس کے متعلق اتنے شوق سے کیوں پوچھ رہے ہو۔

ریڈرف۔ مَیں نے اس کو ایک دو مرتبہ دیکھا ہے اور یہ کہنے پر مجبور ہوں کہ اس کے بے پناہ حسن نے میرے بحرِ جذبات میں جزر و مد پیدا کر رکھا ہے۔ تم کو وہ غمگین دکھائی دیتی ہے۔ لیکن مَیں اُس کی آنکھوں میں ہیرے کی چمک پاتا ہوں۔ کیا تم مجھے اس سے متعارف کرا سکتے ہو۔

فرانسس۔ قریب ترین فرصت میں۔

ریڈرف۔ شکریہ۔

یہ لفظ اس نے کہا اور چپ چاپ اُٹھ کر چل دیا۔ جب فرانسس نے یہ محسوس کیا کہ اب اُس کے پاس میرے سوا اور کوئی متنفس نہیں۔ تو وہ بولا ہمارے دوست کا راز اب کھلتا جا رہا ہے۔"

مَیں۔ کیا تمہارا یہ خیال ہے کہ پانسو پونڈ ماہوار کی دریادِل معطی یہی لیڈی ہے۔

فرانسس۔ اگر یہ مان لیا جائے تو پھر بھی یہ امر موجبِ حیرت رہ جاتا ہے۔ کہ وہ خود اتنی زیادہ خوش پوش معلوم نہیں ہوتی۔ اس کے لباس سے ہرگز یہ معلوم نہیں ہوتا کہ وہ اتنی متمول ہوگی۔

مَیں۔ ممکن ہے کہ وہ دوسرے عطیہ کا وسیلہ ثابت ہوتی ہو۔

فرانسس۔ ہاں یہ ضرور قرینِ قیاس معلوم ہوتا ہے اس کی رفتار و گفتار سے تو معلوم ہوتا ہے کہ اعلےٰ طبقہ سے تعلق رکھنے والی ہے۔ لیکن اس کا لباس اس خیال کی تکذیب کرتا ہے۔ اس میں بھی کوئی بھید معلوم ہوتا ہے مجھ پر نظر پڑنے سے پیشتر وہ نہایت غور سے ہمارے دوست کی طرف دیکھ رہی تھی۔ اس سے پہلے بھی ریڈرف نے کہا تھا۔ کہ ایک لیڈی دو ایک مرتبہ راستہ کاٹ کر دانستہ میرے سامنے سے گزری ہے۔ معلوم یہ ہوتا ہے کہ یہ لیڈی ہمارے دوست کے متعلق اس سے زیادہ جانتی ہے۔ جتنا کہ وہ خود اس کی بابت واقفیت رکھتا ہے۔ لیکن یہ محض قیاس ہے۔ ریڈرف بُری طرح اسکے عشق میں گرفتار ہوگا۔ اتنا مَیں ضرور کہونگا۔

ریڈرف کا راز روز بروز زیادہ دلچسپ اور اہم ہوتا چلا جاتا ہے۔ آؤ ہم بھی اس کے متعلق تحقیقات شروع کریں۔

مَیں۔ تم کس طرح شروع کرو گے۔

فرانسس۔ ریڈرف کے زمانۂ ماضی کے متعلق جتنا

زیادہ علم ہم کو دستیاب ہوگا۔ اتنا ہی زیادہ ہمارے لئے اس راز کو سمجھنا آسان ہوگا۔

قریباً چار مہینے بعد ایک دن شام کو جب میں اور فرانسس بیفکروں کی طرح سیگار کے لمبے لمبے کش لے رہے تھے۔ اور آکسفورڈ سٹریٹ کی چہل پہل کا لطف اٹھا رہے تھے۔ یکلخت فرانسس نے مہر سکوت کو توڑا اور اس طرح کلام کا سلسلہ شروع کیا۔ ہمارے عجیب وغریب دوست ریڈرف کے متعلق مجھے تین باتیں معلوم ہوئی ہیں جو بذاتِ خود تینوں اہم ہیں۔ لیکن تعجب تو یہ ہے کہ جتنا زیادہ اس ڈور کو سلجھانے کی کوشش کرتا ہوں اتنی ہی زیادہ یہ الجھتی چلی جاتی ہے۔ اور سرا ملنا ناممکن ہوتا چلا جاتا ہے۔ اتنا ضرور ہے کہ ان تینوں باتوں سے ایک نہایت غیر معمولی بات سمجھ میں آتی ہے۔ بشرطیکہ میرا اندازہ غلط نہ ہو۔

پہلی بات تو یہ ہے۔ کہ ریڈرف اس فرانسیسی حسینہ ڈیفرسٹ کے دام محبت میں گرفتار ہو چکا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ لاکھوں میں ایک ہے۔ لیکن تعجب تو یہ ہے کہ اُس کی افسردہ دلی۔ اس کی سنجیدگی سمندِ ناز پہ تازیانہ کا کام دے گئی۔ بہرحال وہ اس کا پرستار ہے۔

مَیں۔ وہ اس کی محبت کو قبول کرتی ہے۔

فرانسس۔ ابھی نہیں۔ اس کے خلاف وہ اُس سے گریز کرتی ہے۔ یہ خوشی ابھی اس کے حصہ میں نہیں آئی۔

دوسری بات یہ ہے کہ ابھی تمہارے آنے سے گھنٹہ بھر پہلے ریڈرف میرے پاس آیا۔ خوشی سے اُس کا سانس پھولا ہوا تھا۔ اُس نے خبر سنائی کہ ابھی ابھی اُسے "سر" کا خطاب ملا ہے۔

میں۔ بلا درخواست

فرانسس۔ بالکل اُس کو تو کبھی یہ اعزاز خواب میں بھی نہ دکھائی دیا تھا۔ جس طرح کہ پانسو پونڈ ماہوار کی رقم اور منصب جلیلہ خدائی عطیات تھے۔ ایسے ہی یہ تیسرا آسمانی عطیہ ہے۔ جس کا ذمہ دار وہی نامعلوم دوست ہو سکتا ہے جو ریڈرف کا اتنا زیادہ خیر خواہ ہے۔

تیسری بات کے متعلق مَیں مدت سے تگ و دو میں تھا۔ اور بہ ہزار محنت و جانکاہی اس میں کامیابی حاصل ہوئی۔ وہ اُس کی زندگی کے گزشتہ حالات کی بہم رسانی ہے جو کچھ تو خود اس کے مُنہ سے کچھ دیگر ذرائع سے معلوم کئے گئے۔ اس کی زندگی کا نہایت اہم واقعہ اس کی پانچ اور آدمیوں کے ساتھ گرفتاری ہے۔ یہ اُس کا اپنا بیان ہے۔ کہ روس کے انقلاب پسندوں کی ایک جماعت نے ان سب کو ایک سازش کے جرم میں گرفتار کر لیا تھا۔ لیکن اُس نے اس بات کو صیغۂ راز میں رکھا ہے کہ باقی پانچوں کے خلاف اُس نے خفیہ شہادت دی کس طرح

آزادی حاصل کی۔

وہ پانچوں مختلف قومیت کے آدمی تھے اور ان میں سے تین تو حد درجے کے متمول اور ذی جاہ افراد تھے۔ یہ قابلِ تاسف بات تھی۔ کہ انہوں نے ایک غیر ملک کی سیاسیات میں مداخلت کی۔ میں نے اُن سب کے نام بھی معلوم کئے ہیں۔ فاتبر۔ زبینا اور کونٹ چارنو۔ باقی دو کے لئے سزائے موت تجویز کی جا چکی تھی۔ لیکن وہ معاف کر دیئے گئے تھے۔

بلکہ یہ کہنا چاہیئے کہ گرانبہا رقوم دیکر انہوں نے اپنی جان بخشی کرالی تھی۔ چوتھا شخص آئرلینڈ کا باشندہ تھا جس کا نام ہلارون تھا جو نہایت ہی ہوشیاری سے بچ نکلا تھا۔ پانچواں ایک فرانسیسی لیفارج نامی تھا جسے موت کی سزا دی گئی تھی۔

”بابو۔ یہ ہیں کل معلومات جو میں بہم پہنچا سکا۔ تم ان سے کیا نتائج اخذ کرتے ہو۔“

میں۔ اس سے تو معلوم ہوتا ہے کہ ریڈرف اگر خطرہ میں نہیں ہے تو محفوظ بھی نہیں لیکن اس واقعہ کو اسکی موجودہ خوش نصیبی سے تو کوئی بھی تعلق نہیں ہو سکتا۔

فرانسس۔ میرا بھی یہی خیال ہے۔ وہ اشخاص جن کو اس نے بیوفائی سے مصیبت میں گرفتار کرایا۔ اس کی سود و بہبود کے کیوں خواہشمند ہوتے۔ اور اس کو نفع پہنچانے میں کس لئے کوشاں ہوتے۔ لیکن اگر بفرضِ محال اس واقعہ میں اور اُس کی موجودہ حالت میں ذرا سا تعلق مان بھی لیں تو دو عطیے اور ریڈرف کو ملنے چاہئیں۔ کیونکہ پانچ اشخاص تھے۔

میں۔ لیکن لیفارج مر چکا ہے۔

فرانسس۔ ہاں یہ بھی ٹھیک ہے اور ممکن ہے۔ کہ ہلارون مفلس اور نادار ہو لیکن یہ سب قیاسیات ہیں۔

میں۔ بیشک اور ہاں پھر تمہارا یہ بھی تو خیال ہے کہ ڈیفرسٹ اُس کے واسطے فرشتۂ رحمت ہے اور تینوں عطیات کی معطی نہیں تو کم ازکم ان کے حصول میں وسیلہ ضرور ہے۔

فرانسس۔ میں یہ خیال چھوڑ چکا ہوں۔ یہ اس کی حیثیت اور قدرت سے باہر ہے۔ بلکہ ہر عورت کے قبضۂ اختیار سے بالاتر ہے۔

میں یہ سُنکر خاموش ہو گیا۔ فرانسس نے سیگار کے خاکستر کو کرسی کے بازو پر مسلا۔ اور کہنے لگا۔ ”میں نہیں سمجھ سکتا اس میں کیا راز مضمر ہے۔ لیکن دل ضرور گواہی دیتا ہے کہ اس کے انکشاف میں مجھے خاطر خواہ کامیابی حاصل ہو جائیگی۔

تیسرا غیبی عطیہ اُس کے واسطے اور زیادہ موجبِ شہرت ہُوا۔ رؤسائے عظام اُس کو آنکھوں پر بٹھانے لگے قاعدہ ہے کہ متواتر شاندار کامیابیاں ایسے شخص کے لئے جو نا اہل ہو۔ موجبِ تباہی نہیں تو کم ازکم اُس کے آزار کی

طرف مائل ضرور ہو جایا کرتی ہیں۔ لیکن ریڈرف اس سے مستثنےٰ معلوم ہوتا تھا۔ اکثر سنا گیا ہے۔ کہ شادی مرگ ایسے اشخاص کے لئے معمولی بات ہوتی ہے۔ لیکن ریڈرف بہ ثبات عقل وصحت نفس سب کام کر رہا تھا۔

لارڈ فرانسس اور میں ایک دن پھر تھیٹر میں گئے اور جب کھیل کے اختتام پر وہاں سے نکل رہے تھے۔ تو ناگہاں فرانسس کی آنکھیں ایک شخص پر پڑیں اور وہ اُسے بغور دیکھنے لگا۔ میں نے دیکھا تو ریڈرف تھا۔ فرانسس سے نہ رہا گیا۔ آخر اُسے جا ہی پکڑا۔

پہلا سوال جو فرانسس نے کیا وہ یہ تھا۔

"ریڈرف مجھے بخوبی معلوم ہے کہ تمہیں کیا نیا واقعہ پیش آرہا ہے۔

ریڈرف۔ اچھا تمہارا کیا قیاس ہے۔

فرانسس۔ قیاس کیا یقین اور عین الیقین ہے کہ آخر کار ڈیفرسٹ تم پر مہربان ہو ہی گئی۔

ریڈرف۔ ہاں وہ مجھ سے شادی کرنے پر رضامند ہو گئی۔

فرانسس۔" میں پھر آپ کو مبارکباد پیش کرتا ہوں"۔

لیکن اس نے یہ تہدیہ مبارکباد ایسے خلوص اور گرمجوشی سے پیش نہیں کیا۔ جیسا کہ اس سے قبل وہ کیا کرتا تھا۔

ریڈرف۔ شکریہ۔ میں محسوس کرتا ہوں کہ آج میرا بخت رشک طالع سکندر ہے۔

فرانسس۔ بیشک یہ چوتھا غیبی عطیہ ہے۔

اس کے بعد ایک عالم سکوت طاری ہوا۔ میں اس وجہ سے اور بھی زیادہ پریشان تھا کہ آخر اس کو ریڈرف نے توڑا۔

ریڈرف۔ کل میری شادی ہے۔

فرانسس جیسے چونک اُٹھا۔

"کیا کہا کہ کل؟ ......"

ریڈرف (قطع کلام کر کے) جی ہاں کل شادی ہے۔ میرا اور ڈیفرسٹ کا معاملہ کوئی آج کا نہیں۔ بلکہ ماہ گذشتہ ہی اس نے مجھے ہدایت کر دی تھی۔ کہ میں اسے صیغۂ راز میں رکھوں۔

فرانسس۔ تو کیا شادی کی تقریب صیغۂ راز میں نہ رہیگی۔

ریڈرف۔ بالکل

فرانسس۔ لیکن تم نے مجھ سے کہہ دیا ہے۔

ریڈرف کے چہرہ پر پریشانی کے آثار نمایاں ہوتے اور وہ رخصت ہونے لگا۔ لیکن جاتے جاتے وہ درخواست کرنے لگا۔

"خدارا اسکی کسی کو کانوں کان خبر نہ ہو۔ ڈیفرسٹ کی خواہش ہے کہ یہ صیغۂ راز ہی میں رہے۔ اسکے مذہب کی رو سے جو میں نے اختیار کر لیا ہے۔ وقت تقریب اور محل تقریب دونوں کسی کو نہ بتانے چاہئیں۔

فرانسس۔ کہاں ہو گی۔

ریڈرف۔ خود مجھے ابتک معلوم نہیں۔

فرانسس نے میری طرف دیکھا۔ میرے بدن میں سنسنی سی دوڑ گئی۔ ریڈرف بھی سکتہ کے عالم میں تھا۔ اور وہ نیچی نظریں کئے فرش پر ٹکٹکی لگائے دیکھ رہا تھا۔ کہ اچانک اُس کا چہرہ ایک خاص خوشی کی روشنی سے چمکا اور وہ اس طرح بولا۔ میں یہ بخوبی جانتا ہوں کہ کل انتظام دُلہن پر چھوڑ دینا بھی ایک عجیب معاملہ ہے۔ لیکن کیا کروں اُس کی خواہش یہی ہے۔ اور وہ وعدہ بھی کرتی ہے۔ کہ مناسب موقعہ پر اس کی تفصیلات سے پوری پُوری آگاہی دیدے گی

فرانسس۔ اب آپ کی کوئی آرزو ایسی نہیں رہی جو پُوری نہ ہو گئی ہو۔

ریڈرف۔ بیشک

فرانسس۔ اچھا۔ اجازت۔ آج کی رات انتہا درجہ کی اندھیری ہے۔ اس شب دیجور میں ہر شخص اپنے مکان پر جلد از جلد پہنچنا چاہتا ہے۔

ریڈرف چلدیا اور فرانسس میری طرف مخاطب ہُوا۔

بابو ان تمام باتوں کے کیا معنی ہو سکتے ہیں۔

میں۔ تم بہت بے چین معلوم ہوتے ہو۔

فرانسس۔ حد سے زیادہ

میں۔ کیا یہ انتہائے تعجب کا مقام نہیں ہے۔ کہ ریڈرف اُن تمام باتوں کو ہمیں صاف صاف بتا دے جن کو چھپانے کی اس سے ڈیفرسٹ نے درخواست کی ہو۔

فرانسس۔ یہ تو بالکل ظاہر ہے کہ اُس کی یہ عین خواہش ہے، کہ ہم اس محلِ تقریب کے آس پاس موجود رہیں۔ گو اُس نے صریح الفاظ میں اس کی خواہش تو نہیں کی لیکن اُس کی آنکھیں اس کی ملتجی معلوم ہوتی تھیں۔

میں۔ کیا تم خیال کرتے ہو کہ وہ بے چین ہے۔ خوفزدہ ہے۔ اور کسی خطرہ ......

فرانسس۔ یہ تو یقین ہے۔ کہ اُسے کچھ معلوم نہیں۔ اور وہ ایک عجیب دو دلی میں مبتلا ہے۔

میں۔ تو تم ضرور جاؤ گے ؟

فرانسس۔ یقیناً اگر کسی تدبیر سے ہم دونوں وہاں پہنچ سکیں۔

نہیں معلوم فرانسس کو کہاں سے معلوم ہو گیا تھا۔ کہ ڈیفرسٹ ہلبورن ہوٹل میں ہے۔ عین وقت پر وہ ہوٹل کے دروازہ پر جا پہنچا۔ مجھے موٹر میں چھوڑ کر وہ اُترا اور گھات میں لگا رہا۔ اور جونہی اُس نے ریڈرف اور اس کی حسین معشوقہ کو ایک موٹر کار میں سوار ہوتے دیکھا وہ بھاگ کر میرے پاس آیا۔ اور فوراً موٹر حرکت میں آیا۔

موٹر کاریں اتنی کثرت سے تھے۔ کہ تیز کرنے کا موقعہ نہ ملتا تھا۔ اور اسپر برف باری غضب کی تھی۔ اس وجہ سے بھی موٹر کاریں سُست رو تھیں۔ ہم آہستہ آہستہ آکسفورڈ سٹریٹ

سے گزرے۔ یہاں سے نکلتے ہی فرانسس نے مجھے تاکید کی
"بابو تمہاری آنکھیں ریڈرف والے موٹر پر جمی رہیں
میں موٹر چلاتا ہوں۔"

ماربل آرچ پر پہنچکر ہم ایڈگر روڈ کی جانب مڑے اور
اس تمام راستے کو طے کیا۔ اب ہمیں اپنے موٹر کو کم ازکم سو گز
کے فاصلے پر رکھنا پڑا۔ تاکہ ہمارے تعاقب کا راز نہ کھلے
اچانک اگلی موٹر گاڑی زاویہ قائمہ پر مڑی۔ اور ایک تنگ سی
گلی کے پاس جاکر غائب ہو گئی۔

"بابو اترو اور دیکھو کہ موٹر گاڑی کہاں گئی ہے" فرانس
نے کہا۔

میں اُترا اور آگے بڑھا۔ غور سے دیکھا تو معلوم ہوا کہ
موٹر ایک میدان میں روکا گیا ہے۔ جس کے دونوں پہلوؤں پر
گھنی جھاڑیاں ہیں۔ موٹر کو ایک طرف کر دیا گیا۔ اور ریڈرف
اور اُس کی معشوقہ بائیں طرف ایک لکڑی کے دروازہ میں
داخل ہوئے۔

قریب ہی ایک چھوٹا سا اینٹوں کا مکان تھا۔
وہ دونوں اس مکان میں چلے گئے۔

میں پاشنہ کوب واپس آیا۔ اُس نے پہلے ہی موٹر کو
درخت کے نیچے کھڑا کر دیا تھا۔ اور نہایت بے صبری سے
میرا انتظار کر رہا تھا۔ میں نے اپنے معلومات بیان کئے۔ ہم
دونوں اُس گلی کی طرف مڑے۔ اور چشم زدن میں اُس مکان
کے دروازہ پر تھے۔ کچھ دیر انتظار کیا کہ دیکھیں آخر ہوتا کیا
ہے۔ لیکن کسی قسم کی آواز سنائی نہ دی۔ اب حیران تھے۔ کہ
کیا کریں۔ کس طرح ایسی جگہ پہنچیں جہاں سے ہم چھپکر
کل حالات دیکھتے رہیں۔ مجبوراً یہ مشورہ ہوا کہ چھجے تک
پہنچیں۔ اور وہاں کسی جگہ چھپکر محو تماشا ہو جائیں۔

یہ خیال فوراً حرکات میں منتقل کر دیا گیا۔ میرے
کاندھوں پر پاؤں رکھکر پہلے فرانسس اُوپر جا پہنچا۔ اور
پھر ہاتھوں سے مجھے کھینچ لیا۔

تھوڑی دیر تک ہم دونوں خائف رہے کہ مبادا کھڑکی
جو بالکل مقابل تھی کھلے۔ اور اس میں سے کوئی نمودار ہو۔ آوازیں
تو سنائی دینے لگیں۔ لیکن اب یہ سوال پیدا ہوا کہ دیکھیں کس
طرح، کھڑکی پر زرد سا پردہ پڑا ہوا تھا۔ لیکن خوش قسمتی سے
ذرا چھوٹا تھا۔ اس لئے جھک کر آسانی سے دیکھا جا سکتا تھا۔
اندر کی طرف جھانکا تو ایک کمرہ نظر پڑا۔ جس کی دیواریں
بالکل عریاں تھیں۔ وسط میں ایک میز بچھی ہوئی تھی۔

ایک بھدے سے میز پوش پر شادی کی ضیافت کا
سامان رکھا دکھائی دیتا تھا۔ اس کے گرد چھ کرسیاں رکھی
تھیں۔ اور ہر ایک کرسی پر ایک شخص بیٹھا تھا۔

یہ دیکھ کر میرے بدن میں ایک قسم کی سنسنی دوڑ گئی کہ ان
میں سے چار آدمیوں کے چہرہ آدھے آدھے سیاہ مخمل کی
نقاب سے پوشیدہ تھے۔ پانچویں کرسی پر ریڈرف تھا۔ جو

کھڑکی کے مقابل والی کرسی پر بیٹھا تھا اور اسکی داہنی طرف ڈیفرسٹ جلوہ ریز تھی۔

ریڈرف کی آنکھیں ڈیفرسٹ کے نورانی چہرہ پر جمی ہوئی تھیں۔خوشی کے مارے اُس کی باچھیں کھِل جاتی تھیں

کیا رسوم شادی ادا کی جاچکی تھیں۔ اس سوال کا جواب اثبات میں معلوم ہوتا تھا۔کیونکہ ضیافت اُڑ رہی تھی

پادری کہاں ہے؟ شاید رخصت کر دیا گیا ہو۔

اچانک تمام مجلس پر ایک خوفناک خاموشی طاری ہو گئی اور چند سنٹ بعد ان چاروں میں سے سب سے زیادہ بلند شخص کرسی سے اُٹھا۔اور نہایت ہی کرخت آواز میں حضار مجلس سے مخاطب ہو کر بولا۔

"حاضرین دولہا اور دلہن کے واسطے ہمارے عطیات کہاں ہیں۔اب وقت آ گیا ہے کہ پیش کئے جائیں

ریڈرف میں اپنا تحفہ اس سے قبل پیش کر چکا ہوں۔ میں تمہیں ایک اجنبی معلوم ہوتا ہوں لیکن تم مجھے خوب جانتے ہو۔میں ان میں سے ایک شخص ہوں۔جنہوں نے قسم کھائی ہے۔کہ تمہارے نیرّ اقبال کو خط نصف النہار پر چمکتا دیکھیں اسی مقصد کے حصول کے لئے میں ماہ بماہ پانسو پونڈ کی رقم تمہارے پاس بھیجتا رہا ہوں۔آنکھیں اوپر اُٹھاؤ۔ اور بنظر غور میری صورت دیکھو۔

یہ کہکر اس نے نقاب اُلٹ دیا۔ ریڈرف کے بدن پر لرزہ طاری ہو گیا۔اُس کی آنکھیں پتھرا گئیں۔اُس نے خوف کے مارے میز کے ایک کنارے کو پکڑ لیا۔اُس کی زبان میں لکنت آ گئی۔ نہایت دبی ہوئی آواز میں اُس نے کہا۔

کُ کُ کونٹ چ چ چارنو - - - - - -

دوسرا شخص اُٹھا۔ وہ نسبتاً کمزور بدن کا تھا۔وہ اس طرح گویا ہوا۔

میرے معزز دوست ریڈرف میری ناچیز پیشکش بھی خدمتِ عالی میں گزرانی جاچکی ہے۔ وہ منصب جلیلہ جس پر آپ ممتاز ہوتے ہیں۔ میری ہی کوششوں کا نتیجہ ہے میں بھی تمہارا جام صحت پیتا ہوں۔اگر اجازت دو تو میں آپکے ایک ناچیز معاون کو آپ کے پیشِ نظر کر دوں۔ ریڈرف کی ایک چیخ نکلی۔

ز۔ زینا۔ تم یہاں . . . .

پورے طریق سے یہ فقرہ اس سے ادا نہ ہوا تھا کہ تیسرا شخص اُٹھا۔ یہ لحیم شحیم اور پست قد تھا۔

اُس کی آواز رعد کی طرح گونجی"۔لو تمہاری قسمت پلٹنے میں میرا بھی حصہ ہے۔ 'سر' کا خطاب میرے ہی اثر کا نتیجہ ہے یہ خطاب ایسا معمولی نہیں کہ کسی کو مل جاتے۔اور وہ محسودِ جہاں نہ ہو۔ میں بھی تمہارا جام صحت نوش کرتا ہوں۔

خدایا فائبر۔فائبر۔ میں کیا دیکھ رہا ہوں۔کیا میں اپنی آنکھوں پر یقین کر لوں۔ وہ بیہوش ہو گیا۔کچھ دیر بعد جب

ہوش آیا تو اپنی داہنی طرف ڈیفرسٹ کی طرف دیکھا۔ چاہا کہ اس سے کچھ کہے لیکن اُس نے کرسی ایک طرف کو کھینچ لی۔ اور انتہائے حقارت سے اُس کی طرف دیکھا۔ اور ایک عجیب انداز سے بولی۔

"اب تم میری طرف دیکھتے ہو۔ آخر کس لئے۔ کیا وہ خوشی جس کی موجب میں ہوئی ہوں کسی حالت میں اُن لوگوں کے عطیات سے کم ہے۔ کیا میں نے ان سب کے ساتھ متفقہ کوشش نہیں کی۔ کہ تمہیں آسمان وجاہت پر پہنچا دوں۔ کیا اس سے زیادہ بھی تم حرص و آز رکھتے ہو۔

میں تمہاری آنکھوں میں ایک سوال پڑھ رہی ہوں۔

'میں کون ہوں؟' اس کا جواب سُن لو لیفارج مقتول قید خانہ کے پتھروں پر پڑا ہوا ہے۔ وہ عورت جس کے کیف محبت نے اُسے بیخود کر دیا تھا۔ اور جو خود بھی اُس کے جام اُلفت سے سرشار تھی میں ہی ہوں۔

میں اپنے تعارف کی اور زیادہ ضرورت نہیں سمجھ سکتی۔

قریب تھا کہ ریڈرف ایک چیخ مارے کہ چوتھا آدمی اُٹھا۔ وہ میز کے دوسرے کنارے پر تھا۔

اُس نے نہایت ہی سخت الفاظ میں کہا۔ ٹھہرو ٹھہرو کیا میں ہی ایسا بدنصیب رہونگا۔ کہ اس عظیم الشان تقریب پر کوئی تحفہ پیش نہ کر سکوں۔ نہ میرے پاس مال و دولت ہے نہ طبقۂ بالا میں میرا کسی قسم کا اثر

بعد ازآں حضار مجلس سے خطاب کر کے کہا۔ کہ آپ صاحبان نے اس شخص کے لئے بہت کچھ کیا ہے۔ جس کی خاطر خواہ عزت کرنے کے واسطے ہم سب یہاں جمع ہوئے ہیں۔

اس کی پیشانی کو فرخندہ اختری کی روشنی سے آپ لوگوں نے روشن کر دیا ہے۔ کیا میں بھی اپنی بساط کے موافق اس میں اضافہ کرنے کی کوشش کروں۔

اُس نے نقاب کو اپنے چہرہ سے اُتار کر زمین پر پھینک دیا۔ ریڈرف پر اتنا خوف طاری ہوا کہ وہ انتہائی کوشش کے باوجود بھی نہ بول سکا۔ صرف ایک لفظ اُسکی زبان سے ادا ہو سکا۔ جو ہلارون تھا۔

یہ شخص پھر چند الفاظ اپنی زبان پر لایا جن سے ریڈرف کے بدن پر لرزہ پڑ گیا۔

'دیکھو میرا تحفہ یہ ہے'، یہ کہکر اُس نے انتہائے سرعت سے بجلی کی طرح اپنی جیب سے ایک پستول نکالا۔ اور ریڈرف کی پیشانی کو نشانہ بنایا۔

پستول کی آواز سُنتے ہی میں نے پردہ مضبوطی سے پکڑ لیا۔ کہ اس کو ہٹا کر کود پڑوں لیکن میرے ساتھی نے میرا ہاتھ پکڑ لیا اور بولا کہ اگر اپنی جان کی خیر چاہتے ہو تو جلدی کرو ہماری موجودگی اُن لوگوں کو معلوم ہوگئی۔ دیکھو وہ کھڑکی کی طرف جھپٹ رہے ہیں۔ ایک منٹ کے بعد ہم دونوں اپنی موٹر گاڑی میں تھے۔ جسے فرانسس انتہائی تیزی سے چلا

رہا تھا۔ جب تعاقب کے خوف سے رہائی پائی۔ تو فرانسس نے کہا۔

"بابو ہم کو دیر ہو گئی۔ میں بھی اس میں حصہ لینا چاہتا تھا لیکن اُس آئرلینڈ کے باشندے کی باتیں بڑی فریبدہ تھیں۔ وہ اچانک اپنا کام کر گزرا۔ خیر جان بچی لاکھوں پائے، وہ چاروں تو خیر اُس کے خون کے پیاسے تھے ہی لیکن ڈیونسٹ خونی شیرنی سے کسی حال میں کم ثابت نہیں ہوئی۔

اُف کتنی گہری سازش تھی۔ انتقام کی کیا عجیب صورت تھی۔ اپنے شکار کو عرصۂ اتلاف بنانے سے پہلے اسے کس طرح دولتِ دنیوی سے مالامال کیا گیا۔

میرے خیال میں پولیس اس کی تحقیقات میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہ کریگی۔ ہم بھی اس راز کے انکشاف کو سراغرس پولیس پر چھوڑتے ہیں۔ دیکھیں پولیس کہاں تک اس کی سراغرسانی میں کامیاب ہوتی ہے۔

رمزی پانی پتی

سوز و ساز

راز کیا اس دل میں ہے کیوں اے خدا جلتا ہوں میں؟
صورتِ قرطاسِ مکتوبِ وفا جلتا ہوں میں

گرچہ ہوں پروانہ لیکن شمع سے نا آشنا
ہائے کیا بے آرزو، بے مدعا جلتا ہوں میں

ہر طرف نورِ محبت موجزن ہونے لگا
مثلِ شمعِ روشنِ ظلمت رُبا جلتا ہوں میں

رشک سے دیکھا ہے سوزِ نالہ انگیزِ سپند
کیا یہ آتش ہے کہ جس میں بے صدا جلتا ہوں میں

منزلِ لیلیٰ کو ہر گم کردہ رہ پانے لگا
رات بھر مثلِ چراغِ رہنما جلتا ہوں میں

آج کیوں تصویرِ خاموشی ہوں میں آتش نوا؟
شعلہ آسا اک زبانِ بے صدا جلتا ہوں میں

یہ تپش بھی ہو گئی صرفِ جنونِ جستجو
اک نفس مثلِ شرارِ نارسا جلتا ہوں میں

جب تری اُلفت سے ہے سوزِ شرارِ زندگی
کیوں گُنشتِ غیر میں پھر اے خدا جلتا ہوں میں؟

حامد علی خاں

کوئل سے خطاب

اے خجستہ میہماں خوش آمدی خوش آمدی
مَیں نے یہ تیری کُہک گلزار میں اکثر سُنی

پیاری کوئل سچ بتا کیا تو پرندہ ہے کوئی
حورِ جنّت ہے پری ہے یا فرشتہ ہے کوئی

یا تو صرف آواز ہے جو گونجتی ہے کان میں
کوہ میں وادی میں آبادی میں اور میدان میں

فرشِ سبزہ پر کبھی جب باغ میں ہوں بیٹھتا
کان میں آتی ہے تیز اور رس بھری تیری صدا

تو چمن کے واسطے لاتی ہے پیغام بہار
تیری آمد پر ہوا صحرا بھی رشکِ لالہ زار

تیری ہستی باعثِ آبادیِ ویرانہ ہے
گوشِ گل تیری صدا کے راز سے بیگانہ ہے

یہ صدا بھولے ہوئے قصّے سُناتی ہے مجھے
ہائے بچپن کے دنوں کی یاد آتی ہے مجھے

ہائے کیا دن تھے چمن میں جب لبِ جُو بیٹھ کر
تیری کو اُو سن کے ڈھونڈتا تھا میں ہر سو نظر

جھاڑیوں میں دیکھتا شاخوں کے اندر جھانکتا
اور تیری جستجو میں [illegible] صحرا چھانکتا

تیری صورت سے مگر یہ آنکھ بیگانہ رہی
میرے مستقبل کی صورت ہے مگر صورت تیری

ہاں تو اک آواز ہے اک راز ہے امید ہے
ہاں ترے ملنے کی دُھن ہے آرزوئے دید ہے

تجھ سے اے فرخندہ پیکر اس چمن کی سرزمیں
موسمِ گل میں بنی ہے رشکِ خلدِ بریں

ولی یمنی

جذباتِ وارث

بنا دیے کیا کیا اے نقش بندِ آب و گل تو نے
کہ جب یوں توڑنا تھا کیوں دیا تھا مجھ کو دل تو نے

ٹھہرا اے آہِ سوزاں خرمنِ گل پر گری بجلی
لگا دی آگ آخر آشیاں کے متّصل تو نے

وفورِ گریۂ خوں۔ دید کی حسرت نہ نکلے گی
نگاہِ شوق کو تو کر دیا ہے پا بہ گل تو نے

تصادم کوہِ غم کا اور دل اک شیشۂ نازک
مرے پہلو میں یارب کیوں نہ رکھدی کوئی سل تو نے

یہ دردانگیز نالے اور یہ حسرت آفریں آہیں
کوئی پوچھے تو وارث کیوں دیا تھا اسکو دل تو نے

وارث

روداد محبّت

مصنفہ ٹالسٹائی حصہ اول مترجمہ راز چاندپوری

تیسرا باب

ایک دن فصل کٹنے کے زمانہ میں کاٹیا، سونیا اور میں دوپہر کا کھانا کھانے کے بعد باغ میں چلے گئے۔ اور اپنی پسندیدہ جگہ پر جا بیٹھے۔ جو لیمو کے درختوں کے سایہ میں تھی۔ اور یہاں سے پتلی وادی صاف نظر آتی تھی۔ اور جس کے بعد جنگل اور کھیتوں کا دلفریب منظر دکھائی دیتا تھا۔

سرجیائی دو دن سے ہم سے ملنے نہ آیا تھا۔ آج ہم کو اُس سے ملنے کی امید تھی۔ کیونکہ ہمارے گماشتہ نے کہا تھا۔ کہ وہ آج میرے ساتھ باہر جائیگا۔ دو بجے کے قریب ہم نے اُس کو گھوڑے پر سوار رائی کے کھیت میں ہو کر جاتے ہوتے دیکھا۔ کاٹیا نے مالن سے کچھ شفتالو اور شاہ دانے لانے کو کہا۔ جو اس کو بہت مرغوب تھے۔ اور پھر مُسکرا کر میری طرف نظر کر کے وہ آرام کے ساتھ بینچ پر دراز ہو گئی اور اونگھنے لگی۔

میں نے لیمو کی ایک سرسبز و شاداب شاخ توڑ لی۔ جس سے میرا ہاتھ تر ہو گیا۔ میں اس شاخ سے کاٹیا کو ہوا دینے لگی۔ اور کتاب کے مطالعہ میں مصروف ہو گئی۔ اگرچہ بار بار میں کتاب سے نظر ہٹا کر میدان کی اس سڑک کی طرف دیکھتی تھی جس طرف سے وہ ہمارے پاس آنے والا تھا۔

سونیا ایک پُرانے لیمو کے درخت کی جڑ پر بیٹھی ہوئی اپنی گڑیوں کے واسطے گھر بنا رہی تھی۔ گرمی کی شدت اور ہوا کی تیزی تھی۔ بادلوں کے مجتمع ہو جانے سے تاریکی پھیل گئی تھی اور صبح سے برق و رعد نے ہنگامہ برپا کر رکھا تھا۔

میں اپنی عادت کے مطابق رعد کی آواز سے مضطرب تھی۔ لیکن دوپہر سے بادل منتشر ہونے شروع ہو گئے تھے۔ سُورج تیزی سے چمک رہا تھا۔ اور صرف آسمان کے ایک حصّہ میں رعد کی کڑک آہستہ آہستہ سُنائی دیتی تھی۔ بادل اُفق پر اکٹھے ہو گئے تھے۔ اور بجلی کی شوخ خمیدہ لہریں وقتاً فوقتاً اُس ابر میں تیرتی ہوئی اور زمین کی طرف آتی ہوئی معلوم ہوتی تھیں۔ جو اُفق سے کچھ اُوپر تھا۔ یہ بالکل ظاہر تھا۔ کہ کم از کم ہم آج اس طوفان باد و باراں سے

بچے رہینگے۔

باغ سے پیچھے سڑک پر گٹھوں سے لدے ہُوئے مویشی نظر آرہے تھے۔ اور خالی چھکڑے دوسرے گٹھوں کو لانے کے لئے تیزی کے ساتھ جارہے تھے۔ جن کے ساتھ رنگ برنگ کے لباس میں ملبوس کسانوں کے گروہ تھے۔

گرد و غبار نہ نیچے بیٹھتا تھا اور نہ اپنی جگہ سے ہٹتا تھا۔ بلکہ جھاڑیوں کے پیچھے باغ کے درختوں کے صاف و شفاف پتّوں کے درمیان رُکا ہوا تھا۔

دُور فاصلہ پر خرمن میں آدمیوں کی آواز اور پہیّوں کی گڑگڑاہٹ سُنائی دیتی تھی۔ اور خُشک پتّیوں کی کھڑکھڑاہٹ جو باڑہ کے قریب اُڑتیں اور پھر ہوا میں بلند ہو کر بیضاوی شکل کے مکان کی صورت میں نمایاں ہوتیں اور باہر نکلی ہوئی چھتوں کا نمونہ پیش کرتی تھیں۔ جن کے گرد کسانوں کا مجمع تھا۔

خاک آلود میدان میں گاڑیاں اِدھر اُدھر متحرک تھیں زرد گٹھوں کے ڈھیر لگے ہُوئے تھے۔ اور پہیوں کی گڑگڑاہٹ آدمیوں کی آوازیں اور نغموں کی صدائیں میرے کانوں میں آرہی تھیں۔

ایک جانب میدان بالکل صاف اور چٹیل تھا۔ اور جھاڑیوں کی قطاریں دُور تک پھیلی ہُوئی تھیں۔ داہنی طرف کچھ فاصلہ پر آدھے کٹے ہُوئے بدنما کھیتوں میں چمکدار رنگین پوشاکیں پہنے ہوئے عورتیں نظر آرہی تھیں، جو گٹھوں کو باندھ رہی تھیں۔ اُن کے ہاتھ سرگرم کار تھے۔ حتےٰ کہ کھیت بالکل صاف ہو گئے۔ اور سڈول گٹھے تھوڑے تھوڑے وقفہ کے بعد ہموار جگہ پر پُہنچا دِئے گئے۔

میرے دیکھتے دیکھتے موسم گرما موسم خزاں میں تبدیل ہو گیا۔ سوائے ہمارے باغ کے محبوب کُنج کے گرد و غبار اور گرمی ہر طرف پھیل گئی۔ اس گرد و غبار اور دُھوپ میں ہر چہار طرف محنتی لوگ باتیں کرتے ہُوئے اِدھر اُدھر مصروف کار تھے۔

لیکن کاٹیا اپنا کتان کا رومال مُنہ پر ڈالے ہُوئے آرام سے سانس لے رہی تھی۔ اور ٹھنڈک میں بینچ پر مزے سے محوخواب تھی۔ طشتری میں رکھے ہُوئے شاہ دانے سیاہ، رسیلے اور خوشنما معلوم ہوتے تھے۔ ہماری پوشاکیں خوشرنگ اور صاف تھیں۔ دُھوپ کے عکس پڑنے سے گھڑے کا پانی چمک رہا تھا۔ اور مَیں فرطِ مسرت سے بیخود تھی۔

مَیں نے اپنے دل میں کہا۔ "مَیں کیا کروں، کیا مجھے الزام دیا جا سکتا ہے کہ مَیں کیوں شاد و خرم ہوں؟ لیکن مَیں اپنی مسرت میں کس طرح کسی کو شریک کر سکتی ہوں۔ اور کس کو مَیں اپنی تمام خوشی اور سب کچھ حوالہ کر سکتی ہوں؟"

آفتاب بید کے درختوں کی چوٹیوں کے پیچھے وادی میں غروب ہو رہا تھا۔ گرد و غبار کھیتوں پر جم رہا تھا اور

فضائے آسمان سورج کی ترچھی شعاعوں سے روشن ہو رہی تھی۔ بادل بہت دور نکل گئے تھے۔ خرمن کے پیچھے درختوں کے درمیان سے تین نئے لانک کے ڈھیر دکھائی دے رہے تھے۔ اور کسان اُن کے پاس سے جدا ہو رہے تھے۔ چھکڑے گڑگڑاتے ہوئے آخری بار کھیتوں کی طرف جارہے تھے۔ کسانوں کی عورتیں اپنے شانوں پر کانٹے رکھے اور پیٹیوں میں بید کی شاخیں لگائے گاتی ہوئی گھروں کی جانب جا رہی تھیں۔ مگر سرجیائی ابھی تک نہ آیا تھا۔ اگرچہ بہت پہلے میں نے اس کو سرِ ملک پر اپنے گھوڑے پر سوار آتے ہوئے دیکھا تھا۔

یکایک درختوں کے کُنج میں سے اس کا دراز قد ظاہر ہوا۔ اس طرف سے اُس کے آنے کی مجھے امید نہ تھی۔ وہ نالے کے گرد گھومتا ہوا آیا تھا۔ اُس کا چہرہ خوشی سے چمک رہا تھا۔ وہ اپنی ٹوپی ہاتھ میں لئے ہوئے جلد جلد قدم بڑھاتا ہوا میری جانب آیا۔ جب اُس نے کاٹیا کو سوتے دیکھا تو خاموش دبے پاؤں میرے پاس آیا۔ مجھ کو فوراً معلوم ہو گیا کہ وہ اس وقت اس عجیب اور ناقابلِ بیان جوشِ مسرت کی ایک خاص حالت میں تھا جس کو میں بہت پسند کرتی تھی۔ اور جس کو ہم "وحشیانہ ذوق و شوق" کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔ وہ مثل اس طالب علم کے تھا۔ جس نے ابھی ابھی مدرسہ کی پابندی سے رہائی پائی ہو۔ اس کا تمام جسم سر سے پاؤں تک اطمینان و مسرت اور طفلانہ خوشی کا منظر تھا۔

اُس نے میرے نزدیک آکر اور میرا ہاتھ دبا کر آہستہ آہستہ کہا۔ "میری نوجوان حسینہ! تم کیسی ہو۔ تمہاری طبیعت ناساز تو نہیں۔ کیا تم بخیریت ہو؟" میرے سوال کے جواب میں اُس نے کہا۔ "ہاں آج میں اپنے ابتدائی جذبات سے مکیّف ہوں۔ آج میں ایک تیرہ سالہ لڑکا ہوں۔ میرا دل کھیلنے کودنے اور درختوں پر چڑھنے کو چاہتا ہے۔"

اُس کی متبسم نگاہوں کو دیکھ کر اور یہ معلوم ہونے پر کہ یہ وحشیانہ جوش متعدی ہے میری زبان سے بیساختہ نکلا۔ "تم وحشیانہ حالتِ شوق میں ہو۔"

اُس نے اپنی ایک آنکھ چھپا کر اور متین صورت بنا کر کہا۔ "بیشک، لیکن تم کاٹیا کی ناک پر کیوں ضرب لگا رہی ہو؟"

بات یہ تھی کہ جب میں اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔ اور شاخ کو برابر ہلا رہی تھی تو میں نے یہ نہ دیکھا تھا کہ کاٹیا کے چہرہ سے رومال ہٹ گیا ہے۔ اور شاخ کی پتیاں اُس کے چہرہ سے مس کر رہی ہیں۔

مجھے بیساختہ ہنسی آگئی اور میں نے آہستہ سے کہا۔ "لیکن وہ کبھی اس بات کو تسلیم نہ کریگی۔ کہ وہ سو رہی تھی۔"

میری آہستہ آہستہ گفتگو کرنے سے ظاہر تھا کہ میں چاہتی ہوں کہ کاٹیا بیدار نہ ہو۔ لیکن دراصل یہ وجہ نہ تھی۔

بلکہ واقعہ یہ ہے کہ مجھے اس کے ساتھ سرگوشیاں کرنے میں لطف حاصل ہوتا تھا۔

اُس نے اپنے لبوں کو حرکت دی اور میری نقل اُتاری کیونکہ میں نے اس قدر آہستگی کے ساتھ مندرجہ بالا جملہ کہا تھا۔ کہ اس کو سُننا ناممکن تھا

شاہ دانوں کی طشتری دیکھ کر اُس نے خاموشی کیساتھ اس کو اُٹھا لیا۔ اور لیموں کے درختوں کے سایہ میں سونیا کے پاس جاکر اس کی گڑیوں پر بیٹھ گیا۔ سونیا پہلے تو ناراض ہوئی لیکن اُس نے جلد ہی اس کو اس حیلہ سے خوش کر لیا۔ کہ دیکھیں دونوں میں کون زیادہ شاہ دانے کھا سکتا ہے۔

میں نے کہا۔ "اگر تم پسند کرو تو میں کچھ اور شاہ دانے منگاؤں یا تم خود لے آؤ۔"

اُس نے شاہ دانوں کی طشتری اُٹھالی۔ سونیا کی گڑیاں اس میں رکھ لیں۔ اور ہم دونوں ایک ساتھ وہاں سے اُٹھ کر کنج میں چلے آئے۔ سونیا ہنستی ہوئی اس کے پیچھے دوڑی۔ اور اس کے کوٹ کو کھینچنا شروع کیا۔ تاکہ وہ اس کی گڑیاں واپس کر دے۔ اُس نے گڑیاں واپس دیدیں۔ اور توجہ کے ساتھ میری طرف مخاطب ہوا۔

اُس نے ایسی آہستگی کے ساتھ مجھ سے گفتگو شروع کی۔ گویا کہ وہ ہنوز کسی کے جاگ اُٹھنے سے خائف تھا۔ اُس نے کہا۔ "کیا تم حسین دوشیزہ نہیں ہو؟ گرد و غبار، گرمی اور کام کے بعد جیسے ہی میں تمہارے پاس آیا تو مجھ تک خوشبو کی لپٹیں آنے لگیں۔ وہ گلوں کی مہک نہ تھی۔ بلکہ وہ پہلی قسم کے پھول تھے۔ جو سیاہی مائل ہوتے ہیں۔ اور جن سے برف کے پگھلنے اور بہار کی دوسری خوبصورت چیزوں کی خوشبو آتی ہے۔"

میں نے اُس خوشگوار اضطراب کو جو اس کی اس گفتگو سے میرے دل میں پیدا ہو گیا تھا۔ پوشیدہ رکھنے کی غرض سے دریافت کیا۔ "خیر، یہ بتاؤ کہ اب فصل کی کیا حالت ہے۔"

اُس نے کہا۔ "شاداں و فرحاں! یہ کسان جہاں کہیں ہم کو ملینگے خوش و خرم ملینگے۔ جسقدر ان لوگوں سے مجھے واقفیت ہوتی جاتی ہے۔ اسی قدر میں ان کا شیفتہ اور دلدادہ ہوتا جاتا ہوں۔"

میں نے کہا۔ "ہاں آج تمہارے آنے سے پہلے میں اپنے باغ سے ان کے کام کو دیکھ رہی تھی اور یکایک مجھے ندامت کا احساس ہوا۔ کیونکہ وہ اپنے کام میں مصروف تھے اور میں اطمینان سے بیکار بیٹھی ہوئی تھی۔" اُس نے میری بات کاٹتے ہوئے کہا۔ "تم اس موضوع پر سنجیدگی سے غور کرو۔" اس کے بعد دفعتاً وہ خود بہت سنجیدہ ہو گیا اُس نے جوشِ محبت میں اپنی آنکھیں میری آنکھوں میں ڈالدیں اور کہنے لگا۔ "یہ ایک پاک شے ہے۔ خدا تم کو اس سے

محفوظ رکھے۔

"بیشک، مَیں نے صرف تم ہی سے اس کا ذکر کیا ہے"

"ہاں مجھے معلوم ہے۔ لیکن ہم شاہ دانے کس طرح حاصل کر سکتے ہیں؟"

احاطہ مقفل تھا اور کوئی مالی موجود نہ تھا۔ (اُس نے خود ان سب کو اِدھر اُدھر کام کے لئے بھیجدیا تھا) سونیا چابی لانے کی غرض سے مکان کی طرف دوڑی۔ لیکن وہ بغیر اس کا انتظار کئے ہُوئے دیوار کے ایک گوشہ پر چڑھ گیا۔ اور جال ہٹا کر دوسری طرف کو دگیا۔ اُس نے اندر سے کہا۔ "کیا تم کچھ شاہ دانے لوگی؟ لاؤ مجھے طشتری دیدو۔"

مَیں نے جواب دیا۔ "نہیں مَیں خود شاہ دانے توڑونگی مَیں خود چابی لانے جاتی ہوں۔ کیونکہ وہ سونیا کو نہ ملیگی۔"

لیکن اس وقت میری خواہش یہ تھی کہ مَیں دیکھوں کہ وہ وہاں کیا کر رہا ہے۔ کیسا معلوم ہوتا ہے۔ اور کس طرح چلتا پھرتا ہے۔ جبکہ وہ یہ سمجھے ہُوئے ہے کہ اس وقت مجھ کو کوئی شخص نہیں دیکھ رہا ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ اس وقت مَیں اس کو اپنی نگاہ سے ایک لمحہ کے لئے بھی اوجھل ہونے دینا نہیں چاہتی تھی۔ مَیں دبے پاؤں احاطہ کے دوسری طرف، جہاں کانٹے دار درخت تھے۔ جا پہنچی۔ اس جگہ دیوار زیادہ بلند نہ تھی۔ مَیں ایک خالی ناند پر کھڑے ہو کر احاطہ کے اندر دیکھنے لگی۔ دیوار میرے سینے سے نیچی تھی۔

مَیں نے احاطہ کے اندرونی حصّہ میں نظر دوڑائی پُرانے اور گٹھیلے درختوں اور اُن کے چوڑے دندانہ دار پتّوں کو دیکھا۔ جن کے سایہ میں وزنی اور رسیلے شاہ دانے لٹک رہے تھے۔ جال کے نیچے مَیں نے اپنا سر جُھکا کر دیکھا اور سرجیائی کو ایک پُرانے شاہ دانے کے درخت کی شاخ کے سایہ میں کھڑے ہُوتے پایا۔

وہ یقیناً اس خیال میں تھا کہ مَیں جا چکی تھی اور اسکو دیکھنے والا کوئی موجود نہ تھا۔ وہ برہنہ سر اپنی آنکھیں بند کئے ایک پُرانے درخت کے دوشاخے پر بیٹھا ہُوا شاہ دانے کے گوند کا ایک چھوٹا سا گولہ بنانے میں مصروف تھا۔ یکایک اُس نے اپنے شانوں کو حرکت دی۔ اپنی آنکھیں کھولیں اور مُنہ ہی مُنہ میں کچھ کہکر وہ مُسکرایا۔ وہ الفاظ جو اس کی زبان سے نکلے تھے۔ اور اس کی مسکراہٹ اسقدر دلکش تھی۔ کہ مجھے اس طرح چُھپکر اُسے دیکھنے سے افسوس ہُوا۔ مجھے محسوس ہوا کہ اس کی زبان سے "دلرُبا" نکلا تھا۔

مَیں نے اپنے دل میں کہا۔ "ایسا نہیں ہو سکتا۔"

اُس نے بہت آہستگی اور پیار سے پھر کہا۔ "پیاری دِلربا" مگر مَیں نے اس کے الفاظ صاف صاف سُن لئے۔ میرا دِل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ اور مجھے اس قدر مسرت حاصل ہُوئی کہ مَیں نے دونوں ہاتھوں سے مضبوطی کے ساتھ دیوار کو پکڑ لیا۔ تاکہ مَیں گر نہ پڑوں۔ اور میرا فریب

نہ کھل جائے۔ اُس نے میری حرکات کی آواز سُن لی۔ متحیّر
ہوکر مجھے دیکھا۔ اور یکایک اپنی نگاہیں نیچی کرلیں۔ اُس کا
چہرہ سُرخ ہوگیا۔ اور مثل ایک بچّہ کے وہ پشیمان سا ہوگیا۔

اُس نے مجھ سے کچھ کہنے کی کوشش کی۔ لیکن وہ
کچھ نہ کہہ سکا۔ اور اُس کا چہرہ اور زیادہ سرخ ہوگیا۔ تاہم
جب اُس نے مجھے دیکھا تو اُس کو ہنسی آگئی۔ اور مَیں بھی
مُسکرادی۔ اس کا پُورا چہرہ خوشی سے دمک رہا تھا۔

اب وہ مثل اُس ضعیف چچا کے نہ معلوم ہوتا تھا
جو کبھی مجھ کو بہلایا کرتا تھا۔ اور نصیحت کیا کرتا تھا۔ بلکہ
اب وہ ایک ایسا آدمی تھا جو نہ مجھ سے بڑا تھا نہ چھوٹا،
جو مجھ سے محبت رکھتا تھا۔ اور ڈرتا بھی تھا۔ اور جس سے
مجھ کو بھی محبت تھی۔ اور جس سے مَیں بھی ڈرتی تھی۔

ہم دونوں میں سے کسی کی زبان سے بھی کوئی لفظ نہ
نکلا۔ بلکہ ہم ایک دوسرے کو دیکھتے رہے۔ مگر یکایک
اس کی پیشانی پر بل پڑ گئے۔ اس کی آنکھوں سے چمک اور
مسرت مفقود تھی۔ اور میری جانب اس کا تخاطب پھر سنجیدہ
اور مربیانہ ہوگیا۔ گویا ہم کوئی غیر مناسب کام کر رہے تھے
اب وہ اپنے ہوش و حواس میں آگیا تھا۔ اور مجھ سے بھی
ہوش میں آنے کو کہہ رہا تھا۔

اُس نے کہا۔ "بہتر یہ ہے کہ تم نیچے اُتر جاؤ کہیں
ایسا نہ ہو کہ تم گر پڑو اور چوٹ کھاؤ۔ اپنے بال درست کرو
تم کو معلوم نہیں کہ اس وقت تم کس حالت میں ہو۔"

مَیں نے متنفّر ہوکر اپنے دل سے پُوچھا۔ "وہ مجھسے
ظاہرداری کیوں کر رہا ہے؟ وہ میرے جذبات کو کیوں
صدمہ پہنچانا چاہتا ہے؟ اس وقت یکبارگی ایک زبردست
خواہش میرے دِل میں پیدا ہوئی۔ کہ مَیں اس کو پریشان
کروں اور اپنی طاقت کو اس پر آزماؤں۔

مَیں نے کہا۔ "نہیں مَیں خود اپنے ہاتھوں سے شاہ دانے
توڑونگی۔" اور ایک شاخ کو پکڑ کر جو نزدیک ہی لٹک رہی تھی
مَیں دیوار پر کھڑی ہوگئی۔ اور اپنے پیر اُوپر رکھ لئے جب مَیں
دیوار سے زمین پر کودی۔ تو اُس نے مجھے سہارا دینے کی
مطلق کوشش نہ کی۔

"تم کیسی حماقت کر رہی ہو" اُس نے کہا اور اسکا چہرہ
سُرخ ہوگیا۔ اُس نے اپنے اضطراب کو غُصّہ کے پردہ
میں چھپانے کی کوشش کرتے ہُوئے کہا۔ "دیکھو! ممکن تھا۔
کہ تمہارے چوٹ آجاتی۔ اور اب تم کس طرح یہاں سے
باہر نکلوگی؟"

وہ اب پہلے سے زیادہ پریشان تھا۔ لیکن اس وقت
اس کے اضطراب سے بجائے مسرت کے مجھے خوف معلوم ہوا
یہ اضطراب متعدی تھا۔ میری سمجھ میں نہ آیا۔ کہ مجھے کیا جواب
دینا چاہیئے۔ اس لئے مَیں خجل ہوکر اُس کے پاس سے
تھوڑی دُور جاکر شاہ دانے توڑنے لگی۔ اگرچہ اُنکے رکھنے

کے لئے میرے پاس کوئی چیز نہ تھی۔ مَیں نے اپنے آپ کو ملامت کی۔ مجھے افسوس ہُوا۔ مَیں خائف ہُوئی اور مجھے ایسا معلوم ہُوا کہ میری جلد بازی کی بدولت میرے متعلق اس کی رائے خراب ہوگئی۔ ہم دونوں بالکل خاموش تھے۔ اور یہ خاموشی ناگوار معلوم ہو رہی تھی۔

سونیا چابی لیکر آگئی۔ اور اس قید سے ہم کو نجات ملی۔ ابتک ہم دونوں میں سے کسی کی زبان سے بھی کوئی لفظ نہ نکلا تھا۔ اور ہم دونوں نے سونیا کو مخاطب کرکے گفتگو شروع کی۔

جب ہم کاٹیا کے پاس واپس آئے تو اس نے یقین دلایا کہ مَیں سوتی نہ تھی۔ اور مَیں ہر ایک بات سُن رہی تھی تو مجھے اطمینان ہُوا۔ اُس نے اپنا معمولی مربیانہ اور بزرگانہ لب و لہجہ اختیار کرنے کی کوشش کی۔ لیکن ایسا کرنا اُسکے اختیار میں نہ تھا۔ اور وہ مجھے مطلقاً دھوکا نہ دے سکتا تھا اس وقت مجھے وہ دل آویز گفتگو یاد تھی۔ جو آج سے پہلے اُس کے اور میرے درمیان ہُوچکی تھی۔

کاٹیا اکثر کہا کرتی تھی۔ کہ بہ نسبت عورت کے مرد کے لئے محبت اور اظہار محبت کرنا بہت آسان ہے۔ کاٹیا نے کہا۔ کہ "مرد اپنی زبان سے اظہار محبت کرسکتا ہے لیکن عورت نہیں کرسکتی۔"

سرجیائی نے کہا۔ "لیکن میرا خیال ہے کہ مرد کو نہ اظہار محبت کرنا چاہئے۔ اور نہ وہ ایسا کرسکتا ہے۔"

"آخر اس کا سبب؟" مَیں نے دریافت کیا۔

"اس کی وجہ یہ ہے کہ ایسا کہنا ہمیشہ غلط ہوگا۔ کیس قسم کا مکاشفہ ہے کہ کوئی شخص کسی سے محبت رکھتا ہے؟ جیسے ہی کوئی شخص اپنی زبان سے اظہار محبت کرتا ہے۔ وہ ایک قسم کا تیر چلاتا ہے۔ اور وہ غلام بن جاتا ہے کیونکہ وہ محبت میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ جیسے ہی وہ اظہار محبت کرتا ہے۔ تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یقیناً کوئی معجزہ ظاہر ہوگا' یا کوئی غیر معمولی عجیب واقعہ پیش آئیگا۔ گویا بیشمار توپیں یکدم داغی جائینگی"۔ اُس نے سلسلۂ کلام کو جاری رکھتے ہُوئے پھر کہا۔ "مجھے تو ایسا معلوم ہوتا ہے۔ کہ وہ لوگ جو دیانتداری سے اظہار محبت کرتے ہیں یا تو خود فریب میں ہوتے ہیں' یا دوسروں کو دھوکا دیتے ہیں۔ جو بہت زیادہ بُرا ہے۔

کاٹیا نے دریافت کیا۔ "مگر اظہار محبت نہ کیا جائے تو پھر کس طرح عورت کو معلوم ہوسکتا ہے کہ اُس سے کوئی شخص محبت کرتا ہے"۔

اُس نے جواب دیا۔ "مجھے معلوم نہیں۔ ہر آدمی کا طرز گفتگو جُداگانہ ہوتا ہے۔ مگر محبت نام ہے ایک جذبہ کا اور اس کا اظہار جذبہ ہی کی صورت میں ہونا چاہئے۔ جب مَیں افسانے پڑھتا ہوں۔ تو مجھے ہمیشہ خیال ہوتا ہے کہ قیس و فرہاد' لیلیٰ و شیریں سے اظہار محبت کرتے وقت

کسقدر مضطرب الحال ہوتے ہو نگے۔ اظہار محبت کے وقت عاشق کو خیال ہوتا ہے کہ اس کا نتیجہ کسی غیر معمولی صورت میں نکلیگا۔ لیکن عاشق یا معشوق دونوں میں سے کسی کے لئے بھی کوئی نئی بات ظاہر نہیں ہوتی۔ وہ پھر بھی اپنی حالت پر بدستور قائم رہتے ہیں۔ اور ان کے لئے ہر شے اگلی سی ہی ہوتی ہے۔"

اس کی ظریفانہ گفتگو کے پردہ میں مجھے اصلیت کا احساس ہُوا۔ کہ اس کا خطاب میری جانب ہے۔ مگر کاٹیا کی ان جھوٹے افسانوں کے سُننے سے تسلّی نہ ہُوئی۔

کاٹیا نے کہا۔ "تم تو ہمیشہ بعید از عقل باتیں کیا کرتے ہو سچ سچ بتاؤ کیا تم نے کبھی کسی عورت سے اظہارِ محبت نہیں کیا؟"

اُس نے قہقہہ مار کر کہا۔ "کبھی نہیں میری گردن کبھی کسی حسین کے سامنے خم نہیں ہُوئی۔ اور نہ کبھی ہوگی۔"

مَیں نے اُس کی گفتگو کو یاد کر کے اپنے دل میں کہا۔ "یقیناً اس کے لئے اب مجھ سے اظہار محبت کرنا ضروری ہے۔ مجھے معلوم ہے کہ وہ مجھ سے محبت کرتا ہے۔ وہ لاکھ بیگانہ بننے کی کوشش کرے۔ مگر میری آنکھوں میں خاک نہیں ڈال سکتا۔

اُس شام اس نے مجھ سے بہت کم گفتگو کی۔ لیکن اُس کے ہر لفظ میں جو وہ کاٹیا یا سونیا کو مخاطب کر کے کہتا اور اس کی ہر ادا اور ہر نظر میں مجھے محبت کی جھلک نظر آتی تھی۔ اور میرا خیال درست تھا۔ میرے لئے صرف یہ خیال تکلیف دہ تھا اور مجھے اس کی حالت پر افسوس ہُوا۔ کہ وہ اپنی گزشتہ بے غرضی اور بے التفاتی کے اظہار کو ضروری سمجھتا ہے۔ درآنحالیکہ حقیقت بے نقاب ہُو چکی تھی۔ اور ہر طرح مسرور ہونے کا موقع حاصل تھا۔ مگر شاہ دانوں کے تختہ میں داخل ہونے پر مجھے سخت افسوس تھا۔ مجھے خیال تھا۔ کہ اس طرح مَیں نے اپنے آپ کو اس کی نظر میں حقیر بنا لیا ہے۔ اور وہ مجھ سے ناخوش ہو گیا ہے۔

چائے نوشی کے بعد مَیں پیانو پر جا بیٹھی اور اُس نے بھی میرا ساتھ دیا۔

اُس نے مجھے ملاقات کے کمرہ میں لے جاتے ہُوئے کہا۔ "مجھے کوئی نغمہ سُناؤ۔ مَیں نے مدّت سے تمہارا کوئی ترانہ نہیں سُنا ہے۔"

مَیں نے یکایک اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔ "سرجیائی مَیں تم سے دریافت کرنا چاہتی ہوں۔ تم مجھ سے ناخوش تو نہیں ہو؟ کیا واقعی تم ناراض ہو؟"

اُس نے پوچھا "مَیں کیوں ناراض ہونے لگا؟"

مَیں نے حجاب آلود لہجہ میں جواب دیا۔ "اس لئے کہ مَیں نے آج سہ پہر کو تمہاری مرضی کے خلاف کام کیا تھا۔"

اُس نے میرا مطلب سمجھ لیا۔ اپنا سر ہلایا اور ہنس پڑا۔

اُس کے بشرہ سے ظاہر تھا۔ کہ وہ مجھ کو ملامت کریگا لیکن اُس میں اتنی ہمّت نہ تھی۔

مَیں نے پیانو کے نزدیک بیٹھتے ہُوئے کہا۔ "میرا اس سے کچھ مطلب نہ تھا۔ اب پھر ہم ایک دوسرے کے دوست ہو گئے ہیں، کیوں درست ہے؟

اُس نے جواب دیا۔ "کیوں نہیں؛ یقیناً ہم دوست ہیں"

ملاقات کے وسیع اور آراستہ کمرہ میں صرف دو شمعیں پیانو کے اُوپر روشن تھیں اور کمرہ کا باقی حصّہ تاریک تھا۔ موسم گرما کی صاف و شفّاف رات کی روشنی کھُلی ہُوئی کھڑکی کی راہ سے اندر آرہی تھی۔ ہر طرف خاموشی چھائی ہُوئی تھی۔ کبھی کبھی کاٹیا کے قدموں کی آواز سُنائی دیتی تھی۔ جو ایک تاریک کمرہ میں اِدھر اُدھر پھر رہی تھی۔ اور سر جیائی کے گھوڑے کی ہنہناہٹ اور سبزہ زار پر اُس کے سُم پٹکنے کی آواز بھی آرہی تھی۔ اُس کا گھوڑا کھڑکی کے نیچے بندھا ہُوا تھا۔

وہ میرے عقب میں بیٹھا ہُوا تھا۔ اس لئے مَیں اس کو نہ دیکھ سکتی تھی۔ لیکن ہر جگہ ـــــ کمرہ کی دُھندلی روشنی میں، نغموں اور خود اپنی رُوح میں ـــــ مجھے اسکا جلوہ نظر آرہا تھا اس کی ہر نظر اور ہر حرکت میرے دِل پر اثر کر رہی تھی۔ اگرچہ مَیں ان کو دیکھ نہ سکتی تھی۔

مَیں نے وہ ترانہ چھیڑا جو وہ میرے واسطے لایا تھا اور جس کو مَیں نے اس کی ہدایت کے مطابق صرف اس کی خاطر سے یاد کیا تھا۔ مجھے اس کا مطلقاً احساس نہ تھا۔ کہ مَیں کیا بجا رہی ہوں لیکن میرا خیال ہے کہ مَیں نے اس کو اچھی طرح بجایا ہوگا۔ اور مجھے یقین تھا۔ کہ وہ اس سے مطمئن تھا۔ اگرچہ مَیں اس کی طرف دیکھ نہ سکتی تھی۔ لیکن مجھے اُس مسرت کا احساس تھا۔ جس سے وہ متلذّذ ہو رہا تھا۔ وہ میری پشت پر بیٹھا ہُوا تھا۔ مگر مَیں اُس کی نگاہ کو برابر محسوس کر رہی تھی۔ جو وہ مجھ پر جمائے ہُوئے تھا۔

حالت بیخودی میں جبکہ میری اُنگلیاں پیانو پر رقصاں تھیں۔ مَیں نے گھوم کر اس کی طرف دیکھا۔ اُس کا سر شب کی تاریکی میں نمایاں تھا۔ وہ اپنے ہاتھ پر سر رکھے بیٹھا ہُوا تیز نگاہوں سے میری طرف دیکھ رہا تھا۔

جب مَیں نے اس کو اس طرح محو دید دیکھا تو مجھے بے اختیار ہنسی آگئی اور مَیں نے پیانو بجانا بند کر دیا۔ وہ مُسکرایا اور ملامت آمیز طریقہ سے اپنے سر کو جنبش دی۔ گویا وہ چاہتا تھا کہ مَیں برابر پیانو بجاتی رہوں۔

جب مَیں نے پیانو بجانا بند کیا۔ ماہتاب کی روشنی جو پہلے ہی سے سطح فلک پر پھیل چکی تھی۔ کمرہ کے اندر آرہی تھی۔ اور سیمیں شعاعیں فرش پر کھیل رہی تھیں۔

کاٹیا کی رائے میں، مَیں نے بہترین موقعہ پر پیانو بجانا موقوف کر دیا تھا۔ اور وہ اس امر پر اصرار کرنے لگی۔

کرین نے اچھی طرح نغمہ نوازی نہ کی تھی لیکن سرجیائی نے
کہا کہ میں نے آج سے بہتر کبھی پہلے نہیں بجایا۔ وہ کمرہ میں
اِدھر اُدھر ٹہلنے لگا۔ بار بار ڈرائنگ روم سے تاریک ملاقات
کے کمرہ میں جاتا اور پھر واپس آتا۔ وہ ہر بار مجھے دیکھتا اور
مُسکراتا میں بھی مسکراتی اور قریب قریب قہقہہ لگاتی۔ اگرچہ
مجھے اس ہنسی کا کوئی سبب معلوم نہ ہوتا تھا۔ میں اس روز
بہت ہی خوش و خرم تھی۔

ایک بار جیسے ہی وہ دروازہ کے باہر گیا اور نظروں
سے غائب ہو گیا۔ میں کاٹیا سے لپٹ گئی۔ جو پیانو کے
نزدیک میرے پہلو میں کھڑی ہوئی تھی۔ اور میں نے اسکے
اس جگہ بوسہ لینے شروع کر دئے۔ جو مجھے سب سے
زیادہ پسند تھی یعنی اس کی گداز گردن اور زنخدان پھر جیسے
ہی وہ کمرہ کے اندر واپس آگیا۔ میں نے سنجیدگی اختیار
کرنے اور اپنی ہنسی کو روکنے کی کوشش کی۔

کاٹیا نے اُس سے مخاطب ہو کر کہا۔ "آج اس کو
کیا ہو گیا ہے؟"

لیکن اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اور وہ میری طرف
دیکھ کر ہنس پڑا۔ کیونکہ اس کو معلوم تھا کہ آج مجھے کیا ہو گیا ہے۔

اُس نے ملاقات کے کمرہ میں جہاں وہ باغ کی جانب
چھجّہ دار کھڑکی کے پاس کھڑا تھا۔ کہا۔ "دیکھو کیسی پیاری رات
ہے!"

ہم اُس کے پاس چلے گئے۔ واقعی رات اس قدر
خوشگوار اور باصرہ نواز تھی کہ میں نے آج سے پہلے
کبھی نہ دیکھی تھی۔ ماہ کامل مکان کی آڑ میں ہماری پشت پر تھا
اور اس لئے وہ ہماری نظروں سے اوجھل تھا۔ چھت
ستون اور چبوترہ پر تنے ہوئے شامیانہ کا نصف سایہ
ریتیلی روشوں اور گھاس کے بیضاوی تختہ پر ترچھا پڑ
رہا تھا۔ باغ کا باقی تمام حصہ روشن تھا۔ اور ماہتاب کی
سیمیں شعاعوں سے قطرات شبنم جگمگا رہے تھے۔ پھولوں
کے تختہ کے درمیان کا وسیع راستہ، جس کے اُس طرف
ایک جانب بلند جھاڑیوں کا سایہ ترچھا پڑ رہا تھا،
نظرافروز اور دلخوش کن تھا۔ اور کُہر آلود فضا میں چمکدار پتھروں
کے ٹکڑے چمک رہے تھے۔

درختوں کے سایہ میں نارنگیوں کے تختہ کی صاف شفاف
بالائی سطح دکھائی دے رہی تھی۔ اور نالے سے بخارات
اُٹھ رہے تھے۔ سوسن کے خاموش کُنج، جن میں ہنوز
اچھی طرح پھول نہ کھلے تھے، چاند کی روشنی میں روشن و منوّر
تھے۔ تمام شبنم آلود پھولوں میں صاف فرق تھا۔ کنجوں میں
روشنی اور سایہ اس طرح ملے ہوئے تھے۔ گویا وہ درختوں
اور روشوں سے بنے ہوئے نہ تھے۔ بلکہ صاف و شفاف مکانات
تھے۔ جو متحرک و مرتعش تھے۔

داہنی طرف مکان کے سایہ میں تاریکی ہی تاریکی تھی

مگر باوجود اس تاریکی کے مکان کے نزدیک چنار کی بلند چوٹیاں عجیب انداز سے تاریکی کے مقابل غیر متحرک اور صاف نظر آرہی تھیں۔ وہ چاندنی میں چمک رہی تھیں۔ اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ نیلگوں آسمان کی خاموش فضا میں بہت بلندی پر جا پہنچیں گی۔

میں نے کہا۔ "آؤ ہم باہر چلیں"۔

کاٹیا رضامند ہوگئی۔ لیکن مجھ سے کہا۔ "تم اپنا بوٹ پہن لو۔"

میں نے جواب دیا۔ "کاٹیا! بوٹ پہننے کی کیا ضرورت ہے۔ سر جیائی مجھے سہارا دیگا"۔

گویا اس طرح میرے پیر نم آلود نہ ہو سکینگے۔

لیکن اس وقت سب نے میرا مطلب سمجھ لیا اور کسی کو مطلق تعجب نہ ہوا۔ اس نے کبھی مجھ کو اپنے بازو پر سہارا نہ لینے دیا تھا۔ لیکن اب میں نے اپنی خواہش کے مطابق ایسا کیا۔ اور اس کو بالکل تعجب نہ ہوا۔ وہ اور میں دونوں باہر نکلے۔ اور چبوترہ پر جا بیٹھے۔ یہ دنیا، یہ آسمان، یہ باغ اور فضا میری نظروں میں پہلے سے بالکل مختلف تھے۔

جب میں نے اس کنج پر نظر ڈالی جس میں سے ہم گزر رہے تھے۔ تو مجھے خیال ہوا کہ ہم ایک لمحہ میں ٹھیر جائینگے اور عالم امکان ختم ہو جائیگا۔ لیکن یہ تماشہ ہمیشہ اس طرح قائم رہیگا۔ اور اس کی خوبصورتی میں کبھی کوئی تبدیلی نہ ہوگی۔

لیکن ہم برابر قدم بڑھاتے چلے گئے۔ اور حسن کی سحر طرازی ہماری سدِّ راہ نہ ہوئی۔ ہم اور آگے بڑھ گئے۔ وہاں بھی جیسا کہ خیال تھا باغ، درخت، روشیں اور خشک پتّیاں موجود تھیں۔ اور ہم صرف روشنی اور سایہ کو پامال کرتے ہوئے روشوں پر گھوم رہے تھے۔ صرف خشک پتّیاں ہمارے پاؤں کے تلے کھڑکھڑا رہی تھیں۔ اور سرد ہوا کے جھونکے میرے چہرہ سے مس ہو رہے تھے۔ اُس وقت صرف وہ میرے پہلو بہ پہلو قدم اٹھا رہا تھا۔ اور اُس نے سلیقہ کے ساتھ میرے ہاتھ کو اپنے بازو پر رکھ لیا تھا۔ کاٹیا اِدھر اُدھر ہوتی ہوئی ہمارے پیچھے پیچھے چلی آتی تھی۔ آسمان پر صرف چاند اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ مصروف سیر تھا جسکی روشنی غیر متحرک شاخوں سے گزر کر ہمارے اُوپر پڑ رہی تھی۔

مگر ہر قدم پر فطرت کی سحر طرازیاں نظر نواز ہوتی تھیں۔ اور مجھے یقین نہ تھا۔ کہ ہم اور آگے بڑھ سکیں گے۔ مجھے اُن تمام چیزوں کا خیال بھی نہ تھا جو ہمارے چاروں طرف محیط تھیں۔

کاٹیا یکایک چلا اٹھی۔ "اوہ! مینڈک، مینڈک!"

میں نے اپنے دل میں کہا۔ "یہ کون چلایا اور کیوں؟"

لیکن مجھے فوراً ہی ہوش آگیا۔ اور معلوم ہوا کہ یہ کاٹیا تھی۔ جو مینڈکوں سے ڈرتی ہے۔ میں زمین کی طرف دیکھنے لگی، ایک چھوٹا سا مینڈک اُچھلتا ہوا میرے سامنے آیا۔ اور

ٹھیر گیا۔ اس کا چھوٹا سا سایہ صاف و شفاف روش پر پڑ رہا تھا۔

سر جیائی نے مجھ سے پوچھا۔ "کیا تم کو خوف نہیں معلوم ہوتا؟"

میں نے اس کی طرف دیکھا۔ کُنج کے لیموں کے درختوں میں سے ایک درخت کاٹ دیا گیا تھا۔ اس جگہ پر جہاں سے ہم گزر رہے تھے۔ اُس کا چہرہ چاندنی میں چمک رہا تھا۔ اُس وقت وہ بہت ہی خوبصورت اور مسرور تھا۔

اُس نے کہا تھا۔ "کیا تم کو خوف نہیں معلوم ہوتا" مگر اس کے الفاظ میں ایک راز نہاں تھا۔ میں نے خیال کیا کہ وہ یہ کہہ رہا ہے۔ "پیاری خاتون! میں تجھ سے محبت رکھتا ہوں۔ ہاں مجھے تجھ سے محبت ہے۔ میں تجھے پیار کرتا ہوں۔"

اُس کی نگاہوں اور اس کے بازو کی حرکت سے اسکا اظہار ہوا۔ اور روشنی، سایہ، ہوا اور ہر شے نے اُس کے الفاظ کو دُہرایا۔

ہم نے تمام باغ کا گشت لگایا۔ کاٹیا ہمارے ساتھ تھی وہ چھوٹے چھوٹے قدم اُٹھاتی تھی۔ اور اُس کا سانس پھولا ہوا تھا۔ کاٹیا نے کہا کہ اب واپس چلنا چاہئے۔ اس پر مجھے افسوس ہوا ـــــ افسوس ہوا اُس غریب ضعیفہ کی حالت پر۔ مجھے تعجب تھا کہ وہ ان جذبات سے کیوں متاثر نہیں جس سے ہم تھے۔ اور کیوں سب لوگ مثل اس رات کے اور مثل ہمارے مسرور نہ تھے!

ہم مکان پر واپس آگئے۔ لیکن باوجود دیر ہو جانے کے اُس نے رُخصت ہونے کی اجازت نہ مانگی۔ مرغ بانگ دے رہے تھے۔ گھر کے سب آدمی خواب راحت کے مزے لے رہے تھے۔ اور اس کا گھوڑا کھڑکی کے نیچے زور زور سے بے صبری کے ساتھ زمین پر ٹاپیں مار رہا تھا اور ہنہناتا تھا۔ کاٹیا نے ہم کو آگاہ نہ کیا کہ رات زیادہ گزر چکی ہے اور جب ہم اِدھر اُدھر کی دلخوش کن گفتگو میں مصروف تھے ہم کو اس کا خیال بھی نہ تھا کہ صبح کے تین بج چکے ہیں۔

جب وہ ہم سے رُخصت ہوا تو مُرغ سہ بارہ بانگ دے رہے تھے۔ اور آسمان پر سپیدۂ سحر نمودار ہو چلا تھا وہ اپنے معمول کے مطابق کسی غیر معمولی بات کے اظہار کئے ہوئے رُخصت ہوا۔ لیکن مجھے اچھی طرح معلوم ہو گیا تھا کہ آج سے وہ میرا ہے۔ اور مجھے اُس کو ضائع نہ کرنا چاہئے جب مجھے اپنے دل میں اس امر کا یقین ہو گیا کہ مجھے اس سے محبت ہے۔ تو میں نے کاٹیا سے پُورا قصّہ کہہ دیا۔ وہ بہت خوش ہوئی۔ اور میری گفتگو کا اس پر بہت اچھا اثر پڑا۔ کہ میں نے اس کو اپنا رازدار بنا لیا۔ لیکن غریب کاٹیا اس رات کو پھر بھی سو گئی۔ اس کے برخلاف میں چبوترہ پر اِدھر اُدھر گھومتی رہی۔ اور باغ میں چلی گئی۔ میں اسکے ہر لفظ

کو دُہراتی اور ہر انداز کو یاد کرتی ہُوئی اُس کنج میں جا پُہنچی جہاں وُہ اور مَیں دونوں ایک ساتھ رہ چُکے تھے۔

مَیں رات بھر نہ سو سکی۔ اور اپنی زندگی میں آج پہلی بار یہ موقع نصیب ہُوا کہ صبح تک بیدار رہی۔ اور طلوعِ سحر کا لطف اُٹھایا۔ اور اُس رات کے بعد آج تک مَیں نے پھر کبھی ویسی رات اور صبح نہیں دیکھی۔

مَیں نے اپنے دل سے کہا۔ " وہ مجھ سے سادگی کیساتھ کیوں نہیں کہتا کہ اس کو مجھ سے محبت ہے۔ وہ ایسی مشکلات کا تصوّر کیوں کرتا رہتا ہے۔ اور اپنے آپ کو کیوں ضعیف العمر کہتا ہے۔ جبکہ ہر شے ایسی دلکش اور حسین ہے؟ وہ کیوں اس زرّیں وقت کو ضائع کر رہا ہے۔ جو غالباً پھر کبھی واپس نہ آئیگا؟ اس کو کہنا چاہیئے: مجھے تجھ سے محبت ہے، اس کو میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیکر بوسہ دینا چاہیئے اور پھر کہنا چاہیئے۔ میں تجھے پیار کرتا ہوں۔ الغرض اس کے لئے لازمی ہے کہ اسکا چہرہ سُرخ ہو جائے۔ اس کی نگاہیں میرے سامنے جُھک جائیں۔ اور پھر میں اُس سے سب کچھ کہہ دوں، یا نہیں، مَیں اس سے کچھ نہ کہوں بلکہ اپنی باہیں اس کی گردن میں ڈالدوں اور اس کو اپنے سینہ سے لگا کر اشک ہائے مسرت برساؤں۔ لیکن فرض کرو کہ مَیں غلطی پر ہوں۔ اور وہ مجھ سے محبت نہ کرتا ہو۔" یکایک یہ خیال میرے دِل میں پیدا ہُوا۔

مَیں اس کے تصوّر سے کانپ اُٹھی۔ خُدا جانے میں کیا کر گزری ہوتی ـــــ ہم دونوں کا وہ اضطراب جبکہ میں شاہ دانوں کے تختہ میں دیوار سے کود کر اس کے پاس پُہنچی تھی۔ مجھے یاد آگیا اور میرا دل بھر آیا۔ میرے دل پر بہت ہی بار ہو گیا۔ میری آنکھیں اشک آلود ہو گئیں۔ مَیں نے خُدا کے حضور میں سر نیاز جُھکانے کی کوشش کی اور مجھے ایک عجیب اطمینان و امید کا احساس ہُوا۔ اپنی سالگرہ کے دن عشاء ربانی میں حصّہ لینے اور اس کی منسوبہ بن جانے کی نیّت سے مَیں نے اسی دن سے روزہ رکھنے کا ارادہ کر لیا۔

کیوں اور کس طرح ایسا ہو سکتا ہے؟ اس کا مجھے ذرا بھی خیال نہ ہُوا۔ مگر اس وقت سے میرا اعتقاد مضبوط ہو گیا۔ اور مجھے یقین ہو گیا کہ ضرور ایسا ہی ہوگا۔ کمرہ میں پہنچنے سے پہلے ہی کافی روشنی پھیل چکی تھی۔ اور لوگ بیدار ہونے لگے تھے۔

چوتھا باب (۴)

چونکہ یہ ایک مذہبی فرض تھا۔ اس لئے میرے اس ارادہ پر کہ مَیں ان ایام میں عشاء ربانی کی شرکت کیلئے تیاری کروں گھر میں کسی کو بھی تعجب نہ ہُوا۔

اس ہفتہ میں سرجیائی ایک دِن بھی ہم سے ملنے نہ آیا

اور مجھے اس کے نہ آنے پر تو تعجب تھا، نہ پریشانی اور نہ تکلیف بلکہ اس کے برعکس مجھے خوشی تھی۔ کہ وہ نہیں آیا۔ میں صرف اس امید پر خوش تھی۔ کہ میری سالگرہ کے دن وہ مجھ سے ملیگا۔

اس ہفتہ بھر میں ہر صبح کو سویرے اُٹھتی رہی۔ اور جبتک گھوڑوں پر ساز نہ کسا جاتا میں باغ میں اِدھر اُدھر گھومتی پھرتی اور کل کے گناہوں پر توبہ و استغفار کرتی اور سوچتی کہ آج مجھے کیا کرنا چاہیے۔ تاکہ میرا وقت اطمینان سے گزرے۔ اور میں گناہوں سے محفوظ رہوں۔

اس وقت مجھے گناہوں سے باز رہنا بہت ہی آسان معلوم ہوتا تھا۔ میرے نزدیک صرف کوشش کرنی ضروری تھی۔ جیسے ہی گاڑی میں گھوڑے جوت دئے جاتے میں کاٹیا یا کسی کنیز کو ساتھ لیکر اپنی فٹن میں گرجا کو جاتی۔ گرجا میں داخل ہوتے وقت مجھے خیال ہوتا کہ دُعا اُن سب کے واسطے مانگنی چاہیے۔ جو خدا سے ڈرتے ہیں۔ اور میں اسی خیال میں ڈوبی ہوتی دروازہ کی گھاس سے ڈھکی ہوئی ابتدائی دو سیڑھیوں پر چڑھ جاتی۔

دن کے اس حصہ میں آٹھ دس کسانوں یا غلاموں سے زیادہ کبھی گرجے میں نہ ہوتے جو عشاء ربانی کے لئے تیاریاں کیا کرتے۔ میں ان کے سلام کا جواب بہت ہی عاجزی سے دیتی اور خود الماری کے پاس جاکر اس بوڑھے سپاہی کی موم بتیاں نکال لاتی جو گرجے کے سامان کا محافظ تھا۔ اور ان کو پردہ کے سامنے لاکر رکھ دیتی اور اس کام کے انجام دینے سے مجھے بہت خوشی حاصل ہوتی تھی۔

مقدس دروازہ سے قربانگاہ کا وہ پردہ نظر آتا تھا۔ جس پر اماں نے بیل بوٹے بنائے تھے۔ پردہ پر دو زاویہ تھے۔ جو چمکدار ستاروں سے مزّین کئے گئے تھے۔ اور ایام طفولیّت میں مجھے بہت ہی بڑے معلوم ہوتے تھے۔ اور وہ فاختہ بھی تھی۔ جس کے گرد زرد رنگ کا ہالہ بنا ہوا تھا۔ اور جو ہمیشہ میری طفلانہ طبیعت کو اپنی طرف کھینچتی تھی۔

قربان گاہ کے قریب بپتسمہ دینے کا مخصوص برتن رکھا ہوا تھا۔ جہاں پر بارہا میں خود اپنے ملازموں کے بچّوں کی دینی ماں ہونے کی حیثیت سے کھڑی ہو چکی تھی اور جہاں خود مجھ کو بپتسمہ دیا گیا تھا۔

ضعیف پادری اپنا جُبہ پہنکر آتا جو اس سیاہ کپڑے کا بنا ہوا تھا۔ جس سے میرے والد کی عبا بنی تھی۔ اور اپنے اُسی قدیم لہجہ میں نماز پڑھاتا۔ جس کو میں ہوش سنبھالنے کے وقت سے اپنے گھر پر، سونیا کو بپتسمہ دینے کے وقت اپنے والد کی فاتحہ اور والدہ کے جنازہ پر سنتی رہی تھی۔

مُغنّی کی صدائے لرزاں مثل سابق قربان گاہ میں گونجتی اور وہاں پر وہی ضعیفہ عورت موجود ہوتی۔ جس کو جہانتک مجھے یاد ہے میں نے ہر عبادت کے موقع پر ہمیشہ گرجے میں دیکھا تھا۔ جس کی کمر خمیدہ ہو کر دوہری ہو گئی تھی۔ جو دیوار کے پاس

کھڑی ہوکر اشک آلود نگاہوں سے قربان گاہ کے پردہ کو دیکھا کرتی اور اپنے بدرنگ شال کو اپنے بے رونق ہاتھوں سے پکڑے ہُوئے اپنے پوپلے مُنہ سے نماز ادا کرتی تھی۔

ابتداءً ان سب باتوں میں کوئی بات ایسی نہ تھی جو میرے اشتیاق کو اُکساتی۔ اور نہ وہاں کی صحبت ہی مجھ کو پسند تھی۔ لیکن اب یہ سب باتیں مجھے مقدس، قابل احترام اور پُر معنی معلوم ہوتی تھیں۔

میں مناجات کا ہر لفظ غور سے سُنتی اور اپنے محسوسات سے اس کا جواب دینے کی کوشش کرتی۔ اور جب کبھی میں پُورے طور پر اس کے معنی سمجھنے سے قاصر رہتی تو دل ہی دل میں خُدا سے التجا کرتی کہ اس کا مطلب میرے دِل پر ظاہر ہو جاتے یا اس مناجات کی بجائے جس کا مفہوم میری سمجھ میں نہ آتا تھا میں اپنے دل میں کوئی اور دُعا پڑھتی۔

جب توبہ و استغفار کا وقت آتا تو گزشتہ زمانہ میرے پیش نظر ہوتا۔ اور وہ عالم طفلی کا معصوم زمانہ میری موجودہ روشن روح کے زمانہ میں اسقدر تاریک معلوم ہوتا کہ میری آنکھیں نم آلود ہو جاتیں۔ اور میں خوفزدہ ہو جاتی۔ مگر اسکے ساتھ ہی مجھے محسوس ہوتا کہ میرے پچھلے گناہ معاف ہو گئے ہیں یا اگر میرے گناہ ناقابل عفو ہوتے تو اس کے مقابلہ میں میری توبہ بھی زیادہ دردانگیز ہوتی۔

نماز کے بعد جب پادری کہتا "خدا کی رحمتیں تم پر نازل ہوں" تو مجھے ایسا محسوس ہوتا کہ ایک فطری احساس مسرت مجھے گھیرے ہُوئے ہے۔ اور یکایک ایک عجیب جوش انبساط میرے دِل میں موجزن ہو جاتا۔

جب نماز ختم ہو جاتی تو نیک پادری میرے پاس آکر مجھ سے کہتا "کیا یہ بہتر نہ ہوگا۔ کہ شام کی نماز ہمارے گھر پر ہو۔ اور وہ پُوچھتا کہ اسے کب آنا چاہئے۔ میں اُس کی اس عنایت کا پُر جوش شکریہ ادا کرتی۔ کیونکہ میں جانتی تھی کہ وُہ صرف میری خاطر سے اس قسم کی تجویز پیش کرتا تھا۔ اور میں اُس سے کہہ دیتی۔ کہ اچھا میں خود آؤنگی یا آپ کو اطلاع دیدونگی۔ وہ دریافت کرتا۔ "کیا آپ اتنی تکلیف گوارا کرینگی؟"

میں نہ سمجھ سکتی کہ مجھے کیا جواب دینا چاہئے۔ کیونکہ مجھے خوف تھا کہ کہیں میں مغرور ہوکر گناہ کی مرتکب نہ بن جاؤں۔ نماز کے بعد سوائے اس وقت کے کہ کاٹیا میرے ساتھ ہوتی۔ میں ہمیشہ فٹن کو خالی گھر واپس کر دیتی تھی۔ اور راہگیروں کو عاجزانہ سلام کرتی۔ کسی کو مدد دینے، کسی کو نصیحت کرنے کسی کی مُصیبت میں حصّہ لینے، کسی کا بوجھ اُٹھوانے کسی بچّہ کا جُھولا جھلانے یا کسی کے لئے اپنی جان کو خطرہ میں ڈالنے کا موقع تلاش کرتی ہُوئی پیدل گھر واپس ہُوتی۔

ایک دن شام کے وقت میں نے اپنے گماشتہ کو کاٹیا سے یہ کہتے ہُوئے سُنا کہ سیمیون نامی کسان کچھ تختے اپنی لڑکی کا تابوت بنانے اور کچھ روپیہ فاتحہ کے انتظام کے لئے مانگنے

آیا تھا جو اُس کو دیدیا گیا۔

مَیں نے دریافت کیا "کیا وہ اس قدر غریب ہے!"

مجھے بہت افسوس ہُوا لیکن اس کے ساتھ ہی ایک قسم کی خوشی بھی حاصل ہُوتی۔ کاٹیا کو یہ بتا کر کہ مَیں اِدھر اُدھر گھُومنے جارہی ہوں۔ مَیں بالاخانہ پر گئی۔ اور اپنا سب روپیہ اکٹھا کر کے (اگرچہ وہ بہت تھوڑا تھا) نیچے اُتری، تنہا چبوترہ سے گزر کر باغ کو پار کرتی ہُوتی گاؤں میں پُہنچکر سیمون کے مکان پر جا پُہنچی۔

سیمون کا مکان گاؤں کی بالکل آخری حد پر تھا۔ بغیر اس کے کہ کوئی شخص مجھے دیکھ سکتا مَیں کھڑکی کے نزدیک گئی۔ روپیہ دہلیز پر رکھدئے۔ اور کواڑوں پر دستک دی۔

کوئی شخص مکان سے نِکلا۔ اور اُس نے کھڑکی کھول کر مجھے پکارا۔ لیکن مَیں مثل ایک گنہگار کے ترساں و لرزاں اپنے گھر کی طرف بھاگی۔

کاٹیا نے مجھ سے دریافت کیا کہ مَیں کہاں گئی تھی۔ اور میرے ساتھ کیا معاملہ پیش آیا تھا۔ مگر مَیں نے یہ بھی نہ سُنا کہ وہ کیا کہہ رہی تھی۔ اور مَیں نے اس کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔ یکایک مجھے اپنی یہ حرکت حقیر و مذموم معلوم ہونے لگی۔ مَیں نے اپنے کمرہ میں جاکر اندر سے دروازہ بند کرلیا۔ اور عرصہ تک اِدھر اُدھر ٹہلتی رہی۔ کیونکہ اس وقت مَیں کوئی کام کرنے یا کچھ سوچنے یا اپنے جذبات کو سمجھنے کے قابل نہ تھی۔

مجھے اُس مسرت کا اندازہ ہُوا جو اُس غریب کے تمام خاندان کو ہُوئی ہوگی۔ اور اُن دُعاؤں کا خیال ہُوا جو وہ اُس شخص کے حق میں کرینگے۔ جس نے ان کو روپیہ دیا تھا۔ اور مجھے افسوس ہُوا کہ مَیں نے اپنے ہاتھ سے یہ رقم اُن کو کیوں نہ دی۔

مجھے اس کا بھی خیال ہُوا کہ اگر سرجیاتی میری اس احمقانہ کمزوری کو سُنے گا۔ تو کیا کہیگا۔ لیکن مَیں مسرور تھی۔ کہ اس راز سے کوئی شخص کبھی واقف نہ ہوسکیگا۔ مجھے اس قدر خوشی تھی۔ کہ تمام چیزیں جن میں میری ذات بھی شامل تھی۔ میری نظروں میں بے وقعت معلوم ہونے لگیں۔ اور میرا دل جذبات انبساط سے اس قدر لبریز تھا کہ موت کا خیال بھی مسرت کا پیغام بنکر آیا۔ مَیں مُسکرائی، مَیں نے خُدا سے دُعا مانگی اور بے اختیار میرے آنسو نکل پڑے۔ اُس وقت اپنی ہستی اور دُنیا کی ہر شے کیلئے ایک ناقابل بیان جوش محبت میرے دل میں موجزن تھا۔

مَیں نے انجیل مُقدّس کی چند آیتیں پڑھیں جو نماز کی کتاب میں موجود تھیں۔ جس قدر یہ کتاب میری سمجھ میں آتی گئی اُسی قدر رُوحانی زندگی کا افسانہ دلکش معلوم ہونے لگا اور اس کے اصول اسی قدر دشوار اور خوفناک و عمیق جذبات و خیالات سے لبریز پائے گئے لیکن اسی وجہ سے جب مَیں نے کتاب کو علیحدہ رکھ کر اپنے خیالات اور تصوّرات کو اس زندگی کی طرف رجوع کیا۔ جو میرے گردوپیش تھی تو ہر چیز نہایت صاف اور سادہ معلوم ہونے لگی۔

سیدھی سادی زندگی بسر کرنا مجھے دشوار نہ معلوم ہوتا تھا اور ہر ایک سے محبت کرنا اور ہر ایک کا محبوب بننا بالکل معمولی بات نظر آتی تھی۔ سب مجھ پر مہربان تھے۔ اور مجھ سے محبت رکھتے تھے۔ حتیٰ کہ سونیا بھی جس کو روزانہ درس دیتی تھی پہلے سے بالکل بدلی ہوئی معلوم ہوتی تھی۔ وہ میری حالت کو سمجھنے اور مجھے تسلی دینے کی کوشش کرتی۔ اور کبھی ناخوش ہونے کا موقع نہ دیتی تھی۔

سب میرے ساتھ ایسا ہی برتاؤ کرتے تھے۔ جیسا کہ میں خود ان کے ساتھ کرتی تھی۔ ان لوگوں کا خیال کرتے ہوئے جو مجھ سے ناراض تھے۔ اور اعتراف گناہ سے پہلے ان سے معافی مانگنا میرے لئے لازمی تھا۔ مجھے ایک نوجوان ہمسایہ خاتون یاد آئی۔ اب سے سال بھر پہلے چند مہمانوں کے سامنے میں نے اس کا مضحکہ اڑایا تھا۔ اور اُس دن سے اُس نے مجھ سے ملنا ترک کر دیا تھا۔ میں نے اس کو ایک خط لکھا۔ اس میں اپنے قصور کا اعتراف کیا۔ اور اس سے معافی چاہی۔ اُس خط کے جواب میں اس نے مجھے معاف کرتے ہوئے مجھ سے بھی معافی مانگی۔ جب میں نے ان چند سادہ الفاظ کو پڑھا۔ جن میں اس وقت عمیق اور دلکش معانی پوشیدہ تھے۔ تو میری آنکھوں سے اشک ہائے مسرت ٹپکنے لگے۔ اور جب میں نے اپنی ضعیف دایہ سے معافی مانگی، تو وُہ رونے لگی۔

میں نے اپنے دل سے پوچھا "آخر سب لوگ مجھ پر اس قدر مہربان کیوں ہیں۔ اور میں اس محبت کی کس طرح مستحق ہوں؟" غیر ارادی طور پر مجھے سرجیائی کی یاد آئی۔ اور میں عرصہ تک اس خیال میں محو رہی۔ میں اس کے خلاف کچھ نہ کر سکی۔ اور مجھ کو یہ غیر مناسب نہ معلوم ہوا۔ تاہم اس رات کی بہ نسبت جب کہ مجھے پہلی بار اس امر کا احساس ہوا تھا۔ کہ مجھے اس کے ساتھ محبت ہے۔ اب میرے خیالات بالکل مختلف تھے۔ اُس کے متعلق میرے خیالات ویسے ہی تھے جیسے کہ اپنے متعلق تھے۔ اور وہ فطرۃً میرے مستقبل سے وابستہ ہو گیا تھا۔

اس کی بزرگی کا خیال جو اس کی موجودگی میں میرے دل و دماغ پر مسلط رہتا تھا۔ بالکل مفقود ہو گیا تھا۔ میں اپنے آپ کو اس کا ہم پلہ سمجھنے لگی تھی۔ اور اس روحانی ترقی کی بدولت جو مجھے حاصل ہو چکی تھی۔ میں اس کا مزاج پورے طور پر سمجھ گئی تھی۔

اب تک جو غیر معمولی باتیں اسکے اندر نظر آتی تھیں اب وہ بالکل نمایاں اور ظاہر تھیں۔ وہ کہا کرتا تھا کہ "صرف دوسروں کے لئے زندہ رہنے میں حقیقی مسرت ہے۔ اب پہلی بار مجھے اس کا یقین ہوا۔ اور میں اس کے اس قول کی پورے طور پر موید ہو گئی۔ مجھے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ہم دونوں ایک غیر فانی اور حقیقی مسرت کے مالک ہونگے۔ (باقی پھر)

آنسو

اشک کہتا ہے بتاؤ تو بھلا کیا میں ہوں
چیستاں ہوں نہ پہیلی نہ معما میں ہوں

سر بہ سر رنج و غم و یاس کی تصویر ہوں میں
ہمہ تن حسرت و اندوہ و تمنا میں ہوں

عہدِ طفلی میں ملا داغِ یتیمی مجھ کو
اپنی پھوٹی ہوئی تقدیر کو روتا میں ہوں

دل کے ڈوبے ہوئے ارمان ہیں لاکھوں مجھ میں
لوگ قطرہ جسے کہتے ہیں وہ دریا میں ہوں

آئینہ مجھ کو سمجھتے ہیں وہ حیراں ہوں میں
آنکھ جس پر سے نہ اُٹھے وہ تماشا میں ہوں

مجھ سے جاں باز کو غربت ہے بساطِ شطرنج
جو نہ لوٹے کبھی واپس وہ پیادا میں ہوں

ہو گیا آگ سے پانی کا نکلنا ثابت
دل میں کچھ سوز ہو پیدا تو ہویدا میں ہوں

کوئی دم اور ہوں پھر خاک میں رل جاؤں گا
طفل سمجھو نہ مجھے عمر میں بوڑھا میں ہوں

ہو گا دُنیا میں نہ مجھ سا بھی کوئی تر دامن
اپنی ہی شرم و خجالت کا پسینا میں ہوں

نوکِ مژگاں پہ مجھے گردشِ قسمت لائی
فلکِ چشم کا دُمدار ستارا میں ہوں

شور فریاد و فغاں کیوں نہ مرے ساتھ رہے
آرزوئے دلِ مضطر کا جنازا میں ہوں

ننگ مخلوق ہوں میں سامنے کیونکر آؤں
جی میں آتا ہے کہ ہیرے کی کنی کھا جاؤں

وسعتِ چشم ڈراتی ہے بیاباں ہو کر
چبھتے ہیں موئے مژہ خارِ مغیلاں ہو کر

شمعِ ہستی کو بجھا دیتی ہے صرصر کی طرح
جنبشِ دستِ اجل جنبشِ مژگاں ہو کر

عالمِ یاس کے گوشوں میں لئے پھرتی ہے
گردشِ چشم مجھے گردشِ دوراں ہو کر

سامنے میرے ڈراتی مجھے مُنہ پھاڑ کے ہے
منزلِ ملکِ عدم چاکِ گریباں ہو کر

قفس موئے مژہ سے ہے رہائی مر کر
عمر کٹتی ہے مری قیدیِ زنداں ہو کر

آئینہ خانۂ عالم کو جو دیکھا میں نے
بن گیا آپ ہی آئینہ میں حیراں ہو کر

پانی سورج کو دیا کرتا ہوں ہندو بن کر　　　حج کیا کرتا ہوں کعبے کا مسلماں ہوکر

بارِ صد کوہِ الم کے میں برابر اُترا　　　چشمِ گریاں نے جو تولا کفِ میزاں ہوکر

گر پڑا آنکھ سے منت کشِ مژگاں نہ ہوا

رل گیا خاک میں شرمندۂ احساں نہ ہوا ●

مزرعۂ عیش کو میں آگ لگا دیتا ہوں　　　بجلیاں خرمنِ عشرت پہ گرا دیتا ہوں

میری چپ میں بھی وہ غوغائے قیامت ہے بھرا　　　سینکڑوں فتنۂ خوابیدہ جگا دیتا ہوں

کیا ہے ساون کی جھڑی میری جھڑی کے آگے　　　آبرو ابر کی پانی میں بہا دیتا ہوں

گر پڑوں چشمِ یتامےٰ سے اگر خاک پہ میں　　　کنگرہ عرشِ معلےٰ کا ہلا دیتا ہوں

میں برس جاؤں اگر ابرِ ندامت بن کر　　　حرف سب دفترِ عصیاں کے مٹا دیتا ہوں

میرا دربار زمانے میں ہے دُر بار ایسا　　　جھولیاں موتیوں سے بھر کے لٹا دیتا ہوں

گھر خدا کا نہ بچے اُٹھے جو طوفاں میرا　　　کعبۂ دل کی عمارت کو بٹھا دیتا ہوں

ابرِ رحمت مری ہر بوند مقرر سمجھو　　　شعلۂ برقِ جہاں سوز بجھا دیتا ہوں

بند کر دیتا ہوں دمِ تیغ دو دم کا دم میں　　　دمِ عیسیٰ کی طرح مردے جلا دیتا ہوں

لوگ اس واسطے غماز مجھے کہتے ہیں　　　جو چھپا رکھنے کی باتیں ہیں بتا دیتا ہوں

رازِ افشا نہ کروں یہ مرے بس کی نہیں بات　　　اپنے بدنام کنندوں کو دعا دیتا ہوں

رخ کے آئینے میں جس وقت نظر آتا ہوں

آپ ہی حسن پہ اپنے میں پھسل جاتا ہوں

غم نصیبوں کا غم و رنج میں غمخوار ہوں میں　　　دکھ میں ساتھی ہوں مصیبت میں مددگار ہوں میں

نہیں معراج سے کم نوکِ مژہ کی سولی　　　بزمِ عشاق میں منصور ہوں سردار ہوں میں

ہے کبھی تارِ مژہ رشتۂ تسبیح مرا　　　اور کبھی دوش پہ باندھے ہوئے زنار ہوں میں

میں کبھی آگ کلیجے کی بجھا دیتا ہوں　　　خرمنِ دل پہ کبھی برقِ شرر بار ہوں میں

زندگی بخش کبھی ہوں مَیں مسیحا کی طرح
اور کبھی نرگس بیمار کا بیمار ہوں مَیں

ژالہ باری ہے کبھی کشتِ اِمل پر میری
دامن دل پہ کبھی ابر گہر بار ہوں مَیں

بزم میں فرطِ خوشی کی مَیں علالت ہوں کبھی
اور کبھی دل کے جنازے کا عزادار ہوں مَیں

کام کرتا ہوں گھروں میں کبھی دُنیا والے
خانقاہوں میں کبھی زاہدِ دیں دار ہوں مَیں

کبھی اِک قطرہ ہے پانی کا حقیقت میری
کبھی اُمڈا ہُوا اِک قلزم ذخار ہوں مَیں

تیرے ہی فضل وکرم پہ ہے بھروسا یا رب
اِک خطا وار سیہ کار گنہ گار ہوں مَیں

نوشہ کچھ پاس نہیں اپنی ندامت کے سوا
آسرا کوئی نہیں ہے تری رحمت کے سوا

خون کی جھڑیاں لگاتا ہے جو ساون میرا
رات دن پھولا پھلا رہتا ہے گلشن میرا

بستی ہے حسرت وارمان کی دُنیا مجھ میں
قطرہ دریا ہے مرا دانہ ہے خرمن میرا

میرے طالب مجھے آنکھوں میں جگہ دیتے ہیں
سُرمۂ چشم عزیزاں ہے یہ جوبن میرا

بلبلِ گلشنِ رُخسار بنا کر حق نے
شاخِ مژگاں پہ بنایا ہے نشیمن میرا

موسیٰ مردمک دیدہ کا محبوب ہوں میں
جلوۂ طور بنا ہے رُخِ روشن میرا

ہیں وہ مقبولِ الٰہی ہوں کہ ہنگامِ دُعا
دم بھرا کرتے ہیں سب شیخ و برہمن میرا

رازِ ہستی مری فریاد سے ہوتا ہے عیاں
نغمہ ہے مردِ خُدا کے لئے شیون میرا

دُور اُس دل سے ہوں جو سخت ہے لوہے کی طرح
پایہ پہنچا نیگا کیا دیدۂ سوزن میرا

ہوچکیں صحبتیں پیغام قضا آ پہنچا
اب تو اے دستِ مژہ چھوڑدے دامن میرا

روتے والے دمِ آخر تو گلے مِل لوں مَیں
پھر تو ڈھونڈے سے بھی پائیگا نہ مدفن میرا

حیف کیا جلد ملا خاک میں میرا تن و توش
زندگی ختم ہوئی چشم زدن میں اے جوش

جوش ملسیانی

انتقام

راجکمار آہستہ آہستہ اُٹھا۔ اور قیدی پر ایک تند نگاہ ڈالکر بولا۔

"تم نے سُن لیا ہے نا؟ تم پر کیا الزام ہے؟ تم اس الزام کا کیا جواب دینا چاہتے ہو؟"

پابہ زنجیر قزاق کھلکھلا کر ہنس پڑا۔

"معدلت گستری کا تماشا ختم کر۔ مجھے اپنی قسمت کا فیصلہ اُسی وقت معلوم ہو گیا تھا۔ جب مَیں تیرے ہاتھوں میں گرفتار ہوا تھا۔ مَیں نے تیرے بھائی کو موت کی میٹھی نیند سُلا دیا۔ تو اس کے انتقام میں مجھے سزائے قتل دیگا۔ تو نے عدالت کی زبان میں ثابت کر دیا ہے۔ کہ مَیں قزاق اور قاتل ہوں۔ جس طرح آج مَیں تیرے قلعہ میں پابزنجیر ہوں۔ اگر تو میرے خیمہ میں اسی طرح لایا جاتا۔ تو مَیں تجھ پر وہی الزام ثابت کر سکتا تھا۔ جو تو نے آج مجھ پر ثابت کئے ہیں۔ مجھے معلوم نہ تھا۔ کہ مقتول تیرا بھائی ہے۔ ورنہ مَیں اُسے موت کے گھاٹ نہ اُتارتا۔ کیونکہ چھوٹا ڈاکو بڑے قزاق کی عزت کرتا ہے۔ لیکن میں اس عدم واقفیت کو اپنا شفیع نہیں بناؤنگا۔

جب ایک بھیڑیا مر جاتا ہے تو دوسرے بھیڑیے اس کی تکا بوٹی کر لیتے ہیں۔ اب مَیں تیرے ہاتھوں میں گرفتار ہوں۔ تیرا جی چاہے میرا سر قلم کر دے۔ یا میرے بدن کی بوٹی بوٹی اُڑا دے۔ جنگ کا انجام یہی ہوا کرتا ہے۔ اور مَیں تجھ سے اس کی شکایت نہیں کرتا۔ تیرے ساتھیوں کی تعداد زیادہ تھی۔ اس لئے تو میری جمعیت کو پریشان کر کے مجھے گرفتار کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ مجھے اس امر کا اطمینان ہے۔ کہ اگر تو مجھے سو دفعہ بھی قتل کر سکے تو تیرا بھائی زندہ نہ ہو سکیگا۔ اس لئے اس کھیل کو جو کئی گھنٹہ سے جاری ہے ختم کر اور میری سزا کا حکم سُنا۔ مَیں موت سے ہم آغوش ہونے کے لئے بالکل آمادہ ہوں۔"

قزاق کی اس تقریر کے بعد چند لمحہ عدالت پر سکون طاری رہا۔ پھر راجکمار نے دھیمی آواز میں کہا۔ "تمہاری سزا یہ ہے کہ ۱۵۔ جنوری کے دن تم کو کوٹھڑی سے نکالا جائیگا اور مقتل میں لیجا کر تمہارا سر قلم کر دیا جائیگا۔" یہ فقرہ ختم ہونے پر راجکمار نے قدرے توقف کیا۔ وہ کچھ اور بھی کہنا چاہتا مگر معاً اسے خیال آیا کہ رودادِ عدالت مہاراجہ صاحب کے سامنے پیش ہوگی۔ جن کا نمائندہ عدالت میں موجود ہے۔ روداد میں کوئی ایسی بات درج نہ ہونی چاہئے۔ جس سے

بُو تے انتقام آتی ہو۔ یا وحشیانہ بربریت پائی جاتی ہو۔ کیونکہ مہاراجہ ان باتوں سے سخت متنفر ہیں۔ یہ سوچکر راجکمار بیٹھ گیا۔

قزاق پھر کھلکھلایا۔ اُسکے خیال میں یہ سزا اتنی وحشتناک نہ تھی جتنی اُسے توقع تھی۔ اُس نے ساری عمر پہاڑوں میں بسر کی تھی۔ اُسے معلوم نہ تھا۔ کہ ریاست کی حکمت عملی میں تبدیلی ہو چکی ہے۔ اور مجموعۂ آئین میں سے وحشیانہ قوانین خارج کر دئے گئے ہیں۔ قزاق نے مضحکہ انگیز انداز سے کہا۔ "میں وعدہ پر پہنچ جاؤنگا۔ بشرطیکہ کوئی اور ضروری کام پیش نہ آگیا"۔

محافظ سپاہی قزاق کو اُس کی کوٹھڑی میں لے گیا۔

راجکمار نے مہاراجہ کے سفیر سے مخاطب ہوکر کہا "دیکھا آپ نے، کس قدر گستاخ ہے"

سفیر نے کہا۔ "ہاں حضور، وہ نہایت گستاخ ہے"۔

"میرے خیال میں میں نے نہایت رحمدلی کا سلوک کیا ہے"۔

"بیشک بحالت موجودہ اس کی سزا نہایت نرم ہے"

اودھم سنگھ ڈاکو کوٹھڑی میں پہنچا دیا گیا۔ جہاں سے اُس نے حسرتناک نگاہ وادی پر ڈالی۔ جو کوٹھڑی کی آہنی سلاخوں والے روشندان کے سامنے درخشاں تھی وہ جانتا تھا کہ قلعہ سے نکلنا دشوار ہے۔ وہ یہ بھی جانتا تھا کہ اگر بالفرض میں قلعہ سے نکل بھی گیا۔ تو پہاڑ کی بھول بھلیاں میں پھنس جاؤنگا۔ کیونکہ وہ ان دشوار گذار راستوں سے واقف نہ تھا۔ علاوہ بریں وادی کے مُنہ پر فوج کا شدید پہرہ تھا۔ اسکی اپنی فوج منتشر ہو چکی تھی۔ اس کے کئی جان نثار وفادار سپاہی قتل ہو چکے تھے یا گرفتار کر لئے گئے تھے۔ وہ زمین پر لیٹ گیا۔ اور فرار ہونے کی تدابیر پر غور کرنے لگا۔ کبھی وہ خیال کرتا۔ "راجکمار نے اتنی رحمدلی سے کیوں کام لیا ہے۔ مجھے تو دردناک عذاب کی توقع تھی۔ ضرور دال میں کچھ کالا ہے۔" کبھی سوچتا۔ "اب مقدمہ کا کھیل ختم ہو چکا ہے شاید اب مجھے بھُوکوں ہلاک کرینگے" لیکن اس کے اس خیال کی تردید، داروغہ نے پہلے سے بھی زیادہ خوشگوار کھانا لاکر دی

اودھم سنگھ نے داروغہ سے نہایت لجاجت آمیز لہجہ میں کہا۔ "آپ کا نام کیا ہے؟"

داروغہ نے جوابدیا۔ "میرا نام سردان سنگھ ہے"۔

کیا تم کو معلوم ہے مجھے ۱۵۔ جنوری کو قتل کیا جائیگا؟"

"سنا تو ایسا ہی ہے"

"کیا اُس وقت تک تم ہی مجھ پر داروغہ رہوگے؟"

"میں نہیں کہہ سکتا۔ یہ راجکمار کی مرضی پر منحصر ہے۔ چاہے تو وہ مجھے آج ہی ہٹا دے۔ مگر مجھے زیادہ باتیں کرنے کی اجازت نہیں ہے۔ اس لئے اب مجھے واپس جانا چاہیے"۔

"میں اُن لوگوں کو کافی معاوضہ دیا کرتا ہوں۔ جو وقت

پر میرے کام آئیں۔ افسوس ہے کہ اس وقت میں بالکل بے بس ہوں۔ ورنہ تمہارے نیک سلوک کی داد دیتا۔"

"اس کی چنداں ضرورت نہیں ہے۔ مجھے مہاراجہ صاحب کی طرف سے کافی تنخواہ ملتی ہے۔"

"درست ہے۔ لیکن ایک ڈاکو کا انعام تمہاری آنیوالی نسلوں کو بھی مستغنی کر دیتا۔"

سرون سنگھ کی آنکھیں انعام کا نام سنکر چمک اُٹھیں ایک لمحہ بعد اُس نے نہایت خوفزدہ ہو کر کہا۔" اوہو! مجھے آئے کتنی دیر ہو گئی۔ کہیں اُن کو شک نہ پڑ جائے۔ ابھی میری نگرانی ہوتی ہے۔ چند روز میں نگرانی ہٹ جائیگی تو اس معاملے پر زیادہ تفصیل سے گفتگو کر سکینگے۔" یہ کہہ کر داروغہ جھٹ کوٹھڑی سے نکل گیا۔

قزاق جی میں ہنسا۔ کہ سرون سنگھ رشوت سے بالا تر نہیں ہے۔ جب نگرانی اُٹھ جائیگی تو پھر تذکرہ کریگا۔

آخرکار چند روز بعد داروغہ سے اودھم سنگھ نے کہا۔" اگر میں ایک دفعہ قلعہ سے نکل جاؤں۔ تو پھر میں اپنا راستہ ڈھونڈ لونگا۔"

مجھے تو یقین نہیں آتا کہ آپ قلعہ سے نکل سکتے ہیں۔ بالفرض ایسا ہو بھی تو پہاڑوں میں سرگرداں پھرتے رہو گے اور راجکمار کی فوجوں کے جنگل میں گرفتار ہو جاؤ گے۔ کیونکہ تم پہاڑوں کے راستوں سے واقف نہیں۔ بھلا تمہیں پہاڑی سرنگ کا پتہ ہے؟"

اودھم سنگھ نے اظہار حیرت کرتے ہوئے کہا۔" کونسی سرنگ؟"

"ان پہاڑوں کے درمیان کی سرنگ"

"اگر ہوتی تو مجھے معلوم نہ ہوتی؟"

"بس تم کو اتنا بھی معلوم نہیں۔ اُسے بنے صدیاں ہو چکی ہیں۔ اگر قلعہ غنیم کے ہاتھوں میں چلا جاتے تو قلعے کے تمام باشندے اس سرنگ کے راستے پہاڑیوں کے پار محفوظ مقام پر پہنچ سکتے ہیں۔ اس کا راستہ بہت کم لوگوں کو معلوم ہے۔ اس کے مُنہ پر جھاڑیاں وغیرہ اُگائی گئی ہیں۔ تاکہ کسی کو اس سرنگ کا پتہ نہ لگ سکے۔ اگر میں تم کو اس کا پتہ دُوں تو مجھے کیا دو گے؟"

اودھم سنگھ نے حیرت سے سرون سنگھ کو دیکھا۔ اور ناقابل یقین لہجہ میں کہا۔" جو کچھ میرے پاس ہے۔ سب تم کو دے دُونگا۔"

"تمہارے پاس کتنی دولت ہے؟"

"اسقدر ہے۔ کہ تم ساری عمر مہاراجہ کی ملازمت کرو۔ پھر بھی جمع نہ کر سکو گے۔"

"کیا تم مجھے اس کا پتہ دو گے۔ پیشتر اس کے کہ میں تم کو قلعہ سے باہر نکالوں اور سرنگ کا پتہ دوں؟"

ڈاکو نے کہا۔" ہاں"

"کیا تم مجھے اس کا پتہ ابھی دو گے ؟"

"نہیں! کل تم کاغذ اور قلم دوات لاؤ۔ مَیں تم کو نقشہ بنا کر دکھا دُونگا۔"

دوسرے دِن داروغہ نقشہ بنوا کر لے گیا۔ تیسرے دن قزاق اودھم سنگھ نے پُوچھا۔

"کیا تم کو خزانہ مِل گیا ؟"

داروغہ نے جوابدیا۔ "ہاں"

"کیا تم اب اپنا وعدہ پُورا کرو گے ؟ کیا تم مجھ کو اس قلعہ سے باہر نکال دو گے ؟"

"ہاں۔ مَیں تم کو قلعہ سے باہر نکال دُونگا۔ بلکہ سرنگ کے مُنہ تک لے جاؤنگا۔ اس کے بعد تم کو اپنا رستہ آپ تلاش کرنا پڑیگا۔"

ڈاکو نے کہا۔ "یقیناً جب مَیں اس بدبخت وادی سے نکل جاؤنگا۔ تو پھر سارے راجستھان کا مقابلہ کر سکوں گا۔ کیا تمہارے پاس رسّی ہے ؟"

داروغہ نے کہا۔ "رسّی کی ضرورت نہ پڑیگی۔ میں آدھی رات گئے۔ تمہارے پاس آؤنگا۔ اور چور راستے سے تم کو اس قلعہ سے باہر لے جاؤنگا۔ اور ہمارے فرار کی خبر صبح تک کسی کو معلوم نہ ہوگی۔"

چنانچہ آدھی رات گُزرے داروغہ آیا۔ اور اودھم سنگھ کو عجیب وغریب پیچیدہ راستوں سے رہنمائی کرتا ہوا لیجانے لگا۔ گھنٹہ بھر میں وہ قلعہ سے باہر نکل گئے۔ باہر پُہنچکر قزاق نے اطمینان کا سانس لیا۔

قزاق نے نہایت بے صبری سے پُوچھا۔ "وہ سرنگ کہاں ہے ؟"

"ہش!" داروغہ نے آہستہ سے اس کے کان میں کہا۔ "قلعہ سے تھوڑی دُور ہے مگر اس راستے میں گزگز پر سنتری کھڑے ہیں۔ ہم براہ راست سرنگ تک نہیں پُہنچ سکتے اس لئے ہمیں اس پہاڑ کے اُوپر سے ہوکر وہاں پُہنچنا ہوگا۔"

قزاق نے حیرت زدہ ہو کر کہا۔ "کیا ہمیں ساری وادی کو عبور کر کے واپس اس سرنگ کے مُنہ پر آنا ہوگا؟ اور چند گز فاصلہ کی خاطر اتنا چکّر کاٹنا پڑیگا ؟"

داروغہ نے تسلّی دینے والے لہجہ میں کہا۔ "اس کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے۔ اگر تمہیں براہ راست جانا ہے تو اکیلے اس راستے سے چلے جاؤ۔ مگر مَیں تمہاری گرفتاری کا ذمہ دار نہ ہونگا۔"

"خیر مَیں تم پر بھروسہ کرتا ہوں جہاں چاہو مجھے لیچلو۔"

وہ آہستہ آہستہ پہاڑی کی ترائی کی طرف چلے۔ اور ایک چھوٹی سی ندی کو عبور کرنے لگے۔

ایک دفعہ اودھم سنگھ ندی میں پھسل گیا۔ سردن سنگھ نے بمشکل اُسے سنبھالا۔ اب صبح نکل آئی تھی۔ مگر قلعہ سے ابھی کوئی خبر ہی نہ سُنی گئی تھی۔ جب دِن تھوڑا سا اور چڑھا

تو وہ رینگتے ہُوئے ایک غار میں گئے۔ وہاں سرون سنگھ نے اودھم سنگھ کو کھانا کھلایا۔ اور خود بھی کھایا۔

قزاق نے پوچھا "ہمیں سرنگ کے مُنہ تک پہنچنے میں کتنے روز لگے۔ تو ہم کھانا کہاں سے کھائینگے؟"

"مَیں نے اس کا انتظام کرلیا ہے۔ جہاں جہاں ہم جائینگے۔ وہاں وہاں میں نے خفیہ طور پر اس کا بندوبست کر رکھا ہے۔ جب تم سو جایا کروگے تو مَیں کھانا لے آیا کرونگا۔"

"لیکن اگر تم کو کسی نے پکڑ لیا۔ تو پھر مَیں کہاں جاونگا؟ کیا تم اب مجھے بتا دوگے کہ مَیں سرنگ کا مُنہ کس طرح تلاش کروں۔ مَیں تم کو خزانہ کا پتہ دے چکا ہوں۔ اس طرح تم سرنگ کا پتہ دے دو۔"

سرون سنگھ نے چند لمحہ غور کرکے کہا۔ "ہاں میرے خیال میں یہ محفوظ راستہ ہے۔ اس ندی کے کنارے کنارے جاکر جہاں یہ ندی مشرق سے آنے والی ندی سے ملتی ہے۔ وہاں پہاڑیوں میں ایک آبشار گرتا ہے۔ تم اس پاس کی جھاڑیوں کو صاف کر ڈالوگے۔ تو سرنگ کا مُنہ برآمد ہو جائیگا۔ اس سرنگ میں جاتے جاتے جب تم دوسرے رُخ کے قریب پہنچو۔ تو دروازے کی چٹخنی اندر سے لگی ہُوئی پاؤگے۔ اُسے اُتار کر باہر نکل جانا۔"

اتنے میں قلعہ سے گھنٹوں کی آواز بلند ہوئی۔ شاید کوئی قیدی فرار ہو گیا ہے۔ ہر طرف سوار دوڑنے لگے اور دوپہر سے پہلے ہر جگہ اضطراب کا عالم طاری ہو گیا۔ جھاڑیوں اور جنگلوں میں سپاہی اکڑوں اور کبڑے ہو ہو کر مفرور کی تلاش میں مصروف ہو گئے۔ دو سپاہی تو ان کے اسقدر قریب پہنچ گئے۔ کہ اُن کی باتیں صاف سُنائی دینے لگیں۔

"کیا یہاں پاس ہی کوئی غار نہیں ہے؟ آؤ تو بھلا اس میں تلاش کریں۔"

"نہیں وہ اتنی جلدی یہاں کس طرح پہنچ سکتا ہے؟"

"کیوں۔ وہ آدھی رات گئے بھاگا ہوگا۔"

"آدھی رات گئے سرون سنگھ کو اس کوٹھڑی کی طرف جاتے دیکھا گیا تھا۔ اس لئے وہ اُس وقت نہیں بھاگ سکا ہوگا۔"

اس جواب سے اُس کا ساتھی مطمئن ہو گیا۔ خیر گزری کہ دونوں واپس چلے گئے۔ اور مفرور گرفتاری سے بال بال بچ گئے۔ مگر قزاق کا رنگ زرد تھا۔ اور اس میں ہلنے کی طاقت نہ تھی۔ آخر اس کے ساتھی نے اُسے ڈھارس دلائی۔ اور وہ آگے روانہ ہُوئے۔

آئندہ سفر میں دونوں مفرور کئی مرتبہ راجکمار کے فرستادہ سپاہیوں کے جنگل میں پھنستے پھنستے بچے۔ گرفتاری کے خوف۔ بھوک۔ پیاس اور امید و بیم کی کشمکش نے یہ اثر دکھایا۔ کہ لحیم شحیم قزاق سوکھ کر قاق ہو گیا سردی کی شدت اور بارش نے رہے سہے اوسان بھی

کھو دیتے۔ ہر آباد جگہ ان کے لئے خوف و بیم سے بھری ہوئی معلوم ہوتی تھی۔

آخر کار ایک شام کو وہ آبشار کے قریب پہنچ گئے۔ جس کی دھیمی دھیمی آواز ایک نغمہ سیال کا لطف دے رہی تھی۔ اور سورج کی رخصت ہونے والی شعاعیں آبِ مضطرب پر طرح طرح کے رنگ پیدا کر رہی تھیں۔ طیور چہچہاتے ہوئے اپنے اپنے گھونسلوں کو جا رہے تھے۔

رات اُنہوں نے غار میں گزاری اور صبح کو جب آفتاب جہاں تاب نے پہاڑوں کی اوٹ سے سر نکالا اور اپنی طلائی شعاعوں سے خاکدانِ دنیا کو مطلا کرنے کے بعد اُس پر نقرئی روشنی سے رداتے نور پہنائی۔ تو قزاق آنکھیں ملتا ہوا اُٹھا۔ اور اپنے ساتھی سے کہنے لگا۔

"سرون سنگھ اُٹھو! سورج نکل آیا۔ چلو سرنگ تک پہنچیں۔"

سرون سنگھ نے یاس انگیز لہجہ میں کہا۔ "مَیں تو خستہ تن ہو گیا ہوں تھکان کے باعث میری بوٹی بوٹی درد کرتی ہے۔ مَیں تو ایک قدم بھی نہیں چل سکتا۔"

"یہ نا امیدی کیوں ہے۔ اب تو ہم پہنچ ہی گئے ہیں۔"

"نہیں فاصلہ اُس سے زیادہ ہے۔ جتنا تم خیال کرتے ہو۔ علاوہ بریں ہم قلعہ کے عین سامنے ہیں۔ کیا تم اب یہ چاہتے ہو کہ ہماری مصیبت کا خاتمہ ہونے لگا ہے۔ تو کسی نئی مصیبت کا آغاز ہو جائے۔ تمہیں یہ فراموش نہ کرنا چاہیئے۔ کہ تمہارا سر مطلوب ہے۔ اور آج تاریخ کونسی ہے؟"

قزاق نے سرون سنگھ سے مخاطب ہو کر پوچھا۔

"کیا تاریخ ہے؟"

"آج ۱۵۔ جنوری ہے۔ اس روز تمہیں قتل کیا جانا تھا۔"

اودھم سنگھ کا سانس اندر کا اندر اور باہر کا باہر رہ گیا۔ خطرے نے اُسے نہایت بزدل بنا دیا تھا۔ اب وہ کانپ رہا تھا۔ حالانکہ سزائے موت کا حکم اُس نے ہنستے ہوئے سُنا تھا۔ آخر اُس نے دل کڑا کر کے پوچھا۔ "تمہیں یہ کس طرح معلوم ہے کہ آج پندرہ تاریخ ہے۔"

سرون سنگھ خاموش رہا۔ اور چند لمحوں کے بعد بولا "مَیں تمہارے جیسا طاقتور نہیں طاقتور نہیں ہوں اگر سہ پہر تک مجھے یہاں آرام لینے دو، تو میں سرنگ تک پہنچنے کے لئے آخری کوشش کرنے کو تیار ہوں۔"

اودھم سنگھ نے کہا۔ "بہت بہتر۔"

دونوں وہاں لیٹ گئے۔ اور آبشار کی مدھم موسیقی نے انہیں اپنے خیالات میں غرق کر دیا۔ ناگاہ اودھم سنگھ نے سرون سنگھ سے پوچھا۔ "تم نے خزانہ کیا کیا؟"

سرون سنگھ اس ناگہانی سوال سے سٹ پٹایا۔ اور اُس نے کہا۔ "مَیں نے خزانہ دیکھا اور دیکھ کر وہیں چھوڑ آیا۔ بعد میں کسی روز جاؤنگا۔ اور جاکر لے آؤنگا۔" ڈاکو یہ سُنکر خاموش ہوگیا۔ مگر سرون سنگھ کے لئے یہی بات موت کا فتوےٰ تھی۔ کیونکہ اودھم سنگھ نے دل میں تہیّہ کرلیا تھا۔ کہ جونہی سُرنگ کے دوسرے سرے پر پہنچونگا۔ سرون سنگھ کو قتل کرکے خزانہ پر پھر قبضہ کرلونگا۔

دوپہر کے بعد وہ غار سے نکلے۔ اور دبکے دبکے جھاڑیوں کی اوٹ لیتے ہُوئے پہاڑ کی دوسری طرف نیچے اُترے۔ تین بجے وہ آبشار کے پاس پہنچے اور بمشکل عبور کیا۔

اودھم سنگھ نے کہا۔ "اہاہا! یہ آخری منزل ہے۔ اب سُرنگ تلاش کرنی چاہیئے۔"

آبشار کا پہلو انہیں قلعہ کی طرف سے چھپائے ہُوئے تھا مگر سرون سنگھ نے اودھم سنگھ کو توجہ دلائی۔ کہ وادی کی طرف سے ہم پر نگاہ پڑ سکتی ہے۔

اودھم سنگھ نے بے باکانہ انداز سے کہا۔ "اب کیا پرواہے؟ اب جسقدر جلد ہو سکے سرنگ کا مُنہ تلاش کرنا چاہیئے۔"

"سرون سنگھ نے اِدھر اُدھر ہاتھ پاؤں مارے۔ اور آخرکار ایک جگہ سے چند جھاڑیاں ہٹائیں اور گھاس اُکھاڑ پھینکی۔ نیچے لکڑی کے تختے نظر پڑے۔ جن کے ہٹانے سے ایک سوراخ رونما ہُوا۔ جس میں ایک آدمی بآسانی داخل ہو سکتا تھا۔

سرون سنگھ نے ایک طرف کھڑے ہوکر کہا۔ "تم آگے چلو۔"

اودھم سنگھ نے سر ہلاتے ہُوئے کہا۔ "نہیں تم راستہ جانتے ہو تم پہلے چلو۔ تم یہ خیال نہ کرو کہ میں تم کو صدمہ پُہنچانا چاہتا ہوں۔ دیکھو میں بالکل غیر مسلح ہوں۔"

"مگر مَیں تو ہرگز آگے نہ جاؤنگا۔ جب مَیں نے تم کو بتایا تھا کہ خزانہ ہنوز پہاڑی میں ہے۔ تو تمہاری نگاہیں اچھی نہ تھیں۔ مَیں تسلیم کرتا ہوں۔ کہ مجھے تم پر بھروسہ نہیں ہے۔"

"اچھا یونہی سہی مَیں آگے چلتا ہوں۔" یہ کہہ کر اودھم سنگھ اس کے پیچھے پیچھے ہولیا۔

تھوڑی دُور آگے جاکر سرنگ فراخ ہوگئی۔ وہاں آدمی کھڑا ہوکر چل سکتا تھا۔

سرون سنگھ نے کہا۔ "بس ٹھہرو۔ اب وہ دروازہ آگیا ہے۔"

"ہاں تم نے ایک دروازہ کا ذکر کیا تھا۔ اس پر قفل کیوں لگایا گیا ہے؟"

قفل نہیں چٹخنی لگی ہُوئی ہے۔ جو بآسانی کھول جاسکتی ہے۔"

قزاق نے پھر اصرار سے پوچھا۔ "دروازہ کیوں لگایا گیا ہے۔"

"یہ ہوا کی سیدھی رو کو روکنے کے لئے ہے۔ تاکہ ادھر کے رُخ تختے نہ اڑ جائیں۔"

"اہلو! چٹخنی کھل گئی" قزاق نے چٹخنی اتارتے ہوئے کہا دروازہ کھل گیا۔ سرون سنگھ نے جھٹ قزاق کو دھکا دیکر اندر داخل کر دیا۔ اور دروازہ خود بخود بند ہو گیا۔ قزاق کی آنکھیں خیرہ ہو گئیں۔ کیونکہ کمرہ روشنی سے بقعہ نور بنا ہوا تھا۔ اور ایک درجن کے قریب آدمی مشعلیں لئے کھڑے تھے۔ کمرہ کے وسط میں لکڑی کا ایک ٹکڑہ سیاہ کپڑے میں منڈھا پڑا تھا۔ اور اُس کے پاس جلاد برہنہ تلوار لئے کھڑا تھا۔ اور راجکمار اپنے مصاحبوں کے حلقہ میں طلائی چوکی پر بیٹھا تھا۔

راجکمار نے طنزاً کہا۔ "تم عین وقت پر آگئے۔ ہم تمہارا ہی انتظار کر رہے تھے۔"

پُورن سنگھ ہُنر

اقسامِ غم

طالبِ علم و ادب کا غم نہیں ہے غم میرا — جو کہ رشک آمیز ہے
اور غم میرا نہیں غم زمزمہ پرداز کا — جو کہ وحشت خیز ہے
غم نہیں وہ غم میرا جو دل میں درباری کے ہے — جس میں ہے بوئے غرور
غم سپاہی کا نہیں وہ غم جو میرے دل میں ہے — ہے ہوس اس میں ضرور
غم جو میرے دل میں ہے قانون داں کا غم نہیں — جو کہ دانایانہ ہے
غم نہیں وہ غم مرا دل میں حسینہ کے جو ہے — اور جو معشوقانہ ہے
غم مرا عاشق کے دل کا غم بھی تو ہرگز نہیں — جس میں یہ سب صفت ہیں
(پھر یہ کیسا غم ہے جس کا راز کچھ کھلتا نہیں — آہ خود حیراں ہوں میں!)

محروم

آخری ارمان

مارس لیبلانک کے افسانے جیوش لیمپ کا ترجمہ

پہلا باب

(۵)

اس شام کو ولسن اُس شخص کی مانند سکون و راحت کے ساتھ بستر پر گیا جو اپنا فرض پُورے طور پر انجام دے چکا ہو۔ اور جسے سونے سے قبل کوئی کام باقی نہ رہ گیا ہو۔ اس لئے اس کو جلد نیند آ گئی۔ اور وہ دلچسپ خواب دیکھنے لگا جس میں وہ لوپن کا خود ہی پُوری کامیابی کے ساتھ تعاقب کر رہا تھا۔ اور اس کو گرفتار ہی کرنے والا تھا۔ یہ خیال اُس پر اس تیزی کے ساتھ قائم ہُوا کہ وہ بیدار ہو گیا۔

کوئی شخص اس کا بستر چھو رہا تھا۔ اس نے اپنا طپنچہ سنبھالا۔

"لوپن! دوسری حرکت ہُوئی اور مَیں نے فیر کیا!"

"ہوش میں آؤ، بڈھے خرانٹ ہوش میں۔"

"آہا مسٹر شیر آپ ہیں؟ کیا کوئی ضرورت ہے؟"

"مجھے ذرا تمہاری نظروں کا امتحان درکار ہے۔ اُٹھو۔۔۔۔"

وہ اس کو کھڑکی کے پاس لے گیا۔

"اس طرف دیکھو۔۔۔۔ کٹہرے سے اور آگے۔۔۔۔"

"پارک میں؟"

"ہاں، تمہیں کوئی چیز نظر آتی ہے؟"

"نہیں، کچھ بھی نہیں۔"

"دوبارہ کوشش کرو۔ مجھے یقین ہے کہ تم کوئی چیز دیکھ رہے ہو۔"

"ہاں، مَیں دیکھتا ہوں، ایک سایہ۔۔۔ نہیں! دو۔"

"میرا بھی یہی خیال ہے۔ کٹہرے کے مقابل۔ دیکھو، وہ حرکت کر رہے ہیں۔ ہم کو ذرا بھی وقت ضایع نہ کرنا چاہئے۔"

ٹٹول کر رسی کو پکڑے ہُوئے دونوں زینے سے اُترے اور ایک کمرہ میں جو باغ کی طرف کُھلتا تھا۔ داخل ہُوئے۔ شیشوں سے اب بھی اُن کو وہ دونوں سائے اُسی مقام پر

نظر آرہے تھے۔

"یہ عجیب معاملہ ہے" شیر نے کہا۔ "مجھے مکان میں شور وغل سا معلوم ہوتا ہے"

"مکان میں؟ غیر ممکن؟ ہر شخص خواب میں ہے۔"

"سنتے اگرچہ......"

اسی اثنا میں ایک ہلکی سیٹی کٹھرے کے قریب سنائی دی۔ اور انہوں نے ایک مدھم روشنی مکان سے آتی ہوئی دیکھی۔

"ڈی اسلی ویل نے ضرور اپنے کمرہ میں روشنی کی ہے" شیر نے کہا۔ "ہم لوگوں کے اوپر انہیں کا تو کمرہ ہے۔"

"تو کیا شیر واقعی یہ انہیں کی آواز تھی" ولسن نے کہا۔

"شاید وہ چھجے کی نگرانی کر رہے ہیں" پہلے سے بھی زیادہ آہستگی سے دوسری سیٹی بجی۔

"شیر نے پریشان کن لہجہ میں کہا" میں نہیں سمجھ سکتا میں نہیں سمجھ سکتا"

ولسن بولا "اور نہ میں ہی سمجھ سکا"

شیر نے کنجی گھمائی۔ دروازہ کی چٹخنی ہٹائی اور آہستہ سے اس کو کھول دیا۔ اتنے میں تیسری سیٹی بجی۔ اس مرتبہ کچھ تیز مگر دوسری آواز اور ان کے سر کے اوپر کی آواز ذرا بلند اور تیز ہو گئی۔

شیر نے آہستہ سے کہا۔ "یہ تو ایسی سنائی دیتی ہے گویا خاص کمرہ کے برآمدہ میں ہے"

اس نے اپنا سر دروازہ کے شیشوں سے نکالا۔ لیکن فوراً ہی ایک گہرے سکوت کے ساتھ اندر کھینچ لیا۔ ولسن نے بھی بعد ازاں باہر کی طرف دیکھا۔ ان کے قریب ایک سیڑھی برآمدہ کے ستون سے لگی کھڑی تھی۔

شیر نے کہا۔ "بخدا یہاں کمرۂ خاص میں ضرور کوئی ہے بس بس اسی کی آواز تھی۔ جلدی کرو۔ ہم کو پہلے سیڑھی علیحدہ کرنا چاہیے"

لیکن اسی اثنا میں ایک شکل اوپر سے اتری۔ سیڑھی ہٹالی گئی۔ اور وہ شخص جو اسے لیجا رہا تھا۔ تیزی سے کٹھرے کی طرف لپکا۔ جہاں اس کے معاون انتظار کر رہے تھے۔ شیر اور ولسن باہر جھپٹے۔ یہ اس شخص کے پاس ٹھیک اس وقت جب وہ سیڑھی جنگلے کے مقابل رکھ رہا تھا پہنچ گئے۔

دوسری جانب سے دو فائر ہوئے۔

"زخمی ہو گیا۔ شیر نے چلا کر کہا۔

"نہیں" ولسن نے جواب دیا۔

اس نے اس شخص کو مضبوط پکڑ لیا۔ اور اسکے گرانے کی کوشش کی لیکن وہ گھوما۔ اور اپنے مقابل کو ایک ہاتھ سے مضبوط پکڑ کر دوسرے سے پورا چاقو اس کے سینہ میں بھونک دیا ولسن نے آہ کی۔ لڑکھڑایا اور گر پڑا۔

"لعنت" شیر نے چیخ کر کہا۔ اگر انہوں نے اسے قتل

کیا ہے تو میں اُن کے ٹکڑے اُڑا دونگا۔"

اُس نے ولسن کو گھاس پر لٹا دیا۔ اور سیڑھی کی طرف دوڑا لیکن وہ شخص وہاں سے فرار ہوکر اپنے مددگاروں کے ساتھ جھاڑیوں میں ہوکر بھاگا جا رہا تھا۔

" ولسن، ولسن، یہ زخم کاری تو نہیں ہے۔ خدارا کہہ بھی دو کہ معمولی خراش ہے۔"

مکان کا دروازہ یکبارگی کھُلا۔ اور سب سے آگے ایم۔ ڈی امبلی ویل ملازموں کے ساتھ جو شمعیں لئے ہوئے تھے۔ دکھائی پڑا۔

" یہ کیا معاملہ ہے" بیرن نے چلاّ کر پوچھا " کیا ولسن صاحب زخمی ہو گئے ؟ "

" نہیں! صرف ایک ہلکا زخم" شیر نے اپنے دل کو تسکین دیتے ہُوئے جواب دیا۔ ولسن کی کثرت سے خون جاری تھا۔ اور اس کے چہرے پر موت کی سی زردی چھائی ہُوئی تھی۔ بیس منٹ بعد ڈاکٹر نے بتلایا۔ کہ صرف چوتھائی انچ چاقو کی نوک سینہ میں گھُس گئی ہے۔

" چوتھائی انچ! ولسن ہمیشہ سے ایک خوش نصیب ہستی ہے" شیر نے واقعات حاضرہ پر غور کرتے ہُوئے رقیبانہ انداز سے کہا۔

" خوش نصیب اور قسمت والا۔" ڈاکٹر نے سنجیدگی سے کہا۔

" بیشک اُس کے مضبوط قویٰ اُسے بہت جلد صحتیاب بنا دیں گے۔"

" صرف چھ ہفتہ بستر علالت پر رہنے کے بعد دو ہفتہ کے اندر اندر کامل صحت ہو جائیگی۔"

" زیادہ عرصہ نہیں"

" بیشک۔ اب اگر کوئی پیچیدگی آپڑے تو اور بات ہے"

" مگر سوال تو یہ ہے کہ پیچیدگی آئے ہی کیوں"

پُورے اطمینان کے بعد شیر ایم۔ ڈی امبلی ویل کے پاس کمرۂ خاص میں آیا۔ اس مرتبہ خفیہ آنے والے نے سابقہ متانت سے کام نہیں لیا تھا۔ اُس نے بلا تکلف جواہرات سے مرصع ہلاس کی ڈبیا۔ بڑے بڑے موتیوں کے ہار اور عام چیزوں کو جو ایک باعزت نقب زن کی جیب میں آسکتی تھیں۔ چُرا لیا تھا۔ کھڑکی ابتک کھُلی تھی۔ جس کا ایک شیشہ نہایت صفائی سے کاٹا گیا تھا۔ دِن کی مختصر تفتیش سے یہ پتہ چلا کہ سیڑھی زیر تعمیر مکان سے آئی۔ اور چور بھی ضرور اسی راستہ سے آئے۔

ایم۔ ڈی امبلی ویل نے کسی قدر تُرش لہجہ میں کہا۔" مختصر یہ ہے کہ جیوش لیمپ کی چوری کی بجنسہٖ نقل ہے"

" ہاں، اگر پہلی واردات میں ہم پولیس کے ہم خیال بن جائیں۔"

" ہائیں! کیا آپ اب بھی اس کو ماننے کے لئے تیار

نہیں ہیں؟ کیا اس دوسری چوری نے آپ کے پہلے خیال کی تردید نہیں کی؟"

"اس کے برخلاف یہ میرے خیال کو اور زیادہ تقویت دیتی ہے۔"

یہ قابل قیاس نہیں معلوم ہوتا۔ آپ کے پاس کافی ثبوت موجود ہے۔ کہ گزشتہ شب کی چوری کسی بیرونی شخص نے کی ہے لیکن بایں ہمہ آپ کا یہ خیال ہے۔ کہ جیوش لیمپ کی چوری ہمارے آدمیوں میں سے کسی نے کی ہے؟"

"مکان ہی کے کسی رہنے والے نے؟"

"آخر آپ کس طرح یقین دلاتے ہیں؟"

"میں کچھ کہنا نہیں چاہتا۔ مانشیور، میں نے دو باتیں قائم کی ہیں۔ جو ظاہرا ایک دوسرے سے ملتی جلتی ہیں۔ اب میں ان دونوں پر علیحدہ علیحدہ غور کر کے صرف اس درمیانی کڑی کو دریافت کرنے کی کوشش کر رہا ہوں۔ جس سے دونوں کا سلسلہ مل جائے۔"

اس کا ثبوت مدلل اور اس کی تحقیقات ایسی زبردست معلوم ہوتی تھی۔ کہ بیرن لاجواب ہوگیا۔

"اچھا۔ اب ہمیں کمشنر پولیس کو اطلاع کرنے دیجئے۔"

"کبھی نہیں! انگریز سراغرساں نے چلا کر کہا۔ ہرگز نہیں، خواہ کچھ بھی ہو! پولیس صرف اس لئے ہے کہ جب ضرورت ہو تو ہم اسے طلب کریں۔"

"پھر یہ فیر۔۔۔؟"

"فیروں کی کچھ پروا نہ کیجئے!"

"آپ کے دوست کا معاملہ؟"

"میرا دوست صرف زخمی ہوگیا ہے۔۔۔۔ ڈاکٹر سے کہتے خاموش رہے۔۔۔۔ پولیس کے متعلق تمام ذمہ داریاں میں اپنے سر لے لونگا۔"

(۶)

دو دن بلا کسی واردات کے گزر گئے۔ جس میں شیر نے نہایت انہماک۔ ہوشیاری اور تن دہی سے معاملات کی تحقیق کی۔ جو اس دن کے دلیرانہ حملہ سے پیدا ہوگئی تھی۔ اور جو اس کی آنکھوں کے سامنے واقع ہوا۔ اور یہ اس کے روکنے کے لئے کچھ بھی نہ کر سکا۔ اس نے باغ اور مکان کی تلاش بہت محنت سے کی۔ نوکروں سے پتہ لگایا۔ باورچیخانہ اور اصطبل کی بہت دیر تک دیکھ بھال کی۔ تاہم اسکو رتی بھر پتہ نہ چلا۔ پھر بھی اس نے ہمت نہ ہاری۔

"جس کو میں تلاش کر رہا ہوں۔ ضرور اسکا پتہ لگاؤنگا۔" اس نے خیال کیا۔" اور اس کو میں بھیں پاؤنگا۔ یہ اس قسم کا سوال نہیں ہے۔ جیسا کہ سنہری بال والی خاتون کے قصہ میں تھا خفیہ راستوں سے سفر با پُر اسرار طریق پر کسی نامعلوم جگہ پر پہنچنا۔۔۔۔ بلکہ اس مرتبہ میں خود میدانِ جنگ میں ہوں۔ دشمن پوشیدہ اور نظر فریب تو پن نہیں ہے۔ بلکہ

گوشت و خون کا ایک مجسمہ ہے۔ جو اس مکان کی چار دیواری کے اندر گھومتا ہے۔ مجھ کو ذرا سا پتہ چل جائے۔ بس پھر میں سمجھ لونگا کہ مجھے کیا کرنا چاہیے"

وہ ذرا سا واقعہ جس سے وہ اہم نتائج نکالکر اپنی زبردست ذہانت سے جیوش لیمپ کی پُر اسرار چوری کو سراغرسانی کے نقطۂ نظر سے کامیاب بنانے کا خواہشمند تھا۔ ۔ ۔ ایک ایسا واقعہ تھا۔ ۔ ۔ ۔ جس کو وہ محض سوئے اتفاق سے دریافت کرنا چاہتا تھا۔

تیسرے دِن کمرۂ خاص کے اُوپر والے کمرہ میں جو بچوں کے مکتب کا کام دیتا تھا۔ داخل ہوتے ہی وہ دونوں میں سے چھوٹی بہن ہن ریٹا کے پاس آیا۔ وہ اپنی مقراض دیکھ رہی تھی۔

"آپ جانتے ہیں" اُس نے شیر سے کہا۔ "میں بھی اُس جیسا کاغذ بنانی ہوں۔ جو آپ کے ہاتھ میں گزشتہ شام کو تھا۔"

"گزشتہ شام کو؟"

"ہاں، کھانے کے بعد آپ کے پاس ایک پھٹا ہوا کاغذ تھا نا؟ ۔ ۔ ۔ ۔ آپ کو خیال آیا۔ وہی ایک تار۔ ۔ ۔ ہاں میں بھی ویسا بنا لیتی ہوں"

وہ باہر چلی گئی۔ ہر سننے والا شخص ان الفاظ کو محض ایک بچّہ کی بھولی باتوں کے سوا اور کچھ نہیں خیال کر سکتا تھا۔

اور شیر نے بھی انہیں معمولی طور پر سُنا۔ مگر اپنی تفتیش کو جاری رکھا۔ لیکن دفعتاً وہ بچّی کے پیچھے دوڑا۔ جس کے آخری لفظ نے اُس پر فوری اثر کیا تھا۔ اُس نے اُسے زینہ کے سرے پر پکڑا۔ اور کہا۔ "تو کیا تم اخبارات کے حروف بھی جوڑا کرتی ہو۔"

ہن ریٹا نے نہایت فخریہ کہا۔ "ہاں میں حروف کاٹ ڈالتی ہوں اور پھر لگا لیتی ہوں"

"بھلا تم کو یہ اچھا کھیل کس نے سکھایا ہے؟"

"میڈ موازل نے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ میری اُستانی نے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ میں نے اُنہیں یہ عمل کرتے دیکھا ہے۔ وہ اخبارات سے الفاظ علیحدہ کر لیتی ہیں اور پھر اُن کو ملا کر درست کر لیتی ہیں"

"پھر اُن کو وہ کیا کرتی ہیں؟"

"تار اور خطوط بنا کر باہر بھیجا کرتی ہیں"

ہالملاک شیر غیر معمولی طور پر متوحش مکتب خانہ میں ان معلومات پر پتہ چلانے کے لئے واپس آیا۔ انگیٹھی کے اُوپر اخبارات کا ایک بنڈل رکھا تھا۔ اس نے ان کو کھولا۔ اور دیکھا کہ در اصل وہاں سطریں کی سطریں غائب تھیں۔ اور نہایت صفائی کے ساتھ کاٹی گئی تھیں۔ لیکن اُس نے صرف شروع اور اخیر کے الفاظ پڑھے اور یہ معلوم کر کے کہ درمیان کے الفاظ مقراض سے بلا وجہ کاٹے گئے ہیں۔ اس کا اندازہ کر لیا کہ یہ ہن ریٹا نے کاٹے ہیں۔ بہت ممکن تھا

کہ ڈھیر میں کوئی کاغذ ایسا بھی ہو جسے میڈ موازل نے کاٹا ہو۔ مگر وہ صحیح پتہ کیسے چلا سکتا تھا۔

شیر نے میز پر رکھی ہوئی کتب درسیات و نیز الماری کے اندر کی دیگر کتابوں کی ورق گردانی کی۔ اور ایکبارگی جوش مسرت میں چیخ اُٹھا۔ الماری کے ایک گوشہ میں پرانی مشق کی کاپیوں کے نیچے اس نے بچوں کی ایک سادی کتاب پائی۔ جس میں حروف تہجی کی تصویریں بنی ہوئی تھیں اسکے درمیان کے ایک ورق میں اس کو ایک خالی جگہ نظر پڑی۔ اُس نے اس ورق کا مقابلہ کیا۔ اس میں ہفتہ کے دنوں کے نام تھے۔ یکشنبہ۔ دوشنبہ۔ سہ شنبہ وغیرہ لفظ شنبہ غائب تھا۔ اور جیوش لیمپ کی چوری بھی شنبہ ہی کی شب کو ہوئی تھی۔

شیر کے دل میں انکشاف راز کا احساس ہوا۔ وہ احساس جو ہمیشہ اس کے دل میں ایسے حل طلب معمہ کے وقت پیدا ہوا کرتا تھا۔ اُس حقیقت کا انکشاف۔ اُس یقین کا مادہ جس سے کبھی اُس کو دھوکا نہیں ہوا۔ اشتیاق اور اطمینان کے ساتھ وہ بہت سرعت سے اوراق اُلٹنے لگا۔ چند ورق کے بعد اُس کو ایک اور حیرت خیز بات نظر آئی۔

یہ ایک صفحہ تھا جو جلی حروف تہجی سے لکھا تھا۔ اور جس کے برابر تصویروں کی ایک قطار تھی۔

نو حروف اور تین کی تعداد میں تصویریں نہایت ہوشیاری سے غائب کی گئی تھیں۔ شیر نے اسکو اپنی نوٹ بک میں سلسلہ وار یوں لکھا۔

ج۔ ب۔ ا۔ د۔ و۔ ۶۔ ی۔ ۲۳۷۔ ا۔ ک

"بخدا!" اُس نے کہا۔ "اس سے زیادہ پہلی نظر میں اور کچھ نہیں معلوم کیا جا سکتا۔ کیا ان حروف کو کسی اور طریقہ سے لکھ کر دو فقرے یا بامعنی الفاظ بنا لینا ممکن نہیں؟

شیر نے بیکار اس کی کوشش کی۔

صرف ایک نتیجہ اس کو صحیح معلوم ہوا۔ جو اُس نے اخیر میں اپنی پنسل سے لکھا۔ اور وہ بھی صرف اس لئے کہ اُس کا تعلق اصل واقعات سے تھا۔ اور جن کو معمولی انشاء پردازی پر سمجھا جا سکتا تھا۔

یہ معلوم کرتے ہوئے کہ البم میں صرف ایک ہی بار ایک حرف تہجی لکھا ہے۔ اس کو یہ یقین ہو گیا۔ کہ جملے نامکمل حروف سے بنائے جاتے ہونگے۔ اور یہ الفاظ دوسرے اوراق کے حروف لیکر مکمل کئے جاتے ہونگے۔ ان شرائط کو اور نیز غلطی کے امکان کو مدنظر رکھتے ہوئے حسب ذیل الفاظ بنے:۔

ج۔ و۔ ا۔ ب۔ د۔ ۶۔ ی۔ ۲۳۷۔ ا۔ ک۔ پہلا لفظ بالکل صاف تھا۔ "یعنی جواب" اور حرف "ج" چھوڑ دیا گیا تھا۔ اس لئے کہ یہ حرف ایکبار استعمال کرنیکے بعد دوسرا کوئی نہ تھا۔

آخری نامکمل لفظ کے لئے یہ ممکن تھا کہ اسے کاتب نے مکتوب الیہ کو نمبر ۲۳۷ کے ساتھ پتہ میں لکھا ہو۔ اسکو شنبہ کا دن مقرر کرنے کے لئے نصیحت کی گئی تھی اور ا۔ ک ۲۳۷

کے پتہ پر جواب بھیجنے کو لکھا گیا تھا۔ یا تو ۲۴۳ ڈاکخانہ کا سرکاری پتہ تھا۔ یا کسی خاص اشارہ کے شروع کے حروف ہونگے۔ شیر نے البم کے اوراق اُلٹے پلٹے لیکن اور کسی صفحہ کا کوئی حرف نہیں کٹا تھا۔ اس لئے وہ آئندہ نتائج کے انتظار میں انہیں معلومات پر قانع رہا۔

"کیا یہ عمدہ کھیل نہیں؟"

ہن ریٹا نے واپس آکر پوچھا۔

شیرلاک نے جواب دیا۔

"ہاں، بہت خوب! ہاں کیا تمہارے پاس اور کاغذات نہیں ہیں؟ اگر کچھ الفاظ کٹے ہوتے ہوں تو لاؤ۔ میں بھی چپکاؤں؟"

"کاغذات؟ ..... نہیں ..... بھلا میڈموازل اس کو کب پسند کرینگی۔"

"میڈموازل؟"

"ہاں میڈموازل نے مجھ کو بہت برا بھلا کہا۔"

"کیوں؟"

"اس لئے کہ میں آپ سے واقعات بتلادیا کرتی ہوں اور وہ کہتی ہیں کہ مجھے جن چیزوں سے دلچسپی ہو انہیں دوسرے لوگوں سے نہ بتلایا کروں۔"

"تم نے اچھا کیا۔ جو مجھے بتلادیا۔"

ہن ریٹا اپنی تعریف سنکر خوش نظر آتی تھی۔ اس نے ایک کرمچ کے بٹوہ سے جو اس کے فراک میں آلپین سے لٹکا ہوا تھا۔ کسی چیز کے چند ٹکڑے، تین بٹن، دو شکر کے ٹکڑے اور اخیر میں ایک مربع کاغذ کا ٹکڑا نکالا۔ جس کو اس نے شیر کو دیا۔

"لیجئے، میں آپ کو اس طرح کے بہت سے دونگی۔"

یہ ایک گاڑی کا نمبر تھا۔ نمبر ۸۲۷۹

"تم نے اسے کہاں پایا؟"

"یہ اُستانی جی کی جیب سے گر پڑا تھا۔"

"کب؟"

"یکشنبہ کے دن، جب وہ تانبے سے کچھ ٹکڑے جمع کر رہی تھیں۔"

"شاباش! اب میں تم کو بتلاؤنگا کہ تم کس طرح ملامت سے محفوظ رہ سکتی ہو۔ میڈموازل سے نہ بتلانا کہ تم مجھ سے ملی تھیں۔"

شیر سیدھا ایم۔ ڈی ابسلی ویل کی تلاش میں نکلا۔ اور اس سے میڈموازل کے حالات دریافت کئے۔

بیرن چونکتا ہوا!

"الاتس ڈیمن! ..... کیا آپ کا اس کی طرف خیال ہے؟ ..... آہ! غیر ممکن ....."

"اسے کتنے عرصہ سے آپ کی ملازمت کا فخر حاصل ہے؟"

"صرف بارہ مہینے سے لیکن میں اس سے زیادہ سنجیدہ

یا قابل اعتبار اور کسی شخص کو نہیں سمجھتا۔"

"یہ کیا بات ہے۔ کہ اس وقت تک وہ میری نظروں سے نہیں گذری؟"

"وہ دو دن کے لئے باہر گئی ہوئی تھی۔"

"اور اس وقت؟"

"اپنی واپسی پر فوراً ہی اُس نے آپ کے دوست کی تیمارداری شروع کر دی ہے۔ وہ اعلیٰ درجہ کی تیماردار ہے ...... رحمدل ..... اور پاکباز ہے۔ مسٹر ولسن اُس سے بہت خوش معلوم ہوتے ہیں۔"

"اوہ" شیر نے کہا۔ جو اپنے دوست کی حالت سے قطعی لاپرنا نظر آتا تھا۔

اُس نے ایک لمحہ غور کے بعد دریافت کیا۔

"اور کیا وہ اتوار کی صبح کو باہر گئی تھی؟"

"چوری کے دوسرے دن؟"

"ہاں"

بیرن نے اپنی بیوی کو آواز دی۔ اور اُس سے دریافت کیا۔ اُس نے جواب دیا۔ "میڈ موازل حسب معمول گیارہ بجے کے قریب مجمع میں بچوں کو لے گئی تھی۔"

"لیکن اس سے قبل؟"

"قبل؟ نہیں .... یا شاید .... لیکن میں چوری کے واقعہ سے ایسی پریشان تھی! ..... تاہم مجھے خیال آتا ہے کہ اُس نے پہلے شام ہی کو اتوار کی صبح باہر جانے کی اجازت لی تھی ...... ایک چچازاد بھائی سے ملنے کے لئے جو شاید پیرس سے گذر رہا تھا۔ لیکن یقیناً آپ کو اس پر شبہہ نہ کرنا چاہیے؟"

"قطعی نہیں، لیکن میں اُس سے ملنا چاہتا ہوں۔"

وہ ولسن کے کمرہ میں گیا۔ ایک عورت ہسپتال کی نرسوں کی طرح لانبا بھورے رنگ کا ریشمی گون پہنے مریض پر جھکی ہوئی اس کو دوا پلا رہی تھی۔ جب وہ اس طرف گھومی تو شیر نے اس لڑکی کو پہچانا۔ اور یہ وہی تھی جسنے گیر ڈو نارڈ کے باہر اسٹیشن پر گفتگو کی تھی۔

(۷)

اُن میں ذرا بھی گفتگو نہیں ہوئی۔ الائس ڈیمن بلا کسی گھبراہٹ اور پریشانی کے سنجیدہ اور سحر بار آنکھوں کے ساتھ مسکرائی۔ انگریز جاسوس نے کچھ کہنا چاہا۔ ایک دو لفظ کہنے کی کوشش کی اور خاموش ہوگیا۔ پھر اُس نے اپنا کام شروع کیا۔ شیر کی متحیر نگاہوں کے سامنے اُس نے حرکت کی۔ بوتلوں کو اُٹھایا۔ پٹیوں کو باندھا۔ کھولا۔ اور پھر اُسے دیکھ کر مسکرائی شیہ اُنہیں قدموں واپس ہوا۔ زینہ سے نیچے اُترا۔ ایم ڈی اسلی ویل کے موٹر کے پاس احاطہ میں آیا۔ اُس میں بیٹھا۔ اور ڈرائیور سے احاطہ لیوبلیس چلنے کے لئے کہا۔ جہاں کا پتہ گاڑی کے ٹکٹ پر جن کو ہن ریٹا نے دیا تھا۔ ڈو پر یہ چھپا

گاڑیبان جو یکشنبہ کی صبح کو نمبر ۸۲۷۹ کو گیا تھا۔ موجود نہیں تھا۔ شیر نے موٹر واپس کر دیا۔ اور خود اس کا منتظر رہا۔ یہانتک کہ وہ گھوڑا بدلنے آیا۔ ڈو پریٹ ڈرائیور نے کہا: ہاں وہ ایک خاتون کو پارک مانشور کے قریب سے لے گیا تھا۔ ایک نوجوان سیاہ پوش خاتون جس کے مُنہ پر لانبا نقاب تھا۔ اور وہ بہت پریشان معلوم ہوتی تھی۔

"کیا وہ ایک پارسل لئے تھی؟"

"ہاں، ایک بڑا سا پارسل"

"اور تم اُسے کہاں لے گئے تھے؟"

"پہلس سینٹ فرڈیننڈ کے کنارے' ابونو ڈیبز ٹرنس کو وہ دس منٹ آگے قریب ٹھیری، اور پھر ہم لوگ پارک مانشو کو واپس آئے۔"

"کیا تم پھر ابونو ڈیبز ٹرنس میں اُس مکان کو پہچان لوگے؟"

"غالباً! کیا میں آپ کو وہاں لیچلوں؟"

"اس وقت! پہلے ۳۶ کوائے ڈیز آر فیورس چلو۔"

پولیس کے صدر مقام پر حسن اتفاق سے چیف انسپکٹر گینمارڈ سے اُس کی ملاقات ہوگئی۔

"کیا آپ بیکار ہیں۔ مسٹر گینمارڈ؟"

"اگر یہ سوال لوپن کے متعلق ہے تو ہوں۔"

"یہ لوپن ہی کے متعلق ہے۔"

"تو بندہ باز آیا۔"

"کیا آپ نے علیحدگی اختیار کرلی ...؟"

"میں نے فوق الفطرت ہستی سے دست کشی کرلی..... میں اس ناہموار مقابلہ سے پریشان ہوگیا۔ جس کا نتیجہ ہمیشہ شرم و ندامت کے ساتھ ملا۔"

"یہ بزدلی اور لغویت ہے۔"

کچھ بھی ہو یہ آپ کی مرضی ..... میں اس کی پروا نہیں کرتا! لوپن ہم لوگوں سے زیادہ طاقتور ہے۔ اس لئے بجز علیحدگی اختیار کرلینے کے اور کوئی چارہ کار نہیں۔"

"میں اس کے ماننے کو تیار نہیں۔"

"ہم لوگوں کی طرح وہ آپکو بھی اپنی عظمت کا قائل کر دیگا۔"

"خوب! تو پھر یہ ایک ایسا نظارہ ہوگا جو آپ کے خوش کرنے کو کافی ہے۔"

"یہ بالکل صحیح ہے۔" گینمارڈ نے معصومانہ طرز سے کہا "اور اگر آپ دوبارہ کوشش کے خواہشمند ہیں۔ تو بسم اللہ آگے قدم بڑھاتے!"

گینمارڈ اور شیر دونوں گاڑی میں بیٹھے، اُنھوں نے مکان سے کچھ پہلے۔ راستہ کے ایک طرف ایک چھوٹے سے ہوٹل کے سامنے گاڑی روکنے کو کہا۔ وہ اُس کے باہر لورل اور اپینڈلی درختوں کے درمیان بیٹھ گئے۔

روشنی گھٹنی شروع ہوگئی تھی۔

"نوکر!" شیر نے کہا۔ "قلم دوات"

اُس نے ایک رقعہ لکھا۔ اور دوبارہ خادم کو آواز دیتے ہوئے کہا۔ "اس کو سامنے والے مکان میں دربان کے پاس لے جاؤ۔ وہ شخص جو ٹوپی لگائے دروازہ میں بیٹھا پائپ پی رہا ہے۔"

دربان دوڑتا ہوا آیا۔ اور گیمنارڈ کے بتلانے کے بعد کہ وہ چیف انسپکٹر ہے۔ شیر نے دریافت کیا۔ "کیا یکشنبہ کی صبح کو ایک سیاہ پوش نوجوان خاتون اس مکان پر آئی تھی؟"

"سیاہ پوش؟ ہاں نو بجے کے قریب، یہ بھی اُن میں سے ایک ہے جو دوسری منزل پر جایا کرتے ہیں۔"

"کیا تم اُسے زیادہ تر دیکھتے ہو؟"

"نہیں، یہ بات تو نہیں۔ مگر اس سے قبل وہ اکثر آیا کرتی تھی۔ یعنے گزشتہ پندرہ دن سے روزانہ۔"

"اور یکشنبہ کے بعد؟"

"صرف ایک بار، اگر آج کی آمد شمار نہ کی جائے۔"

"کیا کہا! کیا وہ آج بھی آئی تھی؟"

"وہ اس وقت بھی وہاں موجود ہے۔"

"سچ! وہ اس وقت بھی وہاں موجود ہے؟"

"جی ہاں، اُسے آئے دس منٹ ہوئے۔ حسب معمول کوچوان اُس کا انتظار سینٹ فرڈیننڈ پر کر رہا ہے میں اُس سے دروازہ میں ملا تھا۔"

"اور دوسری منزل کا کرایہ دار کون ہے؟"

"وہاں دو ہیں۔ ایک خیاط میڈ موازل لینجیز اور دوسرا ایک شریف آدمی جس نے تقریباً ایک ماہ سے برلین کے نام سے دو عمدہ کمرے کرایہ پر لئے ہیں۔"

"یہ تم نے کیا کہا۔ کہ برلین کے نام سے؟"

"میرا خیال ہے کہ یہ فرضی نام ہے۔ میری بیوی اُس کے کپڑے درست کرتی ہے۔ مگر جناب، تمام پوشاک میں اُس کو دو کپڑے بھی ایسے نہیں ملے۔ جن پر اس کے نام کا پہلا حرف درج ہو۔"

"اُس کا طرزِ معاشرت کیا ہے؟"

"اے جناب، وہ تو تقریباً ہمیشہ باہر رہتا ہے۔ بعض اوقات وہ تین تین دن تک برابر مکان پر واپس نہیں آتا۔"

"شنبہ کی شب؟ - - - - ٹھیریے میں خیال کرلوں . . . . ہاں وہ شنبہ کی شب کو یہاں آیا اور پھر ابھی تک نہیں نکلا۔"

"وہ کس قماش کا آدمی ہے؟"

"واللہ، یہ میں کچھ نہیں بتلا سکتا۔ وہ ایسا بھروپیا ہے۔ کہ کبھی لانبے قد والا معلوم ہوتا ہے۔ کبھی ٹھگنا۔ کبھی تن و توش والا۔ کبھی دُبلا پتلا . . . . . کبھی سیاہ رو اور کبھی گورا چٹا۔ میں اُس کو پہچاننے میں ہمیشہ دھوکا کھاتا ہوں۔"

گینمارڈ اور شیر نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔

"یہ وہی" گینمارڈ نے کہا۔ "ضرور وہی ہے۔"

"ایک ثانیہ کے لئے پُرانے جاسوس نے ایک حقیقی اضطراب کا احساس کیا۔ جو خود ہی گہری سانس اور مٹھیوں کے کسنے سے ظاہر ہو گیا۔

شیر کو بھی، اگرچہ وہ اپنے نفس پر زیادہ حاوی تھا۔ ایک خاص اثر دل پر محسوس ہُوا۔

"باہر اس طرف دیکھئے!" دربان نے کہا۔ "دوشیزہ خاتون آتی ہے۔"

جونہی کہ اُس نے کہا۔ میڈموازل دروازہ میں نمودار ہُوئی۔ اور احاطہ کی دوسری جانب چلی گئی۔

"خوب لیجئے۔ ایم بریسن بھی آن موجود ہُوا۔"

"اچھا اُن میں ایم۔ بریسن کون ہے۔"

"وہ شریف آدمی جو اپنی بغل میں ایک پارسل دبائے ہُوئے ہے۔"

"لیکن وہ دوشیزہ خاتون کی طرف سے قطعی غافل معلوم ہو رہا ہے۔ وہ اپنی گاڑی کی طرف تنہا جا رہی ہے۔"

"جی ہاں۔ صحیح ہے، مَیں نے ان کو ایک ساتھ کبھی نہیں دیکھا۔"

دونوں سراغرساں جلدی سے اُٹھے۔ سڑک کی لالٹینوں کی روشنی میں اُنھوں نے لوپن کی صورت جونہی وہ احاطہ کے باہر نکلا پہچان لی۔

"کس کا تعاقب کرو گے؟" گینمارڈ نے دریافت کیا۔

"یقیناً اُسی کا۔ یہی اپنا شکار ہے۔"

"تو پھر مَیں دوشیزہ خاتون کے پیچھے لگتا ہوں" گینمارڈ نے اپنی رائے ظاہر کرتے ہُوئے کہا۔

"نہیں، نہیں" انگریز سراغرساں نے جلدی سے کہا۔ کیونکہ اس کی خواہش تھی۔ کہ مقدمہ کا کوئی حصّہ گینمارڈ پر ظاہر نہ ہو۔ "مَیں جانتا ہوں کہ بوقت ضرورت مَیں دوشیزہ خاتون کو کہاں پا سکتا ہوں ...... میرا ساتھ نہ چھوڑتے۔"

(۸)

کچھ فاصلہ دیکر گزرنے والوں اور لالٹین کے ستونوں کی آڑ لیتے ہُوئے گینمارڈ اور شیر لوپن کے تعاقب میں روانہ ہوئے۔ یہ نہایت آسان تعاقب تھا۔ اس لئے کہ وہ بلا کسی طرف دیکھے ہُوئے داہنے پیر کو خفیف لنگ دیتا ہُوا جسکو صرف ایک تجربہ کار کی آنکھیں ہی دیکھ سکتی تھیں۔ نہایت سرعت کے ساتھ چلا جا رہا تھا۔

"وہ قصداً لنگ کر رہا ہے۔" گینمارڈ نے کہا۔ "افسوس، کاش ہم دو ہی تین سپاہی لیتے آئے ہوتے۔ اور اس پر جھپٹ پڑتے! اس لئے کہ موجودہ حالت میں بہت ممکن ہے وہ ہم لوگوں کے ہاتھ سے نکل جائے۔"

لیکن پورٹ۔ ڈیس ٹرنس تک کوئی بھی پولیس کا سپاہی

نہیں دکھائی پڑا۔ اور جب وہ شہر پناہ کے باہر پہنچ گئے تو اب خفیف امداد کی بھی امید نہ رہی۔

"ہم کو علیحدہ ہو جانا چاہیئے"۔ شیر نے کہا۔ "یہ جگہ بالکل ویران ہے۔" وہ بولیوارڈ وکٹر ہوگو پر تھے۔ اُن میں سے ہر ایک نے مختلف روش کی اختیار کی۔ اور درختوں کی آڑ لیتے ہوئے روانہ ہوئے۔ وہ بیس منٹ تک اسی طرح چلے تھے۔ کہ لوپن بائیں جانب دریائے سین کی طرف مڑا۔ یہاں اُن لوگوں نے اُسے دریا کے نشیب میں کنارے تک جاتے دیکھا۔ وہ وہاں چند سکنڈ کے لئے ٹھیرا مگر اس عرصہ میں یہ لوگ اس کی حرکات کو نہیں دیکھ سکے۔ وہ پھر چڑھ کر ساحل پر آیا اور اُسی راستہ سے جس سے آیا تھا واپس ہوا۔ وہ دونوں ایک دروازہ کے کھمبے سے چمٹ گئے۔ لوپن اُن کے سامنے سے گزرا۔ اور اب اس کے ہاتھ میں کوئی پارسل نہ تھا۔ جونہی وہ آگے بڑھا ایک دوسری صورت ایک مکان کے گوشہ کی پشت سے نمایاں ہوئی اور درختوں کے درمیان غائب ہوگئی۔

شیر نے ہلکی دبی آواز میں کہا۔

"اور بھی کوئی شخص اس کے تعاقب میں ہے۔"

"ہاں مجھے یقین ہے کہ میں نے بھی اس شخص کے سایہ کو آتے وقت دیکھا تھا۔"

تعاقب جاری رہا۔ لیکن اب تیسری ہستی کی موجودگی سے معاملہ کی پیچیدگی زیادہ بڑھ گئی۔ لوپن نے وہی راستہ اختیار کیا۔ پورٹ ڈبیں ٹرنس سے دوبارہ گزر کر پلیس سینٹ فرڈی ننڈ کے مکان میں داخل ہوگیا۔

دربان دروازہ بند کر رہا تھا۔ کہ گینمارڈ آ پہنچا۔

"میں خیال کرتا ہوں تم نے اُسے دیکھ لیا؟"

"ہاں، میں گیس کی بتی کو زینہ پر گھما رہا تھا۔ اُس نے اپنے دروازہ کی چٹخنی بند کر دی ہے۔"

"کیا وہاں اُس کے ساتھ اور کوئی شخص نہیں رہتا؟"

"کوئی نہیں، اس کے پاس کوئی نوکر نہیں ہے ..... اور نہ وہ یہاں کہیں کھانا کھاتا ہے۔"

"اچھا بتا! ..... وہاں پشت کی جانب کوئی زینہ تو نہیں ہے؟"

"جی نہیں"

گینمارڈ نے شیر سے کہا۔

"میرے لئے مناسب و بہتر یہ ہوگا۔ کہ میں لوپن کے دروازہ پر ٹھیروں۔ اور آپ روڈریں تشریف لیجاکر داروغہ پولیس سے ملیں۔ میں آپ کو ایک رقعہ دیتا ہوں۔"

شیر نے کہا۔

"فرض کردم وہ اس اثنا میں چلتا بنے؟"

"لیکن میں تو یہاں رہونگا! ......"

"آپ تنہا ہونگے، اور ایسی حالت میں آپ کا

اُس کا برابر کا مقابلہ نہ ہوگا۔"

"پھر میں اُس کے کمرہ میں نہیں گھس سکتا۔ مجھے اس کا مجاز نہیں ہے۔ اور خاصکر رات کے وقت۔

شیر نے اپنے شانہ کو حرکت دی۔

"اگر ایک مرتبہ آپ لوپن کو گرفتار کر لینگے تو پھر آپکو کوئی شخص اس زیادتی کا جو آپ اُس کی گرفتاری میں روا رکھینگے الزام نہ دیگا۔ خیر آؤ.... ذرا گھنٹی تو بجا کر دیکھیں کیا واقع ہوتا ہے۔"

وہ زینہ پر چڑھے۔ فرش کی بائیں جانب دو دروازے تھے۔ گینمارڈ نے گھنٹی بجائی۔

کوئی جواب نہ ملا۔ اُس نے دوبارہ بجائی۔ کوئی نہیں اُٹھا۔

"ہم کو اندر چلنا چاہیے۔" شیر نے کہا۔

"ہاں قدم بڑھائیے۔"

بایں ہمہ وہ کشش و پنج میں بے حس و حرکت کھڑے رہے۔ اُن لوگوں کی طرح جو قطعی فیصلہ کرنے کے قبل پس و پیش کرتے ہیں۔ وہ بھی ہچکچا رہے تھے۔ کہ یکایک یہ اُن کے ذہن نشین ہوگیا۔ کہ آرسین لوپن کا یہاں ہونا غیر ممکن ہے۔ ان کے اتنے قریب۔ ایسے کمزور پردہ کے پس پشت، جن کو وہ ایک ہی گھونسے کی ضرب میں توڑ سکتے تھے۔ یہ دونوں اُس سے اچھی طرح واقف تھے۔ کہ وہ ایسا بیوقوف جن نہیں کہ ایسی آسانی سے اپنے کو حوالہ کردے۔

نہیں، نہیں۔ ہزار بار نہیں۔ وہ وہاں نہیں ہے وہ ضرور پاس کے مکانوں سے نکل گیا ہے۔ چھت سے یا کسی دوسرے بیرونی راستہ سے جس کو اس نے وقت ضرورت کے لئے تیار کر رکھا ہوگا۔ اور ایک مرتبہ پھر اُنھوں نے خیال کیا کہ وہ صرف آرسین لوپن ہی تھا۔ جس کو وہ گرفتار کرنا چاہتے تھے۔ وہ مارے خوف کے کانپ اُٹھے۔

ایک نامعلوم آواز نے دروازہ کی دوسری جانب سے آکر خاموشی کو توڑا۔ ان کو خیال نہیں بلکہ یقین کامل ہوگیا۔ کہ اس چوبی دیوار کے پس پشت ضرور کوئی موجود ہے۔ جو ان کی گفتگو سُن رہا ہے۔ اور آمد کا حال معلوم کرچکا ہے۔

اُن کو کیا کرنا چاہیئے تھا؟ یہ ایک عجیب موقعہ تھا پولیس کے نہایت تجربہ کار و سخت دل افسر ہونیکے باوجود بھی ان پر کچھ ایسی وحشت طاری ہوتی۔ کہ وہ خود اپنے دل کی حرکت کو کانوں سے سُن رہے تھے۔

گینمارڈ نے نیم باز نظروں سے شیر کی رائے دریافت کی۔ اور پھر دروازہ پر سختی سے دستک دی۔

اب پاؤں کی چاپ سُنائی دی۔ وہ چاپ جسکو اب اور زیادہ چھپانے کی کوشش نہیں کی گئی تھی۔

(باقی آئندہ)

شمیم بلهوری۔ سلیم ندوروی

قیمت سالانہ چھ روپے — رجسٹرڈ نمبر ایل ۱۴۱۴ — قیمت ششماہی ۳ روپے فی پرچہ ۱۰ آنے

ہزار داستان

آنریری ایڈیٹر:- حکیم احمد شجاع بی۔اے (علیگ)

ایڈیٹر:- محمد اسمٰعیل نعیم

جلد ۵ اشاعت ماہ ستمبر ۱۹۲۴ء نمبر ۳

نمبر شمار	مضمون	اثر خامہ	نمبر صفحہ	نمبر شمار	مضمون	اثر خامہ	نمبر صفحہ
۱	دریا بہ حباب اندر	ایڈیٹر	۱۶۲	۱۱	پریم ساگر	جناب اثر صہبائی	۱۹۶
۲	شاعر اور اس کا ساقی	حضرت تنہا	۱۶۳	۱۲	خمخانۂ راز	حضرت گرامی مدظلہٗ	۲۰۸
۳	شعلہ بدامن	جناب طالب الہ آبادی	۱۶۴	۱۳	محبت	جناب سیّد ابو محمد ثاقب	۲۰۹
۴	سودائے خام	جناب محمد والا گوہر	۱۷۴	۱۴	روداد محبت	جناب راز چاندپوری	۲۱۰
۵	یوم یکشف عن ساقٍ	حضرت آزاد انصاری	۱۷۵	۱۵	چراغ انجمن	جناب احسن سیمبھی	۲۲۴
۶	ایک پاگل کا قلمی نوشتہ	جناب فیاض الدین احمد	۱۷۶	۱۶	کسی کی آرزو	جناب طاہر	۲۲۵
۷	جوشِ بہار	جناب ابوالاثر حفیظ جالندھری	۱۸۵	۱۷	آخری ارمان	جناب شمیم بلہوری و سلیم ندوردی	۲۲۶
۸	محشر سوز و ساز	جناب شارق	״	۱۸	پیغامِ خواب	جناب پورن سنگھ ہنر	۲۳۴
۹	مار آستین	جناب سلیم	۱۸۶	۱۹	اختلافِ جذبات	ایڈیٹر	۲۳۸
۱۰	پریشان محبت	جناب راز چاندپوری	۱۹۵	۲۰	تبصرہ بہ اشاعات جدیدہ	״	۲۳۹

صفحہ جمیل کلام الملوک — تصویر:- شاعر اور اس کا ساقی

(مرکنٹائل پریس لاہور میں باہتمام لالہ گوپال داس پرنٹر چھپا اور محمد اسمٰعیل لکھیسہ پبلشر و پروپرائیٹر نے دارالاشاعت ادب لطیف کے لئے چیمبرلین روڈ لاہور سے شائع کیا)

دریا بہ حباب اندر

صفحۂ ادارت

اس اشاعت کا صفحۂ جمیل تاجدارِ سندھ کے تازہ نتیجۂ فکر سے مزین ہے۔ تاکہ شائقین ادبِ اُردو اس حقیقت سے آگاہ ہو جائیں کہ ایک والیِ ملک اور خصوصاً ملک سندھ کا فرماں روا اُردو زبان کی شاعری پر کیسا عبور اور اس کا کیسا صحیح ذوق رکھتا ہے۔ کلام الملک ملک الکلام کی یہ زندہ تفسیر امید ہے کہ حضورِ موصوف کی کرم گستری کی پہلی قسط ہوگی۔ اور ہزار داستان کے صفحات اکثر اوقات ان کے دامان تخیل کی خوشہ چینی میں کامیاب ہوں گے۔

ہم کسی دوسری فرصت میں ملک سندھ کی مجمل تاریخ اور اس کے عالی ہمت تاجدار کے سوانح حیات اور اکتسابات علم و فن پر ایک مفصل نظر ڈالیں گے۔ تنگی وقت اور عدم گنجائش اس وقت اس دلچسپ اور نتیجہ خیز تحریر کی متحمل نہیں ہو سکتی

جناب ابوالاثر حفیظ جالندھری جو میرے ساتھ ہزار داستان کی ادارت کے ذمہ دار تھے۔ افسوس ہے کہ چند ناگزیر حالات کی وجہ سے اس فرض سے سبکدوش ہو گئے ہیں مگر امید ہے کہ وہ اس انقطاع تعلق کے باوجود ہزار داستان کو اپنے رشحات قلم سے ہمیشہ مستفیض فرماتے رہینگے۔ آئندہ سے مضمون نگار حضرات اپنے مضامین میرے نام ارسال فرمائیں۔ تاکہ ان کی اشاعت میں تعویق نہ ہو۔

محمد اسمٰعیل نعیم

کلام الملوک

اعلیحضرت قدر قدرت حضور پر نور ہز ہائینس نواب میر علی نواز خانصاحب بہادر والی خیرپور سندھ المتخلص بہ **ناز**

نامہ بر مجھ سے وہ انجان ہوئے ہیں کہ نہیں
کچھ مری موت کے سامان ہوئے ہیں کہ نہیں

بزم دشمن میں پریشان ہوئے ہیں کہ نہیں
شکل آئینہ وہ حیران ہوئے ہیں کہ نہیں

ناز سے صبح شب وصل یہ کہنا ان کا
اب بھی پورے ترے ارماں ہوئے ہیں کہ نہیں

سُن چکا دیکھ چکا غیر کی لاکھوں چالیں
سادہ دل اب بھی ترے کان ہوئے ہیں کہ نہیں

کستے پھر طور پہ جانے کا ارادہ ہے کلیم
قائم اب آپ کے اوسان ہوئے ہیں کہ نہیں

بیعت پیر مغاں کی ہے خبر جھوٹ کہ سچ
حضرت شیخ مسلمان ہوئے ہیں کہ نہیں

آتے ہی موسم گل جوش جنوں کے ہاتھوں
چاک لاکھوں کے گریبان ہوئے ہیں کہ نہیں

وعدۂ وصل پہ آئے تو یقیں خاک آئے
لاکھ جھوٹے ترے پیمان ہوئے ہیں کہ نہیں

بیوفائی کی ہوئی ہے کہ نہیں حد آخر
رفتہ رفتہ وہ مری جان ہوئے ہیں کہ نہیں

سوگ میں غیر کے فرمائیے اے بندہ نواز
آپ کے بال پریشان ہوئے ہیں کہ نہیں

دولت عشق ملی ہے کہ نہیں تم کو **ناز**
دین و دل یار پہ قربان ہوئے ہیں کہ نہیں

شاعر اور اُس کا ساقی

تصویر کا دُوسرا رُخ

شاعر میں عجیب مستیاں ہیں ۱ کچھ اور ہی مے پرستیاں ہیں

شرابِ مئے الست آیا ۲ دُنیا میں یہ ہو کے مست آیا

تخئیل کی سلطنت کا حاکم ۳ جذبہ کے تلاطموں میں قائم

اذکارِ جہاں سے محوِ کاوش ۴ پروانہ کی شمع سے سفارش

سنتا ہے ستم گل و خزاں کے ۵ نغموں میں ہزار داستاں کے

انجم سے لڑا رہا ہے آنکھیں ۶ یا حور سے چار ہیں نگاہیں

رُوحوں سے خطاب کرنیوالا ۷ بیداری کو خواب کرنے والا

دریا ہے کہیں سراب اس کو ۸ ذرّہ کبھی آفتاب اس کو

تحسین نظر ہر ایک شے ہیں ۹ ڈوبا ہے وفا کے فلسفے میں

ہر سنگ میں طور دیکھتا ہے ۱۰ ہر شعلہ میں نور دیکھتا ہے

معمورِ جمال ہے زمانہ ۱۱ خود اس کا خیال ہے زمانہ

گھیرے ہوئے اس کی کارسازی ۱۲ دُنیائے حقیقی و مجازی

اُلفت کی تپش سے لذّت اندوز ۱۳ پہلو میں ہے دل کہ کیمیا سوز؟

ساقی بھی ہے اسکی جانِ عشرت ۱۴ یا مظہرِ پاکِ رُوحِ اُلفت

یا جلوۂ مست حسنِ رنگیں ۱۵ تمثالِ شباب کیفِ آئین

مقصودِ حیات دوستی ہے ۱۶ مضمونِ دُعائے عاشقی ہے

فقرہ فقرہ ہے بیخودی کوش ۱۷ آنکھوں آنکھوں میں کر دے مینوش

پھولوں کی شگفتگی دہن میں ۱۸ تحلیل بہار ہے بدن میں

تاثیرِ نفس بہار پرور ۱۹ اُڑتی ہے شراب پھول بنکر

شعلہ بداماں

احمد شاہ حکمران سندھ نے آج روپہلی جھیل کے کنارے (جہاں وہ گرمیاں گزارنے کے لئے ہر سال پائے تخت سے معمولاً رجعت قہقہری فرمایا کرتے تھے) اپنے سرد محل میں ایک مہتمم بالشان دعوت کا سامان کیا تھا۔ موصوف، مضبوط و خوبصورت سیاہ ریش بزرگ تھے۔ ابتک اُنکے رخساروں پر رنگ شباب کشش نواز تھا۔ اُن کا نام معرکہ آزمائیوں کے لئے ضرب المثل اور اُن کی ذات معماری و شاعری و دیگر صنائع لطیفہ کی سرپرستی کے واسطے "سندی محاورہ" ہوگئی تھی۔

اس وقت ممدوح موصوف اپنے چیدہ اور سنجیدہ مصاحبین کے جھرمٹ میں آٹھ ڈانڈوں والی تفریحی کشتی پر خوبصورت جھیل کے کنارے کنارے کھلی ہوئی چاندنی کے اندر، جھاڑیوں سے گھری ہوئی دو رویہ گھاٹیوں کی شامہ پسند و باصرہ نواز سیر میں بیخود ہیں۔ ساتھ والے ہنر پرور و موسیقی نواز کبشیر فطرت پرست و مجسم ترنم شاعروں کے سامعہ پسند نغمہائے رنگیں سنہری روپہلی ہوا و فضا میں منتشر و برہم ہو رہے ہیں۔ آب سیمیں کا ہر قطرہ ہم آہنگ سوز اور فضائے بسیط کی ہر موج ہم نوائے ساز ہوگئی ہے پہلے مسلم نوالوں نے دلربا و مختلف التقطیع بحور میں، زرمنہ و مدحیہ قطعہ و قصائد اور گل و بلبل کے حاصل عشق و حسن، غزلیں اس خوبی و عمدگی سے سنائیں کہ بیتاب موجیں ہمہ تن گوش ہوگئیں سنہری چاندنی آئینہ حیراں، اور روپہلی جھیل تصویر بے زبان ہوگئی۔ ہوا کا تحرک غیر محسوس اور پانی کی روانی مفقود ہوگئی کبھی دنیائے کشتی، معرکہ رزم اور کبھی خاکہ بزم بن جاتی تھی ممدوح موصوف روئے زمین سے انسانی بہجت و روحانی مسرت کی حاصل معراج و مایۂ کمال منازل میں پہنچ کر آپ اپنے ہی نزدیک کھو گئے تھے۔

اب ایک ہند نژاد کبشر نے اپنے روح پرور، و سامعہ کش لب و لہجہ میں ایک البیلی راجپوت دوشیزہ کی تصویر نگاہوں کے روبرو کھینچ دی۔ جو غزال ختن کی طرح چھبیلی اور رام والی سیتا کی صورت شرمیلی تھی۔ ہندی چاند کی موہنی بھری، دلفریب ٹیڑھی ترچھی کرنوں کے نیچے روپہلی جھیل کی فرحت اثر ہوا میں ترنّم نواز نظم کے سحر طراز نغموں نے موصوف ممدوح کے جمال پسند جوان دل میں انوکھی دوشیزہ کے لئے باطنی کشش و غائبانہ تصوّر کے ماتحت روحانی محبت کے برق صفت طوفان پیدا کر دئے۔ وہ دوشیزہ جس کا خیالی پیکر، وہمی مجسمہ سنہرے

اشعار میں بھی بلا کا دیدہ زیب ستم کا سامعہ فریب تھا۔

دیکھتے تو ! ظل اللہ کے پیوستہ لبوں میں حرکت سی ہُوئی۔ گوہر نصیب دانتوں کی لڑیاں سفید بجلیوں کی طرح تڑپ کر ہونٹوں کی شفقی رنگت میں محلول ہوگئیں، اور بیساختہ کچھ سوالیہ الفاظ سُنائی دِیتے۔

یہ انمول موتی زنان عالم کا سرتاج، حسینانِ جہان کا گوشوارہ اس عالم ترکیب کی فانی صدف میں کب ضیا پاش ہُوا۔ اور کفرستانِ ہند کے کس مشرک کے، رشتہ زندگی میں نامنصفی سے بیدھ کر پرو دیا گیا۔

کبشر نے نہایت ادب سے جواب میں عرض کیا۔

کہ جہاں پناہ وہ اب بھی موجود ہیں۔ اور ابھی تک کنواری ہیں میں خود لالہ پر وصف وتحسین کے شاداب و قرمزی گلابی کلیاں نچھاور کرتا ہوں۔ جو پربت سنگھ کی اکلوتی لڑکی ہے اگر وہ تمہارے خیالی کشیدہ پیکر کی طرح واقعی دلفریب ہے۔ تو میری دُلہن بن کر رہیگی۔ بصورت دیگر تمہارا سر تمہاری کذب سرائی کا خونبہا ہو جائیگا"۔

ممدوح یہ کہہ کر محیط خیالات کے زوردار جزر و مد میں محو سیر ہوگئے۔ اور اشارۂ ابرو سے حکم دیدیا کہ سفینۂ مخصوص سفید محل کی مرمریں فرودگاہ پر واپس کھے کر لگا دیا جائے۔

دوسری صبح کو مشیر خصوصی رکن مجلس مہابرہمن صاحب طلب کئے گئے۔ اور ان سے پربت سنگھ کی اکلوتی کنّیا کے واسطے استفسار کیا گیا۔ اُنہوں نے بھی جواباً وہ گہر ریزیاں کیں اور سنجیدہ نثر میں جمال لالہ کے حسن ظاہر خاصۂ باطن کی ویسی ہی جادو بھری مورت سامنے کر دی، جیسی موبہ مو تصویر ہندی کبشر نے گزشتہ شب کو اپنی نرم و رنگین مدحیہ نظم میں روپہلی جھیل کی ان طلائی موجوں پر روبرو کی تھی، جو پورے چاند کے کشش انداز پر تو سے موجہ نور بیاں بنی ہوئی تھیں۔ اتنی ہی تصدیق کسی کے جمال پرست دل کے لئے تازیانۂ شوق ہوگیا۔ اور مہا برہمن کو فی الفور حکم دے دیا گیا۔ "پربت سنگھ کو فوراً مطلع کر دیا جائے۔ کہ خود سریر آرا بہ نفس نفیس لالہ کو عروس خاص بنانے کا فیاضانہ قصد فرماتے ہیں"۔

کچھ سہی جذبۂ بے اختیاری قابو بخش اور لہجۂ پیام سنجیدہ نہ تھا۔ اکثر راجپوتوں نے اپنی لڑکیاں حرم شاہی اور خلوت گاہِ امراء دربار میں بہ طیب خاطر دیدی تھیں۔ مگر اکیلا پربت سنگھ راجپوتوں کا وہ راجپوت تھا جو سب سے بڑھ کر اپنے بے داغ حسب ونسب پر فخر و ناز کیا کرتا تھا۔ حتےٰ کہ وہ اس خیال سے بھی متنفر تھا کہ اس کی لڑکی کسی نیچ قوم مسلمان سے مربوط ہو کر اپنی موتی جیسی ابرو۔ کندن جیسی ذات کھو دے۔ چاہے اُس کے صلہ میں وہ لڑکی کسی زبردست راجدھانی کی رانی ہی کیوں نہ بن جائے بہرحال اس نے پیشوائے مذہب کے مشورے سے جبلی

رضامندی ظاہر کر دی۔ اور خود قلعہ آہور میں بند ہو کر بیٹھ رہا اور اسی دوران میں اپنے معافی داروں اور رشتہ ناتے والوں کو مجتمع کر لیا۔ کہ اس وہمی ننگ و ذلت اور خیالی رسوائی و بے عزّتی سے سب مل جل کر باپ بیٹی کو بچا لیں۔

احمد شاہ نے بھی ان تیاریوں کی بھنک پا کر اپنی فوج دریا موج سے دس ہزار جوان چن لئے جو حسب موقعہ قلعہ آہور کو طوفانی کر دیں۔ یا راجپوت دُلہن کے ڈولے کے ساتھ محافظ و باراتی بن جائیں۔ کجکلاہ ثریا جاہ بہ نفس نفیس فیل خاص پر نقرئی ہودے میں بیٹھ کر سر کردہ لشکر کی حیثیت سے پیش پیش روانہ ہوتے، جن کی پشت پر دوسرا ہاتھی شاہانہ انداز سے دُلہن بنا ہُوا اس لئے رواں تھا کہ راجپوت عروس کے مسرت افزا خیر مقدم کے وقت کام میں لایا جائے۔

اسی شان سے جنگجو بادشاہ نے قلعہ آہور کی سنگین دیواروں کے قریب پہنچکر داخلہ کا مطالبہ کیا۔ جس کا جواب ایک پوری قوت سے رہا کئے ہوئے برجستہ سہ پہلوی ناوک سے دیا گیا۔ جو تاج "تاج بخش" کے اوپر والی کارچوبی جھول میں ترازو ہو گیا۔ تیر سے بندھا ہوا مسودہ اپنے شکن آلود دامن میں ذیل کا مہذب ترین جوابی پیام رکھتا تھا۔

"جس دھنش دھاری (کمان والے) نے تیرے سروالی جھل (جھول) کو اپنے تیر کا سچّا نشانہ بنا لیا، وہی سُورما بہت آسانی سے یہی تیر اس باندر سروپ (صورت میمون) ظالم کے مغز سر میں بھی گاڑ سکتا تھا۔ جو پربت سنگھ کی لڑکی سے دیوانہ پن کے ساتھ اپنا بیاہ رچایا چاہتا ہے ابھی بھور بیلے (سویرا ہے) جاگ! اور کٹھن گھڑی پڑنے سے پہلے لوٹ جا۔"

اور اسی دوران میں بادشاہ کا بھیجا ہُوا اسوت (پیرہن عروسی) جو راجپوتوں کے حسب رواج تھا، بقچہ پیرہن کثیف کی طرح قلعہ کی دیواروں سے سے لڑھکا دیا گیا۔ اور شاہی فیل کے پاؤں پاس گر کر گرد و غبار میں اٹ گیا (جو غالباً اہانت عروس کے لئے بھی کافی رکیک حرکت تھی) اس طرح سے مقتل نواز اعلان جنگ کی تکمیل کر دی گئی۔ مسلم صفوف اس خیال سے کہ مبادا چشم زخم، حدِ ذلت تک نہ پہنچ جائے۔ خودداری سے زیادہ احتیاطی پیش بینی کی بدولت، ناوکوں کی زد سے دُور ہٹ آئے، کہ شاید راجپوتوں کی طرف سے تیروں کی اچانک بارش واقعی پیام افتتاح جنگ لیکر نہ آ پڑے۔

ایکے احمد شاہ کا بے لوث صلح پسند رویہ غازیانہ محاصرہ میں تبدیل ہو گیا۔ اس طرف آہور کے زبردست مورچوں میں تین ہزار قوی تن راجپوت مسلح موجود تھے۔ شاہ مقابل کے قیمتی عروسی ہدایا اور بیش بہا خسروی تحائف دیواروں کی مضبوطی، حصار کی پختگی عمدہ سلاح کی خریداری، اور اُن

تیاریوں میں صرف کر دیتے گئے تھے۔ جو روپیہ کے ذریعہ
خریدی جا سکتی ہیں۔

جب مسلم محاصرین بڑھنا چاہتے تھے تو انکو تیروں
کی بے پناہ بوچھاڑ اور اُن پتھروں کی سرگردان بارش سے
مجبوراً پیچھے ہٹ آنا پڑتا تھا۔ جو قلعہ کے بلند ترین حصوں میں
آلہاتِ حفاظت سمجھ کر پہاڑ کے دامنوں سے چُن کر ایک
کثیر تعداد میں محفوظ کر لئے گئے تھے۔ بعض وقت عیار محصورین
بیتاب محاصرین کو دیواروں میں ریشمی رسیاں بھی نصب کر لینے
کا موقعہ دیدیا کرتے تھے۔ مگر قبل اس کے کہ کوئی متنفس حریف
کافی بلندی تک چڑھنے پاتے۔ وہ لوگ لانبے نکیلے بانسوں
سے اُن سر بکف جان نثاروں کو موت کے گھاٹ اُتار
دیا کرتے تھے۔ جو پھندے دار ڈانڈوں پر فرط سعی و صدمۂ
ضرب سے لہرا لہرا کر ڈگمگا ڈگمگا کر روئے زمین کی طرف
مائل ہو جاتے تھے۔ رسائیِ قلعہ کے لئے اس قسم کی تمام
کوششیں بے ثمر ثابت ہوتیں۔ اب محاصرین نے دیواروں
پر حملہ موقوف رکھا۔ اور مختلف قسم کی جنگی تدابیر سوچنے میں
مصروف ہو گئے۔

فتح قلعہ اب محض معمہ موقعہ و سوال وقت بن کر رہ گیا
تھا۔ ادھر دو تین مہینوں کے بعد آب و آذوقہ محفوظ میں
نمایاں و روح فرسا کمی شروع ہو گئی اور ستم یہ کہ بیرون قلعہ
سے رہائی کی آخری امید بھی مٹ چکی تھی بلاشبہ اگر پربت سنگھ
شاہ مقابل سے اپنی جگہ گوشہ کا پیوند ہونا منظور کر لیتا تو
جزیہ کی آسان و ترحم آمیز شرائط اس کے واسطے دامن کشادہ
چشم براہ تھیں۔ لیکن بہرصورت وہ قطعی انکاری ہو چکا تھا
اور اس مسیحا نفس نکتہ کی رضامندی کے بغیر مصیبت نصیب
محصورین کے واسطے جزیہ کی تمام راہیں دامن بدست قفل
بدہن ہو چکی تھیں۔

راجپوت اطاعت کے مقابلے میں مر مٹنے کو تیار
ہو گئے۔ مگر ان کے بعد ان کی بیویاں ان کی لڑکیاں فتح نصیب
مسلمانوں کی منکوحہ بیویاں یا مدخولہ لونڈیاں بن جائینگی۔ اس
ننگ و رسوائی سے بچنے کی صورت صرف یہ تھی کہ خوفناک
جوہر کے غیر فطری قانون پر عمل کیا جائے۔ یعنی پہلے تمام
معصوم عورتیں، بے گناہ ہستیاں بے خطا مرد، بے بس بچے
نادان بچے، جھنڈولے بچے، مذہبی قربانی کی تحت میں
جہالت پرستیوں کی مغرور و آدم خور دیوی پر ایک طرف سے
بھینٹ چڑھا دیتے جائیں۔ اور پھر تمام مرد موت کے کرۂ نار
میں اپنے پاؤں سے گھس کر دشمنوں کی بے پناہ جماعت
پر مایوسانہ حملے کریں۔ اور برباد ہو جائیں۔

عورتوں نے بلا تامل اس خوفناک بازی گاہ میں
اپنا فرض ادا کر دینے کے لئے پوری تیاری ظاہر کر دی
کیا عجب ہے کہ انہیں اپنے اندرونی جذبات کے اظہار
کی ہمت نہ پڑی ہو، اور کیسے پڑتی کہتیں بھی تو جان الگ

نہ پہنچی۔ نشانہ طعن و ہدفِ ملامت الگ بنائی جاتیں بعضوں نے سلاح جنگی و پیرہن رزمی سے آراستہ ہو کر باپ بھائیوں اور شوہروں کے سینہ بہ سینہ جنگ کرنے کی اجازت حاصل کر لی۔ پربت سنگھ کی بیوی نے جس کے مطمئن بشرہ پر خوف و پشیمانی کی چھاؤں بھی نہ تھی۔ اپنے شوہر سے کہدیا۔ کہ ہم سب عورتیں دہکتی ہوئی چتا کے اندر باہم جل کر برباد ہو جائینگی۔ تاکہ بیکنٹھ میں اپنے پیاروں سے جلدی مل جائیں مگر مسلمانوں کی لونڈیاں بننا گوارا نہ کرینگے (کاش نادان بچوں سے۔ بے زبان بچوں سے ایک ہی بار سہی ان کی مرضی بھی جھوٹے منہ پوچھ لی جاتی) رات کے وقت ایک بہت بڑی چتا آراستہ کی گئی جس میں سب سے پہلے قلعہ کے محفوظ جواہر و بیش بہا سامان پھینک دیئے گئے جس کے بعد کمسن دمسن ظالمہ و قاتلہ عورتیں اپنے معصوم بچوں کو تصویر یاس بچوں کو گودیوں میں لئے ہوئے سر بفلک شعلوں کے اندر دھا جھم کودنے لگیں یا ادلی ہوئی تلواروں پر گلوں کے بل گرنے لگیں۔ یہانتک کہ ایک راجپوتن بھی باقی نہ رہ گئی۔

اب صبح کو مردوں کی باری تھی کہ مرمٹیں اور شمشیر دشمن ان کے لئے آسان ترموت تھی۔ اعتقادی قانون کا ہر حرف مذہبی پابندیوں کے ساتھ ادا ہونا چاہیئے تھا۔ اور ہوا یعنی اُنہوں نے پوتر تلسی کی ٹہنیاں اپنے خود نما صافوں میں لگالیں۔ "سالگ رام" پتھر اپنے گلے میں باندھ لئے۔ اور سروں پر کامدار کلسیا رکھ لی۔ گویا سندر اپسارس (بیکنٹھ کی پریزادوں سے) گٹھ بندھن ہونے والی تھی۔ اب دو ہزار پانچسو قوی تن در قلعہ کے اس طرف کیسریا (زعفرانی) کپڑے پہنے ہوئے اکٹھے ہوئے۔ اور ہر ایک دوسرے سے جوش کے ساتھ گلے مل مل کر رخصت ہونے لگا۔ گویا انہیں پھر کبھی ملنے کی امید نہ تھی۔ دروازہ کھول دیا گیا۔ اور ساری فوج نے پربت سنگھ و کنور رام سنگھ (وارث و فرزند) کی سرکردگی میں اپنی صفیں درست کر کے محاصرین پر دھاوا بول دیا۔ خاصکر قلب لشکر کی طرف بھرپور زور کر رہے تھے۔ علم محمدی کا دہانی پھریرا، بادشاہ کے ریشمی خیمہ پر لہریں لے رہا تھا۔ اور جس کے ہر غرّاٹے سے "نصر من اللہ و فتح قریب" کی زلزلہ انداز آواز نکل رہی تھی۔ حملہ آوروں کا دلی منشا یہ تھا کہ ان کے قبیلہ کا ہر فرد مصیبت موت میں دوسرے کے قدم بہ قدم رہے۔ خود پربت سنگھ و رام سنگھ اپنے کمترین پیادوں کی طرح ننگے پاؤں تھے۔ صرف فرق یہ تھا کہ باپ کے سر پر کامدار چھتر، راج پاٹ کا نشان لگا ہوا تھا۔ اور راجپوتی جھنڈا بھی اُڑ رہا تھا جس پر چاند سورج سے شاہزادوں کا اُترنا سلسلہ ستارے والی گنگا جمنی خیالی تصویروں میں دکھایا گیا تھا۔ جو ساتھ ہی ساتھ دشمن کے مستقل ترین حملوں کو اپنی جانب مائل کر لینے کے لئے

بھی ایک مہلک امتیازی نشان تھا۔ مگر بہرحال مرنا سبھی کو تھا صرف یہ سوال درمیان تھا۔ کہ سورگ جانے میں کون پیش قدمی کرتا ہے۔

بے خبر مسلم صفوف کے آگے پشتۂ خاکی کا ایک نرم پردہ تھا۔ جو فراوانی تکلیف کے بغیر پہلے ہی حملہ کے نذر ہو گیا مدافعین حیران ہو گئے۔ اور راجپوت دشمنوں کے روبرو پہنچکر نہایت گھماگھمی سے خیمہ شاہی کی طرف ٹوٹ پڑے

چشم زدن میں احمد شاہ نے خیمہ سے نکل کر فیل خاص کے نقرئی ہودے میں جلوہ گری کی۔ جو دشمنوں کے اچانک حملے سے منتشر مسلم افراد کے واسطے رشتہ شیرازہ بندی الصدر بن گیا۔

پھر بھی اس میں بہت دیر ہو گئی کہ محاصرین کے تقسیم شدہ حصص قلعہ کے گرداگرد سے سمٹ کر عین کارزار میں یکجا ہو سکیں۔ اس دوران میں اسد جگر بادشاہ قلب لشکر میں جرأت و استقلال سے کھڑے ہوئے اپنے جرأت فروش نعروں اور ہمت بخش اشاروں سے فوج کا دل بڑھا رہے تھے۔ اور گاہے بہ گاہے کمان کیانی دست حق پرست سے زہ کر کے بڑھتے ہوئے راجپوتوں کی جانب ناوک موت و تیر بے خطا رہا کر دیتے تھے۔ مگر کمی جماعت کی بدولت، موت و اسیری کے خدشہ سے خود بھی خالی نہ تھے جب، دستہ محافظین کے ہر فرد نے فیل خاص کے آگے سینہ سپر ہو کر پیمان بزرگی کے ساتھ حق نمکخواری ادا کر دیا۔ تو اسی وقت اس کھیت میں دوسرے تازہ وارد تمن نے ان کی جگہ لے لی۔

راجپوت ابتک بڑھے آ رہے تھے۔ اگرچہ ان کی پیش روی ہر بار ایک ایک انچ سے زائد نہ تھی۔ آخرکار وہ لوگ شاہی فیل کے سامنے پہنچ گئے۔ جس کا ہودہ انہیں کے رہا کردہ نیزہ و تفنگ کے بے ترتیب گچھوں سے رشک چمن ہو رہا تھا۔

اس موقع پر نوجوان رام سنگھ کی وحشیانہ جرأت نے راجپوتوں کی سزا کے تصویر کے موہوم خدوخال پر پوری اور آخری رنگ آمیزی کر دی ناکردہ کار نے شاہی فیل کے زیر شکم پہنچتے ہی نقرئی ہودے کی داہنی ریشمی رسّیاں تلوار سے کاٹ دیں۔ ہودا دوسری جانب تیزی سے سرک گیا۔ اور گو ہر خاتم فیل نگین خاک بن گیا اُسی حالت بے بسی میں شعار جرأت و تقاضائے جوانمردی کے خلاف خود رام سنگھ اور دوسرے بڑھتے ہوئے راجپوتوں نے غزال فریب کجکلاہ پر چیتوں کی طرح حملہ کر دیا۔ مگر کچھ بھی نہ بنا سکے۔ ممدوح اپنی دو رخی ہلالی جلالی تلوار کھینچے ہوئے برق کی طرح تڑپ کر اُٹھے۔ اور بمثل پھکیت تلواریوں کی طرح چھوٹ کے ہاتھ چلا کر اس وقت تک یکساں مدافعت کرتے رہے۔ جبتک کہ اور غلامان محافظ

کی کافی تعداد نہیں پہنچ گئی۔

اسی دوران میں محیط جنگ کا طوفانی جزر و مد بھی عارضی طور پر سکون پذیر ہوکر اپنا رخ بدلتا گیا۔ اور حلقہ حلقہ کے گوشہ گوشہ سے تازہ دم دستے جمع ہوتے گئے خیمۂ شاہی کے قلب میں (جہانتک راجپوت اپنے پہلے حملہ میں پہنچ گئے تھے) اب مسلمان سپاہی سینہ بہ سینہ دست بدست پہلو بہ پہلو مجتمع ہو گئے۔ یہانتک کہ ان کی ہلالی بدر خیمہ کے گرد نصف ہالہ بن گئی۔

اب راجپوت بھی ایک ہی حلقہ میں ہوکر مقتولین کی دیواروں کی آڑ پکڑ کر اسد شکار دشمنوں سے اپنی حفاظت کرنے لگے۔ اب ان میں ایک قدم بڑھنے کی بھی طاقت نہ تھی۔ ان کی محدود تعداد لمحہ بہ لمحہ کم و کمتر اور گردش حلقہ حملہ بہ حملہ تنگ و تنگتر ہوتی جارہی تھی۔ تلواریں ٹوٹ چکی تھیں۔ خنجروں میں دندانے پڑ گئے تھے۔ ترکش خالی ہوچکے تھے۔ بھالوں کی باڑیں مڑ چکی تھیں۔ اور مسلسل کارزار سے دست و بازو شل ہوتے جارہے تھے۔ اس لئے اُنھوں نے فرض حملہ دشمنوں یا حقداروں کے سپرد کرکے محض مدافعت پر قناعت کرلی تھی۔ کچھ بھی سہی ابتک راجپوتوں کا ایک دستہ مایوسانہ جرأت سے مسلمانوں کی فولادی صفوف میں گھس جاتا تھا۔ اور بقدر حوصلہ کشت و خون کے بعد اسی گھیرے میں اپنے وضع کردہ حریص موت کے گھاٹ اُترکر شمشیر دشمن کی باڑ میں جلا دے جاتا تھا۔ پربت سنگھ کا چھتر و جھنڈا شور کارزار میں ابتک گرد آلود عنوان سے بلند تھا۔ گو بے چین مسلمان اس کے گرادینے یا چھین لینے کے لئے بہت سے روح فرسا مستقل حملے کرچکے تھے جس وقت پربت سنگھ اس خوفناک گھمسان میں اپنے سورما بزرگوں کا نام زندہ کرکے جانباز سپاہیوں کے جھرمٹ میں قالب بے جاں ہوکر فرش زمین ہوگیا۔ فوراً کنور رام سنگھ نے چھتر کے زیر سایہ جگہ لے کر مایوس راجپوتوں میں نیا جوش پیدا کردیا۔ اب اس نے ایک خان سے (جو معرکہ میں بدیر آیا تھا) بڑھ کر تلوار چھین لی۔ اور اس نئے آلہ قتل سے تین دشمنوں کا کام تمام کردیا۔ یہانتک کہ وہ خود اور اس کا وہ طلائی جھنڈا جس میں چاند و سورج کے غرور آمیز خاکے بنے ہوئے تھے۔ سرنگوں کردیا گیا۔

خوفناک جنگ ختم ہوگئی۔ جانبین کے پانچہزار مقتولین پر گرد و غبار کی نرم و گداز چادر پڑ گئی۔ اب مسلمانوں کے طوفان نواز "اللہ اکبر" زلزلہ انداز "اللہ اکبر" کے جواب راجپوتوں کے "ہر ہر مہادیو" والے نعروں سے نہیں دیتے جاتے تھے۔ قلعہ آہور کی تمام تر فوج گنج شہیداں میں برباد ہوچکی تھی۔ مگر مرتے مرتے بھی اُنھوں نے برابر یا زیادہ کی تعداد میں مسلمانوں کو اپنا ہم سفر و ہمنشیں بنالیا تھا (دوسرے معنوں میں ایک جنگ ابھی اور باقی تھی۔

وہ زندوں کی لڑائی تھی جو ختم ہوگئی۔ اور مُردوں کی زرگری جنگ دیکھتے کبتک ہوتی رہے)

احمد شاہ غیر محفوظ قلعہ میں اپنی بیش قیمت گراں مفتوح راجپوت دُلہن کو ساتھ لے جانے کے خیال سے داخل ہوتے۔ تو انہیں قدم رکھتے ہی شہر خموشاں یا گورِ غریباں نظر آیا جس کے اندر باہر کی تمام ہوا بوئے سوختگاں سے بسی ہوئی تھی۔

اس جگہ اور دیگر موقعوں پر بھی راجپوتوں نے عملاً دکھا دیا۔ کہ وہ ننگ غلامی پر موت کو ترجیح دیتے ہیں اور ان کی بہادرانہ موت نے جس میں مرد و زن سبھی شامل تھے آنے والی نسلوں میں وہ ناقابلِ تسخیر روحانیت پیدا کردی جو ان کی آزادی کو زبردست مغلوں کے پنجہ سے ہمیشہ بچاتی رہی۔

(۲)

ذکی الحس احمد شاہ، نازک مزاج احمد شاہ، الم نصیب احمد شاہ! نتائج محبت سے متاثر ہو کر ایک عرصہ تک پیکر حرماں و مجسمہ یاس بنے رہے۔ ہاں اس وقت ان کی پژمردہ امیدوں میں نئے سر سے جان آگئی مرجھائی ہوئی کلیاں کھِل اُٹھیں۔ جب اُنہوں نے ایک معتبر جاسوس سے یہ مسرت اثر خبر پائی۔ کہ دلفریب لالہ آہور والی چتا میں جل کر خاک نہیں ہوئی بلکہ وہ پری جمال محاصرہ کے پہلے ہی پوشیدہ طور پر قلعہ سے باہر بھیجکر ایک راجپوت سردار کے سپرد کردی گئی تھی۔ جس کی عزّت و وفا خودداری وحیا پر پربت سنگھ کو پُورا بھروسہ تھا۔

نفتہ جگر تاج نصیب شاہ نے یہ سُنکر تسخیر دوشیزہ کے لئے نئی تیاریوں کا حکم دیدیا۔ جسے وہ عروس خاص بنانے کا مستحکم ارادہ مصمم قصد کرچکے تھے۔ "محافظ عروس" نے چاہا کہ شاہی طاقتوں کے سامنے بھی امانت نواز دوشیزہ کی مدافعت حتی المقدور کی جائے۔ مگر خود لالہ نے اب اور زیادہ قتل و خون کا سبب بننا پسند نہ کیا۔ اور صاف کہہ دیا کہ "جب بادشاہ مجھے بیاہنے پر تلے ہی بیٹھے ہیں تو انہیں کامیاب ہوجانے دو۔ اور رام کرے وہ اس کامیابی پر کبھی نہ پچھتائیں۔

دوشیزہ نے محض وعدہ ہی پر اکتفا نہ کی بلکہ ایک نہایت بیش قیمت زردوز شاہانہ جوڑا جس میں آبدار جواہر بکثرت ٹکے ہوئے تھے۔ احمد شاہ کی خدمت میں یوم عروسی کو زیب تن کرنے کے لئے بھیجدیا۔ راجپوتوں نے اس آزادانہ حرکت پر، کمینہ فطرت کنّیا کو بہت لعنتیں ملامتیں کیں۔ کہ افسوس! تو بربادکن خاندان سے پیوند ہونے کے لئے اسقدر بے چین ہے۔ اور دُلہن بھی اس ظالم کی بننا چاہتی ہے جس کے ہاتھ تیرے پدر و برادر کے ناحق خون سے رنگے ہوئے ہیں۔

یہ تقریب خانہ آبادی محل شاہی کے مرمریں سائبان میں برپا ہونے والی تھی۔ جو روپہلی جھیل کے عین لبِ ساحل واقع تھا۔ سیاسی اصول اور ذاتی وجوہ کو مدِنظر رکھتے ہوئے شان رسم نہایت بلند ہو جاتی تھی۔ اس لئے کہ آئندہ یہی دعوتِ عمل امن و سکون کی حقیقی دعوت بن جائیگی۔

سرِیرآرا کو محض اپنی خواہشات کی تکمیل منظور نہ تھی۔ بلکہ اسی تحت میں یہ امید افزا راز بھی مضمر تھا کہ ہندو مسلم کی روحانی یکجہتی کے بعد میرے زیرنگیں قلمرو میں متحدہ حکومت کی فرمانروائی بھی داخل ہو جائیگی۔ تکمیل مقصد مذکور کے لئے اُن تمام راجپوتوں کے نام پروانہ جان بخشی جاری و عطا ہوگیا جو کبھی بھی حکومت کے خلاف باغیانہ سازشوں میں شریک رہ چکے تھے۔ شادی حتے الوسع ہندو مراسم کے ماتحت منعقد ہوئی۔ اور ہزاروں برہمن اس پاک موقع پر شکم سیری کے ساتھ کھلا دئے گئے۔

" دیکھئے! آخر احمد شاہ اپنی خواہشات کی معراج قریب بلندی پر پہنچ گئے ہیں۔ آج شادی کا دن ہے وہ اور لالہ پہلو بہ پہلو چاند و سورج کی شان سے مسند آرا ہیں۔ گلوئیں گل وجواہر کے ہار پڑے ہوتے ہیں۔ جادو نگاہ دلہن ریشمی محرم اور مخملیں پیرہن میں ملبوس ہے۔ جس پر آب رواں کا ایک باریک دوپٹہ حباب حسن کا نظر نواز حسین حجاب بنا ہوا آڑا ترچھا پڑا ہوا ہے۔ جس پر سرخ رنگ کے پھول پتے، انگاروں کی طرح دہک رہے ہیں۔ وہی دوپٹہ پتلی لچیلی کمر کا حلقہ بننے کے بعد سر تک بندھا ہوا ہے۔ جو سہ پہلوی تاج نما کلاہ سے ڈھکا ہوا ہے۔ پیرہن زیب دولہا بھی، لالہ کے آج ہی صبح بھیجے ہوئے نفیس ترین زردوزی پوشاک میں ملبوس ہے۔ جس میں جابجا شعلہ مزاج لعل، دہک رہے ہیں راسخ الاعتقاد مسلم افراد کے خلاف مرضی، احمد شاہ نے نہایت مختصر طرز عقد اختیار کر لیا یعنی ایک ہاتھ میں تلسی کی پاک ٹہنی، دوسرے میں لالہ کا ہاتھ تھام لیا۔ اور بس دونوں ہمیشہ کے لئے میاں بیوی ہو گئے۔

ختم رسم کے بعد لالہ نزاکت و متانت سے اُٹھتی ہے۔ شوہر کا ہاتھ تھام کر اس مرتفع شہ نشین تک لاتی ہے جو روپہلی جھیل کے عین بالائے سر ہے۔ اور کہنے لگتی ہے۔ " میرے مالک ذرا دیر کے لئے دھوپ میں کھڑے ہو کر اپنی وفادار رعایا کو اپنا جمال جہاں سوز دکھا کر مسرور فرما دیجئے اور واقعی حب مست مسرت، بیدار بخت خفتہ نصیب احمد شاہ نے دیکھا۔ کہ حد نظر تک ہزارہا خوش پوش، رعایا تعطیلی لباس پہنے ہوئے دید شاہی پر نعرہائے خوشی بلند کر رہی ہے۔ تو فانی دل غرور مسرت سے پھول کر دامن سینہ میں تنگ ہوگیا۔ واقعی اس وقت ساری جھیل اور اس کی تمام گھاٹیاں اسی کی رعیت سے بھری ہوئی ہیں اور جہانتک نگاہ جاتی ہے کوئی سبزہ زار کوئی میدان کوئی وادی کوئی پہاڑی

ایسی نظر نہیں آتی جو اپنے احاطہ سلطنت کی وسیع حدود سے باہر ہو۔

سب سے بڑھکر وہ اپنی دلفریب عروس کی تسخیر پر نازاں تھا۔ جو بازوؤں کا تمام زور صرف کر کے ایک نہایت جنگجو قوم کے سخت پنجے سے ہزاروں بے گناہ ہستیاں ضائع کر کے حاصل کی گئی تھی۔

مگر جب دوشیزہ نے آنکھیں ملائیں تو ان میں ایک عجیب الاثر جذبہ جھلک رہا تھا۔ جو یقیناً "حجاب عروسانہ" سے امتیازی شان رکھتا تھا۔ "میرے مالک! اس مسرت بیز گھڑی کے مزے جبتک یہ باقی ہے اُٹھا لیجئے مگر یاد رکھئے کہ جس وقت انسان اپنی انتہائی فارغ البالی پر ہوتے ہیں۔ اسی وقت دیوتاؤں کی منتقم نگاہیں انکے شباب مسرت کو لگ جاتی ہیں۔ جو ابھی ابھی صحت و جوانی و محبت کے کمال پر ہیں۔ ایک دن۔ نہیں۔ ایک منٹ میں کچھ بھی نہیں رہ جاتے۔"

سرشار محبت نے جواب میں اک شیریں تبسم پر اکتفا کی۔ غریب دُولہا! اپنی سحر طراز دُلہن کی جادو بھری ہستی میں اتنا محو تھا کہ لالہ کا ہر کام ہر لفظ، اس کی آنکھوں میں عروس کی دلفریبی و دلکشی بڑھاتا ہی جاتا تھا۔

سائبان والے مصاحبین اور فصیل والے حاضرین نے نیچے سے دیکھا کہ شاہی پوشاک کے لعل جن پر آنکھیں نہیں ٹھیرتیں شعلوں کی طرح چمک رہے ہیں۔ یکایک آنکھیں جھپک جاتی ہیں۔ اور وہ لوگ کمال یاس و ہراس سے کیا دیکھتے ہیں۔ کہ دُولہا کے داہنے بازو سے آگ کا ایک اصلی شعلہ ہوا میں لپکے لے رہا ہے۔ وہ مشکل سے اپنی آنکھوں پر اعتبار کر سکے۔ مگر واقعیت کی شان مسلّم تھی۔

ہندی آفتاب کی بے پناہ شورش نے اُن غیر محسوس اجزائے سمیّت پر اپنا کام کرنا شروع کر دیا تھا۔ جو بے رنگ و بو روغن کی شکل میں آتش بدامن لالہ نے اپنے دُولہا کے شہانہ جوڑے میں اپنے ہاتھوں سے جی کھول کر مل رکھا تھا۔

احمد شاہ معرکۂ رزم میں شیر صولت بہادر ضرور تھے۔ مگر اس وقت اپنی ہی محبوب دُلہن والی تجویز کردہ موت کے صدمات ان کو معمولی انسانوں کی سطح پر کھینچکر لے آئے تھے۔ انھوں نے درد سے بے چین ہو کر جگر خراش چیخیں ماریں اور وحشیانہ طور پر دوڑنے لگے۔ کہ جلتے ہوئے گوشت سے شعلہ جوالہ پیرہن عروسی کو پھاڑ کر پھینکدیں مگر اس دوا دوش کا سہارا پا کر خوفناک شعلے چشم زدن میں سارے جسم پر دوڑ گئے۔ اور تھوڑی ہی دیر بعد غرور پسند نفیس مزاج بادشاہ اپنے زرنگار ملبوس کے ساتھ محض سیاہ کوئلوں کا ایک عبرت انگیز ڈھیر بن کر رہ گیا۔

اسی دوران میں داغ پرست لالہ شہ نشین پر چڑھ

چکی تھی۔ اور اپنے دولہا کی مشکلات مرگ، رنج و خوشی، اطمینان و بے چینی سے دیکھ کر دل ہی دل میں مطمئن ہوگئی تھی کہ آج پدر و برادر کے خون کا بدلہ اور بربادیٔ نسل کا انتقام پورا ہوگیا۔ اب کیا تھا وہ مسکرائی اور روپہلی جھیل کی گہرائیوں میں سر کے بل جھم سے کود گئی۔

(مفہوم ماخذ) **طالب الہ آبادی**

سودائے خام

ساقی ہو دلنواز   نغمہ ہو جانگداز   ساقی کا روٹھنا   ساغر کا ٹوٹنا
مطرب سے بے نیاز   چشمے بجائیں ساز   چھلّوں کا چھوٹنا   قسمت کا پھوٹنا

منظر ہو فتنہ خیز   بلبل ترانہ ریز   آفت کی وہ گھڑی   محشر سے بھی کڑی
پھولوں میں بوئے تیز   ہر شاخ عطر بیز   حسرت سی چھاگئی   افسردہ ہر کوئی

غم کا نہ ہو نشاں   نہرِ خوشی رواں   پھر گونجے قہقہے   بلبل سے چہچہے
جوبن پہ گلستاں   فردوس کا سماں   ساغر نہیں ملے   چلّو ہی بھر لئے

ہر غنچہ پر حجاب   ہر چہرے پر نقاب   بوندیں پڑیں اِدھر   محشر بپا اُدھر
ہر ڈالی پر شباب   ہر پھول لاجواب   ساقی ہو اک نظر   بدلے میں دِل جگر

نرگس فسوں طراز   سوسن زباں دراز   بادل کی گڑگڑاہٹ   بجلی کی کڑکڑاہٹ
گلچیں سے بے نیاز   ہوں محوِ رقص ناز   رندوں کی تلملاہٹ   کچھ خوف کی ملاوٹ

بوتل کی قاہ قاہ   رندوں کی واہ واہ   عنقا ہوا سکوں   سر کو چڑھا جنوں
محشر ہو اِک بپا   ہر لب پہ یہ صدا   ہر لب پہ ہائے کیوں   مَیں تشنہ لب مروں

ساقیٔ خوبرو   صدقۂ حسن تو   فرقت کا ہو نہ ڈر   غم کا نہ ہو گزر
بھر بھر کے دے سبو   بر آئے آرزو   دنیا سے بے خبر   ہو عمر یوں بسر

محمد والا گوہر

"یوم یکشف عن ساق"

ایک دن ہر ساز سرتا پا صدا ہو جائیگا ایک دن ہر راز رازِ برملا ہو جائیگا
ایک دن ہر جزو کل کا امتیاز اُٹھ جائیگا ایک دن ہر قطرہ دریا میں فنا ہو جائیگا
ایک دن ہر خار و گل کا امتیاز اُٹھ جائیگا ایک دن ہر ذرہ مہر جلوہ زا ہو جائیگا
ایک دن ہر رنج راحت انتما بن جائیگا ایک دن ہر دُکھ ہم آغوش دوا ہو جائیگا
ایک دن ہر قہر لطف جانفزا بن جائیگا ایک دن ہر زہر تریاقِ شفا ہو جائیگا
ایک دن ہر کفر و دیں کی کشمکش مٹ جائیگی ایک دن ہر شبہ و شک کا فیصلہ ہو جائیگا
ایک دن ہر این و آں کی چپقلش مٹ جائیگی ایک دن ہر پیش و پس کا خاتمہ ہو جائیگا
ایک دن ہر ساز سے اس کی صدائیں آئینگی ایک دن نغمات کا طوفاں بپا ہو جائیگا
ایک دن ہر سمت آنکھیں اس کو پیدا پائینگی ایک دن عالم کا عالم ہی نیا ہو جائیگا
ایک دن ہر باب الطاف و کرم کھل جائیگا ایک دن ہر روک ہٹ کر راستا ہو جائیگا
ایک دن ہر لن ترانی کا بھرم کھل جائیگا ایک دن ہر پردہ اُٹھ کر سامنا ہو جائیگا
ایک دن ہر گفتگو کی ہمتیں بڑھ جائینگی ایک دن ہر مطلب بیجا بجا ہو جائیگا
ایک دن ہر آرزو کی ہمتیں بڑھ جائینگی ایک دن ہر امر ناجائز روا ہو جائیگا
ایک دن ہر رنج الفت کا صلا مِل جائیگا ایک دن ہر وعدۂ الفت وفا ہو جائیگا
ایک دن ہر شوق مُنہ مانگی مُرادیں پائیگا ایک دن ہر حسرتِ دل کا بھلا ہو جائیگا
ایک دن ہر دوریِ فانی کے غم مٹ جائینگے ایک دن ہر صدمۂ باقی فنا ہو جائیگا
ایک دن ہر بُعد جسمانی کے غم مٹ جائینگے ایک دن ہر قرب روحانی عطا ہو جائیگا
ایک دن تقدیر بالکل راہ پر آجائے گی ایک دن بخت رسا بخت رسا ہو جائیگا
ماحصل یہ ہے کہ ہر امید بر آجائیگی مختصر یہ ہے کہ ہر فضلِ خدا ہو جائیگا
بس اب اے آزاد تصریحِ مزید اچھی نہیں جا اور اطمینان رکھ۔ جو کہدیا ہو جائیگا

آزاد انصاری

ایک پاگل کا قلمی نوشتہ

ہاں - دیوانہ! آج سے کچھ سال پیشتر یہ لفظ مجھے کس طرح پریشان کر دیتا تھا۔ کس طرح اس لفظ سے مجھ پر وحشت طاری ہو جاتی تھی۔ اور کس طرح میرا خون ایک سنسناہٹ کے ساتھ رگوں میں دوڑنے لگتا تھا۔ حتٰے کہ سرد پسینے کے بڑے بڑے قطرے میری جبین پر نمودار ہو جاتے۔ اور ڈر کی وجہ سے میرے گھٹنے آپس میں ٹکرانے لگتے۔

اب میں اسے پسند کرتا ہوں بہت پسند کرتا ہوں۔ یہ ایک پسندیدہ نام ہے۔ کوئی بادشاہ مجھے ایسا دکھا دو جس کے تیور دیوانے کی خوفناک چمکیلی آنکھوں سے زیادہ دہشت پیدا کر سکتے ہوں۔ جس کی دار و رسن ایک دیوانے کی گرفت سے زیادہ مضبوط ہو۔ دیوانگی! دیوانگی نہایت شاندار چیز ہے۔ اہو ہو ایک وحشی شیر ببر کی طرح سلاخوں میں دکھائی دینا۔ رات کے سکوت کو اپنی بھاری زنجیروں کی جھنجھناہٹ میں موسیقی کے دلگداز نغموں سے زیادہ حظ حاصل کرنا اور پھر اس خوشی سے بیخود ہو کر گھاس پر لوٹنا گھاس اوڑھنا گھاس بچھانا کیا عمدہ نزہت ہے۔ جے پاگل خانے کی جے یہ ایک نادر جگہ ہے۔

میرے دل میں ان دنوں کی یاد باقی ہے جب میں دیوانگی سے خوف کھاتا تھا۔ جب میں سوتے سے چونک چونک اُٹھتا تھا۔ اور گھٹنوں کے بل ہو کر دعا مانگتا کہ اے رب العالمین مجھے اس موروثی لعنت سے نجات دے۔

جب مَیں خوش و خرّم محفلوں سے دُور بھاگتا تھا تاکہ کسی سکوت جگہ میں چھپ جاؤں۔ جب مَیں پہروں اس خوفناک بیماری کو ترقی کرتے دیکھتا ایک دن میرے دماغ پر مسلّط ہو کر اسے ضائع کر دینے والی تھی۔ مَیں جانتا تھا کہ جنون میرے خون میں پنہاں ہے۔ اور یہ مجھے باپ کی طرف سے وراثت میں ملا ہے۔ مَیں جانتا تھا کہ اس کا جوہر میری ہڈیوں میں موجود ہے۔ مَیں جانتا تھا کہ جو ہوتا رہا ہے وہ ہو رہا ہے۔ اور ہوتا رہیگا۔

جب کسی بھری محفل سے آنکھ بچا کر کسی گوشے میں چھپنے کی کوشش کیا کرتا تھا۔ مَیں لوگوں کو اپنی طرف انگشت نمائی اور سرگوشی کرتے دیکھتا تو جان لیتا تھا کہ وہ آپس میں میرے آنے والے جنون کے متعلق باتیں کر رہے ہیں۔ اور میں چپکے سے ٹل جاتا تھا۔ تاکہ تنہائی میں اپنی بدقسمتی پر روؤں۔ چلاؤں۔

"میرا برسوں یہی عملن رہا۔ وہ سال بہت ہی طویل

تھے۔ یہاں بھی اکثر راتیں طویل ہوتی ہیں۔ مگر ان بے چین راتوں اور ان دہشتناک خوابوں سے ان کو کوئی نسبت نہیں میرا خون ان کی یاد آتے ہی منجمد ہونے لگتا ہے۔ بڑی بڑی ڈراؤنی شکلیں اپنی بدقطع اور قبیح صورتوں کو لئے ہوئے کونے کونے سے نمودار ہونے لگتیں۔ بڑھتے بڑھتے میرے بستر پر چھا جاتیں اور مجھے جنون پر اکساتیں۔ میرے کانوں میں نہایت دھیمی آوازیں کہتیں کہ ہمارے گھر کا فرش جس پر میرا باپ فوت ہوا تھا اس خون سے رنگا ہوا ہے۔ جو اس نے جنون کے جوش میں بہایا تھا۔ میں اپنے کانوں میں انگلیاں دے لیتا مگر وہ چیخ چیخ کر کمرہ کو سر پر اٹھا لیتیں۔ وہ مجھے سناتیں کہ میرا دادا کئی برس تک ہاتھوں اور پاؤں میں زنجیریں لئے رہا تاکہ وہ ناخنوں سے خود اپنے ٹکڑے نہ کر ڈالے۔ میں جانتا تھا کہ وہ ٹھیک کہتی ہیں۔ ہاں یہ میں اچھی طرح جانتا تھا۔

آخر کار جنون ترقی کرتے کرتے مجھ پر قابض ہو گیا۔ اور میں حیران ہوتا تھا کہ میں اس سے کیوں خوف کھایا کرتا ہوں۔ اب میں دنیا والوں میں آجا سکتا تھا اور ان میں سے بہترین لوگوں کے ساتھ ہنس کھیل سکتا تھا۔ میں جانتا تھا کہ میں دیوانہ ہوں مگر ان کو اس بات کا بالکل شبہ نہ تھا۔ میں اس عمدہ کھیل کا خیال آتے ہی جو میں ان کے ساتھ کھیل رہا تھا کس طرح خوشی میں اپنے آپ سے بغلگیر ہوا کرتا تھا! کیونکہ وہ کچھ عرصہ پیشتر مجھ پر انگشت نمائی کرتے ہوئے ہنس دیا کرتے تھے۔ جب میں پاگل نہ تھا۔ تو وہ صرف ڈرتے ہی تھے۔ کہ کہیں میں سچ مچ دیوانہ نہ ہو جاؤں۔

جب میں تنہا ہوتا تھا تو میں کس طرح خوشی سے ہنسا کرتا تھا۔ اور خیال کیا کرتا تھا کہ کس خوبی سے میں نے اپنے راز کو پوشیدہ رکھا ہے۔ میرے دوست کس تعجیل کے ساتھ مجھ سے کنارہ کش ہو جاتے۔ اگر وہ اس حقیقت سے آگاہ ہوتے۔

اور جب میں اکیلا کسی خوش رو زندہ دل نوجوان کے ساتھ بیٹھ کر ماحضر تناول کیا کرتا تو خیال کرتا کہ اگر اس نوجوان کو معلوم ہو جاتے کہ اس کا عزیز دوست جو اس کے ساتھ ہی بیٹھا ہوا چاقو تیز کر رہا ہے اپنی تمام قوت سے دیوانہ ہے۔ اور اس کے دل میں یہ خیال ادھورے طور سے جاگزین ہو گیا ہے۔ کہ چاقو کو اس کے دل میں اتار دے تو وہ کس قدر زرد پڑ جاتا اور کس قدر جلدی بھاگ جاتا میں یہ خیال آتے ہی کھلکھلا کر ہنس پڑنے سے بمشکل رک سکتا تھا۔ آہ وہ کیسی پسندیدہ زندگی تھی۔

میں امیر ہو گیا۔ مجھے بیشمار دولت مل گئی اور میں خوشی سے عیش و عشرت میں ڈوب گیا۔ میری خوشی اس خیال سے اور بھی بڑھ گئی کہ میں ایک اہم راز کو چھپائے ہوئے ہوں۔ ہزار گنا زیادہ ہو گئی تھی۔ مجھے ایک بڑی جائداد مل گئی تھی۔ قانون۔ آہنی قانون عقاب کا سا تیز نظر قانون

دھوکے میں آگیا۔ اور ہزاروں روپے بغیر کسی جھگڑے کے مجھے مل گئے۔ کہاں تھی صحیح العقل تیز فہم لوگوں کی معاملہ فہمی کہاں تھی چالاک وکیلوں کی چالاکی جو نقائص نکالنے میں بڑے مشاق ہوتے ہیں۔ ایک مفتن دیوانے کی عیاری نے سب کو فریب دے دیا۔

جب میں دولتمند تھا تو لوگ کس طرح میری خوشامد کیا کرتے تھے۔ میں اس دولت کو بجا اور بیجا طور پر صرف کیا کرتا تھا۔ میری کس طرح تعریف ہوا کرتی تھی۔ کس طرح وہ تینوں مغرور اور متکبر بھائی میرے سامنے عاجز ہو گئے۔ عزت! توقیر!! رفاقت!!! دوستی کس طرح وہ بوڑھا آدمی میری پرستش کرنے لگا! اس کی ایک لڑکی۔ اور ان نوجوانوں کی ایک بہن تھی۔ اور وہ پانچوں مفلس تھے۔ میں امیر تھا اور جب میں نے اس لڑکی سے شادی کی میں نے انکے چہروں پر ایک فاتحانہ تبسم کھیلتا ہوا دیکھا۔ کیونکہ انہوں نے اپنے منصوبوں اور تدابیر کو پروان چڑھتے دیکھا تھا لیکن مسکرانا مجھے چاہیئے تھا۔ مسکرانا اور قہقہہ لگا کر ہنسنا' بالوں کو نوچنا۔ فرش پر لوٹنا اور خوشی سے چیخیں مارنا یہ سب کچھ میرا حق تھا وہ کیا جانتے تھے کہ انہوں نے اپنی بہن ایک دیوانے کو بیاہ دی تھی۔

ٹھہرو! اگر وہ جانتے تو کیا وہ اسے بچا لیتے؟ کیا ایک بہن کی خوشی اس کے خاوند کی دولت کے مقابلہ میں بہت ہلکی نہ تھی۔

ایک چالاکی کے باوجود مجھے دھوکا ہوا۔ گو دیوانے بہت تیز فہم ہوتے ہیں۔ مگر کبھی کبھی وہ بھٹک جاتے ہیں اگر میں پاگل نہ ہوتا تو مجھے معلوم ہونا چاہیئے تھا کہ وہ لڑکی ایک قابل رشک امیر بیوی بننے کے بجائے اپنے تئیں ایک قبر میں ایک سفید کفنی میں ملبوس ہونا زیادہ پسند کرتی ہے۔ مجھے جاننا چاہیئے تھا کہ اس کا دل اس سیاہ آنکھوں والے لڑکے کے ساتھ ہے۔ جس کا نام میں نے اسے خواب میں لیتے ہوئے سنا تھا۔ مجھے جاننا چاہیئے تھا۔ کہ وہ سفید ریش ضعیف باپ کی مفلسی پر بھینٹ چڑھا دی گئی ہے۔

مجھے اب شکلیں یاد نہیں پڑتیں مگر میں جانتا ہوں کہ وہ لڑکی قبول صورت تھی۔ میں اچھی طرح سے جانتا ہوں کہ وہ حسین تھی۔ کیونکہ چاندنی راتوں میں جب میں خواب میں چونک اٹھتا ہوں۔ اور میرے ارد گرد سکوت ہوتا ہے۔ تو ایک لاغر اور افسردہ شکل اپنی کبھی نہ بند ہونے والی آنکھوں سے میری طرف ٹکٹکی باندھے دیکھا کرتی ہے اسکے لمبے لمبے بال اس کے شانوں اور کمر پر پڑے ہوتے ہیں جن کو کوئی دنیاوی ہوا متحرک نہیں کرسکتی۔ میں اسے اپنی کوٹھڑی کے ایک کونے میں بے حس و حرکت کھڑی دیکھا کرتا ہوں اوہ۔ خون میرے دل میں منجمد ہونے لگتا ہے۔ وہ شکل اس کی ہے۔ اس کا چہرہ زرد ہوتا ہے۔ اس کی آنکھیں [illegible] کی طرح

چمکتی ہیں۔ وہ شکل کبھی متحرک نہیں ہوتی۔ اور کبھی دوسری شکلوں کی طرح جو کبھی کبھی اس کی قائم مقام ہو جایا کرتی ہیں۔ مجھے گھورا نہیں کرتی۔ اور نہ مجھ پر ہنسا یا کرتی ہے لیکن وہ اُن آسیبوں سے بھی وحشتناک ہے۔ جو مجھے کئی سال ہوئے درغلایا کرتے تھے۔ کیونکہ یہ تازہ تازہ قبر سے آتی ہے۔ اور اس کی شکل کسقدر خوفناک ہوتی ہے۔ ایک سال کی مدت تک میں اس چہرہ کو روز بروز زردی مائل ہوتے دیکھا کیا۔ اور ایک سال تک میں ان آنکھوں سے آنسو بہتے دیکھا کیا۔ مگر اس کا سبب؟ اس کا سبب مجھے معلوم نہ تھا لیکن مجھے پتہ چل گیا۔ اور وہ زیادہ عرصہ مجھ سے اس کی وجہ نہ چھپا سکی۔ اس نے مجھے کبھی پسند نہ کیا تھا۔ اور میں بھی ایسا ہی خیال کرتا تھا۔ وہ میری دولت سے متنفر تھی اور اس شان وشوکت سے بالکل بے پروا۔ یہ میں نے کبھی خیال نہ کیا تھا۔ مگر وہ کسی اور سے محبت کرتی تھی۔ اس بات کی مجھے کبھی امید نہ تھی۔

عجیب وغریب خیالات مجھے آنے لگے۔ اور کوئی مخفی طاقت مجھ پر قابو پانے لگی۔ عجیب عجیب خیالات میرے دماغ میں چکر لگانے لگے۔ مجھے اس سے نفرت نہ تھی۔ گو میں اس لڑکے سے نفرت کرتا تھا۔ جس کے واسطے وہ ابھی تک روتی تھی۔ لیکن مجھے اس پر رحم آتا تھا۔ ہاں! ہاں!! مجھے اس کی اس اندوہناک زندگی پر رحم آتا تھا جس کا سبب اس کے بھائیوں اور باپ کی خود غرضی اور کمینہ پن تھا۔ میں جانتا تھا کہ اس کی زندگی زیادہ عرصہ نہیں مگر اس خیال نے کہ وہ اپنی موت سے پہلے کسی بدبخت بچے کی ماں نہ بن جائے دیوانگی کی تمام قوتوں کو میرے اندر از سرِ نو زندہ کر دیا تھا میرے جنون کا فیصلہ اٹل تھا۔ میں نے پختہ ارادہ کر لیا کہ اسے قتل کر دوں۔

کئی ہفتے تک میں زہر کا خیال کرتا رہا۔ اور پھر ڈبو دینے کا اور پھر جلانے کا آہا! عالیشان مکان کا تمام تر شعلوں سے گھرا ہوا ہونا اور میری بیوی۔ دیوانے کی بیوی کا اس کے درمیان جلنا کیا ہی عجیب اور خوشنما منظر تھا۔ ذرا اس بڑے انعامی مذاق کا خیال تو کرو یہ کام اگر کسی صحیح العقل آدمی کو دیا جاتا تو اس سے کبھی نہ ہو سکتا۔ ہاں یہ ایک اہم کام دیوانہ ہی انجام دے سکتا ہے۔

میں اکثر اس کا خیال کرتا رہا۔ مگر پھر اسے بھی چھوڑ دیا مجھے ایک استرے کو تیز کر کے اس کی دھار کو دیکھتے ہوئے اس خیال سے کہ اس باریک اور چمکدار دھار سے ایک ہی وار میں کیسا کاری زخم لگ سکتا ہے کیسی خوشی ہوا کرتی تھی

آخر کار وہ تمام شکلیں اور آسیب جو اکثر میرے ساتھ رہا کرتے تھے مجھ سے سرگوشیاں کرنے لگے مجھے اُکسانے لگے کہ اب وقت آگیا ہے۔ اُنہوں نے کھلا ہوا استرہ میرے ہاتھ میں دے دیا۔ میں نے اسے مضبوطی سے پکڑ لیا

بستر پر سے آہستہ آہستہ اُٹھا اور اپنی سوئی ہوئی بیوی پر جھک گیا۔ اس کا چہرہ اس کے ہاتھوں میں چھپا ہوا تھا۔ میں نے آہستہ سے ان کو علیحدہ کیا۔ ہاتھ اس کی چھاتی پر گر پڑے۔ وہ روتی رہی ہوگی۔ کیونکہ آنسو ابھی اس کے گالوں پر خشک نہیں ہوئے تھے۔ اس کا چہرہ پرسکون تھا۔ اور جب میں اسے دیکھ رہا تھا۔ ایک ہلکا سا تسلی بخش تبسّم اس کے زرد چہرے کو زیب دے رہا تھا یہ غالباً ایک جلدی سے گزر جانے والا خواب تھا۔ میں نے اپنا ہاتھ اس کے شانے پر رکھ دیا۔ وہ چونک پڑی۔ میں پھر آگے جھکا۔ اس نے ایک چیخ ماری اور جاگ پڑی میرے ایک دفعہ کے ہاتھ ہلانے سے وہ ہمیشہ کے لئے خاموش ہو جاتی۔ مگر میں دہل گیا۔ اور پیچھے ہٹ گیا۔ اسکی نگاہیں میری آنکھوں پر جم گئیں۔ میں اس کا سبب نہیں جانتا تھا مگر میں ڈر گیا اور جھجک کر پیچھے ہٹ گیا۔ وہ بستر سے اُٹھی۔ مگر ابھی تک اس کی نگاہ نہایت ثابت قدمی سے مجھ پر جمی ہوئی تھی۔ میں کانپ گیا۔ استرا میرے ہاتھ میں تھا۔ مگر میں ہل نہیں سکتا تھا۔ وہ دروازے کی طرف جانے لگی۔ جب وہ اس کے نزدیک پہنچ گئی اس نے اپنا ارادہ تبدیل کر دیا اور اپنی نگاہ بھی ہٹا لی۔ بس سحر ٹوٹ گیا۔ میں آگے کو لپکا۔ اور اس کے بازو کو زور سے پکڑ لیا۔ وہ زور زور سے چیخ رہی تھی۔ حتیٰ کہ وہ بیہوش ہو کر فرش پر گر پڑی۔ اب میں اُسے بغیر کسی مزاحمت کے قتل کر سکتا تھا۔ مگر تمام گھر میں خبر ہو چکی تھی۔ اور میں نے نوکروں کے پاؤں کی چاپ سیڑھیوں پر سُنی۔ میں نے اُسترے کو اس کی اصلی جگہ بند کر دیا۔ اور دروازے کو کھول کر اونچی آواز سے مدد طلب کی۔

لوگ آئے اور اُسے اُٹھا کر بستر پر لٹا دیا۔ وہ گھنٹوں بالکل مردہ پڑی رہی۔ اور جب سانس واپس آنے لگا۔ اس کے ہوش و حواس رخصت ہو چکے تھے۔ اور وہ غضبناک کلمات میں ہرزبان بک رہی تھی۔

ڈاکٹر بلائے گئے۔ جو اپنی امارت کو ظاہر کرنے کے لئے اپنی گاڑیوں میں عمدہ عمدہ گھوڑوں اور اچھے اچھے لباس پہن کر آئے۔ وہ اس کا علاج ہفتوں کرتے رہے۔ اُنہوں نے ایک کمیٹی کی اور دوسرے کمرے میں آہستہ آہستہ آپس میں صلاح و مشورہ کرتے رہے۔ ایک نے جو ان سب میں سے زیادہ چالاک تھا۔ اور زیادہ مشہور تھا۔ مجھے علیحدہ طلب کر کے کہا۔ کہ بُری سے بُری خبر سننے کو تیار ہو جاؤ۔ اور پھر مجھے ایک دیوانے کو بتلایا کہ میری بیوی دیوانی ہو گئی ہے۔ وہ ایک کھلی کھڑکی کے سامنے میرے ساتھ کھڑا تھا۔ اور اس کی آنکھیں میرے چہرے پر گڑی ہوئی تھیں اس کا ہاتھ میرے بازو پر پڑا تھا۔ ایک کوشش سے میں اُسے اُٹھا کر نیچے بازار میں گرا سکتا تھا۔ اور یہ ایک بیمثال مذاق ہوتا۔ مگر اس سے میرے راز کے افشا ہو جانے کا ڈر

تھا۔ اس لئے میں نے اُسے جانے دیا۔ کچھ دن بعد اُنہوں نے مجھے کہا۔ اس کو پابندی میں رکھنا چاہیئے۔ اور اس کیلئے ایک محافظ ملازم رکھنی چاہیئے۔ میں! میں کھلے کھیتوں میں نکل گیا۔ جہاں مجھے کوئی بھی نہیں دیکھ سکتا تھا اور اتنا ہنسا کہ ہوا میں میری ایک وحشیانہ گونج پیدا ہو گئی۔

دوسرے دن وہ مر گئی۔ اس کا ضعیف باپ اسے قبر تک پہنچانے گیا۔ اور مغرور بھائیوں نے اس کی بے جان لاش پر ریاکاری کے آنسو بہائے۔ جنہوں نے اسکی زندگی میں اس کی تکالیف کو نہایت ٹھنڈے دل سے برداشت کیا تھا۔ یہ سارا کھیل میرے واسطے خوشی کا سامان تھا اور میں اپنے سفید رومال کے نیچے جو میں نے اپنے منہ پر رکھا ہوا تھا آتی دفعہ اس قدر ہنسا کہ میری آنکھوں میں آنسو آگئے۔

اگرچہ میں اپنی تدابیر میں کامیاب ہوا۔ اور اُسے مار ڈالا۔ مگر میں بیچین اور بیقرار سا رہا کرتا تھا۔ مجھے محسوس ہو رہا تھا۔ کہ اب زیادہ دیر تک میرا راز پوشیدہ نہیں رہ سکتا ہیں اس وحشیانہ خوشی کو نہیں روک سکتا تھا۔ جو میرے اندر جوش مارا کرتی تھی۔ اور میں تنہائی میں چیخنے اور تالیاں بجانے لگتا تھا۔

جب میں باہر نکلتا اور لوگوں کو کاروبار میں مصروف ان کو تتر بتر جاتے دیکھتا موسیقی کے نغمے سنتا۔ ان کے رقص پر نظر دوڑاتا تو میں اتنی خوشی محسوس کرتا تھا کہ اپنے تئیں بمشکل ان میں کود پڑنے اور ہر ایک کو ٹکڑے ٹکڑے کر دینے سے روک سکتا تھا۔ میں دانت پیس کر فرش پر پاؤں مار کر رہ جاتا۔ اور اپنے ناخن اپنی ہتھیلیوں میں گاڑ دیتا۔ یہانتک کہ گوشت میں سے خون جاری ہو جاتا۔ مگر میں اس جوش کو قابو میں رکھتا اور ابھی تک کسی کو معلوم نہ تھا کہ میں پاگل ہوں۔

مجھے یاد ہے گو یہ آخری بات ہے جو مجھے یاد پڑتی ہے۔ کیونکہ اب واقعات کو میں توہمات سے ملا دیتا ہوں اور چونکہ مجھے فرصت نہیں۔ اس لئے ان کو علیحدہ نہیں کر سکتا۔ میں خیال کرتا ہوں کہ ان کے دہشت کھلائے ہوئے چہرے مجھے ابھی تک دکھائی دیتے ہیں۔ اور میں اِس سہولیت کو محسوس کرتا ہوں۔ جس سے میں نے انکو اُٹھا کر دے مارا تھا۔ اور ان کے سفید چہروں پر مکوں کی بارش کر دی تھی۔ اور پھر ہوا کی طرح وہاں سے بھاگا تھا۔ اور ان کو چیخنا چلانا پیچھے چھوڑ گیا تھا۔

جب میں اس ہنگامے کا خیال کرتا ہوں مجھ میں ایک دیو کی سی قوت آجاتی ہے۔ اور رگوں میں ایک نئی لہر دوڑ جاتی ہے۔

دیکھو میں اس لوہے کی سلاخ کو اپنی غضبناک قوت سے کس طرح دوہرا کر دیتا ہوں۔ میں اس کو ایک نرم شاخ کی طرح توڑ کر علیحدہ کر دیتا۔ مگر چونکہ یہاں بہت سی لمبی لمبی تاریک گلیاں ہیں۔ اور میں نہیں خیال کرتا کہ میں ان میں

اپنا راستہ پالونگا اور اگر راستہ مل بھی جائے تو میں جانتا ہوں کہ نیچے لوہے کے مضبوط دروازے ہیں۔ جو ہر وقت بند اور مقفل رہتے ہیں۔ وہ جانتے ہیں کہ میں کسقدر چالاک دیوانہ تھا اور وہ مجھے اس جگہ نمائش کے طور پر رکھنے پر نازاں ہیں۔

مجھے سوچنے دو۔ ہاں ہاں!! مجھے یاد آگیا۔ ٹھیک! میں باہر گیا ہوا تھا۔ جب میں گھر پہنچا۔ رات کافی آچکی تھی۔ اور میں نے وہاں ان تین بھائیوں میں سے سب سے زیادہ مغرور بھائی کو وہاں پایا۔ وہ کہتا تھا کہ اسے ایک ضروری کام ہے۔ میں اسے خوب یاد رکھتا ہوں۔ میں اس شخص سے ایک مجنون کی تمام قوت سے نفرت کرتا تھا کئی دفعہ میں نے چاہا کہ اس کے ٹکڑے ٹکڑے کر دوں مگر میرا راز مانع تھا۔ انہوں نے مجھے بتایا کہ وہ اوپر ہے۔ میں جلدی سے اوپر بھاگا۔ اسے مجھے چند الفاظ کہنے تھے۔ اس نے نوکروں کو بتایا تھا۔ میں نے ان کو چلے جانے کا حکم دیا۔

کافی وقت گزر چکا تھا اور میں پہلی دفعہ اس کے ساتھ تنہا تھا۔

اول اول میں احتیاطاً اپنی آنکھوں کو اس سے دور رکھتا تھا کیونکہ مجھے اس بات کا علم تھا جس کا اسے گمان تک بھی نہ تھا۔ اور اس علم سے میں بہت خوش ہوتا تھا۔ کیونکہ میں جانتا تھا کہ میری آنکھوں سے دیوانگی کی چمک آگ کی طرح عیاں تھی

کچھ منٹوں تک خاموشی طاری رہی۔ آخر اس نے کہا کہ تمہاری حال کی اوباشی جسکے تم میری بہن کی وفات کے بعد مرتکب ہوئے ہو۔ میری مردہ بہن کی یاد کے لئے ہتک ہے اور ساتھ ہی چند واقعات جن کا مجھے پہلے علم نہ تھا۔ کہ آیا اس بات کی دلالت کرتے ہیں کہ تم نے میری مردہ بہن سے اچھا سلوک نہیں کیا۔ وہ یہ جاننا چاہتا تھا کہ آیا اس کا گمان ٹھیک ہے۔ کہ میں اپنی باتوں اور حرکات سے اپنی مردہ بیوی اور اس کے خاندان کی توہین کرنا چاہتا تھا۔

یہ اس کی فوجی پوشاک کی وجہ سے تھا کہ وہ مجھ سے ان باتوں کا جواب طلب کرنے کی جرأت کر سکا۔ یہ آدمی فوج میں ایک معمولی افسر تھا۔ اور یہ عہدہ اسے میری دولت اور اس کی مردہ بہن کی بدولت دستیاب ہوا تھا۔

یہ وہ آدمی تھا جو ان تدبیروں اور منصوبوں کا بانی مبانی تھا۔ جو میری دولت کو میری بیوی کے ذریعے سے ان تک پہنچا دیتیں۔ یہی وہ شخص تھا۔ جو اپنی بہن کو میرے ساتھ شادی پر مجبور کرنے پر سب سے زیادہ کوشاں تھا۔ اور جو اچھی طرح جانتا تھا۔ کہ اس کی بہن کسی اور کے دام محبت میں گرفتار ہے اس وقت وہ اپنی فوجی پوشاک کے بھروسے پر گفتگو کر رہا تھا۔ جو اس کی رذالت کی وجہ سے اور اس کے اخلاق کی قیمت سے اسے حاصل ہوتی تھی۔ میں نے اپنی نظر اس پر ڈالی میں مجبور تھا۔ مگر میں نے ایک لفظ منہ سے نہیں نکالا۔

مَیں نے وہ فوری تغیّر دیکھا جو اس پر میری نظر سے واقع ہُوا تھا۔ وہ ایک دلیر شخص تھا۔ مگر اس کے چہرے کا رنگ اُڑ گیا اور اس نے کرسی پیچھے کر لی۔ مَیں نے اپنی کرسی کو کھینچ کر اس کے نزدیک کر لیا۔ مَیں ہنسا۔ مَیں اس وقت بہت خوش تھا مَیں نے اسے کانپتے اور جنون کو اپنے اندر بڑھتے ہوئے دیکھا۔ وہ مجھ سے خوف کھانے لگا تھا۔

مَیں نے کہا۔ تم اپنی بہن کو بہت چاہتے تھے جب وہ زندہ تھی۔ بہت

وہ گھبرا کر ادھر اُدھر دیکھنے لگا اور مَیں نے اسے کرسی کی پشت کو مضبوط پکڑتے ہوئے دیکھا۔ مگر وہ بولا نہیں مَیں نے کہا "بدمعاش کُتّے" آخر تم میرے ہاتھ آگئے مجھے تمہاری تمام جہنمی تدابیر کا پتہ چل گیا۔ تم نے اسے میرے ساتھ شادی کرنے پر مجبور کیا تھا لیکن اس کا دل کسی اور طرف تھا۔ مَیں اسے خوب جانتا ہوں میں سب کچھ جانتا ہوں"

وہ یکایک کرسی پر سے کود پڑا اور کرسی کو دونوں ہاتھوں سے اُوپر اُٹھا مجھے پرے ہٹنے کو کہا۔ کیونکہ مَیں جوں جوں بولتا جاتا تھا احتیاطاً اس کے قریب ہوتا جاتا تھا۔ مَیں بولنے کی بجائے چیخ رہا تھا۔ کیونکہ فتنہ انگیز جذبات میرے خون کے اندر جوش زن تھے۔ اور پُرانے آسیب سرگوشیاں کرتے ہوئے مجھے مذاق کر رہے تھے۔ اور اس کے ناپاک دل کو سینہ چیر کر باہر نکال دینے پر برانگیختہ کر رہے تھے۔

"تجھ پر لعنت ہو" مَیں نے کھڑے ہو کر اس پر حملہ آور ہوتے ہوئے کہا۔ "مَیں نے اُسے قتل کر دیا۔ مَیں دیوانہ ہوں تجھے بھی مار ڈالونگا۔ خون! خون!! مَیں اسے ضرور بہاؤنگا" اس نے کرسی مجھ پر دے ماری۔ مَیں ایک طرف ہٹ گیا۔ پھر اس پر لپکا۔ اس کو دبوچ لیا۔ ہم دونوں فرش پر گر پڑے۔

یہ بہت عمدہ کشمکش تھی۔ کیونکہ وہ ایک لانبے قد کا طاقتور جوان تھا۔ اور اپنی زندگی کے لئے جان توڑ کوشش کر رہا تھا۔ اور مَیں! مَیں ایک طاقتور دیوانہ جو اسکے خون کا پیاسا تھا۔ مَیں جانتا تھا۔ کہ کوئی طاقت مجھ سے مقابلہ نہیں کر سکتی اور مَیں درست کہتا تھا۔ مَیں درست کہتا تھا گو مَیں پاگل تھا۔ اس کی کوششیں کمزور ہوتی گئیں مَیں نے اس کے سینہ پر گھٹنے رکھ کر گردن کو اپنے ہاتھوں سے مضبوط پکڑ لیا۔ اور زور سے دبایا۔ اس کا چہرہ سیاہ پڑ گیا۔ اس کی آنکھیں باہر نکل آئیں۔ اور اس کی زبان منہ سے نکلی ہوئی دیکھ کر مجھے خیال ہُوا کہ وہ مجھ سے مذاق کر رہا ہے۔ مَیں نے اور مضبوطی سے دبایا۔

یکایک دروازہ ایک عظیم شور کے ساتھ کُھل گیا اور لوگوں کا ہجوم دوسرے کو پکارتا ہُوا اندر لپکا۔ دیوانے کو پکڑ لو، پکڑ لو۔ میرا راز طشت ازبام ہو چکا تھا۔ اب مَیں نے اپنی تمام کوششیں اپنے آپ کو ان کی گرفت سے آزاد کرانے

میں لگا دیں۔ اس سے پیشتر کہ کوئی مجھے ہاتھ لگاتے میں کھڑا ہو چکا تھا۔ پھر حملہ آوروں پر جھک پڑنا ایک لمحہ کا کام تھا۔ میں اپنے طاقتور ہاتھوں سے راستہ صاف کرنے لگا۔ گویا میرے ہاتھ میں کلہاڑی ہو۔ میں نے انہیں اپنے سامنے سے ہٹا دیا اور دروازہ تک پہنچ گیا۔ کٹہرے پر سے نیچے کود پڑا۔ چشم زدن میں میں سڑک پر تھا۔

میں ناک کی سیدھ میں تیز دوڑا۔ مجھے روکنے کی کسی نے جرأت نہ کی۔ میں نے لوگوں کے پاؤں کی آواز اپنے پیچھے سُنی۔ اس لئے میں نے اپنی رفتار تیز کر دی۔ آواز رفتہ رفتہ کم ہونے لگی۔ کیونکہ فاصلہ زیادہ ہو گیا تھا۔ اور آخر کار بالکل بند ہو گئی۔ مگر میں بھاگتا رہا۔ ندیاں۔ دلدلیں۔ دیواریں۔ احاطے۔ جھاڑیاں پھاندتا اور طے کرتا گیا۔ میں وحشیانہ شور مچاتا بھاگا جا رہا تھا۔ وہ عجیب و غریب شکلیں جو مجھ پر چھائی ہوئی تھیں میرے شور کو بڑھانے کی کوشش کر رہی تھیں۔ یہانتک کہ ہوا میری چیخوں سے معمور ہو گئی۔

میں بھوتوں اور شیطانوں کے بازوؤں پر جا رہا تھا۔ جو ہوا میں اُڑ رہے تھے۔ اور مجھے چکر دیتے ہوئے لیجا رہے تھے۔ حتےٰ کہ میرا سر چکرانے لگا۔ آخر کار اُنھوں نے بڑے زور سے مجھے زمین پر دے مارا۔ میں نے اپنے تئیں زمین پر گرتے ہوئے محسوس کیا۔ اور بس پھر اندھیرا ــــــ

جب مجھے ہوش آیا تو میں یہاں اس پسندیدہ کمرے میں تھا جہاں سورج کی روشنی شاذونادر ہی آتی ہے۔ یہاں چاند کی شعاعیں کبھی کبھی بھولے بھٹکے آجاتی ہیں۔ جن سے میں کمرے کے تاریک کونے دیکھ سکتا ہوں۔ اور ساتھ ہی وہ سفید شکل جو کونے میں بے حرکت کھڑی رہتی ہے۔

جب میں لیٹا ہوا ہوتا ہوں تو کبھی کبھی عجیب چیخ پکار سُنتا ہوں۔ جو اس عظیم الشان محل کے دوسرے حصوں سے آتی ہوگی۔ نہ تو وہ اس خاموش مورت سے آتی ہے اور نہ ہی اُن سے کوئی تعلق رکھتی ہے۔ کیونکہ شام کی تاریکی سے لیکر صبح کی پہلی شعاع تک وہ ساکت کھڑی میری زنجیروں کی موسیقی سُنا کرتی ہے میرا رقص دیکھا کرتی ہے۔ جو میں گھاس پر کیا کرتا ہوں لیکن آوازیں! یہ میں نہیں جانتا۔

(ترجمہ) فیاض الدین احمد

دل کہ اک قطرہ خوں نہیں ہے بیش ایک عالم کے سر بلا لایا

دل مجھے اس گلی میں لے جاکر اور بھی خاک میں ملا لایا

اب تو جاتے ہیں بتکدے سے میر پھر ملیں گے اگر خدا لایا (میر)

پریشان محبت

اے بیخودیٔ اُلفت! یہ جوشِ جنوں کب تک — آوارہ پھروں آخر با حالِ زبوں کب تک

رکھے گی مجھے فطرت مائل بجنوں کب تک — اے دورِ فلک! ہوگی تجدیدِ سکوں کب تک

کاشانۂ دل میرا ویرانۂ وحشت ہے — دُنیائے محبت میں برباد رہوں کب تک

خاموش ہے اب آخر میرا دلِ فریادی — وہ اپنی کہے کب تک، میں اُس کی سُنوں کب تک

تقدیر نہیں بنتی، تدبیر نہیں چلتی — تقدیر بنانے کی تدبیر کروں کب تک

کیوں سرد نہیں ہوتی یہ آگ محبت کی — سوزِ غمِ فرقت میں اللہ! جلوں کب تک

ملتی ہی نہیں مجھ کو کچھ دادِ جبیں سائی — سنگِ درِ جاناں پر سجدہ میں رہوں کب تک

سُنتا ہی نہیں کوئی رودادِ شبِ فرقت — فریاد کروں کس سے، فریاد کروں کب تک

افسردۂ فرقت ہوں، ناکامِ محبت ہوں — جینے کا نہیں حاصل آخر میں جیوں کب تک

مایوسِ مسرت ہوں، مانوسِ اذیت ہوں — فریاد خُدائے دل! ناشاد رہوں کب تک

بیہوشی و ہشیاری، اللہ یہ نیرنگی! — حیران ہوں میں ہوگی تکمیلِ جنوں کب تک

دل سیر ہے جینے سے اب موت کی خواہش ہے
جینے کی تمنّا میں اے رازؔ مروں کب تک

رازؔ چاندپوری

جو شخص تیری متبسّم آنکھوں کو دیکھ کر اپنا دل دے بیٹھتا ہے۔ اُس کی حالت بعینہٖ اُس شخص سے مشابہ ہوتی ہے جو موسم گرما میں مطلع کو ابرآلود نہ پاکر اپنی مختصر سی کشتی بحرِ ناپیداکنار میں ڈال دیتا ہے۔ (ٹامس مور)

کوئی بتاتے وہ حسینہ کہاں ہے۔ جس کا دل خلوص کے ساتھ محبت کر سکتا ہو۔ تاکہ میں دُنیا کو ترک کر کے اُس کے قدموں پر سر رکھ دُوں:۔
اور اس حالت میں صرف ایک بار سانس لوں۔ (ٹامس مور)

پُورن سنگھ ہُنر

پریم ساگر

اُس کی فطرت عجیب تھی! میرے عظیم الشان محلّات میں اُس کی رُوح بیقرار رہتی تھی۔ میری شان و شوکت اُس کی نظروں میں نہ جچتی تھی۔ میرے لاتعداد خزانوں کو وہ حقارت کی نگاہ سے دیکھتا تھا۔ اور میرے عیش و عشرت کی رنگینیوں میں اُس کے لئے کوئی دلکشی نہ تھی۔ آہ، مَیں پاپی اُس کا باپ بننے کے قابل نہ تھا! اے میرے چاند، اے میرے چاند، اے میرے سُورج، تو کہاں چھپ گیا؟ میری زندگی کی طویل رات تجھ بن کیسے گزریگی؟"

شام کا گلابی دھندلکا آسمان کی نیلگوں وسعتوں، پہاڑوں کی گلپوش چوٹیوں، اور دریا کی پرسکون سطح پر رنگ افشانی کرتا ہوا پھیل رہا تھا۔ کہ یہ الفاظ ایک دھیمی سی گونج پیدا کر کے فضا کی اُداس خاموشی میں جذب ہو گئے۔

آج سے کئی سو سال قبل شمالی ہند میں پرتاب گڑھ نام کا ایک شہر آباد تھا۔ اُس کے درمیان ایک دریا تھا جو موسموں کے تغیّر و تبدّل سے بے نیاز ہمیشہ جاری رہتا تھا۔ اُس کا پانی صاف اور شیریں تھا۔ اور اُس کے دونوں کناروں پر سدابہار درخت اپنی پھولوں بھری شاخیں جھکائے رہتے تھے کہیں کہیں سرسبز ٹیلے بھی تھے۔ جن کا پانی آبِ حیات اور ہوا بادِ فردوس تھی۔ شہر کیا تھا۔ گویا جنّت آسمان سے اُتر کر زمین پر آگئی تھی۔ بڑے بڑے باغات تھے۔ جہاں سنگِ مرمر کے حوضوں میں چاندی کے فوّاروں سے عطر کے قطرے اُچھلتے تھے۔ طاؤس اپنے زرّیں پر پھیلا کر ناچتے تھے۔ خوشرنگ پرندے والہانہ انداز میں مسرت کے زمزمے گاتے تھے۔ خُوبصورت پھُول خمارِ حسن سے جھُومتے تھے وہ حُسن کی لطافتوں اور محبت کی زمزمہ سنجیوں کا ایک دلفریب مجموعہ تھا۔

جب جنّت کا نام لیا جاتا ہے تو اعراف اور جہنّم بھی ایک ساتھ دماغ میں پھر جاتے ہیں۔ اس جنّت کا یہ امتیاز تھا کہ وہاں کوئی اعراف نہ تھا۔ ہاں ایک خوفناک اور مہیب جہنم ضرور تھا۔ دریا کے دونوں کنارے عشرت کی فراوانیوں سے معمور تھے۔ مگر چند میل کے فاصلے پر عجیب بستیاں آباد تھیں۔ بے ترتیب جھونپڑیاں ادھر اُدھر بکھری ہوتی تھیں۔ جوُدھوئیں کی سیاہی سے بھیانک سی معلوم ہوتی تھیں۔ جھونپڑیوں کی حالت سے یہی ظاہر ہوتا تھا کہ اُن کے رہنے والے میل کچیل کو بہت پسند کرتے ہیں۔

جھونپڑیوں پر منوں مٹی، غلیظ کپڑے، میلے کچیلے برتن، گدلا پانی یہانتک کہ ان لوگوں کے بدن بھی انسانی گوشت پوست کے نہیں بلکہ میل ہی کے بنے ہوئے معلوم ہوتے تھے۔ وہ مٹی کھودتے اور پتھر توڑتے تھے۔ اور ان میں زیادہ شریف النسب زمین جوتتے تھے۔ ان کو چوبیس گھنٹوں میں بیس گھنٹے کام کرنا پڑتا تھا۔ اور جب وہ سوتے بھی تھے۔ تو خواب میں اپنے افسر کے چابک کی ضرب سے چلّا کر چونک پڑتے تھے۔ اُن کی عورتیں اپنے بچّوں کو پیٹھ پر باندھ کر دن بھر کام کرتی تھیں۔ اور رات کو وہ بھی ایک ایسی ہی بے آرام نیند سویا کرتی تھیں۔ یہ تھی اُن کی زندگی۔ مگر وہ اسی حال میں مست تھے۔ امیر ہونا اور بات ہے۔ اور خوش ہونا اور بات غریبی انسان کی زندگی کو تباہ نہیں کر سکتی۔ یہ لوگ چاہے کتنے ہی بُرے حالوں بسر کرتے تھے لیکن اُن کے دلوں میں بھی مسرت موجزن تھی۔ وہ بھی بعض بعض باتوں سے جامے میں پھولے نہیں سماتے تھے۔ صبح کے وقت جب یہ سب لوگ قطار در قطار عبادتگاہ کی طرف جاتے تو اُن کے دِل بھی کیسی معصوم آرزوؤں سے معمور ہوتے تھے۔ راجہ بکرم اپنے سنگھاسن پر شاہانہ تمکنت سے بیٹھا ہوتا۔ اور یہ لوگ اُس کے سامنے سجدے میں جُھک جاتے۔ جب سجدہ ختم ہو جاتا تو وہ اپنے گھروں کو لوٹتے اور تمام راستہ اسی دلچسپ بحث میں طے ہو جاتا۔ کہ راجہ نے کس کی جانب دیکھا ہر شخص راجہ کی نگاہِ غلط انداز کو اپنی ہی جانب منسوب کرتا۔ وہ پھر کام کاج میں منہمک ہو جاتے۔ اُن کا عقیدہ تھا کہ وہ صرف اسی کے لئے پیدا کئے گئے ہیں۔ اور یہی پرمیشور کی مرضی ہے

(۲)

پرتاب گڑھ راجہ بکرم کی وسیع سلطنت کا دار الخلافہ تھا اُس کی سطوت و جبروت کی دھاک دُور دُور تک بیٹھی ہوئی تھی سلطنتیں اس کے نام سے کانپ اُٹھتی تھیں اور راجاؤں کے دِل اُس کے خیال سے دہل جاتے تھے۔ ارد گرد کی تمام راجدھانیاں اُس کی باجگذار تھیں اور ہر سال اُس کے خزانے خراج کے تحائف سے معمور ہو جاتے تھے۔ راجہ نہیں سمجھتا تھا کہ ان خزانوں کو کیا کرے۔ بالآخر وہ بازو جو کبھی تیر اندازی اور شمشیر زنی میں شہرہ آفاق تھے۔ ساغر و مینا اُٹھانے میں مصروف ہو گئے۔ وہ دِل جو کبھی میدانِ کارزار میں جنگی باجوں کی گُونج پر ناچتا تھا۔ سازِ طرب کی نرم اور ہلکی آوازوں میں فنا ہونے لگا۔ وہ آنکھیں جو کبھی جنگ کے خوفناک مناظر دیکھنے کی مشتاق تھیں۔ گلہائے عارضی کی پتّیوں پر پھسلنے لگیں۔ اب وہ عیاش تھا۔ بادہ نوش تھا وہ شیطنت کا مجسمہ تھا۔ اُس کی زندگی کا مقصد نفس پرستی تھا۔ نیکی اور بدی اُس کے فرہنگ اخلاق میں یکسر مہمل الفاظ تھے۔

یوراج پریم ساگر کی سولھویں سالگرہ تھی۔ تمام شہر خوشی

کے نعروں سے گونج رہا تھا۔ زرق برق پوشاکیں حسن و جمال کے بہترین نمونے اور کوچہ و بازار کی آرائش قوس و قزح کا نقشہ پیش کر رہی تھیں۔ لوگ اس طرح جوق در جوق آرہے تھے گویا سیلاب مسرت اُمڈا چلا آتا ہے۔ جس طرح سمندر کی موجیں اُٹھ اُٹھ کر ایک دوسرے میں جذب ہو جاتی ہیں۔ اسی طرح ایک ہجوم دوسرے ہجوم میں گم ہو رہا تھا۔ وسیع میدان میں کئی شامیانے ایستادہ تھے۔ عین وسط میں ایک زرنگار شامیانے کے نیچے بلند اور جواہر نگار تخت پر مہاراجہ بکرم اور یوراج پریم ساگر جلوہ افروز تھے۔ پریم ساگر فی الحقیقت محبت کا سمندر تھا اُس کا چہرہ خندۂ صبح کی طرح پاکیزہ اور روشن تھا۔ جہاں دو ستارے محبت کا نور برسا رہے تھے۔ اُس کا سڈول اور طاقتور جسم اُس کی پاکبازی کا ثبوت تھا۔ اس شورِ محشر کے ہنگاموں میں اُس کی آنکھیں کسی گہری سوچ میں ڈوبی ہوئی تھیں۔ ہجوم کی ایک لہر دوسری لہر کو دھکیل رہی تھی۔ اور افسروں کے تازیانے اس طوفان کے آگے تنکوں کی طرح بہے جاتے تھے۔ تازیانوں پر تازیانے برستے تھے مگر مشتاقان دیدار کی روک تھام نہیں ہوسکتی تھی۔ کتنے ہی زخمی ہوئے کئی ایک کو چوٹیں آئیں اور کئی ایسے کچلے گئے کہ وہیں جاں بحق ہو گئے۔

"کیا یہ سب شور و شغب میرے لئے ہے۔ جان کو ہتھیلی پر رکھ کر کیا یہ مجھی کو دیکھنے آتے ہیں۔ میرا سر اس تاج کے بوجھ سے کسقدر مصیبت میں ہے۔ یہ بھاری بھر کم زیورات یہ زرق برق پوشاک۔ آہ! میری رُوح کسقدر دبی جاتی ہے۔ مَیں بھی انہیں تماشائیوں کی طرح ایک انسان ہوں تو پھر مجھ کو ایک نظر دیکھنے کے لئے کیوں اتنی جانیں تلف ہو رہی ہیں۔ مَیں گرفتار ہوں میری رُوح گرفتار ہے مَیں ان زنجیروں کو توڑ ڈالونگا" یہ تھے وہ جذبات و خیالات جو یوراج کے سینہ و دماغ میں متلاطم تھے۔

شور و غل کا سمندر طوفان بدوش تھا کہ یکایک فضا میں ایک یاس انگیز صدا اُٹھی۔ اور ارد گرد کے مجمع پر سکوت بن کر چھا گئی۔ ایک لمحہ کے بعد پھر وہی صدا اُٹھی اور یوراج کے کانوں کے پردوں کو چیرتی ہوئی اُس کے دل میں بیٹھ گئی۔ یوراج تڑپ کر اُٹھا اور راستے کو صاف کرتا ہوا اس مقام پر پہنچا۔ مہاراج غُصّے سے کف در دہاں تھے اُمرا و رؤسا حیرت و استعجاب سے دانتوں میں اُنگلی دبائے کھڑے تھے۔ تماشائی خوف و ہراس سے حواس باختہ تھے ایک غریب اور معصوم لڑکی بیہوشی کے عالم میں فرش خاک پر پڑی ہُوئی تھی۔ اُس کے پھٹے پرانے مگر آج کے لئے دھلے ہُوئے کپڑے اُس کی عریانی کو پورے طور پر ڈھانپنے سے قاصر تھے۔ وہ بھی شاید یوراج کو ایک نظر دیکھنے کے لئے آئی تھی۔ اُس کی خاموش آنکھیں محبت اور عقیدت کی داستان کہہ رہی تھیں۔ بکھرے ہُوئے بال چاند سا چہرہ، کمسنی اور

بھولاپن۔ وہ معصومیت کی دیوی تھی۔ اس کی پیشانی پر خون کی ایک لکیر پھیلی ہوئی تھی۔ گویا سورج کی پہلی کرن حورِ صبح کا بوسہ لے رہی ہے۔ "پہلے جنم میں میں نے کونسا پاپ کیا تھا۔ جو اس جنم میں مجھے مہاراجہ کے ہاں پیدا کر دیا۔ اس تمام پاپ کا خون میری گردن پر ہے۔" یہ کہکر یوراج نے اپنا خوبصورت ریشمی رومال نکال کر اُس کی پیشانی پر باندھ دیا۔ اور اُس کے تلووں کو سہلانا شروع کر دیا۔

مہاراجہ صاحب پہلے ہی چراغ پا ہو رہے تھے۔ اب اُن کے جوشِ غضب کی کوئی انتہا نہ تھی۔ اُنھوں نے محفل برخاست کرنے کا حکم دیا۔ اور یوراج کو ساتھ لیکر اپنے محلوں کی طرف چل دئے۔ سب لوگ اپنے اپنے گھروں کی طرف قدم اُٹھانے لگے۔ ہر شخص اس واقعہ سے کم و بیش متاثر تھا۔ کسی نے یوراج کی نیکدلی ثابت کی اور کسی نے اُس کو بچپن سمجھ کر رد کر دیا۔

(۳)

"تو نے میری تمام امیدوں پر پانی پھیر دیا ہے۔ بھری محفل میں تو نے وہ کام کیا۔ جس کو دیکھ کر تمام شرفاء ششدر تھے۔ تو کسقدر ذلیل اور کمینہ ہے۔"

مہاراجہ بکرم نے یوراج کو علیحدہ کمرے میں لیجا کر کہا۔ پریم ساگر کی آنکھیں نمناک تھیں۔ اُس کی گردن ادب سے جھکی ہوئی تھی۔ وہ کچھ کہنا چاہتا تھا۔

"تو نے چنڈالوں کا سا کام کیا۔ تو نے تمام خاندانی شرافت کو بٹّہ لگا دیا ہے۔ تو ایک ذلیل غلام لڑکی پر فریفتہ ہے۔"

اس اتہام نے یوراج کی مہرِ سکوت کو توڑ دیا۔

"یہ اتہام ہے پیارے پتاجی یہ سراسر اتہام ہے میں کسی پر بھی فریفتہ نہیں ہوں۔ مگر کیا کسی کی جان بچانا گناہ ہے۔"

"چل دُور ہو جا میری آنکھوں کے سامنے سے ہٹ جا۔ تیری زبان گُدّی سے کھنچوا دُونگا۔ اگر پھر تیری زبان سے کوئی ایسا کلمہ نکلا۔ ہمارے گھر میں مہاتما بدھ کی رُوح نازل ہو رہی ہے۔"

"مگر کیا مہاتما بدھ ایسے ہی ناپاک تھے جو آپ اُن کی رُوح کے نزول کو شگونِ بد سمجھتے ہیں۔ مہاراجہ بکرم اب جامے سے باہر ہو گیا۔ جوشِ غضب نے اُس کو دیوانہ بنا رکھا تھا۔ اُس نے کڑک کر کہا۔ "دُور ہو جا۔ میری آنکھیں تجھے دیکھنے سے بیزار ہیں۔ جا میدانوں اور جنگلوں میں جہاں سانپ تیرا خُون پی جائیں۔ اور جہاں درندے تیری ایک ایک ہڈی کو چبا جائیں۔ میری وسیع سلطنت میں تیرے لئے کوئی پناہ نہیں ہے۔"

مہاراج نے پریم ساگر کو بازو سے پکڑ کر باہر دھکیل دیا۔ اور شام کی پھیلتی ہوئی تاریکی کے حوالے کر دیا۔

پریم ساگر کی ماں مدّت سے پیوندِ خاک ہو چکی تھی۔ اُس کی تصویر اب اس کی

آنکھوں کے سامنے پھر گئی۔ وہ اُس کی یاد میں پھوٹ پھوٹ کر رویا۔ فقیرانہ کمّل اوڑھ کر وہ دریا کے کنارے چلا گیا۔ تاریکی کے سناٹوں میں اُسے یہی آواز سُنائی دیتی تھی۔ کہ نور راہ راست پر ہے۔ دریا کی لہریں گنگناتی چلی جاتی تھیں اور اُسکو صاف سُنائی دیتا تھا۔ کہ تُو راہ راست پر ہے۔ ستارے آج زیادہ پاکیزہ اور روشن نظر آتے تھے۔ وہ بھی عالمِ رقص میں یہی گاتے تھے۔ "پریم ساگر نور راہ راست پر ہے۔" اسکی ماں کی پُراطمینان تصویر بھی اُسے یہی کہتی سُنائی دیتی تھی۔ "اے مملکت محبت کے بادشاہ تُو راہِ راست پر ہے۔"

وہ چلتے چلتے تھک گیا۔ اور آخر ایک درخت کے تلے بازوؤں کا تکیہ بنا کر سو گیا۔ خواب میں اُس نے دیکھا۔ کہ وہ اپنی ماں کے ساتھ ایک بلند ٹیلے پر سیر کر رہا ہے تھوڑے فاصلے پر ایک وسیع باغ ہے۔ جو محبت اور خوشی کے نعروں سے معمور ہے۔ وہاں پھولوں کی فراوانی سے روشوں پر تل دھرنے کی جگہ نہیں۔ خاردار جھاڑیوں کا نام ونشان بھی نہیں۔ پرندے پھولوں کو لپٹ لپٹ کر چومتے ہیں۔ اور فرطِ محبت سے نغمہ سرا ہیں۔ کیونکہ وہاں دام صیّاد ناپید ہے۔ پریم ساگر کی ماں نے اُس کے شانے کو ہلا کر کہا تو اس کا باغبان ہے مگر یاد رکھ کہ یہ پھول عجز و محبت کے جھونکوں سے شگفتہ ہوتے ہیں۔ کبر و نخوت کا سانس اُن کے لئے بادِ سموم ہے۔"

پریم ساگر نے اپنی ماتا کے چرنوں میں گر کر کہا۔ "میں ایسا ہی مالی بن کر رہونگا۔"

اُس کی ماں نے اُس کو دونوں بازوؤں سے پکڑ کر اُٹھایا اور اپنے سینے سے لگا لیا۔

"اے میری آنکھوں کی ٹھنڈک اب اِس باغ کا راستہ بھی دیکھ لے۔ دیکھ وہ ٹیلے کسقدر ہیبتناک ہیں۔ وہاں بڑے بڑے تاریک غار ہیں۔ جن میں بچھو اور درندے رہتے ہیں۔ اُن جھاڑیوں میں زہریلے سانپ ہیں۔ اس سفر میں دُور دُور تک پانی نایاب ہے۔" پریم ساگر کا دل بیٹھ گیا۔ اُس نے گھبرائی ہُوئی آواز میں پُوچھا۔ "ماتا کیا مجھے اکیلے ہی جانا ہوگا۔"

"ہاں مجھے اکیلے ہی جانا ہوگا۔ کیونکہ اس باغ کے مالک کا یہی فیصلہ ہے کہ صرف وہی شخص اس کا باغبان ہو سکتا ہے۔ جو اکیلا اس سفر کو طے کرے۔ یہ شرط نہایت عجیب ہے مگر اُس کے فیصلے پر کون اعتراض کر سکتا ہے۔ دیکھ میرے پیارے پریم میں تجھ کو ایک راز کی بات بتاتی ہوں ——"

وہ کچھ کہنا ہی چاہتی تھی کہ پریم ساگر کی آنکھ کھُل گئی۔

"ایک پریشان خواب تھا۔ رات کی تاریکی کسقدر گہری ہے۔ فطرت خواب استراحت میں محو ہے خاموش، درخت خاموش، دریا کی موجیں خاموش، پرندے اپنے اپنے آشیانوں میں خاموش ہیں۔ مگر میری رُوح کیوں بیقرار ہے؟" اس کا دِل بیٹھا جاتا تھا۔ مگر خواب کے عہد و پیمان اُسکو

یاد آگئے۔ اور وہ پھر جی کڑا کر کے اسی حالت میں چل دیا۔

(۴)

"آہ میں اُسے ایک نظر بھی نہ دیکھ سکی۔ لوگ کہتے ہیں کہ اُس نے اپنے ہاتھ سے میری پیشانی پر اپنا رومال باندھا تھا۔ اُس نے رومال کو آنکھوں پر رکھ کر چوم لیا۔" "اُس نے میرے تلوے سہلائے۔ اُف ــ یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ لوگ غلط کہتے ہیں۔ یہ کبھی نہیں ہو سکتا۔ چاند زمین کے تاریک غاروں میں کیسے جا سکتا ہے۔" اس روز سے شانتا انہیں خیالات میں غرق رہتی، وہ کوئی کام کاج نہ کرتی تھی۔ اور جب بھی وہ تنہا ہوتی تو یہی کہتی۔ "میں اپنی روح کے مالک کی باندی بنکر رہونگی۔ آہ۔ وہ کہاں ہے۔ میں اُس تک کیسے پہنچ سکتی ہوں میں پھول ہوں اور وہ ستارہ پھول ستارے تک کیسے پہنچ سکتا ہے۔ ستارہ آسمان سے ٹوٹ پڑے یا گداز ہو کر شبنم ہو جائے۔ مگر پھول کی تگ و دو ہی کیا ہے بس یہی کہ شام کے وقت وہ ٹکٹکی باندھ کر ستارے کو دیکھتا رہے اور چند دنوں کے بعد مرجھا کر ہمیشہ ہمیشہ کے لئے خاک میں مل جائے۔"

وہ اپنی بے بسی پر آٹھ آٹھ آنسو روتی اور کہتی۔ "اے پرمیشور تو نے اس خاک کے پتلے میں ایسی چنگاریاں کیوں بھردیں کیا میری قسمت میں سلگ سلگ کر خاکِ سیاہ ہو جانا ہی لکھا ہے۔"

سورج طلوع ہو ہو کر غروب ہوتا رہا۔ مگر شانتا کے خیالات کی ندی وہی راگ گاتی رہی۔ اُس کی نگاہیں اس تصویر کو ڈھونڈتی پھرتی تھیں۔ جو اوراقِ فطرت پر اس کو دکھائی نہ دیتی تھی۔ اُس کی آنکھیں پیاسی تھیں۔ اور وہ اس چشمۂ حسن و محبت کی جستجو میں آوارہ پھرتی تھیں۔ وہ سوچتی۔ کہ اس کو کیا ہو گیا ہے۔ اُس کے دماغ میں یہ طوفان کیوں برپا ہے۔ زندگی خواب تھی اور امید سراب کی جھلک کبھی تو مایوس ہو کر رہ جاتی۔ مگر کبھی کبھی پھر کامیابی کی تصویر چھلاوے کی طرح آنکھوں کے سامنے پھر جاتی۔ اور وہ پھر انہیں خیالات میں ڈوب جاتی۔ "میں اپنی روح کے مالک کی باندی بن کر رہونگی۔ اُس کو مجھ سے محبت ہے۔"

گاؤں کے بعض لوگ شانتا کو دیکھ دیکھ کر ہنستے اور اُس کو ستانے کے لئے شہزادے کی کہانیاں سُناتے۔ وہ اُس کو رانی کہہ کر پکارتے وہ شانتا کو دق کرنا چاہتے تھے۔ مگر شانتا اُن سب سے دامن بچا کر کسی تنہائی کے گوشے میں چلی جاتی۔ اور پریم ساگر کی یاد میں اپنی روح کو مسرور پاتی۔

شانتا گاؤں میں سب سے زیادہ خوبصورت لڑکی تھی۔ اُس کی معصومیت اور اُس کا بھولاپن ہر ایک کو اپنا گرویدہ بنا لیتا تھا۔ اُس کی باتیں آبِ حیات کے گھونٹ تھے۔ اور اُس کی خاموشی حیا سازِ پاکبازی کا لطیف نغمہ۔ وہ ہر نوجوان کے دِل کی آرزو تھی۔ شادی کے متعلق آئے دن کوئی نیا پیغام آتا۔ اور جب شانتا کو معلوم ہوتا۔ کہ اُس کی

رُوح کو زنجیروں میں جکڑنے کی کوشش کی جا رہی ہے تو وہ سخت بے چین ہو جاتی۔ مگر اس حالت کرب میں بھی اُس کے کانوں کو یہی نغمہ سُنائی دیتا۔ "تو اپنی رُوح کے مالک کی باندی بن کر رہیگی"۔ بعض اوقات اُس کو وہم ہونے لگتا کہ اُس کے دماغ میں کچھ خلل ہے۔ اور وہ اسے شیطانی وسوسہ سمجھ کر نکالنے کی کوشش کرتی۔ اُن کی ہنسی مذاق کی باتوں میں خوشی اور اطمینان تلاش کرتی۔ مگر اس ہنگامۂ طرب میں اسکے سینے سے خفیف سی صدا اُٹھتی۔ "تو اپنی رُوح کے مالک کی باندی بن کر رہیگی۔ تو ان مجلسوں سے بالاتر ہے"۔ اور شانتا پھر کسی گہری سوچ میں ڈوب جاتی۔ سہیلیاں قہقہے لگاتی ہُوئی اپنے اپنے گھروں کو چلی جاتیں۔ اور وہ اپنے خیالات کی رو میں بہتی ہُوئی کہیں کی کہیں نکل جاتی۔ "میری رُوح بے چین ہے۔ میری آنکھیں تشنہ ہیں۔ آہ مجھے کیا ہو گیا ہے! راگ رنگ میں رل جل جاتا ہے۔ خوشبو بادِ نسیم کے جھونکوں میں جذب ہو جاتی ہے۔ ندی دریا میں اور دریا سمندر میں فنا ہو جاتا ہے۔ اے پرمیشور میرے پریم کا سمندر کہاں ہے۔ جس کی تلاش میں میری رگ رگ بیتاب ہے میں چاہتی ہوں۔ اور کسقدر چاہتی ہوں۔ کہ میں بھی اپنے پریم کے ساگر میں ہمیشہ کے لئے فنا ہو جاؤں۔ لوگ فنا سے کیوں خوفزدہ ہیں۔ کیا ان کو معلوم نہیں۔ کہ حیاتِ جاوداں کی لذت اِسی میں پنہاں ہے"۔ اگر اُس کو کوئی ایسی ہستی مل جاتی جس کی رازداری اور ہمدردی پر اُس کو بھروسہ ہوتا تو وہ اپنا سینہ چیر کر اُس کے سامنے رکھ دیتی۔ مگر محبت پاک اور بے لوث محبت کی امانت اسی سینے کے لئے مخصوص ہے۔ جس میں وہ پیدا ہوتی ہے۔ دُنیا کے ناپاک کان اس کے لطیف نغمے سُننے کے لئے بہت بوجھل ہیں۔ دُنیا کی ہوس انگیز آنکھیں محبت کو آگ سمجھتی ہیں۔ اور اُن کے لئے وہ آگ ہی ہے کیونکہ وہ ہوس کو محبت سمجھتے ہیں"۔ محبت ایک نور ہے۔ جو ہمارے پیکرِ خاک کو جلا دیتا ہے۔ محبت ایک ضیا ہے۔ جو ہماری روحوں کے تاریک گوشوں کو منور کرتی ہے۔ محبت ایک صیقل ہے جو ہمارے غلیظ اور کثیف جذبات کو صاف اور لطیف بناتا ہے۔ محبت ایک زینہ ہے عرشِ بریں کا اور ایک نغمہ ہے سازِ سرمدی کا۔

شانتا اس خزانے کو لیکر گاؤں سی غیر محفوظ جگہ میں نہیں رہ سکتی تھی۔ جہاں رہزن ہر وقت گھات میں رہتے تھے۔ شام کائنات کے چہرے پر اُداسی کا رنگ پھیر رہی تھی۔ کہ شانتا نے اپنے آپ کو تاریکی کی لہروں کے سپرد کر دیا۔ اُس نے محبت کے خزانے کو اپنے سینے میں اور اپنے حسن کے خزانے کو کمل میں چھپا لیا۔ اور اپنی منزل سے بے خبر جادہ جستجو میں گامزن ہو گئی۔

(۵)

یہ دُنیا کسقدر سریع التغیر ہے۔ جس شہر میں چند روز

پیشتر کھلاتے رنگا رنگ شگفتہ تھے۔ آج وہاں زرد پتّیوں کی کھڑکھڑاہٹ کے سوا کچھ بھی نہیں جو آنکھیں کل تک ندرت نظارہ سے لذّت یاب ہورہی تھیں۔ آج حیرت واستعجاب میں ڈوبی ہوئی ہیں۔ اور وہ قلوب جو فرطِ انبساط سے رقصاں تھے۔ آج موت آسا سکوت میں غرق ہیں۔ خوشی کیا ہے؟ صحرائے زندگی میں سراب کی ایک جھلک، شب تاریک میں بجلی کی ایک چمک، ایک طلسم کا دھوکا ہے آفتاب کے غروب ہونے سے پیشتر رنگین بادلوں کے ٹکڑے سطح آسمان پر تیرتے پھرتے ہیں۔ دُنیا کی محفلیں بھی ایسی ہی ہیں۔ کیونکہ دونوں چشم زدن میں غم واندوہ کی تاریکیوں میں گم ہو جاتے ہیں۔ مہاراجہ بکرم کے سینے پر آج کوئی ہاتھ رکھ کر دیکھے جس طرح طوفان کے بعد سمندر کی رفتار نہایت سُست پڑجاتی ہے اسی طرح آج اُس کے دل کی کیفیت ہے۔ عظیم الشان محلات ویران جنگلوں کی طرح ڈراونے نظر آتے ہیں۔ زرق برق پوشاکیں اس کی آنکھوں میں کھٹکتی ہیں۔ وہ اُداس ہے۔ نہایت اُداس اُس کی رُوح وزنی پتھروں کے نیچے دبی جاتی ہے۔ اور کوئی طاقت نہیں جو اُن کو ہٹا سکے۔

محفلِ قدرت کس قدر معصوم ہے! اس کا دامن سادہ اور پاک خوشبوں سے ہر وقت معمور رہتا ہے۔ پرندے اپنی الاپ میں مست ہیں اور پھول اپنے حسن میں سرشار دریا کی موجیں جوش محبت سے ایک دوسری سے بغلگیر ہو رہی ہیں۔ آبشاروں کی صدائیں کسقدر خمار آگیں ہیں فطرت تسکین کا چشمہ ہے۔ آفتاب کا طلوع وغروب کسقدر طرب انگیز ہے۔ صبح کے وقت اُس کی تاجپوشی کے لئے کائنات کا ذرّہ ذرّہ نغمہ پیرا ہوتا ہے۔ دُنیا اُس کے جلووں سے بقعۂ نور بن جاتی ہے۔ جب وہ غروب ہوتا ہے تو شفق کی رنگینیاں کسقدر دل آویز ہوتی ہیں۔ رنگین بادلوں کے ٹکڑے سُرخ پریوں کی طرح فضا میں لاپروائی سے تیرتے پھرتے ہیں۔ کوہسار کی چوٹیاں گلپوش ہوجاتی ہیں دریا کی مختلف الالوان لہریں رشکِ ارژنگ بن جاتی ہیں اس کی ابتدا اور انتہا دونوں حسن وجمال کی رنگینیوں میں ڈوبی ہوئی ہیں۔ فطرت کا ساز ایک ہی لے پر رہتا ہے مگر ہم ناپاک انسان اپنے جذبات و خواہشات کی بلند آہنگیوں میں اُس کو مٹا دینے کی کوشش کرتے ہیں اس وقت عرش بریں سے تسکین کے فرشتے نازل ہو رہے ہیں میٹھی نیند کا خمار کائنات کی آنکھوں پر چھا رہا ہے۔ مگر بکرم کی آنکھیں اس سے محروم ہیں۔ اسکا باجبروت چہرہ خزاں رسیدہ پتّے کی طرح زرد ہے جس پر آنسوؤں کے قطرے ٹپ ٹپ گر رہے ہیں۔

"اُس کی فطرت عجیب تھی! میرے عظیم الشان محلات میں اُس کی رُوح بیقرار رہتی تھی میری شان وشوکت

اُس کی نظروں میں نہ جچتی تھی۔ میرے لاتعداد خزانوں کو وہ حقارت کی نگاہ سے دیکھتا تھا۔ اور میرے عیش و عشرت کی رنگینیوں میں اُس کے لئے کوئی دلکشی نہ تھی۔ آہ! میں پاپی اُس کا باپ بننے کے قابل نہ تھا! اے میرے چاند! اے میرے سُورج تُو کہاں چھپ گیا؟ میری زندگی کی طویل رات تجھ بن کیسے گزرے گی؟"

مہاراجہ بکرم تمام دن گوشۂ تنہائی میں روتا رہتا۔ اور جب شام کے وقت وہ اپنے محل کی چھت پر بیٹھ کر دریا کا منظر دیکھتا تو اُس کے مُنہ سے یہی فقرے نکلتے۔

اُس نے ہزاروں جاسوس بھیجے ہزاروں ہرکارے اِدھر اُدھر دوڑائے مگر ہر روز شام کے وقت وہ مایوسی کے عالم میں اپنے محل کی چھت پر اِدھر اُدھر ٹہلتا اور ان الفاظ کو دُہراتا۔ وہ اپنی آتش مزاجی پر دانت پیستا۔ مگر اب کیا ہو سکتا تھا۔ اُس کے محلات سے اس کی تسکین کا فرشتہ غائب ہو چکا تھا۔ اور اب اس کی زندگی پیہم اضطراب تھی۔ گل اندام نیم عریاں نازنینیں اپنے کرشمہ و ادا سے اس کا دل بہلانا چاہتیں تو وہ ایک خشمگیں نگاہ سے اُن کو دُور ہو جانے کا حکم دیتا۔ اور جس طرح خزاں میں رنگین پتّیاں ایک ایک کر کے گر جاتی ہیں۔ اسی طرح وہ خوفزدہ مہ جبینیں ایک ایک کر کے بھاگ جاتیں۔ نوعمر اور حسین و جمیل گانیوالیاں اپنا اپنا ساز چھیڑتیں تو وہ جھلّائے ہُوئے شیر کی طرح اُن پر جھپٹ پڑتا۔ اور ان کے طنبوروں کو توڑ پھوڑ کر پھینک دیتا وہ اس گیت کو ڈھونڈھتا تھا۔ جو اس کے وزنی دل کو ہلکا کرے۔

(۶)

جوگی طلوع سحر کے ساتھ اپنا بربط چھیڑتا ہے۔ کائنات خواب نوشیں سے جماہیاں لیتی ہُوئی بیدار ہوتی ہے۔ اور اُس کا راگ کائنات کی رگ و پے میں بادۂ خوشگوار کی طرح دوڑتا ہے۔ پرندے اپنی راگنیاں گاتے ہُوئے جوگی کے پاؤں میں لوٹتے ہیں۔ وہ ندی کے کنارے پانی میں پاؤں لٹکائے اپنے سحر آمیز سروں سے فضا میں محبت کی رُوح پُھونکتا ہے۔ اور جب عرصۂ روزگار کا تمام شور و غل تاریکی اور خاموشی کی لہروں میں گم ہو جاتا ہے۔ تو وہ بھی ایک درد انگیز نغمہ گاتے گاتے آغوشِ خواب میں مدہوش ہو جاتا ہے۔ اس جنگل کے شب و روز ایسے ہی گُزرتے ہیں۔ جوگی اپنے بربط کو چھیڑ چھیڑ کر فضا کو مخمور کرتا رہا۔ حتیٰ کہ اس کی صدائیں دُور دُور تک پہنچنے لگیں۔ اور انسانوں کے گروہ بھی کشاں کشاں آنے لگے مرادوں والے اُس کے چرنوں میں گر پڑتے۔ جوگی خود اپنے ہاتھوں سے اُن کو اٹھاتا اور اپنے بربط سے انکی پیشانیوں کو مس کرتا۔ وہ لوگ چلے جاتے اور اُن کی مُرادیں پُوری ہو جاتیں۔

(۷)

جس طرح دُور سے گاؤں کے ٹمٹماتے ہُوئے چراغ کی مدھم روشنی صحرانورد کو دکھائی دیتی ہے۔اسی طرح شانتا کے مایوس اور تاریک دل میں پریم ساگر کی صورت تھی۔ہوا کے نہایت لطیف جھونکوں سے چنگاریاں زیادہ مشتعل ہوتی ہیں۔اور جب شانتا کے کانوں کو جنگل کے جوگی کی کرامتوں کے چرچے سُنائی دیتے تو امید کی دبی ہُوئی چنگاری پھر بھڑک اٹھتی۔لیکن چند لمحوں کے بعد اُسے ایسا محسوس ہوتا۔کہ یہ لوگ کوئی افسانہ پارینہ سُنا رہے ہیں۔اور وہ مایوس ہو کر بیٹھ جاتی۔وہ اپنے گوش و دل کو فریب خوردہ سمجھتی۔وہ ان نغموں کے لئے ہر وقت گوش برآواز رہتی تھی۔دریا کے کنارے کی طرف بھاگتی مگر وہاں تو صرف موجوں کا شور ہوتا تھا۔وہ درختوں کی طرف بھاگتی ہُوئی جاتی۔مگر آہ! پتّوں کی کھڑکھڑاہٹ کے سوا کچھ بھی نہ ہوتا تھا۔وہ ایک ایک آواز پر ٹھٹک کر رہ جاتی۔تاریکیوں کے سنّاٹے میں اُس کے پُرشوق کان اسی آواز کو سُنتے صبح کے چہچہوں میں وہ اُسی کو ڈھونڈتی۔شانتا اس گنوار کی طرح جو قوس وقزح کے پیچھے بھاگ بھاگ کر مایوس ہو جاتا ہے۔جنگلوں اور صحراؤں میں سرگرداں پھرتی رہتی تھی۔شام کی خمار آلودہ ہواؤں میں آخر وہ ایک پہاڑ کے دامن میں سوگئی۔

جب نشۂ حُسن سے مخمور صبح نے انگڑائی لی تو ایک آواز نہایت لطیف اور شیریں اس کے کانوں کے پردوں میں خفیف سی سرسراہٹ پیدا کرتی ہُوئی اُس کے دل میں جاگزیں ہوگئی۔وہ کھنچی جاتی تھی اس سُوئی کی طرح جو مقناطیس کی جانب کھینچی جاتی ہے۔وہ مسحور تھی۔اُس کبوتر کی طرح جو سائرن کے دلکش نغموں کی جانب اضطراری طور پر کشتیوں کو چلاتے جاتے تھے۔اور بالآخر چٹان پر ٹکرا کر فنا ہو جاتے تھے۔وہ بھی اپنی کشتی حیات کو اسی جانب اضطراری طور پر چلائے جارہی تھی۔کِس کو معلوم ہے۔کہ وہ چٹان یا ساحل کی جانب کھنچی جاتی تھی۔وہ ایک غیر ذی عقل اور بے ارادہ ہستی تھی۔اُسکی آنکھیں بند تھیں مگر وہ اپنے آپ کو ایک پُر نور دُنیا میں محسوس کر رہی تھی۔اُس کا دماغ بیکار تھا۔مگر وہ صحیح راہ پر گامزن تھی۔بالآخر یہ کہتی ہُوئی "میرا پریم ساگر کہاں ہے" ایک مقام پر دھم سے گر پڑی۔

یہ الفاظ سُن کر جوگی کے دل میں جذبات کا محشر برپا ہوگیا۔پریم ساگر کا متلاشی کون ہے؟ اس کی متجسس نگاہیں اپنے متلاشی کو پہچاننے میں کامیاب ہوگئیں۔اور ایک مُدت کے بُھولے ہُوئے واقعات پھر تازہ ہوگئے اُس کی سولھویں سالگرہ کی دھوم دھام اُس کا ایک بیکس لڑکی کو بچانا مہاراج کا جوشِ غضب سب ایک ایک کر کے اُسکی آنکھوں

کے سامنے پھر گئے۔ وہ اس سرور کے عالم میں تھا۔ جسے صرف محسوس ہی کیا جا سکتا ہے۔

"میں۔ فنا۔ ہو چکی ہوں" شانتا عالم بیہوشی میں بڑبڑا رہی تھی۔ "اپنے پریم کے ساگر میں" جوگی نے شانتا کی پیشانی کو بوسہ دیتے ہوئے کہا۔ "ہاں تو اپنے پریم ساگر کے آغوش میں ہے۔ جب دریا سمندر میں مل جاتا ہے تو کون کہہ سکتا ہے کہ یہ دریا کا پانی ہے۔ اور یہ سمندر کا۔ شانتا کی نیم وا آنکھیں زیادہ روشن اور کشادہ ہو گئیں وہ ہم آغوش تھے۔ معلوم نہیں کب سے۔

(۸)

زندگی کی تمام تگ و دو ہو چکی۔ سرکش گردنوں کو جھکایا۔ سورما جوانوں کے دلوں کو تھرایا۔ فلک بوس عظمتوں کو اپنے پاؤں تلے روند دیا۔ مگر کیا ہوا؟ یہ انجام میری سمجھ میں نہیں آتا۔ انسانوں کی گردنیں میری تعظیم —— نہیں؛ بلکہ پرستش کے لئے جھک جاتی تھیں۔ اس وسیع دنیا کی تمام لذتیں میری طرف کھنچی آتی تھیں۔ میرے خزانے نادر جواہرات سے معمور تھے۔ اور میرے محلات ملک فریب ناز نینوں سے رشک فردوس بنے ہوتے تھے۔ یک جنبش نگاہ گدا کو بادشاہ اور بادشاہ کو گدائے بینوا بنا سکتا تھا۔ مگر کیا ہوا؟ یہ انجام میری سمجھ میں نہیں آتا۔ وہی دنیا جو کبھی روشن اور دلکش تھی۔ آج تنگ و تاریک اور ہیبتناک نظر آتی ہے۔

زندگی کی خوشیاں بھی چھلاوے کی طرح ایک جھلک دکھا کر غائب ہو جاتی ہیں" مہاراجہ بکرم خلوت کے کمرے میں انہیں خیالات میں غرق تھا۔ کہ اس کے وزیر نے اندر داخل ہونے کی اجازت چاہی۔ "کہو میرے دیرینہ ہمدرد کیا کہتے ہو۔ میرے کمزور کندھے اب سلطنت کے بار عظیم کے نیچے دبے جاتے ہیں۔ یہ سلطنت بھی ایک پاپ تھا۔ مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے" اس کی آواز بھرائی ہوئی تھی "ہزاروں دیویوں کی عصمت دری اور کروڑوں بے گناہ انسانوں کے خون کا پاپ میری گردن پر ہے۔ یہ سلطنت بھی ایک ہوس ہے خوفناک اور پُرخطر —— " "آخر آپ کا کیا مطلب ہے!" وزیر نے کانپتی ہوئی آواز میں پوچھا۔ "میں خود اس دیوتا کی تلاش میں جاؤنگا۔ جس کو میں نے درندوں کے سپرد کر دیا تھا۔ شاید میں بھی اسی دریا میں غرق ہو جاؤں جس میں اس وقت اس کی لاش ہے۔ اور پھر ہم دونوں ابد تک ہم آغوش رہیں۔ شاید میں بھی اسی درندے کا ایک لقمہ بن جاؤں۔ جس کے خون میں میرے پریم کا خون ملا ہوا ہے۔ اور پھر ہم کو ایک دوسرے سے کوئی جدا نہ کر سکے"۔ بکرم سے ضبط نہ ہو سکا اور وہ زار زار رونے لگا۔ "صبر سے کام لیجئے۔ ہزاروں مخبر ادھر ادھر بھیجے ہوتے ہیں چند دنوں تک کچھ نہ کچھ سراغ مل جائیگا۔ ہاں ایک اور بات یاد آ گئی"۔ بکرم نے بات کاٹتے ہوئے کہا "میں خود ہی مخبر کی

طرح اُس کو تلاش کرونگا۔ ہاں مگر وہ کیا بات یاد آئی" وزیر نے اپنے تمام حواس کو مجتمع کر کے کہا۔ "مہاراج! کئی لوگوں سے معلوم ہوا ہے۔ کہ چند میل کے فاصلے پر ایک جوگی رہتا ہے۔ لوگ اس کے پاؤں میں گر جاتے ہیں۔ اور وہ اُن کو اپنے بربط سے مس کر کے اُٹھاتا ہے۔ لوگ چلے آتے اور اپنی مُرادیں پا لیتے ہیں۔"

"پاؤں میں گر جاتے ہیں! ـــــ نہیں، یہ نہیں ہو سکتا۔ آسمان زمین کے پاؤں پر جُھک جائے! آفتاب ذرّے کو سجدہ کرے! تو نے یہ کیا کہدیا ہے؟"

بکرم اپنے پرانے فخر و اعزاز کے عالم میں چراغ پا ہو رہا تھا۔ وزیر اجازت لیکر بید کی طرح کانپتا ہُوا باہر چلا گیا۔

(۹)

ڈُوبتے کو تنکے کا سہارا بھی کافی ہے۔ مریض جب تمام مستند اطبا کے علاج سے مایوس ہو جاتا ہے۔ تو پھر وہ ایک ناتراشیدہ گنوار کا نسخہ استعمال کرنے کے لئے بھی تیار ہو جاتا ہے۔ بکرم کہنے کو تو کہہ گیا تھا کہ آسمان زمین کو سجدہ نہیں کر سکتا۔ مگر اب وہ خود ہی اپنی تقریر پر عذر کر رہا تھا۔ آہ! احتیاج دُنیا میں کیا کیا انقلابات پیدا نہیں کرتی۔ اُس کی رگ رگ سے یہی صدا اُٹھتی تھی کہ جا اس جوگی کے پاؤں پر اپنا سر رکھ دے۔ غرور اور پدری محبت کی عجیب کشمکش تھی۔ وہ ہستی جس کے پاؤں میں کل تک لاتعداد نفوس جھک رہے تھے۔ آج سر کو ایک جوگی ایک معمولی جنگل کے جوگی کے قدموں پر جُھک جانے کے لئے آمادہ کر رہا ہے۔ "پریم ساگر تیرے لئے میں کیا کچھ نہ کرونگا ـــــ نہیں ـــ تیرے لئے نہیں، تیرے لئے جو کچھ کرنا تھا کر چکا ہوں۔ آہ یہ سب کچھ اپنے ہی لئے ہے اپنے بیتاب دل کے لئے اے میرے پریم تو مجھے کہاں تک سزا دے گا۔ اپنے بوڑھے باپ کی حالت پر رحم کر"

بکرم پر چند لمحوں کے لئے سکوت سا طاری ہو گیا۔ دفعتاً اس کے چہرے پر مایوسانہ رنگ بکھر گیا۔ "اگر پریم فنا ہو چکا ہے تو وہ جوگی کیا کر سکتا ہے۔ مردوں کو زندہ کرنا صرف پرمیشور کا کام ہے۔ اُس کے پاؤں پر گرنا کہیں گناہ بے لذّت ہی ثابت نہ ہو"

بکرم کی حرکات کو وفادار وزیر چھپ چھپ کر تاڑتا رہتا تھا۔ وہ اس موقع کی تلاش میں تھا۔ جبکہ وہ بکرم کو جوگی کے پاس جانے پر فوراً آمادہ کرے۔ آج بھی اُس نے سب کچھ دیکھا۔ اور سُنا۔ اُس کا چہرہ خوشی سے تمتما رہا تھا۔ اُس نے چند لمحوں کے بعد اندر داخل ہونے کی اجازت چاہی۔

"مہاراج! میری بات پر بھی آپ نے کچھ غور کیا اس جوگی کی بہت دھوم دھام ہو رہی ہے۔ اپنے پریم کے لئے آپ نے بھی کچھ سوچا"

بکرم جانے کا فیصلہ کر چکا تھا۔" ہاں! اس کے لئے میں سب کچھ گوارا کرونگا۔"

(۱۰)

"مہاراج" کہہ کر جوگی اور جوگن بکرم کے چرنوں میں گر پڑے۔ تماشائی حیرت کے عالم میں چاروں انسانوں کو دیکھ رہے تھے۔" مہاراج! کونسا مہاراج کیا یہ فقیرانہ کمبل اوڑھے ہوئے مہاراج ہی ہیں۔ اور یہ اُن کے پاس دوسرا شخص کون ہے؟" یہی سوالات سب کے دلوں میں پیدا ہوتے۔ مگر تمام لوگ سکتے کے عالم میں کھڑے تھے۔ ہاں خود مہاراج بھی نہیں سمجھتے تھے۔ کہ معاملہ کیا ہے۔ وہ تو سجدہ کرنے کے لئے آئے تھے۔ مگر یہاں خود ان کو سجدے ہو رہے ہیں۔ بکرم نے جوگی کو اپنے دائیں اور جوگن کو اپنے بائیں ہاتھ سے اُٹھایا۔ اور خوشی کے نعرے لگاتے ہوئے جوگی کو سینے سے لپٹا لیا۔ کیونکہ یہ جوگی وہی پریم تھا۔ وزیر نے سب کو تمام ماجرا سمجھایا۔ بکرم کے گرد تمام ہجوم جمع ہو گیا۔ اور سب کے سر اُس کے پاؤں میں جھکے ہوتے تھے۔ اُس نے کہا۔" اب پریم کی اطاعت تم پر لازم ہے۔ میں بن باسی اور سادھو ہوں" بکرم نے پھولوں کے تاج بنائے۔ اور پریم ساگر اور شانتا کو اپنے ہی ہاتھوں سے پہنائے۔ پریم ساگر نے اسی جنگل کو اپنی راج دھانی مقرر کیا۔ تمام اُمراء اور رؤساء وہیں آکر مقیم ہو گئے۔ اُس کا نام "پریم ساگر" انتخاب کیا گیا۔

ہر صبح راجہ اور رانی پھولوں کے تاج پہنے ہوئے شہر سے باہر نکلتے۔ تمام رعایا اُن کے پیچھے ہوتی اور وہ سب دریا کے کنارے پر راجے اور رانی کی نہیں، بلکہ اپنے حقیقی معبود کی پرستش کرتے۔

اثر صہبائی

خمخانۂ راز

پیغمبر ما کہ انبیا راست امام　　جبریل آوردش از خداوند پیام
بودش بر حکم فطرت انجام آغاز　　در دائرۂ نبوت آغاز انجام

اے ساقی ما بادہ بدہ عصمت خیز　　کآمد با دار و گیر باطل بستیز
در ساغرم اے ساقی خمخانۂ راز　　آں بادہ ز رمز اسمہٗ احمد ریز

گرامی مدظلہٗ

اے کشورِ جاں اے ہنر آرائے تمنّا — جلوہ ہے ترا دیدۂ خونناب نشاں میں
ہر داغِ مصیبت ہے چراغِ شبِ امکاں — ہر زخم ہے گلدستۂ نو بزمِ جہاں میں

تو نور کی دنیا میں ہے سیّارۂ روشن — تو حسنِ جوانی کی نمائش میں ہے رنگیں
تو ہے حکماء کے لئے گنجینۂ تحقیق — تو ہے شعراء کے لئے تخئیل مضامیں

وہ ساز جو ہے مطربِ گلشن کی نوا میں — وہ راگ جو غنچوں کے لئے خوشخبری ہے
چھیڑا ہے اسی کو نئے انداز سے تُونے — وہ زمزمہ جو شعلۂ آوازِ پری ہے

طوطی کے لئے جوہرِ آئینہ ہیں ذرّے — بلبل کے لئے نغمۂ الہام ہے تیرا
پروانۂ جاں سوختہ پر شمع ہے گریاں — بہتر کہیں آغاز سے انجام ہے تیرا

تو وہ ہے کہ اقوام میں اک جان دو قالب — تو وہ ہے کہ آزادیٔ مشرق کا ہے پیغام
تو وہ ہے کہ ہے روحِ تمدن کا مرقع — تو وہ ہے ترقی کی ستائش کا ہے انعام

بجلی کی طرح دوڑتا ہے خون رگوں میں — تو نے دلِ خوابیدہ کو بیدار کیا ہے
قربانیٔ ملت کے سبق نوکِ زباں ہیں — اعدا کے مقابل ہمیں تیار کیا ہے

اس راہ میں تابش ہے ترے نقشِ قدم کی — لغزش ہو جہاں عقل کو ہو فلسفہ حیراں
پابندِ روایات نئے سر سے ہوں زندہ — ہو سعی و عمل گرمیٔ ہنگامۂ انساں

ہر شے متحرک ہے بقا ہے تری بستی — کاشانہ وہ روشن ہے جہاں شاد ہیں روحیں
مٹ کر بھی میسر ہے انہیں لذتِ جاوید — قانونِ غلامی نہیں آزاد ہیں روحیں

سیّد ابو محمد ثاقب

روداد محبّت

مُصنّفہ ٹالسٹائی — حِصّہ اوّل — مترجمہ رازؔ چاندپوری

باب چوتھا

کسی دوسری جگہ جانے یا مسرت بخش صحبتوں اور خوشگوار زندگی کی جستجو کا مجھے خیال بھی نہ تھا۔ بلکہ اس کے برخلاف دیہات میں ایک خاموش زندگی بسر کرنا ایک دوسرے کے لئے جان قربان کرنا، باہم محبت رکھنا۔ اور ہر حال میں رحیم و یاور خدائے واحد کا یقین کرنا میرے نزدیک بہترین زندگی تھی۔

میں اپنی تجویز کے مطابق اپنی سالگرہ کے دن عشائے ربانی میں شریک ہوئی۔ اس دن جب میں گرجے سے واپس ہوئی تو میرا دل اسقدر مسرور تھا کہ میں ہر اُس خیال اور ہر اُس شے سے جو کسی حد تک بھی میری مسرت کو فنا کر دینے والا ہوتا کانپ اُٹھتی۔ لیکن جیسے ہی ہم فٹن سے اُتر کر سیڑھیوں پر چڑھ رہے تھے۔ اس کی گاڑی کے پہیّوں کی آواز جس سے ہم خوب واقف تھے پُل پر سنائی دی۔ اور میں نے سرجائی کو آتے ہوئے دیکھا۔ اُس نے مجھے مبارکباد دی اور ہم ایک ساتھ ملاقات کے کمرہ میں چلے گئے۔ جب سے ہم دونوں ایکدوسرے سے واقف ہُوئے تھے۔ آجتک کبھی میں اسقدر خاموش اور ساکت نہ رہی تھی۔ جیسی آج صبح کو تھی۔ مجھے اس امر کا احساس تھا کہ میرے اندر ایک نئی دُنیا آباد ہے۔ جو اس سے بہت بلند ہے۔ اور جس سے وہ ناواقف ہے۔ مجھے اسکی موجودگی سے مطلق تکلیف نہ ہُوتی۔ یقیناً کسی حد تک اس نے اس کو سمجھ لیا ہوگا۔ کیونکہ وہ محبت اور شرافت سے میرے ساتھ پیش آیا۔ اور ایک عجیب طریقہ سے میرا احترام کرتا رہا۔ میں پیانو کے پاس گئی۔ لیکن اُس نے اس کو بند کر دیا۔ اور چابی اپنی جیب میں رکھ لی۔

اُس نے کہا: "اس اثر کو جس سے تم متاثر ہو رہی ہو برباد نہ کرو۔ اس وقت تمہاری رُوح مادی نغمہ سے بالاتر موسیقی سے معمور ہے۔"

میں اسکی اس عقلمندی پر اس کی شکرگزار ہوئی۔ لیکن ساتھ ہی کسی قدر بددل بھی۔ کیونکہ بہت آسانی سے اس نے وہ بات معلوم کر لی تھی۔ جو میری رُوح کے اندر مثل ایک راز

کے ہر ایک سے پوشیدہ رہنی چاہیئے تھی۔

دوپہر کے کھانے کے بعد اس نے کہا۔ "میں تمہیں مبارکباد دینے اور الوداع کہنے آیا ہوں۔ کیونکہ میں کل ماسکو چلا جاؤنگا" یہ کہتے ہوئے اس نے کاٹیا کی طرف دیکھا۔ اور پھر میری جانب اچٹتی ہوئی نظر کی۔ میں نے دیکھا کہ وہ میرے چہرے کا رنگ متغیر دیکھ کر خوفزدہ ہو رہا تھا۔

مگر میں نے تعجب کا اظہار کیا نہ رنج کا، بلکہ میں نے اُس سے یہ بھی نہ دریافت کیا کہ کیا وہ عرصہ دراز کے لئے جا رہا ہے۔ کیونکہ میں جانتی تھی۔ کہ وہ کیا کہیگا۔ اور مجھے معلوم تھا کہ در اصل وہ نہیں جائیگا۔

آجتک میں خود نہیں سمجھ سکی کہ یہ مجھ کو کیونکر معلوم ہو گیا تھا۔ لیکن اس یادگار دن میں مجھے ایسا معلوم ہوتا تھا۔ کہ ماضی و مستقبل کی ہر بات مجھے معلوم تھی۔ میں اپنے آپ کو ایک مسرت بخش خواب کی حالت میں پاتی تھی۔ اور جو باتیں ہنوز ظہور میں نہ آئی تھیں۔ وہ میرے پیش نظر تھیں اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ میں عرصہ سے اُن سے واقف تھی۔ تاہم واقعہ یہ تھا کہ یہ باتیں مستقبل میں ظاہر ہونے والی تھیں اور میں جانتی تھی کہ وہ مستقبل سے وابستہ ہیں۔

دوپہر کے کھانے کے بعد وہ فوراً ہی جانیوالا تھا۔ مگر کاٹیا جو کام کرتے کرتے تھک گئی تھی۔ تھوڑی دیر کے لئے لیٹ گئی اور اس کو مجبوراً اُس سے رخصت ہونے کے لئے اس کے جاگنے تک انتظار کرنا پڑا۔

ملاقات کے کمرہ میں سورج کی روشنی آرہی تھی۔ ہم چبوترہ پر چلے گئے۔ جیسے ہی ہم وہاں بیٹھ گئے۔ میں نے پورے اطمینان و سکون کے ساتھ وہ گفتگو شروع کی جس پر میری محبت کی قسمت کا فیصلہ منحصر تھا۔ میں نے بیٹھتے ہی سلسلہ کلام شروع کر دیا۔ در آنحالیکہ اس وقت تک کوئی بات نکلی ہی تھی اور نہ کوئی ایسی بات تھی جو ہماری گفتگو میں مخل ہوتی یا جو کچھ میں کہنا چاہتی تھی اس پر کوئی بُرا اثر ڈال سکتی۔ خدا معلوم اطمینان و سکون اور حقیقت کہاں سے میرے بیان میں آگئے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا۔ کہ گویا میں خود نہ تھی بلکہ میری خواہش سے آزاد کوئی اور شئے تھی۔ جو میری زبان میں سرگرم کلام تھی۔ وہ اپنا سر جنگلے پر رکھ کر میرے مقابل بیٹھ گیا۔ اور سوسن کی شاخ اپنی طرف جھکا کر اس کے پتے نوچنے لگا۔

جب میں نے بات چیت شروع کی تو اس نے شاخ کو چھوڑ دیا۔ اور اپنے ہاتھ پر سر رکھ لیا۔ ایسی حالت بالکل سکون یا اضطراب میں ہر شخص پر طاری ہو جاتی ہے۔

میں نے پُر معنی لہجہ میں اس کے چہرہ پر نظر جما کر پوچھا "تم کیوں باہر جا رہے ہو؟"

اُس نے فوراً ہی جواب نہ دیا بلکہ کچھ وقفہ کے بعد نیچی نگاہ کر کے بولا۔ "ضرورت مجبور کرتی ہے۔"

مجھے معلوم ہوا کہ میرے سوال کے جواب میں جو میں نے

آزادی سے پیش کیا تھا۔ اس کے لئے جھوٹ بولنا کس قدر مشکل تھا!

مَیں نے کہا۔ "سُنئے! آپ جانتے ہیں کہ آج کا دن میرے واسطے کیسا ہے۔ بہت سی وجھوں سے یہ دن ایک یادگار دن ہے۔ اگر مَیں تم سے یہ دریافت کرتی ہوں۔ تو یہ صرف احسان ہی نہیں ہے۔ کیونکہ تم کو معلوم ہے کہ مَیں تم سے ملنے کی عادی ہوں اور تمہارے دیکھنے کی مشتاق رہتی ہوں لیکن مَیں صرف اس غرض سے پوچھتی ہوں تاکہ مجھے معلوم ہو جائے اچھا بتاؤ تم کیوں باہر جا رہے ہو؟"

اُس نے جواب دیا۔ "اس معاملہ میں تم سے سچ کہنا میرے لئے بہت دشوار ہے۔ گزشتہ ہفتہ میں تمہارے اور اپنے متعلق بہت کچھ غور و خوض کرتا رہا ہوں۔ اور اس نتیجہ پر پہنچا ہوں۔ کہ مجھے باہر چلا جانا چاہئے۔ تم کو اس کی وجہ معلوم ہے۔ اور اگر واقعی تم کو مجھ سے اُنس ہے تو تم مجھ سے دریافت نہ کرو۔"

اُس نے اپنا ہاتھ اپنی پیشانی پر پھیرا آنکھیں بند کر لیں اور کہا۔ "میرے لئے یہ بتانا مشکل ہے — لیکن تم اس کو بخوبی سمجھتی ہو۔"

میرا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔

مَیں نے کہا۔ "مَیں نہیں سمجھ سکتی، مطلق نہیں سمجھتی۔ تم ہی بتاؤ۔ خُدا کے لئے آج کے دن کے صدقہ میں مجھے بتاؤ کہ کیا بات ہے، مَیں نہایت خاموشی کے ساتھ سُنونگی۔"

اُس نے اپنی نشست کا پہلو بدلا۔ میری طرف دیکھا اور سوسن کی اُس شاخ کو پھر اپنی طرف کھینچ لیا۔

تھوڑی دیر کے بعد اُس نے اپنے لہجہ کو سنبھالتے ہوئے کہا۔ "اگرچہ اس راز کو الفاظ کا جامہ پہنانا حماقت ہے۔ اور ناممکن نیز میرے لئے دشوار تاہم میں اس کو بیان کرنے کی کوشش کرونگا۔" اُس نے سلسلۂ گفتگو جاری رکھا۔ اس کی بھویں تنی ہوئی تھیں۔ اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ ایک باطنی تکلیف میں مبتلا ہے۔

مَیں نے کہا۔ "بہتر ہے۔ فرمائیے۔"

اُس نے جواب دیا۔ "فرض کرو زید نامی ایک شریف آدمی تھا — ضعیف اور زندگی سے بیزار — اور ایک نوجوان خوش و خرم تنا توان جو ہنوز کشمکش حیات سے ناواقف تھی۔ زید غیر شعوری طور پر مثل اپنی بیٹی کے اُس سے محبت کرنے لگا تھا۔ اور کسی دوسرے طریقہ سے محبت کرنے کا خیال کبھی اس کے ذہن میں نہ آیا تھا۔"

اتنا کہکر وہ رُک گیا۔ اور مَیں خاموش رہی۔

سلسلہ کلام کو جاری رکھتے ہوئے اس نے یکایک زمین کی طرف دیکھتے ہوئے متانت کے ساتھ جلد جلد کہنا شروع کیا۔ "لیکن زید نے اس حقیقت کو نظرانداز کر دیا۔ کہ وہ دوشیزہ اسقدر کمسن تھی کہ اس وقت تک اس کے نزدیک

زندگی کوئی اہم چیز نہ تھی۔ اور یہ کہ میں اس کے ساتھ ایک مختلف طریقہ سے محبت کرنے لگونگا۔ اور یہ طرزِ عمل اس حسینہ کے واسطے سامانِ تفریح بن جائیگا لیکن اس کو مغالطہ ہُوا۔ یکایک اس کی رُوح رنج وغم کے جذبات سے لبریز ہوگئی۔ اور وہ کانپ اُٹھا۔ وہ اس لئے خوفزدہ ہُوا کہ کہیں اگلے دوستانہ تعلقات منقطع نہ ہو جائیں۔ اس نے اس سے قبل کہ ایسا موقع پیش آئے اس سے جُدا ہو جانے کا فیصلہ کر لیا۔

یہ کہتے کہتے اُس نے بے پروائی کے ساتھ اپنے ہاتھوں سے پھر اپنی آنکھیں ملیں اور ان کو بند کر لیا۔

میں نے نہایت آہستگی سے پُوچھا "مہربانی فرماکر بتائیے کہ اس کا ایک دوسرے طریقہ پر اس حسینہ سے محبت کرنے میں کیوں پس وپیش ہونا چاہئے؟" میں نے اپنے دلی اضطراب کو دُور کیا۔ اور میری آواز سے اطمینان وسکون ظاہر ہو رہا تھا لیکن وہ حقیقت میں اس کو مذاق سمجھ رہا تھا۔

اس نے ایسے لب ولہجہ میں جواب دیا جس سے معلوم ہوتا تھا کہ اس کو تکلیف پہنچی ہے۔

اس نے کہا "تم نوعمر ہو اور اب میں نوجوان نہیں۔ تمہارے واسطے معمولی سے معمولی بات دلچسپی کا باعث ہے اور میرے لئے کسی اور شے کی ضرورت ہے۔ دلخوش کن باتیں جو تم کو پسند ہیں میرے پاس نہیں ہیں۔ مجھے خوف ہے کہ شاید میں کوئی گستاخی کر بیٹھوں اور تم کو ملال ہو ..... یہ وہ الفاظ ہیں جو زید کی زبان سے نکلے تھے۔" سلسلۂ گفتگو جاری رکھتے ہُوئے اُس نے پھر کہا۔ "خواہ یہ حماقت ہی کیوں نہ سمجھی جائے۔ مگر میں تو یہی کہونگا۔ کہ تم کو میرے جانے کی وجہ معلوم ہوگئی اور اب مہربانی فرماکر اس ذکر کو چھوڑ دیجئے۔"

میرا دل بھر آیا۔ میری آواز کانپنے لگی۔ اور میں نے زور دیکر کہا "نہیں نہیں یہ گفتگو ختم نہیں ہوسکتی۔ خیر یہ بتاؤ کہ زید کو اُس حسینہ سے محبت بھی تھی یا نہیں؟"

اُس نے کوئی جواب نہیں دیا۔

میں نے کہا "اچھا اگر زید کو اُس کے ساتھ محبت نہ تھی تو وہ اُس کے ساتھ مثل ایک بچہ کے کیوں خوش فعلیاں کیا کرتا تھا؟"

اُس نے میری بات کاٹ کر جلدی سے جواب دیا "ہاں یہ زید کا قصور تھا لیکن آخرکار نتیجہ یہ نکلا۔ کہ وہ ایک دوسرے سے دوستانہ طریقہ پر جُدا ہوگئے۔"

"مگر یہ تو بہت ہی افسوسناک واقعہ ہے۔ کیا کسی دوسرے طریقہ سے اس کا انجام ہونا ممکن نہ تھا؟"

مشکل سے یہ الفاظ میری زبان سے ادا ہوئے تھے کہ میں اپنی اس ناعاقبت اندیشی پر کانپ اُٹھی۔

اس نے بے تابانہ میری طرف دیکھتے ہُوئے کہا۔ "ہاں ممکن تھا۔ دو مختلف طریقوں سے نتیجہ نکل سکتا تھا۔ لیکن خدا کے لئے میری بات نہ کاٹو۔ اور جو کچھ میں کہوں،

خاموشی کے ساتھ سنو" وہ کھڑا ہو گیا۔ اور میری طرف افسردگی کے ساتھ مسکراتے ہوئے دیکھ کر کہا "بعض لوگ کہتے ہیں کہ زید دیوانہ ہو گیا تھا۔ اور اس دوشیزہ کی محبت میں از خود رفتہ چنانچہ اس نے اس حسینہ سے اظہار محبت کر دیا۔ مگر وہ اس کی اس حالت پر صرف ہنس کر خاموش ہو رہی۔ کیونکہ اس کے واسطے یہ صرف ایک مذاق تھا۔ اور زید کے لئے زندگی اور موت کا معاملہ"

میں کانپنے لگی۔ اور چاہتی تھی کہ اس کی گفتگو میں مخل در انداز ہو کر اس سے کہوں کہ اس کو میری طرف سے کچھ کہنے کا کیا حق حاصل ہے۔ لیکن اس نے اپنا ہاتھ میرے ہاتھ پر رکھ کر مجھے بولنے سے باز رکھا۔

اس نے مرتعش آواز میں کہا "ٹھہرو، دوسرے لوگ کہتے ہیں۔ کہ وہ دوشیزہ اس پر مہربان تھی۔ وہ بیچاری جو ہنوز دنیا اور دنیوی معاملات سے اچھی طرح واقف نہ تھی۔ کہ اس کو در اصل اس سے محبت کرنی چاہئے۔ اور اس لئے وہ اس کی منکوحہ بننے کے لئے رضامند تھی۔ اور زید اس کا یقین کر کے پاگل ہو گیا تھا۔ اس کو یقین تھا کہ اس کی زندگی میں نئے سرے سے جان پڑ جائیگی مگر دونوں اچھی طرح جانتے تھے۔ کہ وہ ایک دوسرے کو فریب دے رہے ہیں۔ بس اب اس ذکر کو چھوڑ دو" وہ خاموش ہو گیا۔ اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اور کچھ کہنے کی اس میں طاقت ہی نہیں ہے۔ وہ کھڑا ہو گیا اور میرے سامنے اِدھر اُدھر ٹہلنے لگا۔

اس نے کہا تھا کہ "بس اس گفتگو کو ختم کر دو" لیکن مجھے محسوس ہوا کہ وہ میرا جواب سننے کے واسطے ہمہ تن گوش بنا ہوا تھا۔ میں کچھ کہنا چاہتی تھی۔ مگر کہہ نہ سکتی تھی۔ کوئی شے میرا گلا دبا رہی تھی۔ میں نے اس کی طرف دیکھا۔ اسکا رنگ زرد پڑ گیا تھا اسکا نیچے کا ہونٹ کانپ رہا تھا۔ میں نے اپنی تمام قوت صرف کر کے اس قفل خاموشی کو توڑا۔ جو میرے لبوں پر آویزاں تھا۔ اور کمزور اور دبی آواز سے، جس کی نسبت مجھے ہر لحظہ ناکامیاب رہنے کا خوف تھا۔ کہا۔

"لیکن ایک تیسرا نتیجہ بھی نکل سکتا تھا" یعنی یہ کہ زید کو اس حسینہ سے محبت نہ تھی۔ بلکہ اس نے اس کو بے حد صدمہ پہنچایا۔ اور خیال کرتا رہا۔ کہ ایسا کرنے میں وہ حق بجانب ہے۔ پھر وہ وہاں سے چلا گیا۔ اور اپنے طرز عمل کو اپنے لئے موجب فخر سمجھتا رہا۔ میرے لئے نہیں بلکہ صرف تمہارے واسطے یہ ایک بالکل معمولی بات ہے۔ روز اوّل سے مجھے تم سے محبت ہے ——— ہاں میں تم سے محبّت رکھتی ہوں" میں نے پھر کہا۔ "بیشک مجھے تم سے محبّت ہے" اور "محبت ہے" کے الفاظ پر میری آواز خلاف عادت نرم و لطیف ہونے کی بجائے وحشیانہ انداز سے بلند ہو گئی۔ جس سے مجھے خود خوف معلوم ہونے لگا۔

وہ میرے سامنے کھڑا تھا۔ اس کا چہرہ پژمردہ

ہو گیا تھا۔ اُس کے ہونٹ کانپ رہے تھے۔ اور اسکی آنکھوں سے آنسو رواں تھے۔

مَیں نے زور سے کہا۔ "یہ سراسر ظلم ہے"۔ مجھے خوف معلوم ہُوا کہ ضبط گریہ سے میرا دم گھٹ جائیگا۔ مَیں نے پھر کہا۔ "آخر اس کا سبب؟" اور اُس کے پاس سے جدا ہونے کے لئے اُٹھ کھڑی ہُوئی۔

مگر اُس نے مجھے روک لیا۔ اُس نے اپنا سر میرے قدموں پر رکھ دیا۔ اور میرے مرتعش ہاتھوں پر بوسے دینے لگا۔ میرے ہاتھ اُس کے آنسوؤں سے تر ہو گئے۔

اس کی زبان سے نکلا "میرے اللہ اگر مجھے معلوم ہوتا ۔"

مَیں نے پُوچھا "کیا بات ہے؟ کیا معاملہ ہے؟" مگر میری رُوح مسرت سے لبریز ہُو چکی تھی۔ ایسی مسرت جس کو کوئی طاقت مجھ سے نہ چھین سکتی تھی۔ اور اس کا اعادہ کرنا محال ہے۔

پانچ منٹ کے اندر ہی سونیا کاٹیا کے پاس بالاخانہ پر گئی۔ اور گھر میں شور مچا دیا۔ کہ "آپا تو سرجیائی کے ساتھ شادی کرنے والی ہیں"۔

پانچواں باب

ہماری شادی کو ملتوی کرنے کی کوئی وجہ نہ تھی۔ اور نہ ہم دونوں میں سے کسی کی یہ خواہش تھی۔ کاٹیا ماسکو جانے اور لباس عروسی کی تیاری کا انتظام کرنے کے لئے مضطرب تھی۔ سرجیائی کی والدہ اس پر زور دے رہی تھی کہ شادی سے قبل ایک نئی گاڑی اور فرنیچر مہیا کر لیا جائے۔ اور مکان کو نئے پردوں سے آراستہ کیا جائے۔ لیکن ہم دونوں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ اگر ان چیزوں کی دراصل ضرورت ہوئی تو بعد میں ان پر توجہ کی جاتے۔ اور اس طرح میری سالگرہ کے دو ہفتہ بعد شاہانہ جوڑہ، مہمان، برات، دعوت اور دوسرے لوازمات شادی کے بغیر ہمارا عقد ہو گیا۔

سرجیائی نے مجھ کو بتایا۔ کہ اس کی والدہ اس وجہ سے اُس سے ناخوش ہے کہ ہماری شادی بلا ناچ باجے، شان و شوکت اور تجدید مکان کے ہُوئی۔ حالانکہ خود اس کی شادی میں تیس ہزار روپیہ صرف ہُوا تھا۔ وہ خاموشی کے ساتھ پوشیدہ طور پر توشہ خانے کا جائزہ لینے میں مصروف تھی۔ اور داروغہ مکان ماریشکا کے مشورہ سے قالین، پردوں اور ظروف کے انتظام میں لگی ہُوئی تھی جو ہماری آسائش کیلئے ضروری تھے۔

میرے یہاں کاٹیا بھی ضعیف العمر دایہ کزمینشنا کی مدد سے اس قسم کے انتظام میں مصروف تھی۔ اور اس کے متعلق اس سے ملائمت سے کچھ کہنا بے سود تھا جب سرجیائی اور مَیں اپنے مستقبل پر گفتگو کرتے تھے تو کاٹیا سمجھتی تھی کہ

ہم صرف خیال آرائیوں اور دور از کار خیالوں میں مصروف ہیں۔ جیسا کہ لوگ عموماً ایسی حالت میں کرتے ہیں۔ اسکا خیال تھا کہ ہمارے مستقبل کی حقیقی مسرت میرے زرکار و منقش لباس اور مکان کی آرائش پر منحصر ہے

پوکروسکوئی اور نکولسکوئی کے درمیان ہر روز چند بار مختلف قسم کی تیاریوں کے متعلق رازداری کے خطوط آتے جاتے تھے۔ اور اگرچہ بظاہر کاٹیا اور اس کی والدہ بہت ہی مہربان معلوم ہوتی تھیں۔ تاہم ان کی تدابیر پوری ہوشیاری اور کسی قدر مخالفت کے ساتھ جاری تھیں۔

اُس کی ماں ٹاٹیانا، جس سے اب مَیں اچھی طرح متعارف ہو چکی تھی۔ ایک دُور اندیش، پابند وضع تعلقہ دار خاتون تھی اور اپنے بزرگوں کے طریقہ کی سختی کے ساتھ پابندی کرتی تھی سرجیائی نہ صرف بیٹا ہونے کی حیثیت سے اپنا فرض سمجھکر اُس سے محبت نہ کرتا تھا۔ بلکہ وہ اس کو ذی عقل، دنیا میں سب سے بہتر، سب سے زیادہ نیک اور قابل محبت ہستی خیال کرتا تھا۔ ٹاٹیانا ہم دونوں پر عموماً اور خصوصاً مجھ پر ہمیشہ مہربانی کرتی تھی۔ اور وہ خوش تھی کہ اس کا لخت جگر میرے ساتھ شادی کرنے والا ہے۔ لیکن نسبت ہو جانے کے بعد جب مَیں اُس سے ملتی تھی تو وہ اس امر کو میرے ذہن نشین کرنے کی کوشش کرتی۔ کہ ہم دونوں ایک دوسرے کے لئے بہترین شریک زندگی نہ تھے۔ اور یہ کہ اس بات کو مجھے ہمیشہ یاد رکھنا چاہئے۔ مَیں اس کی طبیعت سے اچھی طرح واقف ہو چکی تھی۔ اور اُس کے خیال سے متفق تھی۔

کنوارپنے کے آخری دو ہفتوں میں ہم دونوں ایک دوسرے سے روزانہ ملتے رہے۔ وہ دوپہر کو آتا تھا اور آدھی رات تک میرے پاس بیٹھا رہتا تھا لیکن باوجود اس اظہار خیال کے کہ وہ میرے بغیر زندہ نہ رہ سکتا تھا۔ اور مَیں بھی جانتی تھی کہ وہ سچ کہتا تھا۔ اُس نے میرے ساتھ کبھی ایک پُورا دن بھی بسر نہ کیا۔ اور برابر اپنے کاموں میں پوری توجہ کے ساتھ مصروف رہا

ہمارے ظاہری تعلقات شادی کے دن تک بدستورِ سابق قائم رہے۔ ہم ہنوز مثل سابق ایک دوسرے کو "تم" کہکر مخاطب کرتے تھے۔ وہ میری دست بوسی سے گریزاں رہا۔ اور بجائے ایسے موقعوں کی تلاش کے کہ ہم دونوں خلوت میں بیٹھیں۔ اُس نے ایسے موقعوں پر دیدہ و دانستہ چشم پوشی سے کام لیا۔ وہ دراصل اس خیال سے خائف معلوم ہوتا تھا کہ جو محبت اُس کے دل میں ہے کہیں ترقی کر کے خطرناک صورت نہ اختیار کر لے۔

مَیں نہیں کہہ سکتی کہ آیا وہ خود تبدیل ہو گیا تھا، یا مَیں ہی بدل گئی تھی، اور مجھے معلوم ہوتا تھا کہ اس کے ساتھ مَیں بھی اُسی راہ میں گامزن تھی۔ جس پر وہ خود چل رہا تھا۔ اب وہ سادگی اور بھولا پن نظر نہ آتا تھا جو شروع میں مجھے

ناپسند تھا میں دیکھتی تھی کہ بجائے ایک شخص کے جسکی موجودگی سے دل میں عزت اور خوف پیدا ہو۔ وہ ایک ایسا بھولا اور معصوم بچہ معلوم ہوتا تھا جو جوش مسرت میں قابو سے باہر ہو۔

میں اکثر اپنے دل میں کہا کرتی تھی۔ کہ "اس میں کوئی خاص تعجب خیز بات نہیں ہے۔ وہ صرف ایک انسان ہے جیسی میں ہوں۔ اور اس سے زیادہ کچھ نہیں"

اب مجھے معلوم ہوتا تھا کہ مجھ سے کوئی بات پوشیدہ نہ تھی۔ اور میں اس کو اچھی طرح پہچان گئی ہوں۔ تمام باتیں جو اس کے اندر مجھے نظر آتی تھیں۔ بالکل صاف اور میری طبیعت کے مطابق تھیں۔ حتےٰ کہ ہماری آئندہ زندگی کے متعلق اس کی جو رائے ہوتی وہی میری رائے بھی ہوتی۔ فرق صرف اسقدر تھا کہ وہ اس کو زیادہ واضح اور بہترین الفاظ میں بیان کر دیتا تھا۔

اس زمانہ میں موسم کی حالت اچھی نہ تھی اور ہم وقت کا زیادہ حصّہ گھر میں رہکر گزارتے تھے۔ ہماری بہترین اور محبت آمیز گفتگو پیانو اور کھڑکی کے درمیان بیٹھ کر ہوا کرتی تھی۔ شمع کی روشنی کھڑکی کے آئینوں پر پڑ کر منعکس ہوتی تھی جن پر وقتاً فوقتاً بارش کے قطرے گر کر بہنے لگتے تھے۔ چھت پر مینہ برسنے کی آواز سنائی دیتی۔ اور پانی پرنالے کی راہ سے بہکر تالاب میں چلا جاتا تھا۔ کھڑکی پر تری ہی تری ہوتی اور ہمارا خلوتکدہ اس کی وجہ سے نہایت آرام دہ معلوم ہوتا تھا

ایک دن شام کے وقت جب ہم دیر تک اس جگہ بیٹھے رہے تھے تو اس نے کہا "کیا تم کو معلوم ہے کہ میں عرصہ سے تم سے ایک بات کہنا چاہتا ہوں۔ میں اس پر تمہارے لڑکپن کے زمانے سے برابر غور کرتا رہا ہوں"

میں نے جواب دیا "مجھ سے کچھ نہ کہو۔ میں اسکو بخوبی جانتی ہوں۔"

"بیشک تمہارا کہنا درست ہے۔ مجھے خاموش ہی رہنا چاہیئے۔"

میں نے دریافت کیا "اوہ! اچھا کہو تم کیا کہنا چاہتے ہو"

"بہتر ہے، کیا تم کو یاد ہے کہ میں نے تم سے زید اور ایک حسینہ کا قصّہ کہا تھا؟"

"اس حماقت آمیز قصّہ کو یاد رکھنے کا خیال فضول ہے اس کا انجام جو کچھ ہوا بہتر ہوا"

اگر تھوڑا سا زمانہ اور گزر جاتا تو مجھے کبھی مسرت نصیب نہ ہوتی۔ تم نے میری جان بچائی۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ میں تم سے ہمیشہ جھوٹ بولتا رہا۔ میرا ضمیر مجھے ملامت کرتا ہے۔ اور اب میں اس قصّہ کا باقی حصّہ ختم کرنا چاہتا ہوں"

میں نے کہا "جناب اس کی ضرورت ہی کیا ہے"

اس نے مسکراتے ہوئے جواب دیا "گھبرائیے نہیں

میری خواہش صرف اسقدر ہے۔ کہ میں اپنی حقیقت پورے
طور پر تمہارے روبرو ظاہر کردوں۔ جب میں تم سے گفتگو
کرنا شروع کرتا تھا تو مجھے دلیل و بحث کی ضرورت
ہوتی تھی۔"

میں نے کہا" دلیل و بحث! یہ تو بالکل غیر ضروری ہیں"

اُس نے جواب دیا" لاریب' میں نامناسب طور پر حجت
کیا کرتا تھا۔ اپنی غلطیوں کے بعد جب میں دیہات میں رہنے
کے لئے آیا تھا۔ تو میں نے یہ طے کر لیا تھا کہ محبت کے
خزانے میں میرا کچھ حصہ نہیں ہے۔ اور میں نے سمجھ لیا تھا۔
کہ اب میرا فرض صرف اسقدر ہے۔ کہ بقیہ زندگی جس طرح بھی
ہو خاموشی کے ساتھ گزار دوں۔ مدت کے بعد مجھے یہ احساس
ہوا کہ تمہارے متعلق میرے جذبات کیا ہیں۔ اور جذبات
کی یہ رو مجھے کس طرف لے جا رہی ہے۔ میں ایک ہیجانی
حالت میں تھا۔ بعض اوقات مجھے خیال ہوتا تھا کہ تم میرے
ساتھ صرف عشوہ سازی کرتی ہو۔ لیکن پھر میرا اعتقاد بدل جاتا
تھا۔ دراصل مجھے معلوم نہ تھا۔ کہ مجھے کیا کرنا چاہیے۔ مگر اس
شام کے بعد —— تم کو یاد ہوگا۔ جب ہم اس چاندنی
رات میں باغ میں گشت لگا رہے تھے —— میں خوفزدہ
ہوگیا تھا میری مسرت کی کوئی انتہا نہ رہی تھی۔ اور وہ اسقدر
زیادہ ہوگئی تھی کہ میرے نزدیک حدود امکان سے باہر تھی۔
اب بتاؤ کہ اگر اس وقت میں اپنے دل میں امید کو جگہ دیتا۔
اور پھر ناکامی کا منہ دیکھنا پڑتا تو میرا کیا حشر ہوتا؟ لیکن
حقیقت میں مجھے صرف اپنا ہی خیال ہوا۔ کیونکہ میں ایک
بدنصیب خود غرض شخص ہوں۔"

وہ باتیں کرتے کرتے خاموش ہوگیا۔ اور میری طرف
دیکھنے لگا۔

اُس نے پھر کہنا شروع کیا" تاہم اس وقت میرا
گفتگو کرنا محض فضول نہ تھا۔ کیونکہ تم جانتی ہو کہ میرے خوفزدہ
ہونے کے بہت سے اسباب تھے۔ میں تم سے بہت سے فائدے
اُٹھاتا ہوں اور تم کو میری ذات سے کوئی فایدہ نہیں ہوتا۔ تم
ہنوز ناتجربہ کار ہو۔ یا بالفاظ دیگر ایک غنچۂ ناشگفتہ۔ تم پہلی بار
محبت سے لذت آشنا ہو۔ درآنحالیکہ میں ——"

میں نے کہا" ہاں اُس کے متعلق سب باتیں سچ سچ
کہدو" لیکن یکایک میں ایک ناگہانی خوف سے لرزنے لگی۔
کہ خدا جانے اس کا جواب کیا ہو۔ میں نے پھر کہا" نہیں نہیں'
ان باتوں کے بیان کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔"

اُس نے فوراً ہی میرے خیالات کو معلوم کر لیا۔ اور
کہنے لگا۔" تمہارا مطلب شاید یہ ہے۔ کہ میں نے کبھی پہلے
بھی کسی سے محبت کی ہے؛ ہاں میں تمہیں بتا سکتا ہوں سُنو
میں نے کبھی پہلے کسی سے محبت نہیں کی' مجھے کبھی محبت کے
جذبات سے متاثر ہونے کا تجربہ نہیں ہوا۔"

لیکن یکایک کوئی تکلیف دہ خیال اُس کے دماغ میں

میں آتا ہوا معلوم ہوتا۔ اور اُس نے افسردگی کے ساتھ کہا۔ "صرف یہی جگہ ہے جہاں مجھے ایک ایسے دل کی ضرورت ہوئی جیسا کہ تمہارا دل ہے۔ تاکہ مَیں تم سے محبت کرنے کے لائق بنوں اس لئے تم سے اظہارِ محبت کرنے سے قبل کیا میرے لئے یہ ضروری نہ تھا کہ مَیں ان سب باتوں پر غور کر لوں؟ مجھے تم کو کیا دینا چاہیئے؟ صرف "محبت" اور یہی ایک چیز ہے"۔

مَیں نے اس سے نظر ملا کر کہا۔ "کیا یہ کچھ کم ہے؟"

"کم، میری پیاری! تمہارے لئے یہ بہت کم ہے۔ تم نوجوان ہو۔ حسین ہو۔ مَیں اسقدر مسرور ہوں کہ اکثر رات بھر جاگتا رہتا ہوں۔ اور سوچتا رہتا ہوں کہ ہم دونوں کس طرح باہم زندگی بسر کرینگے۔ مجھے اپنی زندگی میں بہت سے تجربے ہوئے اور اب ایسا محسوس ہوتا ہے کہ مجھ کو وہ سب کچھ مل گیا۔ جو انسان کو خوش و خرم رہنے کے لئے لازمی ہے دیہات کے خلوتکدہ میں خاموش اور تنہا زندگی بسر کرنا' ان لوگوں کو فایدہ پہنچانا جن کے ساتھ سلوک کرنا آسان ہے اور جو اس کے مطلقاً عادی نہیں ہیں۔ پھر کام کرنا ــــ ایسا کام جو اپنا ثمرہ اپنے ساتھ لاتا ہے۔ پھر آرام کرنا' صحیفۂ فطرت کا مطالعہ کرنا' کتابیں پڑھنا' موسیقی سے دل بہلانا' اور اپنے ہمجنسوں سے محبت رکھنا میرے خیال میں انسان کو خوش رکھنے کے لئے کافی ہے۔ اور اس سے بلند کوئی اور معیارِ زندگی میرے سامنے نہیں ہے۔ اس کے علاوہ ایک ایسے رفیق کا ہونا جیسی کہ تم ہو اور شاید اولاد کی موجودگی بھی۔ غرض یہاں وہ سب کچھ موجود ہے۔ جس کی ایک شخص کو اس دُنیا میں خواہش ہو سکتی ہے"۔

مَیں نے کہا۔ "بیشک"

اُس نے جواب دیا۔ "ہاں یہ صرف میرے لئے ہے۔ کیونکہ میرے شباب کا زمانہ گزر چکا ہے۔ لیکن تمہارے واسطے نہیں۔ تم نے ابھی دُنیا میں کچھ بھی نہیں دیکھا۔ تم شاید ہنوز کسی اور ذریعہ سے مسرت حاصل کرنے کی متلاشی ہو۔ اور شاید وہ تم کو مل بھی جاتے۔ اس وقت تم کو اپنی موجودہ حالت ہی میں مسرت کا احساس ہوتا ہے۔ کیونکہ تم کو مجھ سے محبت ہے"۔

مَیں نے کہا۔ "جی نہیں، یہ پُرسکون خانگی مسرت ہمیشہ سے مجھ کو پسند رہی ہے۔ اور تم نے صرف میرے اُن خیالات کو ظاہر کیا ہے۔ جن پر مَیں ہمیشہ غور کرتی رہی ہوں"۔

وہ مُسکرایا اور سنجیدگی کے ساتھ کہنے لگا۔ "میری پیاری صرف تم کو ہی ایسا معلوم ہوتا ہے۔ دراصل یہ تمہارے لئے بہت کم ہے، تم نوعمر ہو، حسین ہو"۔

مجھے غصّہ آگیا۔ کیونکہ اُس نے میرے کہنے کا اعتبار نہ کیا تھا اور میری جوانی اور حسن کو ہدف ملامت بنایا تھا۔

مَیں نے غصّہ کے لہجہ میں دریافت کیا۔ "تو پھر تم مجھ سے کیوں محبت کرتے ہو ــــ میرے حسن سے یا میری ذات سے؟"

اُس نے تیز اور مسحور کن نظروں سے میری طرف دیکھ کر کہا "مجھے معلوم نہیں مگر مَیں تم کو چاہتا ہوں"۔

مَیں نے کچھ جواب نہیں دیا اور اس کی صورت دیکھنے لگی۔ یکایک میرے جذبات میں ایک انقلاب پیدا ہُوا۔ پہلے تو اردگرد کی چیزیں مجھے دکھائی نہ دیں۔ پھر اس کا چہرہ میری نگاہوں سے پوشیدہ ہوگیا۔ صرف اس کی آنکھیں میری نگاہ کے سامنے چمکتی ہوئی معلوم ہوتی تھیں۔ اُس وقت مجھے ایسا معلوم ہُوا۔ کہ اس کی نظروں نے مجھ پر قبضہ کر لیا تھا۔ اس کے بعد ہر شے دھندلی نظر آنے لگی۔ اور ہر چیز میری نگاہوں سے پوشیدہ ہوگئی۔ اور مجھے اس مسرت اور خوف کے احساس سے نجات حاصل کرنے کے لئے اپنی آنکھیں بند کر لینی پڑیں۔ جو اس کی نظر سے مجھ پر طاری ہوگیا تھا۔

اس دن شام کے وقت جو ہماری شادی کے لئے مقرر ہُوا تھا۔ دوپہر کے وقت مطلع صاف ہوگیا۔ اور بارش کے بعد جو موسم گرما ہی میں شروع ہوگئی تھی۔ ہم کو صاف اور فرحت بخش موسم خزاں کی شام نصیب ہوئی۔ ہر چیز نم آلود، خوشگوار اور باصرہ نواز تھی۔ اور پہلی بار باغ کے کنجوں کا منظر خزاں کے مارے ہُوئے پتّوں کے گر جانے سے صاف ہُوا تھا۔ آسمان صاف و شفاف اور زرد تھا۔ مَیں سونے کے لئے چلی گئی۔ اور اس خیال سے مسرور تھی۔ کہ ہماری شادی کے دن موسم خوشگوار رہیگا۔

اُس روز میں طلوعِ آفتاب کے ساتھ بیدار ہوئی اور اس خیال میں ڈوبی ہُوئی تھی۔ کہ وہ وقت آگیا ہے جس سے میں لرزاں اور متعجب تھی۔ مَیں باغ میں چلی گئی۔ آفتاب ابھی ابھی طلوع ہُوا تھا۔ اس کی روشنی لیموں کے ان درختوں کے نازک اور زرد پتّوں سے جو روشوں پر سایہ کئے ہُوتے تھے۔ چھن رہی تھی۔ روشیں خشک پتّوں سے ڈھکی ہوئی تھیں۔ بیروں کے شکن آلود گچھّے شاخوں پر سُرخ ہو رہے تھے۔ جن کے گرد ابتک پالے سے ماری ہُوئی چند پتّیاں لٹک رہی تھیں، پودے پژمردہ اور سیاہ تھے۔ پالا زرد سبز گھاس اور مکان کے نزدیک مرجھائے ہُوئے درختوں پر چاندی کی طرح چمک رہا تھا۔ اور صاف و خوشگوار سطحِ فلک پر بادل کا نام نہ تھا۔

مَیں نے اپنے دل میں کہا۔ "کیا یہی دن ہے؟" کیونکہ جوشِ مسرت میں مجھے اس کا یقین نہ تھا۔ "کیا واقعی آج وہی دن ہے جبکہ مَیں کل صبح اس گھر میں بیدار نہ ہونگی بلکہ نکولسکوئی کے مسقف مکان میں؟ کیا یہ صحیح ہے۔ کہ اب مجھے اس کے آنے کا انتظار نہ کرنا پڑیگا نہ اس سے ملنے کے لئے جانے کی ضرورت ہوگی۔ اور نہ کاٹیا سے اسکے متعلق گفتگو کرنی پڑیگی؟ کیا اب پوکروسکوئی کے مکان کے ملاقاتی کمرہ میں پیانو کے پاس اُس کے پاس نہ بیٹھونگی؟ کیا اب مجھے اُس کی آمد کے انتظار میں چشم براہ رہنا اور تاریک راتوں میں اس کی خیریت معلوم کرنے کے لئے پریشان ہونا پڑیگا؟"

لیکن اس وقت مجھے یاد آیا کہ کل شام کو اُس نے مجھ سے کہا تھا "یہ کل کے واسطے ہے" اور ایک لمحہ کے لئے مجھے اس کا یقین ہو کر پھر کچھ شک سا ہو گیا تھا۔

میں سوچتی تھی کیا یہ ممکن ہے کہ پرسوں نڈیوزا، غریب گرگوری اور کاٹیا کے بغیر مجھے اپنی خوشدامن ہی کیساتھ رہنا ہوگا؟ کیا میں اپنی دایہ کو رات کا سلام نہ کہہ سکونگی؟ اور قدیم رسم کے مطابق اب اس کو میرے سینہ پر صلیب کا نشان بنانے اور مجھے اس کو سلام کرنے کا موقعہ نہ ملیگا؟ کیا اب مجھ کو سونیا کو پڑھلانے اس کے ساتھ کھیلنے، صبح کو اُسے بلانے کی غرض سے دیوار پر دستک دینے اور اُس کی دلکش ہنسی کو سُننے کا اتفاق نہ ہوگا؟ کیا آج میری شخصیت تبدیل ہو جائیگی اور میں خود اپنے لئے بھی بیگانہ بن جاؤنگی؟ کیا اب نئی زندگی کا دور شروع ہوگا۔ اور کیا میری آرزوئیں اور تمنائیں پوری ہو جائینگی؟ اور کیا زندگی کا یہ دورِ جدید ہمیشہ قائم رہیگا؟

میں بے صبری کے ساتھ اُس کے آنے کا انتظار کر رہی تھی کیونکہ میرے لئے ان خیالات میں تنہا رہنا بہت دشوار تھا۔

وہ جلد ہی آگیا اور جب میں نے اس کو دیکھا تو مجھے یقین ہو گیا کہ آج میں اس کی شریکِ زندگی بن جاؤنگی اور اس خیال کے آتے ہی مجھے سکون حاصل ہو گیا۔

دوپہر کے کھانے سے پہلے والد مرحوم کی روح پر فاتحہ پڑھنے کے لئے ہم گرجا گئے۔

جب ہم گھر کو واپس آ رہے تھے تو مجھے خیال ہوا کہ کاش! وہ آج زندہ ہوتے!! "اور میں خاموشی کے ساتھ اُس شخص کے بازو پر سر رکھے ہوئے تھی جو مرحوم کا گہرا دوست رہ چکا تھا۔

نماز کے دوران میں جب میں نے دوزانو ہو کر اپنی پیشانی گرجا کے ٹھنڈے فرش پر رکھی تو میں والد مرحوم کی یاد میں محو ہو گئی اور مجھے پورا یقین تھا کہ اُن کی رُوح مجھے دیکھ رہی ہے۔ اور میرے انتخاب کو پسند کرتی ہے۔ نیز مجھے ایسا محسوس ہو رہا تھا گویا اُن کی پاک رُوح ہمارے سروں پر سایہ فگن ہے۔ اور ہمارے حق میں محوِ دُعا ہے۔ اُن کی یاد، امید، مسرت اور غم کے جذبات ایک مسرت بخش اور روح پرور جذبہ کی شکل میں تبدیل ہو گئے۔ اور خاموش فضا۔ اور سرد ہوا نے اس جذبہ کو اور زیادہ تیز کر دیا۔ خاموشی، وسیع و صاف میدان اور زرد آسمان نے جہاں سے تیز مگر سکون بخش شعاعیں آ آ کر ہر چیز پر پڑ رہی تھیں میرے رخساروں کے رنگ کو بھی نمایاں کر دیا تھا۔

مجھے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ بھی میرے جذبہ سے متاثر ہو رہا تھا۔ وہ خاموشی کے ساتھ میرا ہمقدم تھا۔ اُس کا چہرہ، جسے میں بار بار دیکھتی تھی۔ ایسا سنجیدہ اور متین تھا جس سے خوشی یا رنج کا اظہار نہ ہوتا تھا۔ اور اس وقت فضا سے دہر اور میرے قلب کی بھی یہی کیفیت تھی۔

یکایک وہ میری جانب متوجہ ہوا اور مجھے محسوس ہوا کہ

وہ مجھ سے کچھ کہنا چاہتا ہے۔ مگر مجھے خیال ہوا کہ شاید وہ اس شخص کا ذکر نہ کرے۔ جسکے تصور میں اسوقت تک میں محو ہوں

اُس نے والد مرحوم کا ذکر چھیڑا اگرچہ اُن کا نام نہیں لیا۔ اُس نے کہا "ایک مرتبہ اُنہوں نے مجھ سے مذاق میں کہا تھا۔ کہ تم کو ہماری دلربا کے ساتھ شادی کرنا چاہیئے۔"

میں نے اُس کے اس ہاتھ کو جس پر میں سہارا لئے ہوئے تھی۔ جوش میں دبا کر جواب دیا۔ "وہ اسوقت کسقدر خوش ہوتے!"

اُس نے مجھ سے نظر ملا کر کہا۔ "ہاں اُس وقت تم کمسن تھیں۔ میں اُن کو بہت پسند کرتا تھا۔ میں تمہاری آنکھوں کو بوسہ دیا کرتا تھا۔ کیونکہ یہ مثل اُن کی آنکھوں کے تھیں۔ مجھے خیال بھی نہ تھا یہ بذاتِ خود میرے لئے موجب انبساط ہو جائینگی۔

اُس وقت میں تم کو دلربا کے نام سے پکارا کرتا تھا۔"

میں نے کہا "مجھے 'تم' نہ کہو بلکہ 'تُو' کہکر مخاطب کرو۔"

اُس نے جواب دیا۔ "اس کی تو مجھے خود بھی خواہش ہے۔ مگر اب مجھے یہ ممکن معلوم ہوتا ہے کہ تو تمام و کمال میری ہے۔"

اتنا کہکر وہ خاموش ہو گیا اور اس کی ساکن و مسرور اور مسحور کن نظریں میرے چہرہ پر جم گئیں۔ ہم آہستہ آہستہ راستہ سے گزر رہے تھے۔ اور اناج کے تودوں کے درمیان بمشکل کسی کو نظر آسکتے تھے۔ صرف ہمارے قدموں کی آہٹ اور ہماری آوازیں فضا کی خاموشی کو توڑ دیتی تھیں۔ ایک جانب نالہ کے اُس پار فاصلہ پر صاف کھیت تھے۔ ایک کسان ہمارے نزدیک اپنے بھدّے ہل کے ذریعہ سے خاموشی کیساتھ زمین پر ایک نشان بناتا جاتا تھا۔ جو برابر چوڑا ہوتا جاتا تھا گھوڑوں کا ایک گلہ دامن کہسار میں پھیلا ہوا ہمارے قریب ہی معلوم ہوتا تھا۔

دوسری جانب ہمارے بالکل مقابل پالے سے مارا ہوا موسم سرما کا گیہوں کا کھیت تھا۔ جس میں کہیں کہیں سبز پودے تھے۔ اور جو جنگل کے کنارے کنارے باغ تک اور اُس مکان تک پھیلا ہوا تھا۔ جو اُس کے عقب میں صاف نظر آرہا تھا۔ موسم خزاں کے آفتاب کی پہلی کرنیں ہر شے کو روشن بنا رہی تھیں۔ ہر طرف مکڑی کا جالا تنا ہوا تھا۔ جو ہمارے چاروں طرف ہواہیں لہرا رہا تھا۔ اور پالے سے مارے ہوئے کھیتوں پر پھیلا ہوا تھا۔ یہ جالا ہماری آنکھوں، سر کے بالوں اور ہماری پوشاک کو چمٹ جاتا تھا۔ جب ہم بات چیت کرتے تو ہماری آوازیں فضا تے خاموش میں گونجنے لگتیں اور ایسا معلوم ہوتا کہ گویا ہم تنہا نیلے آسمان کے زیر سایہ ایک ایسی وسیع دنیا میں ہیں۔ جس پر آفتاب کی خوشگوار، روشن اور مرتعش شعاعیں کھیل رہی تھیں۔

میں بھی اس کو "تُو" کے محبت آمیز ضمیر سے مخاطب کرنا چاہتی تھی۔ مگر اس کو "تُو" کہکر پکارتے ہوئے مجھے شرم معلوم ہوتی تھی

میں نے جلدی اور آہستگی سے کہا۔ "تو اسقدر تیزی کے ساتھ کیوں قدم اُٹھا رہا ہے؟" اور مجھے محسوس ہوا کہ میرا چہرہ

سرخ ہو گیا ہے۔

اُس نے اپنی رفتار کم کر دی اور محبت و مسرت سے بھری ہوئی نظروں سے میری طرف دیکھا۔

جب ہم گھر پہنچے تو اس کی والدہ اور وہ مہمان جن کو ہم نے مجبوراً مدعو کیا تھا پہلے ہی سے جمع ہو چکے تھے۔ اور اُس وقت تک جبکہ ہم گرجا سے رخصت ہو کر نکولسکوئی جانے کے لئے گاڑی میں سوار ہوتے مجھے اس کے ساتھ تنہائی نصیب نہ ہوئی۔

گرجا قریب قریب بالکل خالی تھا۔ مَیں نے دزدیدہ نظر سے دیکھا کہ اس کی ماں مستغدی کے ساتھ مغنیوں کے بیٹھنے کی جگہ پر کھڑی تھی۔ کاٹیا جس کی ٹوپی میں سوسنی فیتہ لگا ہوا تھا۔ ایک طرف کھڑی اشکبار تھی۔ اور دو تین کسان بھی موجود تھے۔ جو میری زیارت کے شوق میں آئے تھے۔

مَیں نے اُن کی طرف نظر نہ کی لیکن مجھے اس کی نزدیکی کا احساس تھا۔ مَیں نے دُعا کے الفاظ سُنے۔ اور ان کو منہ ہی مُنہ میں دُہرایا۔ مگر میری رُوح بیدار نہ ہوئی۔ مَیں دُعا نہ مانگتی بلکہ سادہ لوحی سے قربانگاہ کے پردہ کے قریب پادری کے پیچھے کھڑی ہوئی منقش صلیب اور کھڑکیوں کی طرف دیکھتی رہی کیونکہ مجھے ہر چیز خواب و خیال معلوم ہو رہی تھی۔

مجھے ایک اضطراب آمیز احساس تھا۔ کہ مجھ میں کوئی بڑا انقلاب پیدا ہو رہا تھا۔ جب پادری صلیب لئے ہوئے ہماری طرف مخاطب ہُوا، ہم کو مبارکباد دی۔ اور کہا کہ مَیں نے تم کو بپتسمہ دیا ہے۔ اور خُدا نے مجھے یہ اجازت دی ہے کہ تم کو رشتۂ ازدواج میں منسلک کر دوں۔ کاٹیا اور اسکی والدہ نے ہماری پیشانیوں کو بوسہ دیا۔ اور جیسے ہی میں نے گریگوری کی آواز سُنی۔ کہ وہ گاڑی والے کو بلا رہا تھا۔ تو مَیں متعجب اور خوفزدہ ہو گئی۔ کیونکہ سب مراسم ختم ہو چکے تھے۔ مگر میری روح میں کوئی خاص کیفیت پیدا نہ ہوئی تھی۔ ہاں اس مقدس رسم سے جو میرے لئے ادا کی گئی تھی۔ میرے دل میں کوئی خاص کیفیت پیدا نہ ہوئی تھی۔

ہم دونوں نے ایک دوسرے کا بوسہ لیا۔ یہ بوسہ ہمارے جذبات کے مقابلہ میں غیر معمولی اور عجیب سا تھا۔

مَیں نے اپنے دِل میں کہا "بس اتنی سی بات تھی!"

ہم گرجے کے دروازہ کی طرف بڑھے۔ گاڑی کے پہیوں کی آواز گنبد میں گونج رہی تھی۔ اور ٹھنڈی ہوا کے جھونکے آرہے تھے۔ اُس نے اپنی ٹوپی سر پر رکھی اور مجھے سہارا دیکر گاڑی میں بٹھا دیا۔ مَیں نے گاڑی کی کھڑکی میں سے پالے سے ڈھکے ہُوئے ہلال کو دیکھا۔

وہ میرے برابر بیٹھ گیا۔ اور گاڑی کا دروازہ بند کر دیا میرا دل دھڑکنے لگا۔ اور وہ خود اعتمادی جس کی وجہ سے اُس نے ایسا کیا تھا۔ مجھے ہتک آمیز معلوم ہوئی۔

کاٹیا نے میرا سر تھامنے کے لئے کہا۔ گاڑی کے پہیے

ایک پتھر سے ٹکراتے۔ اور پھر ہم کشادہ سڑک پر پہنچکر روانہ ہوگئے ہیں، گاڑی کے ایک کونے میں بیٹھ کر کھڑکی سے جھانکنے لگی۔ دور افتادہ کھیتوں اور سڑک پر ماہتاب کی سرد اور زرد کرنوں کا عکس پڑ رہا تھا۔ اگرچہ میں نے اسی کی طرف نظر اُٹھا کر نہیں دیکھا۔ مگر مجھے اپنے قریب اس کی موجودگی کا برابر احساس رہا۔

میں نے اپنے دل میں کہا۔ "کیا یہی اُس لمحہ کا ماحصل ہے جس کے لئے میں بے صبری سے منتظر تھی؟" اور اُسکے نزدیک اس طرح بیٹھنے میں مجھے حقارت اور شرم معلوم ہوئی میں اُس سے ہمکلام ہونے کی غرض سے اس کی طرف مخاطب ہوئی۔ مگر زبان نے ساتھ نہ دیا۔ گویا محبت کے پہلے جذبات میں سے اب میرے دل میں کچھ بھی نہ تھا۔ اور اُن کی جگہ شرم اور دہشت نے لے لی تھی۔

اپنی جانب مخاطب پاکر اُس نے کہا۔ "اس وقت تک بھی مجھے اس کا یقین نہ تھا۔ کہ میری تمنا پوری ہوگی"

میں نے جواب دیا۔ "لیکن بہر حال میرے لئے یہ سامانِ وحشت ہے"۔

اُس نے میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیکر اور اپنے لبوں سے لگاکر کہا۔ "کیا مجھ سے تم خوفزدہ ہو؟"

میرا ہاتھ اُس کے ہاتھ میں بے حس و حرکت تھا۔ اور میرے دل میں ایک تکلیف دہ بے التفاتی پیدا ہوگئی تھی۔

میں نے آہستگی سے کہا "ہاں"

لیکن فوراً ہی میرا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ میرا ہاتھ کانپنے لگا۔ اور یکایک میں نے اُس کے ہاتھ کو دبایا۔ میری رگ رگ میں ایک جوش پیدا ہوگیا۔ میری نظریں اس کی نظروں میں پیوست ہوگئیں اور مجھے معلوم ہوا کہ میں اُس سے خوفزدہ نہیں ہوں۔ بلکہ یہ اضطراب صرف وہ "محبت" تھی جو اب پہلے سے بہت زیادہ بڑھ گئی تھی مجھے محسوس ہوا کہ اب میں بالکل اس کی ہو چکی ہوں۔ اور اُس کے زیر فرمان رہنے سے مسرور ہوں (باقی باقی)

چراغِ انجمن

نیرنگ حسن و عشق ہر اک انجمن میں ہے
جو پھول ہے وہ چاک گریباں چمن میں ہے

وہ خوش کہ تم کو داغِ تمنا ہوا نصیب
میں خوش کہ اک چراغ میری انجمن میں ہے

بیتابیوں نے کس کو تماشا بنا دیا
تو بھی تو دیکھ کون تری انجمن میں ہے

جب تو نہ تھا تو شمع بھی تھی انجمن بھی تھی
اب کچھ نہیں نظر میں جو تو انجمن میں ہے

احسن کی بیکسی بھی ہے ہنگامہ آفرین
غربت میں اس طرح ہے کہ گویا وطن میں ہے

احسن سنبھلی

کسی کی آرزو

ہرے ہوئے ہیں زخم پھر وہ موسم بہار ہیں پڑے ہوئے تھے مضمحل جو سینہ فگار ہیں
کھلے ہیں داغ مثل گل جگر کے لالہ زار ہیں جو دیکھتے ہو پھول تم میرے گلے کے ہار ہیں
گندھے ہوتے ہیں لخت دِل یہ آنسوؤں کی تار ہیں

مریض عشق پر کرے اثر کوئی علاج کیا گلوں کے رنگ و بو سے ہو سرور و ابتہاج کیا
نسیم خوشگوار سے شگفتہ ہو مزاج کیا مجھے چمن کی سیر کی بتاؤ احتیاج کیا
ہزاروں گل کھلے ہوتے ہیں قلب داغدار میں

تڑپ رہا ہے درد دِل طپاں ہے دل کنار میں بدل رہا ہے کروٹیں جگر بھی اضطرار میں
مچل رہے ہیں طفل اشک چشم اشکبار میں یہ کس کی یاد آگئی الٰہی احتضار میں
کہ تار ہچکیوں کا ہے بندھا نفس کے تار میں

نہ جانے دھیان ہے کدھر دل شکستہ حال کا سماں نگاہ شوق میں ہے کس کے خط و خال کا
کہاں ہے دام و دانہ آج طائر خیال کا بندھا ہوا ہے نزع میں خیال کس جمال کا
یہ میری چشم نیم وا ہے کس کے انتظار میں

مذاق لطف زندگی سے گرچہ ہاتھ دھو چکا کہاں کا لطف زندگی میں جان کو بھی رو چکا
تپِ غم فراق میں حواس و ہوش کھو چکا جگر بھی آتش دروں سے جل کے خاک ہو چکا
مگر ابھی ہے جان کچھ دلِ وفا شعار میں

فغاں میں شانِ دلکشی نہیں اگر نہیں سہی مذاق نغمہ خوشی نہیں اگر نہیں سہی
شگفتگی و تازگی نہیں اگر نہیں سہی لہو کی ایک بوند بھی نہیں اگر نہیں سہی
کسی کی آرزو تو ہے دلِ امیدوار میں

طاہر

آخری ارمان

مارس لیبلانک کے افسانے جیوش لیمپ کا ترجمہ

(بسلسلۂ گزشتہ)

گینمارڈ نے دروازہ ہلایا۔ شیر نے اپنے کندھوں سے بہت سخت دھکا دیا۔ اور اُس کو توڑ کر کھول دیا۔ وہ دونوں اندر جھپٹے۔ لیکن فوراً ہی ٹھہر گئے۔ ایک فیر کی آواز دوسرے کمرہ سے سُنائی دی۔ اور پھر دوسری۔ بعد ازاں کسی کے گرنے کا دھماکا ہُوا........ جب وہ داخل ہُوئے تو اُنہوں نے اس آدمی کو سنگ مرمر کے آتشکدہ پر مُنہ کے بل گرے ہُوئے پایا۔ وہ حالتِ نزع میں تھا۔ اس کا پستول اس کے ہاتھ سے نکل کر علیحدہ گر پڑا تھا۔

گینمارڈ جھکا اور مردہ کے سر کو گھمایا۔ وہ خُون سے تر اور تھا۔ جو رُخسار اور ٹھوڑی کے دو بڑے زخموں سے بہ رہا تھا

"اب شناخت کیسے ہو" اُس نے آہستہ سے کہا۔

"یہ یقین کیجئے" شیر نے کہا "کہ یہ وہ نہیں ہے"

"یہ تم نے کس طرح کہہ دیا؟ تم نے تو ابھی اسے غور سے دیکھا بھی نہیں"

انگریز سراغرساں نے جواب دیا۔

"کیا آپ خیال فرماتے ہیں کہ آرسین لوپن ایسا شخص ہے کہ خودکشی کرے؟"

"لیکن ہم کو یقین ہے کہ ہم نے اُسے باہر پہچان لیا تھا"

"یہ محض واہمہ تھا جس نے ہم کو یقین دلایا۔ یہ شخص ہمارے دماغ کو پراگندہ کر دیتا ہے"

"پھر یہ اُس کے ساتھیوں میں سے کوئی ہے"

"آرسین لوپن کے ساتھی خودکشی نہیں کرتے"

"تو پھر کون ہے؟"

اُنہوں نے جسم کی تلاشی لی۔ ایک جیب میں ہالملاک شیر نے ایک خالی نوٹ کیس پایا۔ دوسری میں گینمارڈ نے چند لوئی سکہ پائے۔ اُس کی پوشاک وغیرہ پر کسی قسم کے نشانات نہ تھے۔

ٹرنک —— ایک بڑا صندوق اور دو بیگ جن میں ذاتی اور ضروری اشیاء کے سوا اور کچھ نہ تھا۔ آتشکدہ کے اُوپر اخباروں کا ایک بنڈل رکھا تھا۔ گینمارڈ نے ان کو کھول کر پڑھا۔ ان سب میں جیوش لیمپ کی چوری کا ذکر درج تھا۔

ایک گھنٹہ بعد جب گینمارڈ اور شیر نے مکان چھوڑا تو انکو اس

عجیب ہستی کا حال ذرہ برابر بھی معلوم نہ ہُوا۔ جس نے مجبوراً اُن کے داخلہ سے خودکشی کر لی تھی۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ وہ کون تھا؟ اُس نے کیوں اپنی جان ضائع کی؟ اس کا جیوش لیمپ کی چوری سے کیا تعلق تھا؟ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ یہ سب پیچیدہ سوالات اور لاینحل معمے تھے۔

(۱۰)

ہالملاک شیرز نہایت پریشانی کی حالت میں بستر پر گیا جب وہ جاگا تو اُس نے ایک ضروری خط اپنے نام سرہانے رکھا ہُوا پایا۔

"آرسین لوپن ایک برتین نامی شخص کی حیثیت میں اپنی دردناک موت کی آپ کو اطلاع دینے کی اجازت چاہتا ہے۔ اور التجا کرتا ہے کہ آپ اس کی میت میں شریک ہو کر عزت افزائی کیجئے۔ جو کہ سرکاری صرفہ سے پنجشنبہ واقعہ ۲۵ رجون کو دفن کی جائیگی"

دوسرا باب

(۱)

"جناب۔ آپ نے ملاحظہ کیا۔" آرسین لوپن کا خط اپنے ہاتھ میں ہلاتے ہُوتے ہالملاک شیرز نے ولسن کو مخاطب کر کے کہا "اس واقعہ کا بدترین پہلو یہ ہے۔ کہ اس کمبخت کی آنکھیں ہر وقت میری نگران کار رہتی ہیں۔ میرا اہم سے اہم راز بھی اس سے محفوظ نہیں رہتا۔ میں ایک ایسے ایکٹر کی طرح کام کر رہا ہوں۔ جس کے قدم تماشہ گاہ کے مقررہ قوانین کے مطابق اُٹھتے ہوں۔ جس کی ہر گفت گو ہر نقل و حرکت کسی ارفع طاقت کے زیر اثر عمل میں آتی ہو۔ ۔ ۔ ۔ مسٹر ولسن ۔ ۔ ۔ ۔ میں کیا کہہ رہا ہوں ۔ ۔ ۔ ۔ کچھ سمجھے بھی۔"

اس میں ذرا کلام نہیں کہ اگر ولسن ظاہراً ایک صحتور آدمی کی طرح مگر باطناً ۱۰۲ و ۱۰۴ ڈگری کی حرارت بخار کے درمیان مدہوش نہ سو رہا ہوتا۔ تو وہ ضرور شیرز کی باتیں سمجھتا۔

لیکن شیرز نے اس بات کی قطعی پروا نہ کر کے کہ آیا وہ اسکی گفتگو کو سُن رہا ہے یا نہیں۔ اپنا سلسلہ کلام یوں جاری رکھا "اس کے لئے ضرورت ہے۔ کہ میرے تمام ذرائع اور دماغی قوتیں پست ہمت نہ ہونے پائیں۔ خوش قسمتی سے یہ چرکے میرے لئے ایسے زخم ہیں جو مجھے تڑپا کر اور زیادہ کام کرنے کی ترغیب دیتے ہیں۔ اگر کہیں خدانخواستہ ایک مرتبہ بھی یہ آگ ٹھنڈی ہو جائے اور زخم باقی نہ رہے۔ تو میں پھر ہمیشہ اپنی تقریر اس جملہ پر ختم کر دیا کروں۔ "اچھا بھائی، ہنس لو" جلد یا بدیر تم خود اپنے ہی ہاتھوں کسی جال میں پھنس جاؤ گے۔ اچھا، ولسن اس تمام گفتگو کو سُننے کے

بعد کیا تم نہیں سمجھ سکتے کہ وہ لوپن ہی کی ذات تھی جس نے اولاً تو اپنے سابقہ تار اور اشارات کا جس کو اس نے ناسمجھ ہنرمیٹا پر ظاہر کیا۔ اور بعد ازاں اپنی کل خفیہ خط وکتابت کا جو الاتس ڈیمن سے کی گئی۔ پتہ بتلایا۔۔۔۔ کیوں دوست کیا تم اس تفصیل کو بھول سکتے ہو۔"

وہ کمرہ میں اِدھر اُدھر اسقدر زور سے قدم مار کر ٹہلنے لگا کہ اس کے رفیق کی آنکھ کھل جائے۔

"خواہ معاملات کتنے ہی خراب کیوں نہ ہوں۔ اور یہ طریقہ جو میں نے اختیار کیا ہے۔ تھوڑا سا ناقابل اطمینان ہی کیوں نہ نظر آئے۔ تاہم میں نے اس معاملہ کا ایک سرا پکڑ لیا ہے چنانچہ اس کو باقاعدہ شروع کرنے کے لئے میں بہت جلد ماسٹر بریسن کے تفصیلی حالات معلوم کرلونگا۔ میں نے انسپکٹر گینمارڈ سے دریائے سین کے کنارے پر جہاں بریسن نے پارسل پھینکا تھا۔ ملاقات کا وعدہ کر لیا ہے۔ اب ہم ضرور بالضرور معلوم کرلینگے۔ کہ وہ کون تھا۔ اور کیا چاہتا تھا۔ بقیہ امور کے متعلق میں اس سے زیادہ اور کچھ نہیں کہہ سکتا۔ کہ یہ میرے اور الاتس ڈیمن کے درمیان ایک کھیلا جانیوالا تماشہ ہے۔ اس میں حریف کچھ زبردست نہیں کیوں میاں ولسن، کیا تم نہیں سمجھتے کہ میں بہت جلد مرقع تصویر کے خفیہ جملہ کو معلوم کرلونگا۔ اور جان لونگا کہ وہ دو علیحدہ علیحدہ حروف "ا۔ک" کیا معنے رکھتے ہیں۔ اس لئے کہ تمام راز نہیں میں مضمر ہے۔"

عین اسی وقت میڈ موازل کمرہ میں داخل ہوئی۔ اور شیرز کو اس طرح بڑبڑاتے دیکھ کر اُس نے اپنے شانوں کو حرکت دیکر یوں کہا۔

"مسٹر شیرز، میں آپ سے سخت ناراض ہونگی۔ اگر آپ نے میرے مریض کو بیدار کر دیا۔ یہ امر مناسب نہیں۔ کہ آپ خواہ مخواہ اُسے پریشان کریں۔ ڈاکٹر صاحب نے اُسے خاموش رکھنے کی سخت تاکید فرمائی ہے۔"

اس کا کوئی جواب نہ دیتے ہوئے شیرز نے اس کی طرف نظر بھر کر دیکھا۔ اور پہلے روز کی طرح اُسکے ناقابلِ بیان اطمینان کو دیکھ کر حیران و ششدر رہ گیا۔

"کیوں جناب۔ شیرز صاحب یہ آپ ایسی بری طرح مجھے کیوں گھور رہے ہیں۔ آپ کے دل میں یقیناً کوئی شبہہ ہے۔ جس کو آپ عمداً چھپانا چاہتے ہیں۔ وہ کیا ہے۔ ذرا براہِ عنایت مجھ پر بھی ظاہر کیجئے۔" تاباں چہرہ، دلربا آنکھوں، تبسم زا ہونٹوں اور انتہائی اخلاقانہ انداز سے دونوں ہاتھ ملا کر خفیف سا آگے کو جھک کر اُس نے شیرز سے سوال کیا اور اپنے فقرات کو اسقدر سادگی و خلوص کے ساتھ بیان کیا کہ شیرز کو غصہ آگیا۔ لیکن اس جذبہ کو قطعی دبا کر وہ اُس کے قریب آیا۔ اور دبی زبان سے کہا۔

"کل بریسن نے خودکشی کرلی۔"

ظاہراً اس کا کوئی مطلب نہ سمجھ کر خاتون نے بھی انہیں الفاظ کا اعادہ کر دیا۔ "کل برٹین نے خودکشی کر لی....."

فی الحقیقت اس کے چہرہ پر نہ تو کسی تبدیلی کے آثار نمایاں ہوئے۔ نہ کسی غلط بیانی کی کوشش کا اظہار۔

"اچھا تم کو معلوم ہو چکا ہے" شیرز نے چڑچڑا کر کہا۔ "اور اگر یہ بات نہیں۔ تو کم از کم وہاں سے روانہ ہو چکی ہو گی۔۔۔ افسوس۔ میرا اندازہ غلط تھا۔ تم کافی سے زیادہ چالاک ہو آخر یہ حیلہ سازی کیوں۔"

اس نے تصویروں کی کتاب کو جسے قریب کی میز پر رکھ دیا تھا۔ فوراً اٹھا لیا۔ اور اس کے کٹے ہوئے اوراق کھول کر کہنے لگا۔ "کیا تم مجھے بتلا سکتی ہو۔ کہ یہاں کے غائب شدہ حروف کو میں کس طرح ترتیب دوں تا کہ میں اس رقعہ کا صحیح مفہوم معلوم کر سکوں۔ جو تم نے جیوش لیمپ کی چوری سے چار یوم قبل برٹین کو بھیجا تھا۔"

"اجی حضرت، کیسی ترتیب، کون برٹین، کیسی جیوش لیمپ کی چوری۔"

خاتون نے یہ الفاظ مکرر سہ کرر باہستگی دہرائے۔ گویا ان کا مطلب سمجھنے کی کوشش کر رہی ہے۔

شیرز نے پھر اصرار کیا۔

"ہاں، وہ الفاظ جن کو تم نے استعمال کیا... اچھا تو کاغذ کے پرچے پر تم نے برٹین کو کیا لکھا تھا؟"

"وہ الفاظ جو میں نے استعمال کئے.... میں تو یہ کہہ رہی تھی.... کہ...."

ایکبارگی خاتون نے زور کا قہقہہ لگایا۔

"آخاہ.... یہ بات ہے.... میں اب سمجھی.... گویا چوری میں میرا بھی ہاتھ ہے۔ یعنے کوئی شخص ایم برٹین نامی ہے۔ جس نے جیوش لیمپ چرایا۔ اور کل خودکشی کر لی.... میں اس شریف آدمی کی دوست ہوں۔ خوب! شیرز صاحب آپ کیا بات پیدا کی ہے۔"

"خیر.... کل شام کو ایونیو ڈی ٹرنس میں دوسری منزل پر تم کس سے ملنے گئی تھیں؟"

"اپنی کپڑا سینے والی میڈموازل لیجنز سے۔ کیا آپ کا یہ خیال ہے کہ میرا دوست ایم برٹین اور میری درزن ایک اور صرف ایک ہی ہستی ہیں۔"

یہ گفتگو سنکر شیرز کو پھر شک ہوا۔ اور وہ سوچنے لگا۔ کیا یہ ممکن ہے۔ کہ ضبط دل اور خیالات کو اس درجہ قابو میں لیا جا سکے۔ کہ دوسرا شخص قطعی دھوکا کھا جائے۔ خوف، مسرت، پریشانی کا چھپا لینا تو ممکن ہے۔ مگر لاپروائی اور پُر جوش قہقہے ایک شئے دیگر ہیں۔ بہرکیف اس نے کہا۔

"اچھا صرف ایک آخری سوال.... گزشتہ شام کو گارڈی نارڈ کے سٹیشن پر تم نے مجھ کو کیوں مخاطب کیا تھا.... اور کیوں یہ التجا کی تھی کہ میں اس چوری کے معاملہ کو تحقیق کئے بغیر

واپس چلا جاؤں۔"

"اوہ مسٹر شیرز، آپ اب بہت زیادہ رازجوئی کی کوشش کر رہے ہیں" خاتون نے ہنوز اُسی قدرتی انداز سے ہنستے ہوئے جواب دیا۔ "اچھا اب میں آپ کو یہ سزا دیتی ہوں۔ کہ اب آپ سے کچھ نہ کہونگی۔ اور دیکھئے جب تک کہ میں عطار کے پاس سے واپس نہ آجاؤں۔ آپ مریض کی تیمارداری کریں۔ مجھے ایک بہت ہی ضروری نسخہ تیار کرانا ہے۔ میں جلد واپس آؤنگی۔"

یہ کہکر وہ کمرہ سے رخصت ہو گئی۔

"اف مجھ کو فریب دیا گیا۔" شیرز نے بکنا شروع کیا "لاحول ولا قوۃ..... میں نے تو اُس سے کوئی بات نہ معلوم کی۔ خود جو کچھ معلوم تھا اُسے آگاہ کر دیا۔"

اس وقت اسے اس نیلگوں ہیرے اور اُن سوالات جرح کے واقعات یاد آئے۔ جو اُس نے میڈم کلاٹلڈ ڈسٹیج[۵۱] کو مجبور کر کے معلوم کئے تھے۔ اس دوشیزہ خاتون نے بھی اس چالاکی سے کام لیا تھا جس کا اظہار وہ قبل ازیں سنہرے بالوں والی خاتون سے دیکھ چکا تھا۔ اب اس نے خیال کیا کہ وہ دوبارہ ایک ایسی ہستی کے مقابل ہے جو آرسین لوپن کی حفاظت میں اسی کے زیر اثر اسی کی ہدایات پر کاربند ہے۔ اور جو اہم ترین خطرناک صورتوں میں بھی انتہائی سکون و سنجیدگی کے ساتھ راز کو مخفی رکھ سکتی ہے۔

"شیرز..... شیرز....."

یہ ولسن کی آواز تھی۔ شیرز بستر کے قریب گیا۔ اور جھک کر پوچھنے لگا۔ "کہو بھائی کیا حال ہے۔ کیا طبیعت کچھ زیادہ خراب ہو رہی ہے۔"

ولسن نے اپنے لبوں کو جنبش دی۔ لیکن آواز نہ نکل سکی آخرکار کئی بار کی کوشش کے بعد اُس نے کہا۔

"نہیں..... شیرز..... یہ وہ نہیں تھی..... یہ..... نہیں ہو سکتی۔"

"تم اس وقت کیا بیہودہ باتیں بک رہے ہو۔ میں کہتا ہوں کہ وہ یہی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ میں لوپن سے تربیت و تعلیم یافتہ عورت کی موجودگی میں ایسی بیوقوفی کی باتیں کرتا ہوں کہ سارا دماغ پراگندہ ہو جاتا ہے۔ وہ مرقع تصویر کے متعلق تمام حالات سے واقف ہے۔ اور میں شرطیہ کہہ سکتا ہوں۔ کہ ایک گھنٹہ سے کم ہی وقفہ میں لوپن کو اس وقت کی تمام گفتگو کا حال معلوم ہو جائیگا۔ ہاں ایک گھنٹہ سے کم میں.... ارے توبہ۔ یہ میں ایک گھنٹہ کیوں کہہ رہا ہوں۔ بلکہ ممکن ہے اس وقت تک اُسے سب کچھ معلوم ہو چکا ہو۔ یہ عطار اور ضروری نسخہ کی بھی خوب

[۵۱] میڈم کلاٹلڈ ڈسٹیج یا سنہرے بالوں والی خاتون کی حیرت انگیز کارروائیاں۔ آرسین لوپن کے کارناموں کے ساتھ دیکھنا ہوں۔ تو ناول "اریسٹ آف آرسین لوپن" کا ترجمہ خونی ہیرا ملاحظہ فرمائیے۔ جو لاہور ہی سے دستیاب ہو سکتا ہے۔

رہی۔ سب مکر و فریب . . . . چالاکی۔"

ولسن کی نگہداشت و تیمارداری کے خیال کو بالائے طاق رکھ کر وہ کمرہ سے تیزی کے ساتھ باہر نکلا۔ اور ایونیوڈی مِن کی طرف چل دیا۔ وہاں اُس نے میڈ موازل کو ایک عطار کی دکان میں داخل ہوتے دیکھا۔ دس منٹ بعد وہ سفید کاغذ میں لپٹی ہوئی دو یا تین بوتلیں ہاتھ میں لئے باہر آئی۔ اور جب مکان کی طرف واپس ہونے لگی۔ تو وہ ایک شخص سے مخاطب ہوئی۔ جو اُس کے پیچھے ہاتھ میں ٹوپی لئے اس طرح خوشامدیں کرتا آرہا تھا گویا بھیک مانگ رہا ہو۔

وہ رکی، اُس کو کچھ دیا۔ اور پھر اپنی راہ چلنے لگی۔

"اُس نے ضرور اُس سے گفتگو کی"۔ انگریز جاسوس نے دل میں کہا۔

یہ ایک فطرتی شک تھا نہ کہ یقین کامل تاہم اس کے اصولِ تحقیق میں اس سے کوئی تغیر واقع نہ ہو سکتا تھا چنانچہ خاتون کو چھوڑ کر وہ اس نقلی فقیر کے تعاقب میں لگ گیا۔

وہ اس طریقہ سے ایک دوسرے کے عقب میں پلیس سینٹ فرڈی نانڈ تک پہنچے۔

متعدد مرتبہ اپنی آنکھیں دوسری منزل کی کھڑکی کی طرف اٹھا کر داخل ہونے والے لوگوں کو غور سے دیکھتے ہوئے اس نقلی فقیر نے برسین کے مکان کے گرد چکر لگایا۔

تقریباً ایک گھنٹہ کے بعد وہ ایک ٹرام گاڑی میں سوار ہو گیا۔ جو نوئیلی کی طرف جا رہی تھی۔ شیبرز بھی سوار ہوا۔ اور اُس شخص کے پیچھے تھوڑے فاصلہ پر ایک شریف آدمی کے پہلو میں بیٹھ گیا۔ جس کا چہرہ اس اخبار سے جسے وہ بہت انہماک کے ساتھ پڑھ رہا تھا۔ بالکل چھپا ہوا تھا۔ جب یہ سب شہر پناہ کے قریب پہنچے۔ تو اخبار نیچا ہوا۔ اب شیبرز نے گینمارڈ کو پہچانا گینمارڈ نے اُس شخص کی طرف اشارہ کر کے شیبرز سے کہا۔

یہ وہی گذشتہ رات والا آدمی ہے۔ جو برسین کے ہمراہ تھا یہ احاطہ کے قریب ایک گھنٹہ سے پھر رہا تھا"۔

"برسین کے ہاتھ کوئی نئی بات معلوم ہوئی"۔

"ہاں آج صبح ایک خط اس کے نام کا آیا ہے"۔

"آج صبح کو . . . . . . تو پھر ضرور یہ کل صبح برسین کی موت کی خبر کا تب کو معلوم ہونے سے قبل ڈاک میں ڈالا گیا ہوگا"۔

"بالکل ٹھیک، یہی بات ہے، خط تو حاکمِ تفتیش کے پاس ہے۔ لیکن مجھے اُس کے الفاظ بجنسہٖ یاد ہیں۔ سنئے۔ "وہ کسی قسم کے راضی نامہ پر تیار نہیں۔ وہ ہر چیز لینا چاہتا ہے۔ پہلی چیز اور وہ چیزیں جو دوسری واردات میں اُڑائی گئیں۔ اگر نہیں، تو وہ سب معاملات آشکارا کر دیگا"۔ اُس پر کسی کے دستخط وغیرہ نہیں"۔ گینمارڈ نے کہا "اب آپ دیکھ سکتے ہیں۔ کہ یہ چند مہمل سطور ہمارے لئے چنداں مفید نہیں"۔

"مسٹر گینمارڈ۔ میں سراسر آپ کا ہمخیال ہوں لیکن صرف اتنا ضرور ہے کہ میں ان سطور کو نہایت دلچسپ خیال کرتا ہوں"۔

"آخر کوئی وجہ.... ذرا مجھے تو بتائیے"۔

"اپنے خاص ذاتی وجوہ کی بنا پر" شیبرز نے کہا۔

ٹرام ایوڈی چیٹو پر رکی۔ وہ شخص نیچے اترا۔ اور خاموشی کے ساتھ آگے روانہ ہوا۔

شیبرز اس کے عقب میں اس قدر نزدیک پہنچ گیا کہ گینمارڈ کو مجبوراً کہنا پڑا۔ "اگر وہ ذرا بھی مڑا تو ہم لوگوں کو دیکھ لیگا"۔

"وہ اب ہرگز نہ مڑیگا"۔

"یہ آپ نے کیسے کہدیا"۔

"یہ آرسین لوپن کا ساتھی ہے۔ کیا آپ دیکھتے نہیں۔ کہ وہ اپنے ہاتھ جیبوں میں ڈالے ہوئے چل رہا ہے۔ اسے معلوم ہے کہ اس کا تعاقب کیا جا رہا ہے۔ دوسرے یہ کہ اسے ذرا ہراس نہیں"۔

"بایں ہمہ ہم بھی اس کا نہایت احتیاط کے ساتھ تعاقب کر رہے ہیں"۔

"یہ کوئی بات نہیں، اگر وہ چاہے تو ہم لوگوں کے پنجہ سے ایک منٹ میں نکل سکتا ہے۔ اس کو اپنی ذات پر کامل بھروسہ ہے"۔

"آئیے۔ آئیے۔ ذرا میری طرح چھپتے ہوئے چلے آئیے دیکھئے، وہ ہوٹل کے دروازہ پر دو پولیس کانسٹبل سائیکل لئے کھڑے ہیں۔ اگر میں انہیں آواز دیکر اپنے دوست کی نگرانی کا حکم دیدوں تو پھر دیکھوں۔ یہ کیسے ہمارے پنجہ سے نکلجاتا ہے"۔

"باوجود اس کے ہمارا دوست ذرا بھی پریشان نظر نہیں آتا۔ آہا.... لیجئے وہ خود ہی انہیں آواز دے رہا ہے"۔

"بخدا" گینمارڈ نے کہا۔ "اس شخص کے ہتھکنڈے تو دیکھئے"۔

یہ شخص واقعی اُن دونوں پولیس والوں کے نزدیک ٹھیک ایسے وقت پہنچا جب وہ اپنی سائیکل پر سوار ہونیکی تیاریاں کر رہے تھے۔ اس نے صرف چند لفظ اُن سے کہے اور یکدم ایک تیسری سائیکل پر جو ہوٹل کی دیوار سے لگی کھڑی تھی۔ سوار ہوگیا۔ اور تیزی کے ساتھ اُن دونوں پولیس والونکے ہمراہ روانہ ہوگیا۔

انگریز جاسوس نے بڑے زور سے فرمائشی قہقہہ لگایا۔

"فرمائیے حضرت۔ میں نے آپ سے کیا کہا تھا۔ جبتک ہم وہاں پہنچیں وہ خود ہی مع ہمارے دونوں ساتھیوں کے چلتا بنا ایم گینمارڈ صاحب دیکھ لیا آپ نے۔ وہ اپنی حفاظت خود کر سکتا ہے۔ یا آرسین لوپن.... سائیکل سوار پولیس والوں کے ساتھ..... کیا میں نے آپ سے عرض نہیں کیا تھا۔ کہ ہمارا دوست بہت ہی سنجیدگی سے کام لے رہا ہے"۔

"اچھا تو پھر اب" گینمارڈ نے غصہ میں چلا کر کہا۔

"میں کیا کر سکتا تھا۔ یہ آپ نے ہنسنے کا اچھا موقعہ نکالا"

"چلتے چلتے۔ غصہ نہ ہوجئے۔ ہم بہت جلد عوض لے لینگے۔ فی الحال ہمیں صرف ذراسی امداد کی ضرورت ہے"۔

"ایونیوڈی نوئیلی کے خاتمہ پر فولین فانٹ سارجنٹ

تبصرہ بہ اشاعات جدیدہ

تحفہ:۔ انجمن ارباب اردو سرور نگر حیدرآباد دکن کا ماہوار علمی رسالہ ہے۔ جو ماہ محرم الحرام ۱۳۴۳ھ سے جاری کیا گیا ہے۔ رسالے کے مقاصد اشاعت بہت اہم ہیں یعنی توسیع و اشاعت زبان اردو۔ ایسے رسالوں کو اگر استقلال میسر ہو تو اردو کی ترقی تیقن ہے۔ تقطیع ۲۰×۳۰/۸ سرورق خوبصورت، حجم بمع ٹائیٹل ۴۸ صفحے کاغذ معمولی لکھائی چھپائی گوارا۔ سالانہ چندہ پانچ روپے۔ جو حجم کے لحاظ سے کچھ زیادہ معلوم ہوتا ہے۔ مندرجہ بالا پتہ سے طلب فرمائیے۔

عالمگیر۔ علمی، ادبی، تاریخی اور مذہبی اتنے مضامین کا ماہوار رسالہ ہے۔ جو زیر ادارت جناب حافظ محمد عالم لاہور سے شائع ہونا شروع ہوا ہے۔ پیش نظر نمبر علمی مضامین سے بالکل کورا ہے۔ اکثر و بیشتر مضامین ادبی ہیں۔ جناب مطلب حسین صاحب کا افسانہ تھیٹر کا پردہ بلحاظ زبان اور پلاٹ کے خوب ہے۔ "لیمپ کی چوری" جو متعدد اشاعتوں میں بالاقساط شائع ہو رہا ہے۔ مارس لیبلانک کے اس معرکتہ الآرا سراغرسانی کے ناول سے ماخوذ ہے۔ جس کا نام جیوش لیمپ ہے۔ اور جو "آخری ارمان" کے نام سے ہزار داستان میں نصف سے زائد چھپ چکا ہے۔ ادب لطیف کا عنصر غالب ہے۔ کاغذ۔ کتابت۔ طباعت معمولی حجم ۴۸ صفحے۔ سائز ۲۰×۲۶/۸ چندہ سالانہ عہ/ دفتر عالمگیر بازار سید مٹھا لاہور سے طلب فرمائیے۔

بنارسی حور:۔ اس نام کا جولائی سے ایک ماہوار رسالہ بنارس چھاؤنی سے جاری ہوا ہے۔ سرورق پر علم روحانی علم سیمیا۔ علم ریمیا۔ علم موسیقی۔ علم سامدرک۔ میجک اور ناولس وغیرہ وغیرہ الفاظ درج ہیں۔ ٹائیٹل پیج کی سہ رنگی تصویر کے علاوہ ایک اور تصویر بھی ہر رسالے میں ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ "بنارسی حور کے ایک ہزار خریداروں کے لئے خاص رعایت کر دی گئی ہے۔ جو لوگ اس کے ابھی سے خریدار ہو جائینگے۔ ان سے پانچ روپیہ کے بجائے صرف تین روپیہ سالانہ چندہ لیا جائیگا" (خواہ تین روپیہ سالانہ چندہ بھی زیادہ ہی کیوں نہ ہو) ہم فی الحال اس کے متعلق کوئی اور رائے قائم کرنا نہیں چاہتے۔ لیکن یہ ضرور کہینگے کہ ایسے قلیل حجم اور چھوٹے سائز کے رسالے میں اتنے شعبوں کا التزام سودائے خام ہے۔ لکھائی چھپائی کاغذ ہلکا حجم ۳۶ صفحے تقطیع ۱۸×۲۲/۸ ملنے کا پتہ۔ مینیجر بنارسی حور۔ بنارس چھاؤنی

ستارہ۔ مجلہ ادبیہ جس کے دبیر مینا زبیری مارہروی (علیگ)

ہیں۔ علیگڈھ سے جاری ہوا ہے۔ پہلے نمبر میں جناب ساغر نظامی سیمابی (علیگ) ایڈیٹر پیمانہ کی نظم طلوع بالکل مہمل چیز ہے۔ کئی مضامین اچھے بھی ہیں۔ امید ہے کہ اگلے نمبروں کو زیادہ کامیاب بنانے میں جناب مینا سعی بلیغ فرمائینگے

تقطیع ۲۷×۱۷/۸ لکھائی چھپائی گوارا۔ کاغذ معمولی قیمت عوام سے ۲؍ سالانہ۔ معاونین سے عہ سرپرستوں سے عہ؍ سے زیادہ۔ مینجر ستارہ دار النشور علیگڈھ سے خط و کتابت کیجئے۔

نیرنگ خیال۔ لاہور سے اس نام کا ایک ماہوار اسلامی رسالہ زیر ادارت جناب حکیم محمد یوسف حسن جاری ہوا ہے۔ مضامین نگاروں میں جناب سید امتیاز علی تاج۔ جناب ریاض حسین بی۔اے اور ابو رشید عبد المجید صاحب سالک بی۔اے وغیرہ بلند ادیبوں کے نام ہیں۔ ایسے ایسے رسائل کا جاری ہونا اردو زبان کے لئے ایک نیک شگون ہے۔ امید ہے کہ جناب ایڈیٹر نیرنگ خیال کا ہر نمبر پہلے سے زیادہ وقیع اور نظر فریب بنانے کی کوشش فرمائینگے اور ہمارے اس اعتماد کو غلط ثابت ہونے کا موقع نہ دینگے ہماری رائے میں اگر مضامین نظم و نثر کے انتخاب میں زیادہ سختی سے کام لیا جائے تو بہتر ہوگا۔ اور اگر نثر منثور کے ٹکڑوں کو بالکل ہی بند کردیا جائے تو یہ سب سے اچھا ہوگا۔ رسالہ کے ہر نمبر میں ہندوستان کے مایۂ ناز مصور جناب عبد الرحمن چغتائی (جن سے ناظرین ہزار داستان ناواقف نہیں ہیں) کے قلم سے بہترین تصاویر شائع ہوتی ہیں۔ جو رسالے کے لئے باعث فخر ہیں۔

لکھائی چھپائی کاغذ قابل اصلاح سائز ۲۲×۲۹/۸ حجم ۵۰ صفحے۔ چندہ سالانہ ۲؍ پیشگی۔ ملنے کا پتہ مینجر رسالہ نیرنگ خیال۔ بارود خانہ لاہور

حنیف۔ لدھیانہ سے اس نام کا ایک ماہوار رسالہ زیر ادارت غازی محمود دھرمپال بی۔اے نکلنا شروع ہوا ہے۔ ہر نمبر تقریباً یکصد صفحوں کا ہوتا ہے۔ شروع سے لیکر آخر تک عموماً ایک ہی مضمون سے پُر ہوتا ہے پہلے نمبر میں ہندو مسلم اتحاد کا بنیادی پتھر اور دوسرے نمبر میں خنجر بیداد نکل چکے ہیں۔

تقطیع ۲۲×۱۸/۸ کاغذ لکھائی چھپائی معمولی قیمت سالانہ چھ روپے (۶؍) فی پرچہ ۱۲؍ جو زیادہ ہے۔

مینجر حنیف لدھیانہ سے طلب فرمائیے

ایڈیٹر

نوٹ

گنجائش کے نہ ہونے کے باعث کتب موصولہ پر ریویو نہ ہو سکا۔ انشاء اللہ انپر اشاعت آئندہ میں تنقیدی نگاہ ڈالی جائیگی۔

ایڈیٹر

قیمت سالانہ چھ روپے — رجسٹرڈ نمبر ایل ۱۴۱۴۷ — قیمت ششماہی ۳ روپے فی پرچہ ۱۰ ر

ہزار داستان

آنریری ایڈیٹر: حکیم احمد شجاع بی۔ اے (علیگ)

ایڈیٹر: محمد اسمٰعیل نعیم

جلد ۵ — اشاعت ماہ اکتوبر سنہ ۱۹۲۴ء — نمبر ۴

نمبر شمار	مضمون	اثر خامہ	نمبر صفحہ
۱	دریا بہ حباب اندر	ایڈیٹر	۲۴۲
۲	ہدیۂ مبارکباد	حضرت آزاد انصاری	۲۴۳
۳	قطرہ میں طوفان	جناب حامد اللہ افسر بی۔ اے	۲۴۵
۴	شہیدانِ محبت	جناب مولٰنا محوی صدیقی	۲۵۵
۵	تدبیر و تقدیر	جناب سید احسن بی۔ اے بی ٹی	۲۶۵
۶	غزل	جناب اودھے سنگھ شائق بی۔ اے	"
۷	گوتم بدھ	جناب افتخار الرسل بدر ممبر رائل ایشیاٹک سوسائٹی	۲۶۶
۸	جذباتِ افسر	جناب حامد اللہ افسر بی۔ اے	۲۷۰
۹	غیر فانی احساس	جناب ابوالمحاسن محمود علیخاں	"
۱۰	صحبت کا اثر اُردو زبان پر	جناب غلام ربانی	۲۷۱
۱۱	گریۂ بے اختیار	جناب سید ابو محمد ثاقب	۲۷۴
۱۲	دیوانہ بزعم خویش ہشیار	جناب م۔ ہ۔ ح	۲۷۵
۱۳	بادۂ معرفت	حضرت گرامی مدظلہ	۲۸۱
۱۴	شمع	جناب ابوالفاضل سید راز چاندپوری	۲۸۲
۱۵	احساس فرض	جناب ابوالخیر محمد عبداللہ اورینٹل کالج لاہور	۲۸۳
۱۶	تبصرۂ اشاعات جدیدہ	ایڈیٹر	۲۸۶
۱۷	ناکام محبت کے خیالات	جناب اثر صہبائی	۲۸۸
۱۸	ہولناک بیابان	جناب محمد جمیل واعظی بی اے آنرز	۲۸۹
۱۹	نغماتِ آزاد	جناب آزاد انصاری	۲۹۵
۲۰	رودادِ محبت	جناب سید راز چاندپوری	۲۹۶
۲۱	غزل	جناب پورن سنگھ ہنر	۳۱۰
۲۲	تخییل	جناب محروم بی۔ اے	"
۲۳	آخری ارمان	جناب شمیم بلہوری	۳۱۱
۲۴	اشتہارات	. . . . .	۰

تصویر: مظفر الممالک نظام الملک آصف جاہ اعلیٰحضرت سر میر عثمان علیخاں صاحب بہادر سلطان دکن خلد اللہ ملکہٗ

(مرکنٹائل پریس لاہور میں باہتمام لالہ گوپال داس پرنٹر چھپا اور محمد اسمٰعیل لکمیسر پبلشر و پروپرائیٹر نے دارالاشاعت ادب لطیف کیلئے چمبرلین روڈ لاہور سے شائع کیا)

دریا بہ حباب اندر

صفحۂ ادارت

وہ شخص جو نیکی کے مقدس قانون کا احترام نہیں کرتا، نہ صرف اوروں کے لئے بلکہ خود اپنے لئے خطرناک ثابت ہوتا ہے۔ وہ زہر آلود عناصر جن سے وہ فضائے خارجی کو مسموم کر دیتا ہے۔ اُس پر بھی اپنا مہلک اثر دکھا کر رہتے ہیں۔ خود اُس کی ذات اُس کے لئے خوفناک ہو جاتی ہے۔ اور یہ قدرت کا سب سے بڑا انتقام ہے۔ جو وہ ایک گناہگار سے لے سکتی ہے۔ "قطرہ میں طوفان" اسی حقیقت کا ایک لطیف اظہار ہے۔ اس افسانے کے متعلق یہ ذکر دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔ کہ اس کے مصنف جناب حامد اللہ افسر ہیں۔ آپ نے اسے ہمیں عنایت کیا تھا۔ لیکن اُس وقت جب ہزار داستان مطبع میں تھا۔ ہم اسے غیر متوقع طور پر معاصر "پیمانہ" میں چھپا ہوا دیکھ کر بیحد متعجب ہوئے۔

جناب مدیر "پیمانہ" نے ہماری اس حق تلفی کا اس "حسنِ اتفاق" کو الزام دیا ہے کہ وہ اسے جناب افسر سے لے آئے تھے۔ اور یہ انہیں بعد از وقت معلوم ہوا کہ یہ ہزار داستان کو بھیجا جا چکا ہے۔ ہم اس "حسنِ معذرت" کے لئے اُنکے ممنون ہیں۔

"صحبتِ ناجنس" اُردو کی زود اثر پذیر طبیعت پر جو مخرب اثر مترتب کر رہی ہے۔ وہ اگر اسی طرح رفتہ رفتہ سرایت کرتا گیا تو خوف ہے کہ کہیں اُس کی قلب ماہیت نہ ہو جائے۔ غلام ربانی صاحب نے اپنے مفید اور دلچسپ مضمون میں اسی غیر محسوس اثر کو نمایاں کیا ہے۔ ضرورت ہے کہ ہم آئندہ کی ممکنات کا خیال کرتے ہوئے اصلاحِ زبان کی طرف متوجہ ہوں۔

"دیوانہ بزعم خویش ہشیار" ایک دیرینہ کرمفرما کا عطیہ ہے جنکی کوششیں ہزار داستان کے ایک گزشتہ دورِ خوشگوار میں اُس کے شاملِ حال رہ چکی ہیں۔ اور ہمیں وثوق ہے۔ کہ اس کا مستقبل بھی اُن سے کسبِ فیض کر سکیگا۔ یہ افسانہ "ایڈگر ایلن پو" کے ایک افسانے کا ترجمہ ہے۔ جو امریکہ کا بہترین مختصر افسانہ نگار ہے۔ اور جس کی شخصیت کا نقش دوامِ ادبیاتِ حاضرہ کے صفحات پر ثبت ہے۔ یہ ایک ایسے شخص کی کیفیاتِ اندرونی کا غائر مطالعہ ہے جسکی ذکاوتِ حس اس حد تک پہنچ گئی تھی کہ ایک معمولی جذبۂ نفرت نے اُسے قتل پر آمادہ کر دیا۔

ہدیۂ مُبارکباد

بہ تقریب قبولیت سند اعزازی "سلطان العلوم" منجانب بندگان عالی متعالی مظفر الممالک ۔ نظام الملک آصف جاہ ۔ اعلیحضرت سر میر عثمان علی خاں صاحب بہادر سلطان دکن ۔ خلد اللہ ملکہ و ادام اللہ اقبالہٗ

احکام خلاف حق کا رد بھی   اصلاح رسوم نیک و بد بھی   تعلیم علوم لاتعد بھی   ترویجِ فنونِ مستند بھی
سلطانِ علوم کی سند بھی   سلطانِ دکن! تجھے مبارک
اس نام سے شہرتِ ابد بھی   خاقانِ زمن! تجھے مبارک

تو شاہ ادانی و اعالی   تو سایۂ لطفِ لایزالی   تو گنج معارف و معالی   تو مہر سپہر بے مثالی
سلطانِ علوم کی سند بھی   سلطانِ دکن! تجھے مبارک
اس نام سے شہرتِ ابد بھی   خاقانِ زمن! تجھے مبارک

تو واقفِ شانِ علم و حکمت   تو مرتبہ دانِ علم و حکمت   تو جانِ جہانِ علم و حکمت   تو روحِ روانِ علم و حکمت
سلطانِ علوم کی سند بھی   سلطانِ دکن! تجھے مبارک
اس نام سے شہرتِ ابد بھی   خاقانِ زمن! تجھے مبارک

تو گوش نہِ فغانِ اُردو   تو دادرسِ زبانِ اُردو   تو یاورِ بیکسانِ اُردو   تو رہبرِ کاروانِ اُردو
سلطانِ علوم کی سند بھی   سلطانِ دکن! تجھے مبارک
اس نام سے شہرتِ ابد بھی   خاقانِ زمن! تجھے مبارک

تحقیق کا اہتمام تجھ سے   تدقیق کا انصرام تجھ سے   تدریس کا انتظام تجھ سے   فیضانِ علوم عام تجھ سے
سلطانِ علوم کی سند بھی   سلطانِ دکن! تجھے مبارک
اس نام سے شہرتِ ابد بھی   خاقانِ زمن! تجھے مبارک

ہر علم کو انتساب تجھ سے   ہر جہل کا سدِ باب تجھ سے   ہر چشمۂ فن میں آب تجھ سے   جو ہے سو وہ فیضیاب تجھ سے
سلطانِ علوم کی سند بھی   سلطانِ دکن! تجھے مبارک

اس نام سے شہرتِ ابد بھی خاقانِ زمن! تجھے مبارک

تو نورِ جبینِ ملک و ملت تو مہرِ مبینِ ملک و ملت تو حافظِ دینِ ملک و ملت تو حسنِ حسینِ ملک و ملت
سلطانِ علوم کی سند بھی سلطانِ دکن! تجھے مبارک
اس نام سے شہرتِ ابد بھی خاقانِ زمن! تجھے مبارک

رفعت بھی تری کنیزِ بے دام عظمت بھی تری کنیزِ بے دام سطوت بھی تری کنیزِ بے دام عزت بھی تری کنیزِ بے دام
سلطانِ علوم کی سند بھی سلطانِ دکن! تجھے مبارک
اس نام سے شہرتِ ابد بھی خاقانِ زمن! تجھے مبارک

دولت کا قیام تیرے دم سے صولت کا نظام تیرے دم سے نصفت کو دوام تیرے دم سے بہبودیٔ عام تیرے دم سے
سلطانِ علوم کی سند بھی سلطانِ دکن! تجھے مبارک
اس نام سے شہرتِ ابد بھی خاقانِ زمن! تجھے مبارک

اقبال کو افتخار تجھ سے اجلال کو افتخار تجھ سے ہر حال کو افتخار تجھ سے ہر قال کو افتخار تجھ سے
سلطانِ علوم کی سند بھی سلطانِ دکن! تجھے مبارک
اس نام سے شہرتِ ابد بھی خاقانِ زمن! تجھے مبارک

ہر ملک میں تیرے کام کی دھوم ہر قوم میں تیرے نام کی دھوم ہر سو ترے احتشام کی دھوم ہر سو تری جودِ عام کی دھوم
سلطانِ علوم کی سند بھی سلطانِ دکن! تجھے مبارک
اس نام سے شہرتِ ابد بھی خاقانِ زمن! تجھے مبارک

ہر وقر ترے لئے سزا ہے ہر فخر ترے لئے بجا ہے ہر عزہ ترے لئے روا ہے تو علم و حلم کا دیوتا ہے
سلطانِ علوم کی سند بھی سلطانِ دکن! تجھے مبارک
اس نام سے شہرتِ ابد بھی خاقانِ زمن! تجھے مبارک

ہر جود و عطا ترے لئے ہے ہر بذل و سخا ترے لئے ہے ہر فضلِ خدا ترے لئے ہے دنیا کی دعا ترے لئے ہے
سلطانِ علوم کی سند بھی سلطانِ دکن! تجھے مبارک
اس نام سے شہرتِ ابد بھی خاقانِ زمن! تجھے مبارک

آزاد اگرچہ اک گدا تھا نو واردِ شہر و بے نوا تھا لیکن یہ سماں وہ دلکشا تھا خوش ہو کے صدا لگا رہا تھا
سلطانِ علوم کی سند بھی سلطانِ دکن! تجھے مبارک
اس نام سے شہرتِ ابد بھی خاقانِ زمن! تجھے مبارک

(آزاد انصاری)

قطرہ میں طوفان

مدنی کے کتب خانہ کی ہر کتاب پر طرزی کی نظر ٹھوکر کھاتی تھی، کیسا بیش قیمت مجموعہ ہے۔ اس شخص کی زندگی قابلِ رشک ہے، ایسی نایاب کتابیں جسکے قبضہ میں ہوں پھر اُسے دُنیا میں کسی چیز کی ضرورت نہیں

سورج کی آخری کرنیں کمرے کی سفید دیواروں پر نور برسا رہی تھیں۔ نظر پڑتے ہی پلٹتی تھی۔ مارچ کا مہینہ بھی کیسا عجیب اور پُرلطف مہینہ ہوتا ہے۔ اور پھر نور نگر کی سرزمین، حقیقت یہ ہے کہ ہوا کا ہر جھونکا فطرت کی عیش پرستیوں کا اثر لئے ہوئے تھا،

جس وقت طرزی ایک قدر شناس کی نگاہ سے کتابوں کی پشت کے سنہری حرفوں کے پڑھنے میں مصروف تھا مدنی کی نظر اُس کی بلند اور نازک گردن پر پڑی۔ ذرا سے اشارے میں کیا کچھ ہوسکتا ہے! کیسا دل خوش کن خیال تھا!

مدنی اور طرزی دونوں دوست تھے، آج کے نہیں بیس سال کے دوست تھے، دونوں ادیب اور دونوں شاعر تھے

طرزی بہت حساس تھا، وہ برداشت نہ کرسکتا تھا کہ اُس کے کسی دوست کو اُس کی نسبت کوئی بدگمانی یا غلط فہمی پیدا ہو اور اگر پیدا ہوجائے تو اوّلین موقعہ پر اُسے دور کرنے کی کوشش کرتا تھا یہی خیال آج اُسے بمبئی سے نور نگر تک کھینچ لایا،

طرزی کو فضا کی ہر چیز سے محبت تھی، وہ چاہتا تھا کہ دنیا کی ہر چیز اُس سے محبت کرے شاید یہی وجہ تھی کہ طرزی ایک مقبول مصنف تھا، دنیا اُس کی قدر کرتی تھی اور اُس کی زندگی ایک کامیاب زندگی سمجھی جاتی تھی،

مدنی کے دماغ میں اس وقت خیالات کا ایک حشر برپا تھا، "اُس کمبخت نے میری زندگی تباہ کردی، اُس نے ہمیشہ میری ترقی کے راستے میں رُکاوٹیں پیدا کیں۔ میری ناکامی اور میری کس مپرسی کا سبب ہوا، دکھاوے کے لئے ظاہرداری کے واسطے میرا مربی میرا معاون، میرا مددگار کیا کیا نہ بنا مگر صرف لوگوں پر یہ ظاہر کرنے کے لئے کہ طرزی مدنی کو ایک نہایت معمولی آدمی سمجھتا ہے، اُف کسقدر خودبین، کسقدر خود پسند، کسقدر

مغرور ہے، میں سب جانتا ہوں، میں تیری رگ رگ سے واقف ہوں، مجھ پر تیرے سیاہ اور کثیف دل کا حال روشن ہے"

مدنی کے خیالات مبالغہ میں ڈوبے ہوئے سہی مگر حقیقت سے زیادہ دور نہ تھے۔ ایک حد تک یقیناً طرزی اُس کی ناکامیوں کا باعث ہوا۔ لاہور کے مشہور رسالے "سروش" کی ایڈیٹری کے لئے جب مدنی رسالے کے مالک مرزا نسیم سے ملا تو دل میں کسقدر خوش آئند امیدیں لیکر آیا تھا، کسقدر جوش اور سرگرمی سے کام کرنیکا ارادہ تھا۔ کیسے کیسے منصوبے گانٹھے تھے مگر نتیجہ کیا ہوا، سروش کی ایڈیٹری پر طرزی کا تقرر ہوگیا، یہ مانا کہ رسالہ ایک سال سے زیادہ جاری نہ رہ سکا مگر اس حقیقت سے کسی کو انکار نہیں ہوسکتا کہ اس رسالہ کے تعلق نے طرزی کو ملک کے مشہور ادیبوں کی صف اوّل میں جگہ دی، غالباً یہی مدنی کے ساتھ ہوتا،

اس واقعہ کے پانچ برس بعد مدنی کا ناول "مجنون خواب" شائع ہوا، یہ تین سال کی شبانہ روز جاں کاہی کا نتیجہ تھا۔ کسقدر امیدیں اس سے وابستہ تھیں مگر سب بے سود، اس کی اشاعت سے ایک ہی ہفتہ بعد طرزی کا مشہور ناول "طوفان" شائع ہوا، غل مچگیا، ہر شخص کے ہاتھ میں طوفان نظر آنے لگا۔ ریلوں میں، ہوٹلوں میں جہاں دیکھو طوفان موجود ہے، طرزی کا نام ہر زبان پر تھا، اور لطف یہ کہ طوفان میں "سوائے چند ہوش رُبا اور پُر درد واقعات کے اور کچھ نہ تھا" ممکن ہے آپ یہ کہیں کہ ایک ناول سے دوسرے ناول کی اشاعت پر کیا اثر پڑ سکتا ہے۔ مگر اتنا تو سوچئے کہ "اگر طوفان نہ شائع ہوتا یا کم سے کم اتنی جلد نہ شائع ہوتا تو پبلک کا وہ محدود، نادان، بے خبر، خود پرست اور خود رائے طبقہ جو صرف چرب زبانی سے ایک کتاب کی اشاعت پر زبردست اثر ڈالتا ہے یقیناً "مجنون خواب" کو ہاتھوں ہاتھ لیتا" مگر یہ نہ ہوا طوفان شائع ہوا اور دو ہی چار ہفتہ میں اُس کی اشاعت کہیں سے کہیں پہنچ گئی،

اس کے بعد اور بہت سے واقعات ہوئے، اور ہمیشہ کسی نہ کسی صورت سے یہ دُبلا پتلا، کاغذی، لاغر انسان مدنی کی راحت اور اُس کی کامیابی میں رخنہ انداز ہوا ہے

مدنی کے دماغ پر ان تمام واقعات کا بہت گہرا اثر تھا۔ طرزی کا خیال اس کے لئے کسی ڈراؤنے بھوت سے کم نہ تھا۔ نور نگر کے ایک غیر آباد حصہ میں پڑے ہوئے رات دن اپنی ناکامیوں پر افسوس کرتا رہتا، نہ دوست نہ احباب نہ کوئی ہمدرد نہ قدر شناس۔ وہ ناکام رہا لیکن اس میں خود اس کا قصور نہ تھا اور ظاہر ہے کہ اس علمی تبحر اور ادبی مذاق کے ہوتے ہوئے اس کا قصور کیونکر

ہو سکتا تھا یہ تو زندگی کی جدید روشوں اور معیشت کے نئے طریقوں کا قصور ہے، تعلیم، تربیت اور تہذیب کا کھوٹ ہے، اس مجہول مصلحے کی خطا ہے جس کی آمیزش سے انسانی ادراک اور شعور اور فہم کا خمیر گوندھا گیا ہے ــــــ اور ان سب سے زیادہ سنگین تقصیر طرزی کی ہے،

مدنی چاہتا تھا کہ کبھی طرزی کی صورت نہ دیکھے، کبھی اس کے سامنے نہ آئے، کبھی اس کا نام بھی نہ سُنے، مگر جس وقت اُسے ذیل کا تار موصول ہوا تو اُس کی حیرت کی انتہا نہ تھی،

"کیا تم اتوار اور پیر کو نورنگر میں رہوگے؟ دو روز تمہارے پاس قیام کرنا چاہتا ہوں" طرزی جیلانی

مدنی نے بار بار آنکھیں مل کر تار پڑھا۔ اُسے یقین نہ آتا تھا کہ یہ طرزی کا تار ہے اور پھر ــــــ پھر ایک راز جو یا نہ جذبہ کے اثر میں ایک حقارت آمیز کشش کی وجہ سے ایک گہرے پوشیدہ مقصد کی تحریک سے جس کا تجزیہ کرنے کی اس میں جرأت نہ تھی مدنی نے تار کے جواب میں لکھ دیا

"آجاؤ میں نورنگر ہی میں رہونگا"

چنانچہ طرزی نورنگر آگیا اور یقین کیجئے کہ اس طویل مسافت کا سبب سوائے اس کے اور کچھ نہ تھا کہ وہ اُس نامعلوم شکایت کو دور کرے جو مدنی کو پیدا ہوگئی تھی۔ اور جس کا علم اُسے شیبانی کے ذریعہ ہوا تھا،

"مدنی! مجھے بتاؤ تمہیں مجھ سے کیا شکایت ہے؟ میرے لئے یہ خیال تکلیف دہ ہے کہ تم مجھ سے کسی وجہ سے ناراض ہو، ممکن ہے کہ وجہ شکایت محض کوئی غلط فہمی ہو، ممکن ہے واقعی مجھ سے کوئی فروگذاشت ہوئی ہو"

طرزی نے یہ الفاظ خلوص نیت سے کہے تھے اس کا دل صاف تھا وہ چاہتا تھا کہ مدنی کا دل بھی اُس کی طرف سے صاف ہو جائے،

مدنی نے جواب دیا "کوئی بات نہیں ہے" مدنی نے غلط کہا، مدنی نے جھوٹ بولا مجھے تم سے کوئی شکایت نہیں ہے"

طرزی نے خوش ہو کر کہا "مجھے بڑی مسرت ہوئی تعجب تھا کہ آخر ایسی کیا بات ہو سکتی ہے جس سے تمہیں کوئی شکایت پیدا ہوئی۔ میرا دل تمہاری طرف سے صاف ہے، میں تمہارا مخلص دوست ہوں، مجھے تم سے محبت ہے"

جب طرزی کی گفتگو جاری تھی اُس وقت مدنی کی نفرت اور حقارت کا اندازہ کرنا مشکل تھا۔ وہ تیز اور مہلک زہر کو خوش ذائقہ شربت ظاہر کر کے خود ہی پی گیا،

(۲)

اگلے روز صبح کے وقت طرزی نے پھر مدنی

سے کہا " مدنی ایک بار پھر کہدو کہ تمہارا دل میری طرف سے صاف ہے ، مجھے اطمینان ضرور ہے مگر کبھی کبھی کچھ خیال پیدا ہو جاتا ہے کہ شاید تم کچھ ناراض ہو "

مدنی نے نیچے سے اوپر تک طرزی کو دیکھا، آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں ۔ خیال آیا کہ یہ دونوں آگ کی طرح چمکتی ہوئی آنکھیں نکال کر پھینکدوں اور پیشانی کے نیچے دو گہرے گڑھے چھوڑدوں ، خون میں بھرے ہوئے اور روشنی سے محروم ، کاش میں اسقدر بے بس نہ ہوتا ،

" بھائی میں تم سے کل شام کہہ چکا ہوں ، آخر شکایت کی کوئی وجہ بھی ہو "

طرزی نے کہا اس وقت میں بہت ہی خوش ہوں ، مدنی مجھے تم سے محبت ہے اور ہمیشہ سے محبت ہے میں نے ہمیشہ تمہاری فطرت شناسی اور نکتہ رسی کی تعریف کی ہے ، تمہارا وہ ناول ...... اُس کا نام اس وقت یاد نہیں آتا ، کچھ خواب کے متعلق ہے ——"

" مجنونِ خواب "

" ہاں " مجنونِ خواب " مجھے بہت پسند ہے ، اس پر کچھ قدامت پرستی کا اثر سہی لیکن اس میں کسی کو کلام نہیں کہ وہ تمہارے کمال انشا پردازی کا نمونہ ہے اس کی اشاعت یقیناً امید سے کم رہی ،

" ہاں اشاعت کم رہی "

" زمانہ قدر شناسی میں ذرا سست ہے ، تمہاری قدر ضرور ہوگی ، آج نہ سہی کل سہی ۔ قابل قدر چیز کامیاب ہو کر رہتی ہے "

" ہاں میری قدر ہوگی "

" میری بات تو ظاہر ہے کہ جتنی مقبولیت مجھے ہوئی ہے اُس کا میں ہرگز مستحق نہ تھا ۔ لیکن مجھے مقبولیت ضرور حاصل ہے ، اس سے کوئی انکار نہیں کرسکتا ، مجھے کسرنفسی کی ضرورت نہیں ہے ، لیکن تمہارے ساتھ ناانصافی ہوئی ہے ، ابھی دنیا نے تمہاری قدر نہیں پہچانی ، تم میں ایک کامیاب انشا پرداز اور ادیب کی تمام خصوصیات موجود ہیں صرف اتنی بات ہے —— بھائی بُرا نہ ماننا ، تم میرے دوست ہو ، مجھے حق حاصل ہے کہ اپنے نزدیک جو خامیاں تمہارے اندر دیکھوں تمہارے منہ پر اُن کا اظہار کردوں —— صرف اتنی بات ہو کہ تم اپنے زمانے سے کچھ پیچھے ہو ، تم زمانے کے ساتھ ساتھ نہیں چلتے اور اس کی وجہ ظاہر ہے ، تم تنہائی پسند ہو ، دنیا سے الگ نور نگر کے ایک گوشہ میں پڑے ہو تمہیں کیا خبر ہے کہ دنیا میں کیا ہو رہا ہے "

مدنی نے اپنی داہنی طرف آسمان کی سمت دیکھا اُس کی پیشانی پر خفیف سی شکن پڑی اور پھر نظریں

طرزی کی طرف رجوع ہوئیں۔

طرزی کی تقریر جاری رہی "میں تو چھ مہینہ بمبئی میں رہتا ہوں، وہاں دلچسپی اور تفریح کی ہر چیز موجود ہے، تین مہینہ کشمیر میں صرف کرتا ہوں اور تین مہینہ اور مختلف مقامات مثلاً بنارس ہردوار وغیرہ کی سیر کرتا ہوں،

کشمیر! اُف کشمیر! اس نام میں کیسی کشش ہے! مدنی کے دل پر چوٹ سی لگی، اُسے کشمیر جانیکا کسقدر شوق تھا، کاش کسی طرح دو ہی چار روز کے لئے اس فردوس ارضی کی زیارت نصیب ہوتی، مگر کبھی اتنا روپیہ نہ ہوا کہ وہاں جا سکے اور اس خود بین، خود پسند، مغرور جاہل کو دیکھو ——

مدنی کچھ بے چین ہو کر اُٹھا اور دریچہ کے باہر کی طرف جھانک کر بولا "طرزی ٹہلنے کے لئے چلتے ہو، یہ تفریح کے لئے بہت اچھا وقت ہے،

(۳)

یہ فقرہ زبان سے نکلنے کے بعد مدنی کے چہرہ پر حسرت سی چھا گئی، خدا جانے اُس نے ٹہلنے کی تجویز کیونکر پیش کردی، آخر طرزی کو وہ کیوں ٹہلنے کے لئے لیجائے، نورنگر کی فضا اس کی چھوٹی چھوٹی پہاڑیاں جیسے بہت سے دیو دوزانو بیٹھے ہوں خوبصورت جھیلیں، سبزہ زار یہ سب چیزیں اس غریب کے لئے ایک چھوٹے سے کشمیر سے کسی طرح کم نہ تھیں، کسقدر ظلم اور ناانصافی ہے کہ اس میں بھی طرزی شریک ہو جائے مدنی کو خیال ہوا کہ کہیں اور کسی نے تو یہ ٹہلنے کی تجویز پیش نہیں کی ہے، اس خیال کا اسقدر غلبہ ہوا کہ اُس نے کمرے میں اِدھر اُدھر دیکھا بھی کہ شاید واقعی کوئی تیسرا شخص کمرے میں موجود ہو،

آخر دونوں تفریح کے لئے چلے، سڑک پہاڑوں کے بیچ میں ہو کر گئی تھی، جب بلندی پر چڑھنا ہوتا تھا تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ سڑک سیدھی آسمان تک جارہی ہے۔ جب نشیب میں اُترنا ہوتا تھا تو یہ نظر آتا تھا کہ سبزہ زار کے اندر کسی جھیل میں غرق ہو گئی ہے،

طرزی نے مدنی کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیا اور بولا، " مدنی! تمہارے ساتھ اس طرح تفریح کے لئے چلنا کیسا لطف انگیز ہے، مجھے آج کا دن عمر بھر یاد رہے گا، میرا ضمیر جذبات سے گوندھا گیا ہے، میں زود حس ہوں اور گداز دل رکھتا ہوں، بھائی دنیا چند روزہ ہے محبت ہی ایک ایسی چیز ہے جس کے سہارے وقت مسرت سے گذر سکتا ہے، تم بہت ہی تنہائی پسند ہو، یہ نہ ہونا چاہئے"

طرزی کے لفظ مدنی کے سینہ میں تیر کی طرح

اُتر گئے، اس چھوٹے سے کمزور ہاتھ کا مس کسقدر عجیب تھا، اتنی دور سے تم دل کی حرکت کی آواز سن سکتے تھو، بار بار بے اختیار جی چاہتا تھا کہ دونوں ہاتھوں سے اس دُبلے پتلے ہاتھ کو ایسی زور سے موڑا جائے کہ ہڈیوں کا چورا ہو جائے ـــــ اُف کھولتے ہوئے پانی کی طرح خون میں جوش آتا ہے۔ مگر کچھ بس نہیں چلتا،

مدنی ذرا ٹھٹکا، "یہ نورنگر کی حد ہے، وہ سر ہے، یہاں کے قریب ہی پہاڑیوں کے بیچ میں ایک بڑی خوبصورت جھیل ہے، میں اکثر اس میں تیرتا ہوں۔ چلو تمہیں دکھاؤں تم بہت پسند کروگے"

(۴)

نورنگر کے قرب وجوار میں بہت سی جھیلیں تھیں اور سب پہاڑوں کے درمیان میں تھیں۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ قدآور دیو ناف تک پانی میں خاموش کھڑے ہیں۔ چند بادل پہاڑوں کی چوٹیوں کا تکیہ بنائے سو رہے تھے۔ ہر طرف سکوت تھا، آسودگی تھی، سکون تھا، کیسا پیارا سماں تھا، کسقدر دلکش نظارہ تھا۔ طرزی کو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ زمین سے اُدھر چل رہا ہے۔ کوئی اُسے اُٹھا کرلئے جا رہا ہے،

مدنی نے کہا "یہ جھیلیں بہت گہری ہیں عمیق ہیں، اتھاہ ہیں آجتک کوئی ان کی تہ تک نہیں پہنچ سکا ہے"

طرزی نے کہا "مجھے کبھی تیرنا نہ آیا، ہمیشہ پانی سے ڈرا، یہ خیال دماغ میں جم جاتا ہے کہ ڈوب جاؤں گا"

مدنی خیال میں غرق ہو گیا، طرزی اس سے دو قدم پیچھے تھا۔ ان کے داہنی طرف ایک چٹان پر پہاڑ کی تلیٹی میں پتھر کی چند کانیں تھیں، سونی، ویران، افتادہ اور اُجاڑ، یہاں ذرا چڑھاؤ زیادہ تھا، طرزی کا سانس پھول گیا، کانوں کے نیچے ہوتے ہوئے دونوں پانی کے کنارے کنارے چل رہے تھے۔ پانی کبھی سنہرا، کبھی میلا، کبھی بھورا، کبھی سفید مختلف رنگوں میں پیش نظر تھا۔ آخر مدنی ایک پہاڑ کی گود میں تاریک پانی کے کنارے ٹھہر گیا "یہ جھیل مجھے بہت پسند ہے سب سے علیحدہ ہے اور چاروں طرف سرسبز وشاداب پہاڑ ہیں، شفق کی ہلکی ہلکی روشنی میں پہاڑ کیسے عجیب معلوم ہوتے ہیں، گویا اُن کے چوڑے چکلے سینوں پر زندگی مچل رہی ہے۔" طرزی اس وقت ہم یہاں تنہا ہیں، کسقدر سناٹا چھا رہا ہے، اب تھوڑی دیر میں سورج غروب ہو جائیگا اور بس پھر تاریکی ہے، طرزی کیسی پیاری جھیل ہے، تمہیں معلوم ہے یہ میرے دل کا ٹکڑا ہے۔ مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ میں بلاشرکت

غیرے اس کا مالک ہوں، جیسے تم اپنی تمام تصانیف کے، اپنی تمام عزت اور شہرت اور کامیابی کے مالک ہو، وہ میری ملکیت ہے اور یہ سب چیزیں تمہاری ملکیت ہیں،

طرزی :۔ "اُف! پانی کسقدر تاریک ہولناک اور ڈراؤنا ہے"

مدنی! "یہ جھیل یہاں کی سب جھیلوں سے زیادہ گہری ہے، کوئی نہ کی خبر نہ لاسکا، مجھے اس سے بہت اُنس ہے، مجھے یقین ہے کہ یہ ایک دن مجھ پر اپنا راز سربستہ کھول دیگی"

طرزی کو اپنے جسم میں جھرجھری سی محسوس ہوئی، اُسنے کہا "تمہاری جھیل بہت خوبصورت اور دلفریب ہے اب چلو، راستہ سخت اور پیچیدہ ہے، ہوا میں خنکی اور ٹھر پیدا ہوگئی ہے،

مدنی طرزی کا ہاتھ پکڑکر ایک طرف کو چلا "دیکھو پانی میں نکلی ہوئی اس چٹان کے سر پر سے جھیل کیسی بھیانک معلوم ہوتی ہے، یہ نظر آتا ہے کہ پہاڑ برابر قریب تر آتے جاتے ہیں یہاں تک کہ ایک دوسرے سے پیوست ہوجائیں گے اور ہم بیچ میں کچل کر رہ جائیں گے"

اب دونوں چٹان کے سرے پر پہنچ گئے،

اس میں شک نہیں کہ پانی یہاں سے بہت تاریک اور عمیق معلوم ہوتا تھا، جیسے ہی طرزی نے جھک کر پانی میں جھانکا، مدنی کا ہاتھ اُس کی پتلی اور نازک گردن پر تھا، ایک ہلکا سا جھٹکا بہت کافی ہوا، تیز اور باریک چیخ کی آواز آئی۔ پانی کی موجوں میں جنبش مضطرب نمودار ہوئی، ایک بےچین دائرہ پیدا ہوا، پھر وہ بڑھا، وسیع ہوا، اور زیادہ وسیع ہوا اور پھر خاموشی تاریکی ہوگئی،

(۵)

خاموشی بڑھتی رہی، جھیل پر قابو حاصل کرلینے کے بعد وہ اور بڑھی، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ بےحس و حرکت سنسان پہاڑوں کے پاس انگشت برلب پہنچی اور پھر اُنہیں بھی پار کرگئی، مدنی وہیں کھڑا رہا، اس کی نظر جھیل کے تاریک پانی پر جمی ہوئی تھی، وہ خیالات کی گہرائیوں میں غرق تھا، اُسے ایک قسم کی تسلی تھی، تسکین تھی، اطمینان تھا، وہ گو مسرور نہ تھا، خوش نہ تھا مگر مغموم اور ملول بھی نہ تھا،

آخر طرزی رخصت ہوا، وہ یاوہ گو، ہرزہ سرا، خودبیں، خودپسند مغرور وجود رخصت ہوا، طرزی نے دیکھا کہ جھیل مسکراتے ہوئے اُس کے چہرہ کو تک رہی ہے اور کہتی ہے "تم نے جو کچھ کیا بہت خوب کیا، میں بھی تمہارے ساتھ شامل ہوں، اس کارنمایاں کے انجام

دینے والے دو ہیں، میں اور تم، مجھے تم پر فخر ہے"

اس وقت مدنی کا دماغ مصروف تھا، تیزی سے کام کر رہا تھا، ناکامی کی آگ میں جل رہا تھا، آخر عمل کا وقت آگیا، جو کچھ کرنا تھا کر گذرا، مدنی نے چاروں طرف نظر اُٹھا کر سنجیدہ اور سلیم پہاڑوں کو دیکھا، وہ مفتخر تھا ــــ اور وہ سرد تھا، لرزاں تھا، ہاتھ پیر قابو میں نہ تھے، اندھیرا گہرا ہوتا جاتا تھا، بہت دیر ہوگئی ہے اب یہاں سے چلنا چاہئے،

مدنی گھر کی طرف چلا، سردی سے اُس کے دانت بج رہے تھے، سارا جسم کانپ رہا تھا وہ گھر کی طرف جا رہا تھا اور جانا نہ چاہتا تھا، اس وقت جمیل کی جُدائی اُسے گوارا نہ تھی، جمیل اُس کی دوست تھی، دنیا میں سوائے اس جمیل کے کوئی اُس کا ساتھی نہ تھا، کوئی رازداں نہ تھا، کوئی ہمدرد نہ تھا، جمیل سے چھوٹ کر وہ بالکل تنہا رہ جائیگا۔ بے یار و مددگار رہ جائے گا ــــ اب وہ گھر کی طرف جا رہا تھا، مگر گھر تو اب بالکل خالی ہے، ایک مہمان قیام پذیر تھا، اب وہ وہاں نہیں ہے، اب وہ کبھی نہ آئیگا،

مدنی یکایک دوڑا، یہ نہیں معلوم کیوں، اُسے سوائے اس کے اور کوئی خیال نہ تھا کہ جمیل سے جدا ہونے کے بعد اب وہ تنہا رہ گیا، دوڑتے ہوئے چھوٹے چھوٹے پتھر کے ٹکڑوں سے آواز پیدا ہوئی اور ایسا معلوم ہوا کہ کوئی اور اُس کے پیچھے دوڑ رہا ہے، مدنی ٹھہر گیا اور پیچھے دوڑنے والا بھی ٹھہر گیا، اُس نے شام کے سناٹے میں گہرے سانس بھرے، اس وقت اُسے گرمی معلوم ہو رہی تھی، سر سے پیر تک پسینہ میں شرابور تھا، پیشانی سے رخساروں سے پسینے کے قطرے برابر ٹپک رہے تھے، ٹانگیں کانپ رہی تھیں، دل دھڑک رہا تھا، تھوڑی دیر ٹھہر جانے سے کچھ سکون ہوا، پھر دوڑا، اور زیادہ زور سے دوڑا، بستی کے مدھم مدھم چراغ نظر آئے، کچھ یقین ہوا کہ سب کچھ اسی طرح ہے کوئی چیز بدلی نہیں ہے، مگر ابھی یہ خیال دل سے نہیں نکلا کہ کوئی پیچھے پیچھے آرہا ہے، کئی مرتبہ پلٹ کر دیکھا مگر کوئی نظر نہ آیا،

مدنی کا دماغ اس وقت اسقدر تیزی کے ساتھ کام کر رہا تھا کہ وہ کچھ سوچ نہ سکتا تھا، آخر یہ پیچھے کون آرہا ہے، جمیل ہے، ہاں جمیل اس کے ساتھ ساتھ ہے، پھسلتی ہوئی لغزش کرتی ہوئی، رپٹتی ہوئی آرہی ہے، مدنی نے جمیل کی آواز سُنی، "جو کچھ کیا ہے ہم دونوں نے ساتھ کیا ہے، میں یہ نہیں چاہتی کہ تم تنہا ذمہ داری کا بار سنبھالو، میں تمہارے ساتھ ہوں، میں تمہیں تنہا نہ چھوڑونگی"

آخر مدنی گھر پہنچ گیا، اپنے کمرے میں ایک آرام کرسی پر لیٹ گیا، کمرے کے اندر ساری چیزیں اُسی طرح موجود تھیں، کتابیں بھی وہی تھیں جن پر طرزی للچائی ہوئی نظریں ڈال رہا تھا، میز بھی وہی کرسیاں بھی وہی، آرام کرسی پر لیٹتے ہی مدنی کو نیند آگئی، بڑی دیر تک بے خبر سوتا رہا، جب کافی وقت گذر گیا تو ملازم نے آکر جگایا اور کہا کھانا تیار ہے، کمرے میں دو موم بتیاں جل رہی تھیں جو بہتیرا اُچک اُچک کر کمرے کو روشن کرنا چاہتی تھیں، مگر پھر بھی تاریکی کم نہ ہوتی تھی، وہ طرزی کا انتظار کر رہا تھا مگر یہ بھی جانتا تھا کہ اب وہ نہ آئیگا، بار بار دروازے کی طرف دیکھتا تھا مگر اُدھر اندھیرا اسقدر گہرا تھا کہ کچھ نظر نہ آتا تھا، کھانا چُنا ہوا رکھا تھا اور رکھا رہا، اس نے ایک لقمہ بھی نہ توڑا، اُٹھکر کمرے کی کھڑکی کھولی، باہر کو جھانکا، معلوم ہوتا تھا کہ اُس کے کان کسی آواز کے منتظر ہیں، بے چین پانی کی آواز اس سناٹے میں کچھ ہل چل، کچھ اضطراب، جیسے کوئی تالاب، کوئی جھیل، جوش میں اپنی حدوں سے نکل جاتی ہے، درختوں کے پتوں کی جھڑ جھڑاہٹ —— اکدم گھبرا کر اُس نے کھڑکی بند کرلی، کمرے میں چاروں طرف دیکھا کچھ نظر نہ آیا،

(۶)

مدنی سونے کے لئے بستر پر لیٹا، نیند کا پتہ نہ تھا، دماغ تیزی کے ساتھ مصروف تھا، دل دھڑک رہا تھا، اُسے بار بار خیال ہوتا تھا کہ مجھے کوئی آواز دے رہا ہے، وہ ہمیشہ کھڑکیاں کھول کر سویا کرتا تھا، آج چاندنی ایک مریض کی طرح ایک روگی کی طرح ناتوان اور زرد رو اُس کے کمرے میں داخل ہوئی، مدنی نے کھڑکی کی طرف دیکھا، اُسے ایسا معلوم ہوا کہ کوئی چیز حرکت کر رہی ہے، میلی میلی زرد چاندنی میں کوئی چیز چمکتی ہوئی نظر آئی، مدنی نے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھا، بالکل بہتا ہوا پانی معلوم ہوتا تھا، مدنی کے ہوش اُڑ گئے، اُس کے کانوں میں کھڑکی کے باہر پانی کے اکٹھا ہونے کی آواز آنے لگی، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ پانی برابر چڑھتا آرہا ہے، تیزی سے نہیں، بے چینی کے ساتھ نہیں بلکہ آہستہ آہستہ مگر بڑی کثرت سے،

مدنی بستر پر بیٹھ گیا اور جھک کر دیکھا، کھڑکی کے نیچے پلنگ کے قریب پانی ہی پانی نظر آیا، اُس نے چوکھٹ کی طرف بہتے ہوئے دیکھا، پھر اُسے رکتے ہوئے اور پھر پلنگ کی طرف کو آتے ہوئے دیکھا عجب یہ ہے کہ کھڑکی کے باہر پانی کے چڑھنے کا شور تھا، مگر کمرے کے اندر خاموشی طاری تھی، ہلکی چاندنی میں پانی

برابر چڑھ رہا تھا، مدنی نے بستر سمیٹ لیا اور سرہانے کی طرف دوزانو بیٹھ گیا، نیچے کو دیکھا ایک چیخ ماری، کمرے کی زمین چمکدار پانی کے قبضہ میں تھی، پلنگ کے آدھے آدھے پائے غرق تھے، پانی چڑھ رہا تھا، بلا روک ٹوک بلا وقفہ کے چڑھ رہا تھا، اس کے روکنے کی بھی کوئی صورت نہ تھی، کاش وہ کسی طرح دروازہ تک پہنچ سکتا، پاؤں پلنگ کے نیچے لٹکائے، پانی برف کی طرح ٹھنڈا تھا، جیسے ہی وہ جھکا ایسا معلوم ہوا کہ کوئی اُسے پیچھے کی طرف دھکیل رہا ہے، مدنی اوندھے منہ زمین پر آیا، اس کا سر اس کا منہ ٹھنڈے پانی میں تھا، اس نے ہاتھ پاؤں مارے، اب پانی سینے تک آگیا، چیخ ماری، پھر چیخ ماری، سامنے شیشہ تھا، کتابیں تھیں، تصویریں تھیں، مگر کسی پر اثر نہ ہوا، دروازے کی طرف جانے کی کوشش کی مگر سب بیکار، اب پانی اس کی گردن کے قریب تھا، کسی نے یکایک اُس کے پیر کا انگوٹھا پکڑ کر کھینچنا شروع کیا، بہتیرا چھوٹنے کی کوشش کی مگر کارگر نہ ہوئی، "مجھے چھوڑ ظالم چھوڑ، مجھے تجھ سے نفرت ہے، میں تیرے پاس جھیل کی بھیانک تاریکی میں آنا نہیں چاہتا" —— یہ کہتے اُسے ایسا معلوم ہوا کہ ایک سرد ہاتھ نے اُس کا منہ بند کر لیا، دم گھٹنے لگا، پانی آنکھوں پر چھا گیا اور پھر اندھیرا ہی اندھیرا تھا،

صبح کو ملازم ناشتے کے لئے پوچھنے آیا، آواز دی، "سرکار! سرکار!" کچھ جواب نہ ملا، اندر آیا خوف سے کانپنے لگا، یہ کیا ہوگیا، اس کے آقا کی آنکھیں اُبلی پڑی تھیں، بتیسی بند تھی، باہر جاکر محلہ والوں کو بلایا، سب نے مل کر لاش کو اُٹھایا کوئی غیر معمولی بات معلوم نہ ہوئی ایک صراحی بیشک اوندھی پڑی تھی اور اُس کا پانی کمرے کے فرش پر پھیل گیا تھا اور بس،

حامد اللہ افسر

دیر میں مَیں خاک بسر ہی رہا	عمر کو اس طور بسر کر گیا
کس کو میرے حال سے تھی آگہی	نالۂ شب سب کو خبر کر گیا
گو نہ چلا تا مژہ تیر نگاہ	اپنے جگر سے تو گذر کر گیا
مجلسِ آفاق میں پروانہ ساں	میرؔ بھی شام اپنی سحر کر گیا (میرؔ)

تدبیر و تقدیر

آلودۂ خوں ہر دم تدبیر نظر آئی ۔۔۔ تقدیر کے ہاتھوں میں شمشیر نظر آئی
محروم تماشا نے دیکھا تو یہی دیکھا ۔۔۔ ہر چیز اُسے اپنی تصویر نظر آئی
محروم تماشا نے جب چارطرف دیکھا ۔۔۔ ہر چیز اُسے اپنی تصویر نظر آئی
لو ختم ہوئی کوشش لو ٹوٹ گئی ہمت ۔۔۔ تدبیر کے پردے میں تقدیر نظر آئی
کیوں تنگ نظر زاہد! کوثر کا سماں دیکھا! ۔۔۔ ہم خانہ خرابوں کی توقیر نظر آئی؟
آنکھوں سے اُٹھے پردے جب غیرت نے آگھیرا ۔۔۔ اُس وقت ہمیں اپنی تصویر نظر آئی
ناکام محبت کو ناکام تمنا کو ۔۔۔ بگڑی ہوئی عالم کی تقدیر نظر آئی
وابستۂ اُلفت کو پابستۂ وحشت کو ۔۔۔ آزادیٔ صحرا بھی زنجیر نظر آئی

اللہ رے یہ پر تو میرے دلِ محزوں کا
فطرت بھی مجھے احسنؔ دلگیر نظر آئی

سید احسن

غزل

بتاؤں کیا تمہیں کس باغ کی بہار ہوں میں ۔۔۔ ہو کوئی دیکھنے والا تو آشکار ہوں میں
یہ کون آیا ہے تربت پہ میرے ماتم کو ۔۔۔ یہ کس کی یاد میں مرنے پہ شرمسار ہوں میں
مآلِ گل پہ تو گریاں ہے قطرۂ شبنم ۔۔۔ مآلِ قطرۂ شبنم پہ اشکبار ہوں میں
مٹا نہ مجھکو خدا را نئے غمِ پنہاں ۔۔۔ کہ غم نوازوں کی دنیا میں یادگار ہوں میں

قصورِ غیر پہ ملنے لگی سزا شائقؔ
گلہ عدو سے کیا تھا گنہگار ہوں میں

اودے سنگھ شائق

گوتم بدھ

یادش بخیر! گوتم بدھ کے واقعاتِ زندگی میں سے
ذیل کا واقعہ مجھے ایک برہما کے پروہت نے سُنایا تھا

اکثر شام کے وقت راجکمار سدھارتا ایک ندی کے کنارے جا بیٹھا کرتا تھا۔ یہ جگہ اپنی خوبصورتی کے لحاظ سے کچھ ایسی دلفریب تھی کہ وہ اسے اپنے شاہی باغ سے زیادہ پسند کیا کرتا تھا۔ یہاں بیٹھکر اُسے دُنیا کے بکھیڑوں سے رہائی مل جاتی تھی اور اطمینان قلب میسر آتا تھا۔ اکثر وہ صاف شفاف پانی میں قدرت کی نیرنگیوں اور کنول کے پھولوں کو تیرتا ہوا دیکھ کر حیران ہوتا تھا۔ وہ گھنٹوں دنیا کی ابتدا اور انتہا پر غور کیا کرتا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ موت کا راز معلوم کرے مگر نہیں کر سکتا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ ہمیشہ زندہ رہے مگر نہیں رہ سکتا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ ہر قسم کے حوادث و مصائب سے محفوظ رہے۔ مگر کامیاب نہ ہوتا تھا۔ وہ ہمیشہ مسرور و کامیاب رہنے کی کوشش کرتا تھا مگر یہ مشکل تھا اس کی بے بسی و بیچارگی اُسے یہ نتیجہ نکالنے پر مجبور کرتی تھی کہ اُس کی موجودہ قوتوں سے پرے کسی اور قوت یا قوتوں کا وجود ہے۔ جو اس پر اور اسی کے مثل تمام فانی موجودات پر ہر لحظہ و ہر آن حکومت کرتی ہے۔ وہ اس راز کو معلوم کرنا چاہتا تھا مگر نہ کر سکتا تھا۔

ایک دن شام کے وقت کپلوستو کے بازاروں میں پھرنے کے بعد جونہی وہ ندی کے کنارے پہنچا ہوا کے ایک تیز و تند جھونکے نے اُسے بیدار کر دیا۔ اُسے معلوم ہوا کہ ہوا نے اُس کے گرد ہالہ بنا لیا ہے اور اُس کی زبردست قوت کسی نامعلوم طاقت سے مغلوب ہوتی جا رہی ہے۔ اُس کا دل گھٹنے لگا اور اس کمزوری کی حالت میں وہ لیسودھارا کو ڈھونڈھنے کے لئے اُٹھا اُس نے کنول کے پھول کو پانی پر کانپتے ہوئے دیکھا۔ اُس کا دل غم سے لبریز ہو گیا۔ وہ کچھ کہنا چاہتا تھا۔ مگر اُس کی قوت گویائی کچھ دیر کے لئے سلب ہو چکی تھی۔

تین دن وہ متواتر وہاں جاتا رہا۔ ہر روز غروب آفتاب کے وقت ہوا کا جھونکا آتا اور درختوں کے پتّوں میں سے گذر جاتا اور ہر روز کنول کا پھول اُس کی مشق سے زیادہ کانپتا۔ چوتھے روز اُس نے دیکھا کہ

اُس کے پتے پژمردہ ہو رہے تھے اور چھٹے دن جب وہی جھونکا پھر آیا تو کنول کا پھول ہمیشہ کے لئے پانی کی گود میں سو گیا۔ اُسی وقت ایک سفید ریش بڈھے کی شکل اُس کی آنکھوں میں پھرنے لگی جسے اُس نے شام کو بازار میں دیکھا تھا۔ اس کے علاوہ باغ میں پھولوں کی پژمردگی نے اس کے خیالات پریشاں میں اور بھی اضافہ کیا۔ اس کا دل غم سے لبریز ہو گیا۔ وہ سوچنے لگا کیا قانون فنا کی گرفت اُس پر قابو نہ پا سکیگی؟ اب اُسے یقین ہو گیا کہ موجوداتِ فانی سے ماوراء و مافوق کسی اور شے کا وجود ضروری ہے۔

وہ لیشودھرا کے پاس آیا جو بچے کو گود میں لئے بیٹھی تھی۔ تھوڑی دیر وہ چپ چاپ اُس کے پاس کھڑا رہا۔ اُس کی آنکھیں کسی اندرونی غم کا پتہ دیتی تھیں۔ لڑکی نے اُس کے چہرے سے معلوم کر لیا کہ وہ کچھ کہنا چاہتا ہے۔

"میرے سرتاج......" وہ بچہ کی بھولی صورت کی طرف دیکھتے ہوئے بولی

"لیشودھرا" شہزادے نے بات کاٹتے ہوئے کہا "راہولا کو زندہ نہیں رہنا چاہیئے"

لڑکی نے بچہ کو چھاتی سے لگاتے ہوئے آنکھ اُٹھا کر دیکھا۔ شہزادے نے کہا:۔

"میں نے آج مشاہدہ اور تجربہ سے پا لیا ہے کہ زندگی اور زندگی کی ہوس ایک دائمی رنج پیدا کرتی ہے میں نے دیکھ لیا ہے کہ بڑھاپا۔ بڑھاپے کی کمزوری اور موت ہر جگہ ہے۔ اور یہ ہماری ہی وجہ سے ہے کہ ایک معصوم پھول کو دکھ اور پاپ ہوتا ہے۔ دنیا کی کوئی طاقت ہمیں کیا بر ہما دیوتا کو بھی موت سے نجات نہیں دلوا سکتی۔ موت کا قانون اٹل ہے اس لئے......"

"ہش" لڑکی نے بات کاٹتے ہوئے کہا "مگر راہولا کو کیوں زندہ نہیں رہنا چاہیئے؟"

"نجات، اپنی نجات کے لئے" سدھارا نے جھک کر اُس کے کان میں کہا

"لیکن جب موت زندگی کی انتہا ہے تو پھر کیوں نہ اسے اس وقت تک زندہ رہنے دیا جائے"

یسودھارا نے التجا کرتے ہوئے کہا

"زندگی آخر زوال پذیر ہے"

"میرے باپ نے مجھے دنیا سے دور رکھنے میں بڑی بھاری غلطی کی۔ یہ ناممکن تھا کہ میں دنیا کے تغیرات کا مشاہدہ نہ کرتا۔ مجھے آخر حقیقت معلوم ہو گئی۔ اب ہمیں اس بچہ کو ان تکالیف سے دور رکھنا لازمی ہے"

"میرے سرتاج اگرچہ مجھے آپ کے حکم کی تعمیل میں عذر نہیں مگر ذرا ٹھہریئے اسقدر عجلت سے کام نہ لیجئے

اور مجھے اجازت دیجئے کہ میں تین دن کے اندر اس معمہ کو حل کردوں اور پھر اگر میں کامیاب ہوجاؤں تو بچہ کو زندہ رہنے دیجئے "۔

تھوڑی دیر سوچنے کے بعد سدھارتا نے اُسے تین دن کی مہلت دی۔ تیسرے دن شہزادہ یسودھارا کے پاس آیا اور معصوم کے چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے بولا

" پھر؟ "

" کیا آپ نے نہ کہا تھا کہ زندگی اور زندگی کی ہوس دائمی رنج پیدا کرتی ہے۔ مگر یہ آپ کو کس طرح معلوم ہوا کہ رنج بجائے خود ایک تکلیف دہ چیز ہے۔ جب راہولا پیدا ہوا تو مجھے بیحد تکلیف رہی اور ابھی تک وہ تکلیف رفع نہیں ہوئی کہ دوسری آیا چاہتی ہے دنیا میں کئی ایسے ہیں جنہوں نے زیست کا نصب العین محبت قرار دے رکھا ہے۔ اگر محبت کے معنے یہی ہیں تو یہ ایک اور غلطی ہے۔ فرمایئے اس قدر کھلی حقیقت کی کیونکر تردید ہوسکتی ہے۔

" یسودھارا " شہزادے نے جواب دیتے ہوئے کہا " تمہارے الفاظ مطلب سے خالی ہیں۔ تم نے جو کچھ بھی کہا ہے یہ ہماری مساعی کوششوں کے بالکل برعکس ہے جس کی ہم جدوجہد میں ہیں۔ ہر چیز جو ہماری نظر سے گذرتی ہے اُس میں کئی تبدیلیاں پیدا ہوتی ہیں اور اگر یہ نہ ہو تو دنیا قائم نہیں رہ سکتی۔ اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ دنیا کی یہ تبدیلیاں بھی ایک بڑی مصیبت ہیں "۔

" اچھا تو مجھے پھر دو موقعے دیئے جائیں " لڑکی نے التجا کرتے ہوئے کہا

بڑی مشکل۔ شہزادے نے مان لیا۔ دوسرے دن اُس کے سوال کرنے سے پہلے ہی وہ بحث کرنے لگی۔

" سنو! اسے بارہ برس تک زندہ رہنے دو تاکہ وہ کچھ سمجھنے کے قابل ہولے اور پھر آپ کو اس کا جواب دے سکے "۔

شہزادے کی بھویں سکڑنے لگیں

" تم ایک عورت کی طرح بحث کرتی ہو اور ہر ایک چیز کو غلط سمجھتی ہو۔ اگر بچہ کو زیادہ عرصہ تک زندہ رہنے دیا جائے تو اس کی زندگی کی ہوس اور زیادہ ہوجائیگی اور یہی ایک بدی ہے۔ زندہ رہنے کی ہوس اس پر اپنا غلبہ پالیگی۔ نہیں یسودھارا تمہارے الفاظ مجھے قائل نہیں کرسکے "۔

تیسرے دن راہولا کی موت کی گھڑیاں گنتے گنتے کسی خیال سے یسودھارا کو ذرا تسکین ہوئی اور وہ سدھارتا کا انتظار کرنے لگی اور جونہی وہ کمرے میں

داخل ہوا بول اُٹھی

میرے سرتاج! آپ کہتے ہیں دنیا کی ہر ایک چیز فانی ہے۔ زندگی کی ہر ایک ساعت، ہر ایک گھڑی، موت کا پیغام لاتی ہے۔ دنیا فانی ہے اور اس کی ابتدا و انتہا نامعلوم، یہ درست ہے اور بجا۔ مجھے آپ کی صداقت پر کامل یقین ہے۔ مگر کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ حقیقت کس چیز کا نام ہے؟ آپ کہتے ہیں کہ دنیا میں ہمیشہ تبدیلیاں ہوتی رہتی ہیں۔ کیا آپ کے بعد جو پیدا ہوگا وہ بھی آپ ہی کا ہم خیال ہوگا؟ فرض کیا، اگر وہ کہے کہ زندگی کی ہر ایک ساعت، ہر ایک گھڑی اپنے ساتھ نئی پیدائش، درختوں اور پھولوں میں نئی روح لاتی ہے جو آپ کے عقیدہ کے بالکل برعکس ہے کیونکہ ہر ایک انسان کا نقطۂ نظر مختلف رہا ہے۔ اور یہی خیال اس بچہ کا ہو تو پھر؟ آپ کے الفاظ ہمیشہ قائم نہیں رہ سکتے۔ کیونکہ تبدیلیاں لازمی ہیں اور جب ہر ایک چیز فانی ہے تو آپ ہی بتایئے کہ کیا آپ کے الفاظ ہمیشہ قائم رہ سکیں گے۔

جب وہ اپنی تقریر ختم کر چکی تو اُس کی آنکھیں چمکنے لگیں کیونکہ اُس نے اپنی تمام عقل اس میں لگا دی تھی۔ شہزادہ کوئی جواب نہ دے سکا۔ یسودھارا کو کچھ امید بندھ گئی۔

"یسودھارا۔۔۔!" شہزادے نے اس پر نظر جماتے ہوئے کہا "تم نے بیشک مجھے اپنے دلائل سے قائل کر دیا ہے مگر تمہارے الفاظ میری حقیقت کے مقابلہ میں ہیچ ہیں۔ آج تم نے اپنی حکمت عملی سے مجھے مغلوب کر لیا ہے۔ مگر کل میرے الفاظ کی صداقت دنیا میں ایک شورش برپا کر دیگی اور دنیا اس غلط راستے سے صراطِ مستقیم پر آجاویگی۔ یہ کہتے ہوئے اُس نے یسودھارا کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیکر کہا "راہولا اب زندہ رہے گا"

لڑکی نے فرطِ مسرت سے دونوں باہیں شہزادے کے گلے میں ڈال دیں مگر اُس نے آہستہ علیحدہ کر کے کرسی پر بٹھا دیا اور کمرے سے باہر نکل آیا۔

رات کو آدھی رات کے وقت جب کائنات محوِ خواب تھی۔ وہ اُٹھا۔ ایک نظر یشودھارا پر ڈالی جو بچے کو گلے سے لگائے نیند کے مزے لے رہی تھی۔ اُس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے اور چُپ چاپ دونوں کو الوداع کہتے ہوئے محل سے رخصت ہوگیا۔ دوسرے دن طلوعِ آفتاب کے وقت دو آدمی ریاست سے جاتے ہوئے دکھائی دے رہے تھے اُن میں سے ایک کا نام بڈھے پروہت نے کہا گوتم بدھ تھا۔ جس نے دنیا کی تبدیلیوں میں حقیقت اور صداقت کی ایک نئی روح پھونکی ہے۔ (ترجمہ)

افتخار الرسول بدر

جذبات افسر

برسات کے یہ دو چار ستارے شام سے سوئے جاتے ہیں
جھینگر کی دھیمی آوازوں میں نیند کے جھونکے آتے ہیں

جب دل پہ نہ ہو قابو اپنا کیا ضبط کریں کیا صبر کریں
مجھ جیسے کاش وہ ہوآکر سمجھاتے ہیں

دل غم سے بیٹھا جاتا ہے کیا حال کہوں ہمدردوں سے
لکنت سی زباں میں ہوتی ہے جب پوچھنے والے آتے ہیں

کس درجہ شوخ طبیعت ہیں یہ عشق و محبت والے بھی
برسات کی تنہا راتوں میں گاگا کر دل بہلاتے ہیں

ہم جس کو موت سمجھتے ہیں پیغام حیات جدید ہے وہ
یہ پھول چمن میں جھڑتے ہیں پھر کھلنے کو مرجھاتے ہیں

دو شخص جب ایسے ملتے ہیں آپس میں جن کو محبت ہو
خاموشی طاری ہوتی ہے لب کھل کھل کر رہ جاتے ہیں

ہے حسن کی دنیا بھی افسر محروم سکوں کی نعمت سے
دل دھک دھک کرنے لگتا ہے جب سامنے وہ آجاتے ہیں

حامداللہ افسر

غیر فانی احساس

اے گذشتہ زمانے، اے گذرے ہوئے دورِ زریں میں تجھے نہیں بھولا میری تنہائیاں اور میری صحبتیں تیری یاد سے معمور ہیں۔ اس وقت جبکہ میں محوِ سکوت، اور زمانہ کی کشمکش سے آسودہ ہوں میری فضائے حیات میں تیری یاد کے ہزار نغمے ترنم ریز ہیں۔ میری صدائے شوق کی امواج حزیں صرف تیرے کانوں پہ ٹکراتی ہیں، اُن کا ارتعاشِ پیہم صرف تیرے لئے ہے کیونکہ تیری ہی ذات اُن کا مرجع ہے، اور میری حیاتِ غم آشنا کا تنہا مرکز۔

اگر میں تیری یاد نہ کروں تو میں اس یاد نہ کرنے پر قدرت نہیں رکھتا۔ میری آنکھوں کے سامنے ہر وقت تیری آنکھیں پھرتی رہتی ہیں۔ میری حیاتِ فانی میں تیری یاد کی غیر فانی طاقت موجود ہے اور تیرے خیال کی محویت اس یاد کے استمرار و دوام کا سلسلہ بڑھاتی رہتی ہے۔ کائنات کا حسن تیرے جمال کے انعکاس سے پیدا ہوتا ہے، اور ستاروں کی گردش تیری گردشِ چشم کی تقلید ہے،

(ماخوذ از ترکی) ابوالمحاسن محمود علی خاں

"صحبت کا اثر"

اُردو زبان پر

یہ امر مسلمہ ہے کہ زبان کی اشاعت وترقی اہل زبان کے ذریعہ سے ہوتی ہے۔ جوں جوں کسی مُلک کے لوگ علوم وفنون میں ترقی کرتے جاتے ہیں ان کی زبان وسیع اور ادب سے مالامال ہوتی جاتی ہے۔ اشاعتِ زبان کے بڑے ذرائع اخبارات ورسائل اور کتابیں ہیں لیکن ان کے علاوہ بعض اور بھی اسباب ہیں۔ جو بالواسطہ زبان کی نشر واشاعت میں معاون ہوتے ہیں۔ اُردو کے خیرخواہوں کو ریلوے کمپنیوں کا ممنون ہونا چاہیئے کہ ان کی ریلوں نے تجارتی مال کی باربرداری کے ساتھ اُردو زبان کی حمل ونقل بھی اپنے ذمہ لے لی ہے۔ اگرچہ یہ اُردو بگڑی ہوئی اُردو ہے۔ مگر مُلک میں اس سرے سے اُس سرے تک ریلوے اسٹیشنوں پر بولی جاتی ہے۔ بہار، ممالک متوسط، سندھ، گجرات، مہاراشٹر، بمبئی غرض بیشتر حصہ مُلک کی ریل گاڑیوں میں جب دو مسافر آپس میں بات کرتے ہیں تو عموماً اُردو میں بولتے ہیں۔ ہر شخص اپنے مخاطب کو اُردو داں فرض کرلیتا ہے۔ اگرچہ ان موقعوں پر بعض اوقات طرح طرح کے دلچسپ اور انوکھے فقرے سُننے میں آتے ہیں مگر لوگ اپنی بساط کے موافق اسی زبان میں گفتگو کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

انگریزی ادب نے ہماری زبان کو جسقدر فائدہ پہُنچایا ہے وہ اہلِ نظر سے پوشیدہ نہیں لیکن انگریزوں نے دانستہ یا نادانستہ اُردو کی جو خدمت کی ہے۔ اس کا نتیجہ وہ زبان ہے جو ان کے اردلیوں اور بہروں میں رائج ہے۔ اس فرقہ کے لوگ اول تو تعداد میں کم ہیں۔ دوسرے ان کو ارتباط واختلاط کے موقعے کم ملتے ہیں۔ اس لئے اُن کی زبان کم سُننے میں آتی ہے۔ لیکن انگریزوں کی اُردو حدودِ ریلوے میں خوب حکومت کرتی ہے۔ ریلوے ملازم تعداد میں لاکھوں ہیں۔ اور سب ایک رشتہ ارتباط میں جکڑے ہُوئے ہیں۔ ان کی ایک خاص زبان ہوگئی ہے جس کو ہم "ریل کی اُردو" کہہ سکتے ہیں۔ اس وقت ہماری غرض اس معجون مرکب سے ہے۔ جس سے تقریباً ہر شخص کو واسطہ پڑتا ہے۔ اس زبان کی خصوصیت یہ ہے کہ اس کی قواعد وترکیب مُلکی اختلاف السنہ کے باوجود ہر جگہ تار کے کھمبوں کی طرح ایک ہی سانچہ میں ڈھلی ہُوئی ہے۔ قلی اور خلاصیوں سے لیکر ڈرائیور، گارڈ، ٹکٹ کلکٹر، چیکر اور اسٹیشن ماسٹر تک خواہ وہ ہندوستانی

یا تیم ہندوستانی یا انگریز ہو سب ایک ہی اُستاد کے شاگرد
معلوم ہوتے ہیں۔ "گاڑی چھوڑ دیا" "سیٹی ہوگیا"
"اے! جلدی کرو گاڑی جاتا ہے" "تم کہاں جائیگا"
وہ عام جملے ہیں جو چند گھنٹہ کے سفر کے بعد مسافر کے کانوں
میں بس جاتے ہیں۔ اور اس وقت ہماری حیرت
کی کوئی انتہا نہیں رہتی جبکہ ہم دہلی، لکھنؤ اور ان کے
درمیانی اسٹیشنوں پر بھی یہی ڈھلے ہوئے جملے سنتے ہیں
حالانکہ اس خطہ میں اکثر بابو، قلی اور دیگر ملازم اُن شہروں
کے باشندے ہوتے ہیں جن کی زبان ٹھیٹ اُردو ہے

یہ "ریل کی اُردو" صرف ملازمان ریل تک
محدود نہ رہی بلکہ مرض متعدی کی طرح اپنے جراثیم پھیلانے
لگی۔ اور سب سے پہلے ان لوگوں کو متاثر کیا۔ جو ان کے
زیادہ قریب تھے۔ ہم متھرا کے اسٹیشن پر یہ آواز سنتے
ہیں۔ "متھرا کا پیڑا" اس موقع پر "پیڑا" کو جمع کے صیغہ
میں استعمال کرنا چاہیئے۔ آگرہ کے پلیٹ فارم پر مٹھائی فروش
آواز لگاتا ہے۔ "آگرہ کا میٹھے کا مٹھائی" برج کی نواح
میں یہ جملہ سُن کر ہم سے ضبط نہ ہوسکا۔ اور مٹھائی فروش کو
اس کی غلطی سے آگاہ کیا مگر وہ ہنس کر چل دیا۔ اور پھر وہی
"آگرہ کا میٹھے کا مٹھائی" الاپنے لگا۔ گویا مٹھائی کی تذکیر
سے اس کی بکری پر کوئی خاص اثر پڑتا تھا معلوم نہیں
کہ اس زبان میں ایسی کونسی گھلاوٹ ہے جس کے اثر سے
ریل کے مسافر بھی نہیں بچ سکے۔ اکثر مسافر جتنی دیر
ریل میں بیٹھتے ہیں۔ وہ "کمپنی بہادر" کی زبان بولتے
ہیں۔ ان کا مخاطب ہندوستانی گارڈ، ٹکٹ کلکٹر یا چیکر
کوئی ہو سب سے انگریزی میں بات کرتے ہیں۔ اور اگر
ریل کے ادنٰے ملازم یا قلی وغیرہ سے بولنے کی ضرورت
پڑے تو وہی "ریل بھاشا" استعمال کرتے ہیں ہم نے
اچھے خاصے پڑھے لکھے اُردو داں حضرات کی زبان
سے بارہا یہ جملے سُنے ہیں۔ "اے پانی والا!" "چاے
والا!" "ادھر آؤ!" یہی بزرگ جب ریل سے اُتر کر اپنے
مکان پر جاتے ہیں تو "برف والے" یا "آم والے"
کہہ کر پکارتے ہیں۔ طلسم ہوش ربا اور بوستان خیال
میں بعض طلسم اس قسم کے ہیں۔ ہمیں اندیشہ ہے کہ یہ "ریل
کی اُردو" انگریزی فتوحات کی طرح کہیں ریلوے کی حدود
سے آگے نہ بڑھنے لگے۔

اس میں شک نہیں کہ ریل نے زبان اُردو کی
اشاعت میں کچھ نہ کچھ مدد ضرور کی ہے۔ لیکن جو اسباب
کسی چیز کی ترقی میں معاون ہوتے ہیں وہی بعض اوقات
موجب زوال بن جاتے ہیں۔ تاہم اگر انصاف سے دیکھا
جائے تو اس کے ذمہ دار انگریز یا ان کے انجن اور
ریل گاڑیاں نہیں ہیں بلکہ ہمارے ریل کے بابو ہیں۔ یہ
بابو صاحبان تھوڑے بہت لکھے پڑھے ہوتے ہیں

تعداد کے لحاظ سے ریلوے ملازموں میں ان کا عنصر غالب ہے۔ یہ طبقہ انگریزی بولنے کا بہت دلدادہ ہوتا ہے۔ اُردو یا دوسری مُلکی زبانوں سے اس کو ایک قسم کی مغائرت اور نفرت ہوتی ہے۔ اگر یہ حضرات انگریزی کی بجائے ہندوستانی زبان کو مُلکی زبان سمجھ لیں تو "ریل کی اُردو" کا سارا بانکپن جاتا رہے۔ کیونکہ قلیوں یا دیگر ادنےٰ ملازموں کا تعلق زیادہ تر انہی بابو صاحبان سے ہوتا ہے صرف یُورپین ملازم باقی رہے۔ ان کا حلقہ اثر صرف ریلوے کی حدود کے اندر محدود ہے۔ اور اگر ہندستانی بابو لوگ اُس کی توسیع میں مدد و معاون نہ ہوں تو وہیں تک محدود رہے۔

ہمارے خیال میں اس زبان کا جنم بھوم بمبئی ہے۔ اس شہر کی بڑی زبانیں انگریزی، گجراتی اور مرہٹی ہیں لیکن انگریزی کے علاوہ اُردو (اگر یہ اُردو کہی جا سکتی ہے) کم و بیش یہاں کا ہر شخص سمجھتا ہے۔ "بمبئی کی اُردو" صورت شکل اور طرح و ترکیب میں "ریل کی اُردو" کی بہن ہی معلوم ہوتی ہے۔ ہمیں یہاں اس نئی زبان کی پیدائش اشاعت کے اسباب و علل سے بحث نہیں لیکن اب یہ زبان اپنے ننھے سے جزیرہ نما سے نکل کر گردو نواح میں قدم جما رہی ہے۔ پونا، احمد نگر، ناسک اور اورنگ آباد دکن کے ہوٹلوں اور بازاروں میں اس کا سکہ رائج ہو گیا ہے۔ شاید ناظرین کو یہ سُنکر تعجب ہوگا کہ یہ زبان صرف انہی اضلاع تک محدود نہیں۔ بلکہ دہلی تک دھاوے مار رہی ہے۔ دہلی کے پچاس فیصدی باشندے ٹریم کار کو ٹھہرانے کے لئے ایک نہایت ہی بھونڈا لفظ "باندھ لے" استعمال کرتے ہیں۔ اسی طرح ٹریموے کے ملازم (جن میں بعض مقامی باشندے بھی شامل ہیں) "گاڑی چالو ہو گئی" کہتے ہیں۔ ہوٹلوں میں چائے کی پیالی کی جگہ عوام کی زبان پر "کوپ" چڑھ گیا ہے ہم نہیں کہہ سکتے کہ یہ لفظ "کوپ" کہاں تک قبول کرنے کے لائق ہے۔ مگر اب سے دس بارہ سال پیشتر وہاں اس کا وجود نہ تھا۔ تحقیق کرنے سے معلوم ہُوا کہ "باندھ کے" "چالو" "کوپ" اور اسی قبیل کے بعض اور ٹکسال باہر لفظ بمبئی سے وہاں پہنچے ہیں اور اس قدیم راجدھانی میں سرعت کے ساتھ شرف قبول حاصل کر رہے ہیں۔ جہاں ہر شخص عام اس سے کہ وہ تعلیم یافتہ ہو یا جاہل مطلق نئے الفاظ وضع کرنے اور غیر الفاظ کو اُردو بنانے کی صلاحیت رکھتا ہے۔

بمبئی کے تجارتی الفاظ اور کارخانوں کی اصطلاحیں ریل میں بیٹھ کر مُلک کے بڑے بڑے شہروں میں گشت لگاتی ہیں۔ اور وہاں کارخانوں، ہوٹلوں، سنیما اور تھیٹریکل کمپنیوں کے ذریعہ عوام کی زبان میں داخل ہوتی ہیں۔

ہمارا قیاس ہے کہ اب سے دس سال بعد شمالی شہروں کے بازاروں میں بھی کا یہ مال عام ہو جائیگا۔ اور یہ ایک بے پناہ سیلاب ہے جس کا روکنا محبانِ اردو کے لئے دشوار ہے۔

غلام ربانی

گریۂ بے اختیار

(۱)

یہ کون رو رہا ہے لپٹ کر مزار سے — مضطر ہے رُوح گریۂ بے اختیار سے
شبنم کے اشک، سبزے کی غفلت، گلوں کے داغ — کیا کیا نہ لے چلا چمنِ روزگار سے
اے نالہائے نیم شبی حشر زا نہ ہو — میں ڈر رہا ہوں صبحِ شبِ انتظار سے
عبرت ہے ہم کو دفترِ ہستی کا ہر ورق — پردہ فنا کا اُٹھتا ہے نقش و نگار سے

ثاقب ہمیں ہیں حسرت و حرماں کی یادگار
زندہ ہے نامِ عشق دلِ بیقرار سے

(۲)

کہتے ہیں جام دل کی طرح ٹوٹ ٹوٹ کے — کچھ ذوقِ میکشی نہ رہا اُن سے چھوٹ کے
دامن چھڑا کے ہاتھ سے، جاتے ہو تم کہاں — مجھ کو تباہ کر کے مرے دل کو لوٹ کے
کس طرح ضبطِ غم ہو کہ میری متاعِ صبر — لیجائے ان کی شوخ نظر لوٹ لوٹ کے
وعدہ کیا تھا ہم سے گئے اور ہی کہیں — کیا سچ ہے یہ مثل کہ "نہیں پاؤں جھوٹ کے"
ذرّے ہیں لالہ گوں، شفق آلودہ ہے زمیں — چھالے بہے ہیں دشت میں یوں پھوٹ پھوٹ کے
کچھ درد ہی کے دم سے تھا اس زندگی کا لطف — راحت ملی نہ پھر مجھے اس غم سے چھوٹ کے

ثاقب ہے اور بادیۂ معرفت کی سیر
آزاد ہے وہ قیدِ علائق سے چھوٹ کے

سیّد ابو محمد ثاقب

دیوانہ بزعم خویش ہشیار

مَیں نے مانا کہ مَیں اُس وقت گھبرایا ہوا تھا' بے حد گھبرایا ہوا تھا۔ اور اب بھی ہوں۔ مگر لوگ مجھے دیوانہ کیوں کہتے ہیں؟ میرے ہوش و حواس مجھے جواب نہ دے چکے تھے۔ جواب دینا کیا معنی؟ وہ پہلے سے زیادہ کام کر رہے تھے۔ جسے میری بیماری کہا جاتا ہے۔ وہ صحت کی علامت تھی۔ اُس نے میرے حواس کو مُردہ نہ کیا تھا' بلکہ اُن میں نئی جان ڈال دی تھی۔ اور تو اور' میری قوتِ سامعہ بلا کی تیز ہو گئی تھی۔ زمین و آسمان اور دُنیا بھر کی صدائیں میرے کانوں میں گونج رہی تھیں۔ پھر مَیں دیوانہ کیونکر ہُوا؟ ذرا گوشِ ہوش سے سُنو۔ کہ مَیں کس صحت و درستی کس سکون و اطمینان سے ساری کہانی لفظ بہ لفظ بیان کر سکتا ہوں۔ اور پھر اندازہ کرو کہ مَیں دیوانہ ہوں یا فرزانہ۔

مَیں یہ نہیں کہہ سکتا کہ یہ خیال اوّل اوّل مجھے کیونکر آیا۔ لیکن جب وہ ایک بار میرے ذہن میں سما گیا تو اُس کا نکلنا محال تھا۔ مَیں نے جو کچھ کیا' نہیں جانتا کیوں کیا' کس لئے کیا۔ باعث پوچھو تو نا معلوم' مدعا کہو تو اُس کا نام و نشان نہیں۔ بُوڑھے سے مجھے دلی اُلفت تھی۔ اُس نے کبھی مجھ سے بُرائی نہ کی تھی۔ اُس نے کبھی مجھے ناخوش نہ کیا تھا۔ اُس کی دولت کی مجھے ہوس نہ تھی جہاں تک میرا خیال ہے اسکی آنکھیں — ہاں اسکی آنکھیں جو کچھ تھیں وہی تھیں۔ مَیں کیا کہوں اُس کی آنکھیں کیسی تھیں؟ ایک گدھ کی سی آنکھیں ہلکے نیلے رنگ کی آنکھیں جن پر ایک جھلّی سی چھائی ہُوئی تھی۔ جب اُس کی آنکھیں میری آنکھوں سے چار ہوتیں' تو میرا خُون خُشک ہو جاتا۔ اس لئے مَیں نے ارادہ کر لیا' اور میرا یہ ارادہ روز بروز زیادہ راسخ ہوتا گیا' کہ اُس کی زندگی کا خاتمہ کر دُوں۔ تاکہ وہ آنکھیں پھر کبھی مجھے دکھائی نہ دیں۔

تم سمجھے ہُوئے ہو کہ مَیں دیوانہ ہوں۔ میں یہ کہتا ہوں کہ دیوانوں کو کسی بات کی خبر نہیں ہوتی' اور میری یہ حالت نہیں۔ کاش تم نے دیکھا ہوتا کہ مَیں کس طرح پُھونک پُھونک کر قدم رکھتا تھا۔ کس طرح اونچ نیچ کو دیکھ بھال کر' بُرے بھلے کو سوچ سمجھ کر مَیں اپنا کام کرتا تھا۔ تم نے میری حکمت عملی' میری مصلحت اندیشی دیکھی ہی نہیں۔ تم دیکھتے تو کہتے۔ جس ہفتے مَیں اُس کا قصّہ پاک کرتا ہوں' اُس ہفتے مَیں نے اُس کے ساتھ پہلے سے بڑھ چڑھ کر مہربانی کا سلوک کیا۔ اور آدھی رات گئے

میں اُس کے کمرے کا دروازہ کھولتا تھا۔ چپکے سے، آہستہ سے، کہ کسی کو کانوں کان خبر نہ ہو۔ اور پھر جب دروازہ اتنا کھل جاتا کہ میرا سر بآسانی گزر سکتا، تو میں ایک مدھم، بالکل مدھم لالٹین کمرے میں داخل کرتا، اور اس کے بعد اپنا سر دروازے میں سے گزارتا۔ تم اگر دیکھتے کہ میں کس ہوشیاری اور چالاکی سے یہ سب کام کرتا تھا تو تم مجھے بہت داد دیتے۔ میں اپنے سر کو آہستہ، نہایت آہستہ جنبش دیتا تھا، کہ کہیں بوڑھا آہٹ پاکر جاگ نہ اُٹھے ایک گھنٹے کے عرصے میں کہیں جاکر میں اپنا سر بمشکل اتنا آگے لے جاتا تھا کہ بوڑھے کو بستر پر لیٹا ہوا دیکھ سکوں۔ تمہیں کہو، کیا کوئی دیوانہ اتنا دانا ہو سکتا ہے!

پھر جب میں اپنا سر پورے طور پر کمرے میں لیجا چکتا، تو میں لالٹین کی بتی کو اکساتا، بیحد احتیاط سے، کیونکہ مجھے خوف تھا کہ کہیں وہ اس کی آواز نہ سُن پائے اور میں بتّی کو صرف اس قدر اکساتا کہ ایک ننھی سی کرن اُسکی ڈراؤنی آنکھوں پر پڑتی۔ اور یہ سب کچھ میں نے لگاتار سات راتوں تک کیا۔ مگر ہر بار بوڑھے کی آنکھیں بند ہوتی تھیں، اور اس لئے میں اپنا کام انجام نہ دے سکتا تھا۔ کیونکہ بوڑھے سے مجھے کچھ دشمنی نہ تھی۔ دشمنی تھی تو اُس کی آنکھوں سے تھی۔ اور ہر روز علی الصباح میں بے دھڑک اس کے کمرے میں چلا جاتا، اور بڑی جرأت و دلیری سے اُس سے باتیں کرتا، اور ایک بے تکلف لہجے میں اُس کا نام لے لیکر اُس سے پوچھتا کہ رات کیسی گزری؟ اب تم سمجھے کہ اس میں میں نے کیا مصلحت مضمر رکھی تھی؟ کوئی بہت ہی دانا بینا آدمی ہوتا جو میرے رویّہ سے بھانپ لیتا کہ میں بلا ناغہ، جب آدھی رات ادھر ہوتی تھی اور آدھی اُدھر، چوری چھپے اُس کے کمرے میں جاکر اُس کو سوتے دیکھا کرتا تھا۔

جب آٹھویں رات آئی تو میں نے پہلے سے زیادہ خرم و احتیاط سے کام لیا۔ گھڑی کی سُوئی مجھ سے زیادہ تیزی سے حرکت کرتی ہوگی۔ اُس رات سے پہلے مجھے کبھی اپنی قوت، اپنی عقلمندی کا کامل احساس نہ ہوا تھا۔ کامیابی کی امید سے مجھے جو خوشی ہو رہی تھی وہ میرے ضبط کئے ضبط نہ ہوتی تھی۔ ذرا سوچو تو سہی کہ میں ادھر آہستہ آہستہ دروازہ کھول رہا ہوں۔ اور اُدھر اُس کے فرشتوں کو بھی اس بات کی خبر نہیں کہ میرے دل میں کیا ہے اور میں کیا کیا چاہتا ہوں! اس سے مجھے خوشی کیونکر نہ ہوتی؟ ہاں خوشی کے مارے میری باچھیں کھلی جاتی تھیں، اور شاید اُس نے میری ہنسی سُن بھی لی تھی۔ کیونکہ اُس نے بستر پر یکایک کروٹ لی۔ گویا چونک گیا ہے۔ تم سمجھتے ہوگے کہ میں ڈر کر پیچھے ہٹ گیا! نہیں، ہرگز نہیں، مجھے ڈر کس بات کا تھا؟ اُس کے کمرے میں

ایسا گھپ اندھیرا تھا کہ ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہ دیتا تھا (کیونکہ اُس نے چوروں کے خوف سے کھڑکیاں سب بند کر رکھی تھیں) اور اس لئے مجھے یقین تھا کہ وہ دروازے کو کھلتے نہیں دیکھ سکیگا۔ چنانچہ مَیں بیخوف و خطر اپنے کام میں لگا رہا۔

مَیں اپنا سر کمرے میں داخل کر چکا تھا۔ اور بتّی کو ٹمٹمانے والا تھا کہ میرا ہاتھ دروازے کی چٹکنی پر سے پھسل گیا۔ ایک آن میں بُوڑھا چونک کر اُٹھ بیٹھا۔ اور پکارنے لگا۔ "کون ہے ؟ کون ہے ؟"

مَیں چُپکا رہا اور اپنی جگہ سے نہ ہلا۔ پورے ایک گھنٹے تک مَیں نے ذرّہ برابر جنبش نہ کی۔ اور اس درمیان میں، مَیں نے بوڑھے کے بستر پر لیٹ جانے کی آواز نہ سُنی۔ وہ اب تک چوکنّا ہو کر بستر پر بیٹھا ہُوا تھا جس طرح میں راتوں کو اُٹھ کر اپنے بستر پر بیٹھ جاتا ہوں، اور رات بھر موت کی گھڑیاں گنا کرتا ہوں۔ کچھ عرصہ گزرا تھا کہ ایک چیخ کی آواز میرے کان میں آئی۔ مجھے معلوم تھا کہ یہ آواز کیا معنی رکھتی ہے۔ یہ آواز شدّتِ درد یا انتہائے غم کی آواز نہ تھی۔ یہ وہ دھیمی بھرّائی ہُوئی آواز تھی جو اس وقت رُوح کی گہرائیوں سے نکلتی ہے۔ جب رُوح خوف کے شکنجے میں جکڑ جاتی ہے۔ مَیں اس آواز سے خوب واقف تھا۔ اکثر آدھی رات کے وقت جب ساری دُنیا محوِ خواب ہوتی ہے، یہ آواز خود میرے سینے سے گونج کر اُٹھتی ہے اور رات کے سناٹے میں اسکی غیر فطری گونج نے میرے ہول و ہراس کو دو بالا کر دیا ہے۔ ہاں، مَیں اس سے خوب واقف تھا۔ مَیں جانتا تھا کہ اس وقت بوڑھے کے دل پر کیا گزر رہی ہے۔ اور مجھے اُس کی حالت پر رحم آگیا اگرچہ مَیں دل ہی دل میں خوش ہو رہا تھا۔ جب سے وہ چونک کر اُٹھا تھا۔ اُس وقت سے اب تک وہ ہلا جلا نہ تھا اُس کا خوف لمحہ بہ لمحہ بڑھتا جاتا ہوگا۔ وہ اپنے خوف کو بیوجہ قرار دینے کی کوشش کر رہا ہوگا۔ مگر اُس کا دل نہ مانتا ہوگا وہ ضرور سوچتا ہوگا :۔ "کچھ بھی نہیں، صرف ہوا کی سرسراہٹ ہے۔ یونہی کوئی چوہا ہوگا۔ یا کوئی جھینگر ہے۔ کہ ایک ہی بار بول کر چپ ہو گیا ہے۔"

وہ ضرور ان باتوں سے اپنے دِل کو تسکین دینے کی کوشش کر رہا ہوگا۔ مگر بے سود، بالکل بے سود۔ کیونکہ قضا اُس کے سر پر کھیل رہی تھی۔ موت کا فرشتہ اُس کی طرف آرہا تھا۔ اور اُس کے پروں کا تاریک سایہ اُس پر پڑ چکا تھا۔ اسی تاریک اور نظر نہ آنے والے سائے کا ہولناک اثر تھا جس نے اُسے میری موجودگی محسوس کرادی حالانکہ وہ اس قدر حواس باختہ ہو گیا تھا کہ نہ کچھ دیکھ رہا تھا نہ سُن رہا تھا۔

جب مجھے صبر و سکون سے انتظار کرتے ہُوئے بہت وقت گزر گیا، تو مَیں نے ارادہ کیا کہ کمرے میں ذرا

روشنی کر دوں۔ چنانچہ میں نے بتی کو اکسانا شروع کیا۔ تم اندازہ نہیں کر سکتے کہ کس آہستگی سے ___ یہاں تک کہ ایک ننھی سی کرن، تارِ عنکبوت سے باریک تر، چمک کر اس کی گھناؤنی ڈراونی آنکھوں پر پڑی۔

اُس کی آنکھیں کھلی تھیں، خوب کھلی تھیں، اور ان کو دیکھ کر میرے غصے کی کچھ انتہا نہ رہی۔ وہ مجھے اچھی طرح دکھائی دے رہی تھیں۔ وہی بد نما نیلا نیلا رنگ، وہی خوفناک جھلی جس کو دیکھ کر میری روح کانپ اٹھی۔ اس کا چہرہ یا اس کے جسم کا اور کوئی حصہ مجھے نہ نظر آ رہا تھا، کیونکہ میں نے قدرتی طور پر روشنی کی کرن عین اس کی آنکھوں پر ڈال دی تھی۔

میں کہہ چکا ہوں کہ جسے تم غلطی سے میری دیوانگی تصور کئے ہوتے ہو۔ وہ دراصل میرے حواس کی غیر معمولی ذکاوت ہے۔ اور اس کے سوا کچھ بھی نہیں۔ میرے اس قول کی سچائی میں کچھ شک نہیں ہو سکتا۔ اور میں تمہیں بتائے دیتا ہوں۔ کہ کیوں نہیں ہو سکتا۔ اس وقت میرے کانوں میں ایک ایسی آواز آئی جیسی اگر کسی گھڑی کو روئی میں لپیٹ دو تو اس میں سے آتی ہے۔ میں اس آواز کو بھی خوب پہچانتا تھا۔ یہ آواز بوڑھے کے دل کے دھڑکنے کی آواز تھی۔ اس کو سن کر میرے خون میں ایک جوش پیدا ہوا۔ جس طرح جنگ کے میدان میں ڈھول کی آواز سے دلاوروں کے حوصلے بڑھ جاتے ہیں۔

لیکن اس حالت میں بھی میں اپنے جوش کو دبائے خاموشی سے کھڑا رہا۔ گویا ایک بت تھا، بےحس و حرکت میرے ہاتھ میں لالٹین کو کیا مجال جو ذرا بھی جنبش ہوئی ہو میں یہ آزمانے لگا۔ کہ کتنی دیر تک میں کرن کو اسکی آنکھوں کے نقطۂ انجذاب پر مرکوز رکھ سکتا تھا۔ اس عرصے میں اس کے دل کا بے ہنگم شور بڑھتا گیا۔ وہ لمحہ بہ لمحہ بلند تر اور تیز تر ہوتا جاتا تھا۔ یقیناً اس کا خوف انتہائی درجے پر پہنچ گیا تھا۔ اس کا دل زور زور سے دھک دھک کر رہا تھا۔ تم نے سنا کہ میں کیا کہہ رہا ہوں؟ میں تمہیں بتا چکا ہوں کہ میں بہت ذکی الحس ہوں، اور یہ امر واقعہ ہے آدھی رات کے وقت اس پرانے مکان کی سنسان خاموشی میں، ایک ایسی عجیب و غریب آواز سن کر مجھ پر اک عجیب وحشتناک اثر ہوا۔ تاہم میں کچھ دیر اور طبیعت پر جبر کئے اپنی جگہ قائم رہا۔ لیکن اس دھک دھک نے میری جان کھالی۔ لحظہ بہ لحظہ وہ زیادہ بلند ہوتی جاتی تھی۔ اور اب مجھے ایک تازہ خوف دامنگیر ہوا۔ کہیں کوئی ہمسایہ اس آواز کو نہ سن لے۔ اگر کسی نے ذرا آواز سن لی تو بات بگڑ جائیگی بس، اب بوڑھے کا وقت آ گیا تھا۔ ایک فلک دوز نعرہ کے ساتھ میں اس کی طرف جھپٹا۔ اس نے صرف ایک چیخ ماری۔ صرف ایک چیخ، اور پھر خاموش ہو گیا۔ آنکھ جھپکنے

کی دیر نہ گزری تھی کہ میں نے اسے بستر سے فرش پر گھسیٹ لیا۔ اور بستر اُس پر ڈال دیا۔ پھر میں نے اطمینان کی سانس لی اور یہ دیکھ کر کہ میری کوشش ٹھکانے لگی۔ میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ آ گئی۔ لیکن کئی منٹ تک بوڑھے کا دل بدستور دھڑکتا رہا۔ اُس کی آواز اب وہی آواز تھی۔ جو ایک روئی میں لپٹی ہوئی گھڑی کی ہوتی ہے۔ تاہم اس کا مجھے چنداں خوف نہ تھا۔ کیونکہ گھر کی چار دیواری کے باہر اس آواز کو کوئی نہ سُن سکتا تھا۔ آخرکار یہ آواز بھی خاموش ہو گئی۔ اب بوڑھے میں زندگی کی رمق بھی باقی نہ تھی۔ میں نے بستر کو اُٹھا کر لاش کو بغور دیکھا۔ وہ بالکل ٹھنڈی پڑ چکی تھی۔ پھر میں اُس کے دل پر ہاتھ رکھ کر کافی دیر تک دیکھا کیا لیکن وہاں حرکت کا نام بھی نہ تھا۔ بوڑھے کی زندگی کا خاتمہ ہو چکا تھا۔ میں خوش تھا کہ اس کے بعد اُس کی آنکھیں مجھے کبھی تکلیف نہ دیں گی۔

اگر اب بھی تم اس بات پر اڑے ہوئے ہو کہ میں دیوانہ ہوں تو یہ سُن کر کہ میں نے کیا کیا تدبیریں لاش کے چھپانے کے لئے اختیار کیں تم ضرور اپنی رائے کو تبدیل کرنے پر مجبور ہو جاؤ گے۔ رات گزری جاتی تھی اور میں وقت کی قلت کے خیال سے جلدی جلدی لیکن خاموشی سے اپنے کام میں مصروف تھا۔ سب سے پہلے میں نے لاش کو ٹکڑے ٹکڑے کیا۔ سر الگ، بازو الگ، ٹانگیں الگ

پھر میں نے کمرے کے چوبی فرش پر سے تین تختے ہٹائے۔ اور اُن کے نیچے لاش کے ٹکڑے چھپا دئے پھر میں نے تختوں کو ایسی ہوشیاری اور پرکاری سے اپنی جگہ پر رکھ دیا کہ اور کسی انسان کی آنکھ تو کیا خود اُس بوڑھے کی آنکھ بھی سرِمو فرق نہ دیکھ سکتی تھی۔ دھو نے دھلانے کی کچھ ضرورت نہ تھی۔ کیونکہ خون کی چھینٹ تک کہیں نہ پڑی تھی۔ میں ایسا عقل کا دشمن نہ تھا کہ کوئی داغ کہیں لگنے دیتا۔ میں نے پہلے ہی سے ایک برتن تیار کر رکھا تھا کہ خون کا قطرہ بھی زمین پر نہ پڑنے پائے۔

میں جب اس کام دھندے سے فارغ ہوا۔ تو چار بجے تھے۔ لیکن اب تک ہر طرف اندھیرا تھا۔ ابھی گھڑیال بجا تھا کہ باہر کے دروازے پر دستک کی آواز آئی۔ میں نے کسی قسم کے خوف و خدشہ کے بغیر جا کر دروازہ کھولا۔ تین آدمی داخل ہوئے۔ جنہوں نے نہایت شائستہ انداز میں اپنے آپ کو پولیس کے افسر کہہ کر اپنا تعارف کرایا۔ رات کے وقت کسی ہمسائے نے چیخ کی آواز سُنی تھی اُسے شُبہ گزرا، اس لئے اُس نے تھانے میں جا کر اطلاع کر دی۔ اور اب یہ لوگ تفتیش کے لئے آئے تھے۔

میں مُسکرایا۔ آخر مجھے خوف کس بات کا تھا؟ میں نے ان لوگوں کو خوش آمدید کہا۔ چیخ کے متعلق میں نے اُنہیں بتایا کہ میں نے خواب میں ڈر کر چیخ ماری تھی میں نے

بر سبیلِ تذکرہ یہ بھی بتا دیا کہ بوڑھا گھر سے باہر کہیں گیا ہوا تھا۔ رہی تلاشی۔ اُس کی نسبت مَیں نے عرض کیا کہ "آپ کا گھر ہے جہاں چاہیے جائیے۔ اور اچھی طرح دیکھ بھال لیجیے۔" مَیں اُن کو گھر کے ایک ایک حصّے میں لے گیا، اور آخر کار کمرے کی باری آئی۔ وہاں مَیں نے اُن کو بوڑھے کا زر و مال محفوظ دکھا دیا۔ اور مجھ کو اپنی خوبیِ قسمت پر اتنا اعتماد تھا کہ مَیں نے کرسیاں لا کر کمرے میں رکھ دیں۔ اور اُن سے آرام کرنے کی درخواست کی۔ ذرا میری جراٗت دیکھنا کہ مَیں خود اُس جگہ بیٹھا جہاں بوڑھے کی لاش مدفون تھی۔

افسروں کو پورے طور پر تسلی ہو گئی۔ میرے طور طریق نے اُن کے دل سے شک رفع کر دیا۔ میری ہر بات سے سکون اور دلجمعی کا اظہار ہوتا تھا۔ وہ وہاں بیٹھے اِدھر اُدھر کی باتیں کرتے رہے۔ اور مَیں خندہ پیشانی سے گفتگو میں شریک رہا۔ لیکن جب اُن کو بیٹھے ہوئے دیر ہو گئی۔ اور اُنھوں نے اُٹھنے کا نام نہ لیا، تو مجھے یوں محسوس ہونے لگا۔ کہ میرے چہرے کا رنگ اُڑ رہا ہے۔ مجھ پر اُن کا طولِ کلام گراں گزرنے لگا۔ اور مَیں سوچنے لگا کہ "یہ لوگ جاتے کیوں نہیں؟" اُن کی بیزار کن باتوں سے میرے سر میں درد ہونے لگا۔ اور میرے کان بجنے لگے لیکن اب بھی تخفیف تصدیعہ کی امید نے صورت نہ دکھائی۔ میرے کانوں میں ایسا محسوس ہونا شروع ہوا کہ سیٹیاں بج رہی ہیں۔ اور یہ سیٹیاں بلند ہوتی جا رہی ہیں۔ مَیں نے اس احساس کو مٹانے کے لئے زیادہ باتیں کرنا شروع کیں مگر یہ آواز اتنی بلند ہو گئی کہ گویا ڈھول بج رہے ہیں۔ اب مجھے معلوم ہوا کہ یہ میرے کانوں کی سنسناہٹ نہیں کہیں باہر سے آواز آ رہی ہے۔

میں اس سے انکار نہ کروں گا کہ میرے چہرے کی رنگت اُس وقت بالکل زرد پڑ گئی۔ لیکن میری گفتگو میں پہلے سے زیادہ روانی تھی، اور میری آواز پہلے سے زیادہ بلند تھی۔ تاہم ایسا معلوم ہوتا تھا کہ میری آواز کے ساتھ اُس نامعلوم آواز نے شرط باندھی ہے۔ وہ بھی لمحہ بہ لمحہ بلند ہوتی جاتی تھی۔ اور وہ آواز وہی آواز تھی، جو ایک رُوئی میں لپٹی ہوئی گھڑی کی ہوتی ہے۔ میرا دم خشک ہونے لگا۔ مگر افسروں نے اس آواز کو نہ سُنا۔ اب تک نہ سُنا۔ مَیں جوشِ تقریر میں بلند آہنگی سے باتیں کرنے لگا۔ مگر اُس آواز کی بلند آہنگی بھی ترقی کرتی گئی۔ مَیں ذرا ذرا سی باتوں پر گلا پھاڑ پھاڑ کر بحث و تکرار کرنے لگا۔ مگر اس آواز کا بے پناہ ہنگامہ بھی بڑھتا چلا گیا مَیں فرش پر زور زور سے پاؤں مارتا ہوا اِدھر اُدھر جاتا تھا۔ گویا اُن لوگوں کی باتوں سے جوش میں آ گیا ہوں۔ لیکن میرے پاؤں کی دھمک ایسی تھی جیسی نقّار خانے میں طوطی کی آواز۔ مَیں فرطِ مایوسی سے سوچتا تھا یا الٰہی

اب کیا کروں؟ میں دل ہی دل میں پیچ و تاب کھاتا تھا' ان ناخواندہ مہمانوں کو کوستا تھا۔ لیکن اُن پر مطلق اثر نہ ہوا۔ میں نے ایڑی چوٹی کا زور لگا کر کرسی کے پایوں سے شور مچانے کی کوشش کی۔ لیکن وہ آواز سب آوازوں سے بلند تھی۔ اور لحہ بہ لحہ بلند تر ہوتی جاتی تھی۔ تاہم وہ لوگ اُسی طرح مزے سے بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ کیا یہ ممکن تھا کہ اُنھوں نے اس آواز کو نہ سنا ہو! نہیں نہیں' وہ ضرور اس کو سن رہے تھے! ــــ اُن کے دل میں شک تھا! ــــ وہ سب کچھ جانتے تھے! ــــ یہ اُن کی ستم ظریفی تھی کہ مجھ پر ظاہر نہ کرتے تھے! ــــ اُس وقت میرے دل میں یہ خیال آیا' اور اب بھی میرا یہی خیال ہے۔ مجھ میں اس ذہنی تکلیف کو برداشت کرنے کی طاقت نہ تھی! میں انکے زہر خند کی تاب نہ لا سکتا تھا! ــــ اُن کا ریاکارانہ تبسّم مجھ سے دیکھا نہ جاتا تھا! مجھے یوں محسوس ہوتا تھا کہ زور سے چیخوں' ورنہ میرا دم گھٹ جائیگا اور مر جاؤنگا۔ اور پھر ذرا سُننا ــــ وہی آواز۔ دھک! دھک! دھک! دھک!

میں پکار اُٹھا۔ "بدمعاشو! اب یہ مکاری رہنے دو۔ میں جرم کا اعتراف کرتا ہوں۔ ان تختوں کو ہٹا دو! یہ' یہ ــــ یہ اُسی کے دل کی آواز ہے"۔ "م۔ ہ۔ ح"

بادۂ معرفت

در حضرتِ شیخ عرض ما بے ادبی ست ‎ ‎ آں شیخ کہ نائب رسولِ عربی ست
ما از در گنج بخش محروم رویم ‎ ‎ در قاعدۂ کرم بسا بوالعجبی ست

در شہرِ گرامیست کہ معنی نظر ست ‎ ‎ در پنجۂ مرگ سخت بے بال و پر ست
در تلخیِ نزع حکم آمد باجل ‎ ‎ بگذار کہ ایں مرید گنج شکر ست

خونابِ جگر تراود از چشم ترم ‎ ‎ زد خیمہ بر اوج عرش آہ سحرم
نازم بدماغ خویش و بر شورش خویش ‎ ‎ شوریست ز محبوب الٰہی بسرم

گرامی

شمع

اے پیکرِ نورانی ، ناطورۂ زیبائی　　تو بزم کی رونق ہے ، تو زینتِ کاشانہ

موقوف تجھی پر ہے ہنگامۂ ہر محفل　　روشن ہے ترے دم سے خلوت کا نہاں خانہ

پنہاں تری ہر ضَو میں اسرارِ محبت ہیں　　سینہ ہے ترا مخزن انوارِ حقیقت کا

تو سوزِ محبت میں جلتی ہے سرِ محفل　　دل والوں کو دیتی ہے پیغام محبت کا

راتیں ہیں ترے دم سے پُرنور زمانے کی　　ہیں شاہ و گدا تیرے دلدادہ و شیدائی

ہر جا ہے ترا جلوہ ، ہر سو ہے ترا پرتَو　　اک بزمِ عروسی ہو یا عالمِ تنہائی

مسلک ہے ترا الفت ، جلنے سے تجھے مطلب　　ہو گوشۂ تنہائی یا محفلِ رندانہ

ایماں کی خلوت ہو یا کفر کی مجلس ہو　　مندر ہو کہ مسجد ہو ، کعبہ ہو کہ بت خانہ

تو شمع سرِ محفل تو شمع سرِ مدفن　　تو رونقِ آبادی ، تو زینتِ ویرانہ

ہر حال میں جویا ہے ہر اہلِ نظر تیرا　　مے خانۂ عشرت ہو یا غم کا نہاں خانہ

پروانۂ سوز آگیں عاشق ہے ترے رُخ کا　　دیوانہ ہے وہ تیرا ، تو اُس کی ہے شیدائی

اک آگ محبت کی دونوں کے دلوں میں ہے　　جل بجھتے ہو تم دونوں محفل ہو کہ تنہائی

اک شعلۂ لرزاں ہے ظاہر میں اگرچہ تو　　رخشندہ مگر تجھ میں انوارِ حقیقت ہیں

اک لطف ہے ظاہر میں اک کیف ہے باطن میں　　پیدا ترے پیکر سے اسرارِ حقیقت ہیں

واقف ہے ازل سے تو اسرارِ محبت کی　　دیتی ہے زمانے کو تو درس محبت کا

قسمت ہے تری اچھی قسمت کی دھنی ہے تو　　شاہد ہے ترا جلنا ، جل بجھ کے فنا ہونا

میرا دلِ سوزاں بھی اک شمع محبت ہے　　ہوتا ہے مجھے اس پر تیرا ہی گماں پیہم

ہے شعلہ بسر تو بھی ، آتش بجگر میں بھی　　اُٹھتا ہے مرے دل سے دن رات دھواں پیہم

آ دل میں تجھے رکھ لوں اے سوختۂ الفت　　تو مہر و وفا بن جا اس گوشۂ خلوت میں

اک روز تو مرنا ہے ، آ ساتھ ہی ہم دونوں　　جل جائیں محبت میں ، مٹ جائیں محبت میں

احساسِ فرض

کائناتِ ہستی سالمات کا ایک رابطہ ہے۔ اُس کا ذرّہ ذرّہ بجائے خود قائم ہے۔ اور اُس کے ساتھ ہی دوسرے ذرّوں پر اُس کا دارومدار ہے۔ اگر عناصر میں اشتراکِ عمل نہ ہوتا تو یہ دُنیا وجود میں نہ آتی۔ اور نظامِ ہستی ترکیب نہ پاتا۔ اس لحاظ سے کوئی چیز بیکار نہیں۔ موجودات ہمارے جسم کی طرح ایک جسم ہے۔ جس کا کوئی عضو معطل نہیں۔ اگر کوئی عضو معطل ہو جائے۔ تو نہ صرف اپنے لئے بلکہ ساری دُنیا کے لئے بنائے فساد ہے۔ نباتات۔ جمادات، حیوانات ان میں سے ہر ایک اپنے اپنے مخصوص حلقے میں بروئے کار ہے۔ زمین گردش میں مصروف ہے۔ اجرامِ فلکی چاند، سُورج اور تارے اپنے وقت پر طلوع ہوتے ہیں۔ اپنے وقت پر غروب ہوتے ہیں۔ موسم معینہ وقت پر آتے ہیں اور جلتے ہیں۔ ان غیر ذی شعور چیزوں سے کہیں زیادہ حیوانات اپنے فرائض کے پابند ہیں۔ چرند درند کو لیجئے۔ وہ اپنے محدود دائرۂ عمل میں اپنا اپنا کام انجام دیتے ہیں چلنا پھرنا، چرنا چگنا، یہ اُن کے آئے دن کے کام ہیں۔ جو اُنکے تحفظِ حیات کے لئے ضروری ہیں۔ اور وہ انہی میں مصروف و سرگرم رہتے ہیں۔ قدرت نے حفظِ نسل کا فرض ان کے ذمے کر دیا ہے اور وہ اس فرض کو بالالتزام ادا کرتے ہیں۔

کچھ انہی پر منحصر نہیں۔ کچھ نہ کچھ کام ہر چیز کے سپرد کیا گیا ہے جو اس کی تخلیق کا راز اور اُس کی ہستی کا مقصد و مدعا ہے اُسکے پُورا کرنے کا نام فرض ہے۔

ہر شخص کو اپنی زندگی کے مخصوص دائرے میں بعض فرائض ادا کرنے پڑتے ہیں۔ فرائض زندگی کے ادا کرنے میں بعضوں کے عوارض و حالات مساعد ہوتے ہیں۔ اور بعضوں کی راہ میں مشکلات حائل ہوتی ہیں۔ لیکن مُبارک ہیں وہ لوگ جو رُکاوٹوں کا سامنا کر کے ثبات و استقلال سے اپنے ہمجنسوں کی بہتری اور بہبودی میں کوشاں رہتے ہیں۔ ہر فردِ بشر دُنیا کے لئے مفید ثابت ہو سکتا ہے۔ یہ جُدا بات ہے کہ اُس کا حلقۂ اثر وسیع ہے یا محدود۔ اگر کوئی شخص صرف اپنے عیال و اطفال اور اعزّہ و اقارب کی پرورش اور نوازش کرتا ہے۔ تو اس طرح بھی دُنیا میں خیرِ کثیر کا باعث ہوتا ہے۔ مانا کہ وُہ تمام بنی نوع انسان کو براہِ راست کوئی فائدہ نہیں پہنچاتا۔ لیکن اتنا ضرور ہے کہ وہ اپنی بساط کے موافق افادۂ عام کا باعث ہوتا ہے۔ اس سے کہیں زیادہ فیض و برکت کے سرچشمے وہ لوگ ہیں۔ جو آپس میں مل جلکر رہتے سہتے

والے انسانوں کو اخوت کے رشتۂ زرّیں میں مربوط کئے ہوئے ہیں۔ پھر وہ انسان جو اپنے ملک و قوم کے خادم ہوتے ہیں۔ جو فائدہ ان کی ذات سے نوعِ بشر کو پہنچتا ہے وہ محتاجِ بیان نہیں۔ کہ ایثار و صداقت کے پتلے وہ عظیم الشان ہستیاں ہیں۔ جن کا مدعائے حیات خدمت کرنا ہے۔ اور وہ اسی کے ذریعے مخدوم ہوتے ہیں۔ وہ ہمہ گیر محبت کے حلقہ بگوش ہو کر فنا کی قیود سے ہمیشہ کے لئے آزاد ہو جاتے ہیں۔ وہ اپنی ذات کو فنا کر کے ایک شمع کشتہ کی طرح بقائے حقیقی حاصل کرتے ہیں۔ وہ اس دُنیا کی تاریک فضا میں اپنے کارناموں سے ایک شمع ہدایت روشن کر جاتے ہیں دُنیا کی وہ عظیم بالشان ہستیاں جن کے آستانِ شہرت پر خلق خُدا آجتک جبیں فرسائی کرتی ہے۔ وہ اکابر تاریخ جنھوں نے اپنے بعد میں آنیوالی نسلوں سے خراج عقیدت وصول کیا ہے۔ اُنھوں نے اپنی ہستی کو مٹا کر جریدۂ عالم پر خلوص و ایثار ایک انمٹ نقش ثبت کر دیا ہے۔

وطن و قوم کی خدمت بجائے خود ایک اعلیٰ فرض ہے۔ لیکن اس سے کہیں گرانمایہ فرض وہ فرض ہے جو تمام نوعِ انسانی کی طرف سے بحیثیت مجموعی ہم پر عاید ہوتا ہے اس فرض کا دائرہ صرف دُنیا کے اُس حصے اور انسانوں کی اُس مخصوص جماعت تک محدود نہیں جس میں اتفاق محض نے ہمیں پیدا کر دیا۔ بلکہ اس کا دائرہ دُنیا کے ایک سرے سے لیکر دوسرے سرے تک محیط ہے۔ یہ وطنیت کا جذبہ وطن پرستی سے بدرجہا زیادہ قابلِ تعریف ہے۔ وہ لوگ جو اپنے برادران ملک و ملّت کی خدمت کے لئے اپنے آپکو وقف کر دیتے ہیں۔ اور اپنے حاصل عمر کو اپنے یارانِ وطن کی راہ میں نثار کر دیتے ہیں۔ بیشک ہر طرح کی تعریف کے قابل ہیں۔ لیکن وہ آزاد مشرب ہستیاں جو اپنے آپ کو قیود سے آزاد کر کے ساری دُنیا کو اپنا مرکزِ عمل بنا لیتی ہیں۔ ان سے کہیں رُتبے میں زیادہ ہیں۔

اپنے ملک کی ترقی و بہبودی کے لئے جان لڑا دینا، اپنے وطن پر نثار ہو جانا بلا تفریقِ مذہب و ملّت اپنے ہمجنسوں کی خدمت کرنا یہ بیشک اہم فرائض ہیں۔ لیکن اعلےٰ قسم کا فرض وہ فرض ہے جو پوشیدہ طور پر انسانی نظروں سے غائب ادا کیا جاتا ہے۔ یہ اُس بزرگ و برتر اور ذوالجلال ہستی کی طرف سے ہم پر عاید ہوتا ہے۔ جس نے ہمیں اپنی قدرتِ کاملہ سے پیدا کیا۔ اور ہمیں عقل و شعور سے مشرف کیا۔ ذاتِ باری ہماری عبادت و ریاضت کی محتاج نہیں لیکن اس کا شکر و سپاس ایک ایسا فرض ہے۔ جس کا ادا کرنا ہم کو مقصود بالذات سمجھنا چاہیئے۔ اور اگر مفادِ دُنیوی کی نگاہ سے دیکھا جائے تو اُس حالت میں بھی بندے اور خدا کے درمیان عبودیت کا رشتہ ہماری حقیقی ترقی کا باعث ہے۔ کیونکہ یقین اور اعتقاد میں کبھی مغلوب

نہ ہونے والی طاقت ہے۔ فرض کا ادا کرنا بذات خود ایک رُوحانی مسرت ہے۔ جس پر زمانے بھر کی سب خوشیاں نثار ہیں۔ کیونکہ قدرت کے قانون نے ہم پر جو فرائض عاید کئے ہیں۔ وہ تحفظ زندگی کے لئے ضروری اور اس لئے خوشی کا باعث ہیں۔

فرض کے ادا کرنے میں جو محویت انسان پر طاری ہو جاتی ہے۔ وہ اُسے مصائب و آلام کے احساس سے محفوظ رکھتی ہے۔ وہ قوتیں جو خُدا کی طرف سے ہمیں ودیعت کی گئی ہیں۔ اگر بر روئے کار نہ لائی جائیں۔ تو زنگ خوردہ ہو جاتی ہیں۔ اور جس وقت فنا ہونے کے قریب پہنچتی ہیں تو حفظ نفس کے طبعی قانون کے مطابق ایک دوسرے سے برسر پیکار ہو جاتی ہیں۔ اور اس طرح فساد کا باعث ہوتی ہیں۔ یہی سوچ کر سقراط نے یہ کہا تھا کہ "میں اپنے مقدس ہتھیاروں کی جو میرے مالک نے میرے سپرد کئے بے وقری نہیں کرونگا۔ اور نہ میں اس جگہ کو چھوڑونگا جس کی محافظت کے لئے مجھے تعینات کیا جائیگا"۔

سقراط کا یہ قول خاص طور پر قابلِ غور ہے۔ ذرا سوچنے کی بات ہے۔ کہ اگر کوئی سپاہی جسے کسی خاص کام پر مامور کیا گیا ہو۔ اگر وہ اپنے فرض کو فراموش کر دے۔ تو اُس کے رفیقانِ کار پر جن کی کامیابی کا دار و مدار بہت حد تک اُس پر ہے۔ کیا گزریگی۔ یا ایک دوسری مثال لیجئے۔ اگر کسی کل کے پُرزوں میں سے ایک پُرزہ اپنا کام کرنا چھوڑ دے تو کیا سارا کارخانہ بگڑ نہ جائیگا؟ بعینہٖ اسی طرح ہر ایک فرد بشر پر جماعتِ انسانی کی بہبودی کا انحصار ہے۔

فرض زندگی کا جوہر ہے۔ کیونکہ فرض عمل کے ارتقاء کا معراج ہے۔ اور عمل وہ چیز ہے جس کے ذریعے سے زندگی اپنی ہستی کا ثبوت دیتی ہے۔ بلکہ یہ کہنا چاہئے۔ کہ فرض زندگی ہے۔ اور یہ کہنا بھی نادرست نہ ہوگا۔ کہ زندگی ایک فرض ہے۔ کیونکہ اگر قدرت کو اپنی مخلوقات کے ہر ایک فرد سے کوئی کام لینا منظور نہ ہوتا تو غالباً نہ یہ دُنیا ہوتی، نہ زندگی ہوتی۔ وہ علّتِ غائی جو اس دُنیا اور زندگی کی تخلیق کا باعث ہُوئی ہے۔ اس بات کی متقاضی ہے کہ کوئی شے کسی ضرورت کے بغیر پیدا نہ کیجائے اس بات سے بعض غفلت کیش لوگ ایک نہایت ناجائز فایدہ اُٹھاتے ہیں۔ وہ اپنے فرض کے ادا کرنے میں تساہل سے کام لیتے ہیں۔ اُس کا عذر یہ پیش کرتے ہیں۔ کہ شاید قدرت نے کچھ نہ کرنے کا فرض ہم پر عاید کر دیا ہے۔ بالفاظ دیگر وہ تقدیرِ الٰہی کو اپنے اعمال کا کفیل قرار دیکر خود التزام سے بری ہو جانا چاہتے ہیں۔ لیکن ایک انسانِ کامل کے لئے قسمت کوئی معنی نہیں رکھتی۔ اور خاصکر جب ادائے فرض کا مسئلہ اُس کے درپیش ہو۔ اور اگر قسمت واقعہ میں کوئی چیز ہے تو وہ اپنے آپکو اپنے اعمال کا مختار سمجھ کر قسمت کا مقابلہ کرنے پر

آمادہ ہوجاتا ہے اور اس فرض کو ادا کرنے کی کوشش کرتا ہے جس کا احساس اُس کے ضمیر میں ہے۔ ذوقِ عمل اسی چیز کا نام ہے اور اسی کا تقاضا تھا کہ انسان نے ازل کے دن دو جہان کے کام اپنے ذمے لے لئے۔ انسان کا عمل کسی خارجی طاقت کا محکوم ہرگز نہیں ہوسکتا۔ وہ ضرور اپنے اعمال کا مختار اور ممکنات عالم پر قادر ہے۔ جب تک اُس کی عقل باقی ہے یعنی دوسرے الفاظ میں جبتک وہ زندہ ہے وہ اپنی قسمت آپ بناتا ہے۔ البتہ جب قدرت اُس سے اپنا کام لے چکے، اور اُس سے علم و عمل کی قوتیں واپس لینا چاہے، تو اُس حالت میں، اور صرف اُس حالت میں وہ مجبور ہے اُسے صرف موت پر اختیار نہیں، باقی ہر بات میں وہ خدا کا نائب ہے۔ اور خدا کی صفات کا حامل ہے۔ اُس کی ترقی کی کوئی حد نہیں۔ اُس کا نصب العین پست نہ ہونا چاہیئے۔ کیونکہ وہ خُدا سے ادھر ہر چیز بن سکتا ہے۔

ابوالخیر محمد عبداللہ

تبصرہ اشاعات جدیدہ

حکایات پنجاب۔ مسز فلورا اینی سٹیل ایک انگریز مصنفہ ہیں۔ اور بہت سی مقبول کتابیں آپ کی تصنیفات میں ہیں۔ آپ نے اپنی زندگی کے چند سال پنجاب میں گزارے۔ اور پیشِ نظر کتاب انہی سالوں کے تجربات کا نتیجہ ہے۔ مسز سٹیل ایک اندازِ خصوصی کی مالک ہیں جس کا امتیازی وصف دلچسپی ہے۔

اس کتاب کو سیّد عبدالقادر صاحب ایم اے پروفیسر اسلامیہ کالج لاہور نے "اُردو کے لباس میں ترجمہ کیا" اور لالہ مہر چند سیٹھی صاحب ایم۔ایس۔سی نے "بعد نظرثانی کے ترمیم کیا" ترجمہ بامحاورہ اور سلیس ہے۔ تاہم اُس میں اصل کی خوبیاں بہت حد تک برقرار رکھی گئی ہیں۔ کتاب کی عبارت ابھی اصلاح طلب ہے۔ کتابت و طباعت کے لحاظ سے "حکایاتِ پنجاب" نفاست کا ایک اعلیٰ نمونہ ہے۔ میکملن اینڈ کمپنی لمیٹڈ کلکتہ۔ بمبئی۔ مدراس۔ لندن۔

باغبان۔ یہ کتاب بھی میکملن اینڈ کمپنی کی تازہ ترین مطبوعات میں سے ہے۔ اسے حامد حسن صاحب پھلواروی نے جو اخبار "سعید" کانپور کے ایڈیٹر ہیں، سر رابندرا ناتھ ٹیگور کی مشہور تصنیف "گارڈنر" سے ترجمہ کیا ہے۔ ترجمے

میں یہ خوبی ہے کہ "ٹیگوریت" بدستور قایم ہے۔ ہمیں تعجب ہوتا ہے کہ ٹیگور کے شیدائی کیوں اُردو کی تنگ دامانی کا خیال نہیں کرتے۔ اور اس جنسِ گرامی کے وفور کو سمیٹنے کی بے سود کوشش کرتے ہیں۔

مکاتیبِ امیر مینائی۔ کسی مصنّف سے ذاتی طور پر واقف ہونیکا شرف تو اُس کے معاصرین ہی کو نصیب ہو سکتا ہے۔ لیکن سوانحعمریوں کی بدولت بعد میں آنے والے لوگ بھی کسی قدر واقفیّت حاصل کر لیتے ہیں۔ سوانحعمری کے تمام اصناف میں سے بہترین صنف خود نوشتہ سوانحعمری ہے۔ کیونکہ اُس میں مصنّف خود اپنی زبانِ قلم سے اپنی داستانِ زندگی بیان کرتا ہے۔ بعض مصنّفین کے خطوط اُن کی شخصیت سے اسقدر مملو ہوتے ہیں۔ کہ وہ کسی اعتبار سے خود نوشتہ سوانحعمری سے کم پایہ نہیں رکھتے۔ غالبؔ اور اکبرؔ کے مکاتیب بُعدِ زمانی و مکانی کے پردے کو چاک چاک کر کے ہمیں اُن کے روبرو کر دیتے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہم ان سے ہمکلام ہو رہے ہیں۔ اور ہمیں اُن سے نہ صرف روحانی قرب حاصل ہو جاتا ہے۔ بلکہ اُن کا وجودِ جسمانی بھی ہمیں اپنی آنکھوں کے سامنے نظر آنے لگتا ہے۔ یہی وصف اُستاد امیر احمدؒ امیرؔ مینائیؔ کے مکاتیب کا طغرائے امتیاز ہے۔ وہ اپنے خطوط میں اپنے درمیان اور پڑھنے والے کے درمیان کوئی اجنبیت و غیریت کا پردہ حائل نہیں رہنے دیتے،

اُن کے الفاظ مُنہ سے بولتے ہیں اُن کا صفحہ صفحہ گویا اُنکی لوحِ دل ہے۔ یہ خطوط اُن کی سیرت کی ایک مکمل تفسیر ہیں جو اُس وقت جبتک اُن کا نام اُردو ادب میں باقی ہے اُن کی شخصیت کو ہر دلعزیز بناتے رہینگے۔

ہمیں مولوی احسن اللہ خاں صاحب ثاقب مدیر رسالہ "قند پارسی" کا ممنون ہونا چاہیئے۔ کیونکہ ان مکاتبات کی تالیف و ترتیب انہی کی مساعیِ جمیلہ کا نتیجہ ہے۔ شروع میں ۱۰۶ صفحے کا ایک مبسوط مقدمہ قابل مؤلّف نے اپنی طرف سے شامل کیا ہے، جس میں اُنہوں نے حضرت امیر مرحوم کی ذات و صفات پر بہت کچھ روشنی ڈالی ہے۔ مقدمے کا ایک حصّہ ایسا ہے جس سے شاعری کے دلدادہ اس کامل الفن اُستاد سے ایک معنوی تلمّذ کا رشتہ پیدا کر کے کسبِ فیض کر سکتے ہیں۔ ہماری مراد اُن اصلاحوں سے ہے جو اُستاد نے مختلف وقتوں میں اپنے شاگردوں کو دیں اور جن کا نمونہ اس کتاب کے پورے ۲۰ صفحوں پر درج ہے۔ اگر قابل مؤلّف اس امر کی اجازت دیں تو ہم ایک بات میں اُنسے اختلافِ رائے کا اظہار کرنا چاہتے ہیں۔ اُنہوں نے امیرؔ اور داغؔ کا موازنہ کرنے میں جو کئی صفحے سیاہ کر دیے ہیں تو اس سے کیا حاصل ہے؟ کیا ان دو اُستادوں کے درمیان تفریقِ مراتب کر دینے سے اُنکے اُن درجوں میں فرق آجائیگا جو اُنکو اپنی اپنی جگہ ادب اُردو کی تاریخ میں حاصل ہیں؟ کتاب ظاہری خوبیوں سے حسبِ خاطر خواہ آراستہ نہیں کاغذ لکھائی چھپائی سب معمولی قیمت ۸/ ملنے کا پتہ: مولوی احسن اللہ خاں وکٹوریہ کالج گوالیار

ناکامِ محبت کے خیالات

(۱)

او تغافل کیش اگر یونہیں رہیں بے مہریاں ایک دن خاموش پھر میری زباں ہو جائیگی
یہ مری ہستی، کہ ہے اک شعلہ زار آرزو ظلمتِ شہرِ خموشاں میں نہاں ہو جائیگی
گو مرا پیکر فنا ہو جائے گا لیکن مری سادگی الفت کی زیبِ داستاں ہو جائیگی

محفلِ ہستی سے محرومِ تمنا جاؤں گا
نقش صدقِ عشق کا لیکن بٹھاتا جاؤں گا

(۲)

شام کو دنیا کے ہنگاموں سے جب گھبرا کے تُو باغ میں پھولوں سے اپنی روح کو بہلائیگی
جب نہ پائے گی کہیں بوئے محبت کا نشاں جب گلستاں کی کلی ہر ایک مرجھا جائیگی
آہ! پھر اس وقت اے مستِ مئے پندارِ حسن یاد آ آ کے مری تجھ کو بہت تڑپائیگی

روح جنت کے لئے پھر پر فشاں ہو جائیگی
عارضی ہستی تری بھی جاوداں ہو جائیگی

(۳)

ہوں گے پھر فردوس کے پھولوں میں دونوں ہمکنار خوگرِ فتنہ نہیں جس سر زمیں کا آسماں
جس کی ہر آواز میں ہے بربطِ الفت کی گونج جس کی ہر وادی میں ہیں چشمے محبت کے رواں
پھر وہاں ہونگے ترے لبہائے لعلیں کے ایاغ جن کی ہستی میں ہے تاثیرِ حیاتِ جاوداں

بے نیازِ لطف و جورِ آسماں ہو جائے گا
چند جرعے پی کے کیف جاوداں ہو جائے گا

آثر "صہبائی"

ہولناک بیابان

پہلے زمانے میں ملک سکاٹ لینڈ کے شمال میں ایک عظیم الشان بیابان تھا۔ گھنے جنگل سر بفلک سلسلہ ہائے کوہ برفانی چوٹیاں۔ غرضیکہ انسان کا قدم صدیوں سے وہاں نہ پہنچا تھا۔ سیاہ بادلوں کی گھٹائیں چھائی رہتی تھیں اور تند و تیز ہواؤں کے طوفان برپا رہتے تھے۔ برفباری شب و روز غضب ڈھاتی تھی۔ سفید بھیڑیئے اور ریچھ کی قسم کے درندے افراط سے پائے جاتے تھے۔ اسکاٹلینڈ کے لوگ جو فطرتاً اوہام پرست واقع ہوئے ہیں۔ اس بیابان کو بھوتوں کے جنگل کے نام سے موسوم کرتے تھے۔

سر چارلس کے عہد شباب کا آغاز تھا۔ دربار شاہی میں اُس کی بہادری و شہ زوری زبان زد خاص و عام تھی۔ سالانہ کھیلوں میں اُس نے سپہ گری کے تمام انعام حاصل کئے تھے۔ حسین شہزادیاں۔ امراء وزراء کی دوشیزہ لڑکیاں اس کی نظر التفات کی خواہشمند تھیں۔ عہد سلف کے سورماؤں کی طرح اس کی بھی خواہش تھی کہ وہ بھی حوادث کی جستجو میں ہر چہار سو بادیہ پیما ہو۔ دنیا کی طرح طرح کی بلاؤں کا سامنا کرے۔ اور اثنائے سفر میں کسی حسین عورت کو مصیبت سے بچائے اور اس سے شادی کرے۔ چنانچہ اپنی اس خواہش کے مطابق یکہ و تنہا عازم سفر ہوا۔ عجیب و غریب حادثات رستے میں پیش آئے مگر سر چارلس کی ثابت قدمی سب پہ غالب آئی۔ ڈاکو درندے وغیرہ سب کو تہ تیغ کیا۔ آخر اس دشت وحشت انگیز کے کنارے پہنچا جس کا ہم اوپر ذکر کر چکے ہیں۔

میلوں تک سنسان۔ آسمان پر بادل گھٹا ٹوپ چھائے ہوئے تھے۔ کبھی کبھی یخ کے تودے گر پڑتے تھے۔ دوپہر کو شام کا عالم تھا۔ گھوڑے کے ٹاپوں کی آواز خاموشی کو ہولناک بنا رہی تھی۔ سیاہ پہاڑ تنگ و تاریک وادیاں۔ ڈراؤنے غار ہیبت کا نظارہ پیش کر رہے تھے۔ خاموش بھیانک شکلیں۔ گریہ منظر بھتنے دور سے اُفق میں سیاہ پانی کی جھیلوں پر رقص کرتے ہوئے دکھائی دیتے تھے۔ اور قریب پہنچنے پر ہوا میں غائب ہو جاتے تھے۔ دیار کے درختوں کے تاریک سائے پر گھات میں بیٹھے ہوئے درندوں کا احتمال ہوتا تھا۔ اس اندھیرے منظر میں دو دراز سفید برف پوش

چوٹیوں کا نظارہ دہشت کو اور بڑھا رہا تھا۔

سر چارلس کا دل خوف سے دھڑک رہا تھا کہ خدایا یہ کون سے عالم میں گذر ہوا۔ مگر سرگمٹ سپاہی خوف وہراس سے بیگانہ تھا۔ اس نے ثابت قدم رہنے کی دوبارہ قسم کھائی جنگلوں اور پہاڑوں کو چیرتا۔ درندوں سے مقابلہ کرتا۔ جنوں کو اپنے صلیبی اشاروں سے جلاتا اپنے رستے پر قائم رہا۔ رات کو عجیب وغریب بھیانک آوازیں دہشت ناک صدائیں "سر چارلس خبردار" "سر چارلس بھاگ جاؤ" پکارتی سنائی دیتی تھیں۔ زہرہ گداز چیخیں۔ طوفان برف باری۔ پُراسرار گونجیں سر چارلس جیسے بے ڈر انسان کو بھی خواب سے محروم رکھتی تھیں۔ کئی دفعہ جب وہ کسی پتھر کے سہارے رات کو آرام کیلئے لیٹا ہوتا تو ایک سیاہ پوش عورت اُسے اپنی طرف آتی دکھائی دیتی۔ آخر ش اُس نے تنگ آکر اپنی شمشیر براں کو نیام سے باہر کیا۔ اور اس شکل سیاہ پر ایک ایسا ہاتھ مارا کہ وہ گر پڑی۔ مگر جب زمین پر دیکھا تو سوائے سامنے کے درخت کے چند کٹے ہوئے پتوں کے کچھ نہ تھا۔

تیرہ دن اور تیرہ راتیں وہ اسی کیفیت میں سفر کرتا گیا۔ اس مدت میں صرف ایک دفعہ چند منٹ کیلئے خورشید کی کرنوں نے منظر کو منور کیا۔ سورج کی روشنی میں اُسے معلوم ہوا کہ جن نالوں اور آبشاروں کو وہ سیاہ آب رواں خیال کرتا تھا۔ اصل میں بہتے ہوئے خون کے چشمے تھے۔ جتنا وہ آگے بڑھتا تھا۔ اُتنا ہی اُس کے دل میں اپنی تنہائی کا احساس اور گرد کے منظر کی ہیبت بڑھتی جاتی تھی۔ مگر شہرت کی خواہش اور ایک نامعلوم کشش اُس کے استقلال کو استوار کر رہی تھی۔ اُسنے مصمم ارادہ کر لیا۔ کہ وہ اس جانکاہ سفر کو اس کے قدرتی انجام تک پہنچائیگا۔

چودھویں صبح کو جبکہ مطلع قدرے صاف تھا، سر چارلس کو اُفق کی چوٹیوں میں سے ایک پر کچھ غیر معمولی ہونے کا گمان ہوا۔ بادل دو دِ سیاہ کی قسم کے جن میں بجلی کوندرہی تھی۔ اس چوٹی پر چھائے ہوئے تھے۔ مگر کچھ انوکھی سی زرد رنگ کی روشنی جس میں سبزی کی جھلک بھی تھی۔ اسی چوٹی پر ایک عظیم الشان قلعے کی دیواروں کو درخشاں کر رہی تھی۔ اس تیرگی و تاریکی کے عالم میں قلعے کی منور دیواروں نے ایک عجیب ہولناک کیفیت پیدا کر رکھی تھی۔ خواہ مخواہ سر چارلس کے دل میں خیال ہوتا تھا کہ منبع ضیا کوئی زبردست غیر ارضی قوت ہے جس سے اُس کو مقابلہ کرنا ہوگا۔

پہاڑوں کے سفر ٹیڑھی میڑھی چڑھائیاں۔ آخر صعوبتوں سے مجبور ہو کر سر چارلس کے گھوڑے نے دم دیدیا۔ دل ہی دل میں سر چارلس نے اس فیمتی سفر کا

تھوڑی دیر ماتم کیا۔ اور آگے چل دیا۔ جب اگلی پہاڑی سے نیچے اترنے لگا تو اُس نے اپنے مردہ مرکب پر آخری الوداعی نگاہ ڈالی۔ گھوڑے کی لاش کے گرد خوفناک شکلوں اور درندوں کا ایک مجمع ناچ رہا تھا۔ تھوڑی دیر کے بعد تمام وحشی ڈراؤنی آوازوں کیساتھ اس لاش پر گر پڑے اور طرفتہ العین میں اس کا خاتمہ کر کے غائب ہو گئے۔

(۲)

سر چارلس قلعہ کے دروازہ پر پہنچا۔ اور اسے کُھلا پایا۔ داخل ہوا۔ تو دیکھا کہ ایک وسیع میدان ہے جس پر گھاس کا فرش گلہائے گوناگوں سے آراستہ بچھا ہوا ہے۔ کہیں کہیں دیار کے درخت کھڑے ہیں۔ قلعہ کی عمارت صدیوں پرانی معلوم ہوتی تھی مگر مضبوط اور قائم تھی۔ گمان ہوتا تھا کہ قلعہ کسی نامعلوم وجہ سے وقت کی دستبرد سے محفوظ ہے۔ ہر طرف ویرانگی تھی۔ کوئی انسان نظر نہیں آتا تھا۔ سر چارلس کے پہلے شکوک دور ہو گئے۔ اور وہ دلیری سے قدم اُٹھاتا سامنے کی عمارت میں داخل ہوا۔ کمرہ بالکل خالی تھا۔ گوشہ میں ایک میز استادہ تھی۔ سر چارلس ستانے کی نیت سے اس پر دراز ہو گیا۔ پندرہ راتوں کی بیخوابی اور علاوہ اس کے تھکن۔ فطرت غالب آئی۔ اور سر چارلس تھوڑی ہی دیر میں اس میز پر محوِ خواب تھا۔

اُسے معلوم ہوا کہ اُس کے کمرے میں کچھ روشنی ہوئی۔ دیکھا تو ایک زہرہ طلعت شہزادی جس کی چشم مخمور مدہوشیٔ عشق کی تعلیم تھی تاجِ تجلّی زیبِ سر کئے ہوئے اور نقابِ حُسن سے مُنہ چھپائے ہوئے اس کمرہ میں آئی۔ اُس کے خوبصورت چہرے سے الم واندوہ کے آثار نمایاں تھے۔ اُس نے اپنے بازو سر چارلس کی طرف بڑھائے۔ ایک نگاہ ڈالی جس میں بے کسی ٹپکتی تھی اور جس میں امداد کی درخواست مضمر تھی۔ اس کے لب ہلے۔ ایک دردبھرا نغمہ فضا میں پھیل گیا۔

"سر چارلس مجھے بچاؤ۔ مجھے اس ظالم کی قید سے چھڑاؤ۔"

سر چارلس چونکا۔ رات کی تاریکی اور بارش کا شور تھا۔

(۳)

تمام دن سر چارلس اس صحن سے اگلی عمارتوں میں داخل ہونے کا رستہ تلاش کرتا رہا۔ مگر بے سود۔ شام کے وقت اسی جستجو میں وہ ایک عظیم الشان ہال میں داخل ہوا جو ایک کونے پر تھا۔ اس کی تمام دیواروں کو اس نے ٹٹولا۔ مگر کوئی رستہ وغیرہ نہ پایا۔ حیران تھا کہ اس عقدے کو کیونکر وا کیا جائے۔ آخر وہ تنگ آ گیا۔ اور باآواز بلند پکارنا شروع کیا۔

"او ظالم۔ او سفاک ناموسِ حسین شہزادی کے

قید کرنے والے۔ میرے سامنے آتا کہ تجھے تیری نامردی کی سزا دوں۔"

یکایک ایک خیرہ کن ضیا اس کمرے میں ظاہر ہوئی۔ اس زرد روشنی میں سر چارلس کو چودہ قبریں نظر آئیں۔ تھوڑی دیر کے بعد سب قبریں پھٹ گئیں اور ہر قبر میں چمکدار زرہ بکتر زیب تن کئے ہوئے ایک شخص اٹھ کھڑا ہوا۔ چودہ نظریں سر چارلس کے سینے میں گڑ گئیں۔ ہر ایک اپنی نامرادی کی ایک علیحدہ کیفیت بتا رہی تھی۔ تمام شکلوں پر مردنی اور یاس برس رہی تھی چودہ ڈراؤنی آوازوں نے مُہر سکوت کو یکبارگی توڑا۔

"سر چارلس باز آؤ۔"

سر چارلس سہم گیا۔ اس پر غشی سی طاری ہو گئی۔ اُٹھا تو منظر غائب تھا۔ مگر اس کا دل زور سے دھڑک رہا تھا۔ بیم و ہراس کے آثار اس کے چہرے سے عیاں تھے۔ انتہائے خوف سے اسے پسینہ آگیا تھا۔ آہستہ آہستہ اُس کی مردانگی نے اس کے دل پر دوبارہ قابو پایا۔ وہ جرأت جو تکلیف کی انتہا اور یاس سے پیدا ہوتی ہے۔ اس کے سینے میں پیدا ہو گئی۔ اس نے مڑ کر دیکھا تو ایک طرف اسے کچھ دھندلی سی روشنی نظر آئی۔ اس کی طرف بڑھا۔ وہ آگے جانے کا راستہ تھا۔

(۴)

دروازے میں ایک سفید ریش آدمی کھڑا تھا وہ سر چارلس سے نہایت تپاک سے پیش آیا اور اُسے اپنے ساتھ اندر لے گیا۔ سر چارلس حیران تھا کہ اس کے کیا معنی ہو سکتے ہیں۔ وہ بھوتوں کا جنگل وہ قلعہ وہ چودہ بہادروں کی روحیں اور یہ سفید ریش بوڑھا یکہ و تنہا اس قلعے میں سکونت پذیر۔ کچھ اُس کی سمجھ میں نہ آتا تھا۔ اس نے بوڑھے سے اس کیفیت کا مطلب پوچھا۔ بوڑھا خاموش سر چارلس کو ایک عالیشان دیوان میں ہمراہ لے گیا۔ جس کے مقابلے میں شاہ سکاٹلینڈ کا دربار ہیچ تھا۔ وہاں دونوں بیٹھ گئے اور بوڑھے نے اپنا حال بیان کرنا شروع کیا:-

"سر چارلس تمہارے اسکاٹلینڈ کے شمال میں سویڈن ناروے تک ایک نہایت عظیم الشان سلطنت ہے۔ جو اسکاٹلینڈ سے کئی گنا بڑی ہے۔ اس مملکت میں کوئی انسان آباد نہیں۔ فقط بھوت پریت اُڑتے پھرتے نظر آتے ہیں تم اس سلطنت کے بادشاہ کے مہمان ہو۔"

سر چارلس نے آنکھیں اُٹھا کر دیکھا۔ وہ بوڑھا جلال و شوکت شاہی کا مرقع تھا۔

"مگر سر چارلس! اس سلطنت کی تباہی نزدیک ہے۔

کیونکہ میں نے جوش جوانی میں عالم انسانی میں سے ایک حور وش شہزادی پر عاشق ہو کر اُسے یہاں بالجبر لاکر اسیر کیا تھا۔ اور صدیوں سے ہمارے خاندان میں یہ رسم چلی آئی ہے کہ جب ہم میں سے کوئی تاجدار جو آئی کسی بیٹی سے محبت کریگا اور اُسے بالجبر قید کریگا تو اس شہزادی کا پندرہواں چھڑانے والا اس سلطنت کی تباہی کا موجب ہوگا۔ تم چودہ نامراد بہادروں کی قبریں دیکھ چکے ہو۔ وہ میرے ہاتھ سے قتل ہوئے ہیں"۔

سر چارلس کے دل پر دہشت طاری ہوگئی اس کا ہاتھ اس کے نیام تک پہنچ گیا تھا۔ اس بوڑھے بادشاہ کی جگہ ایک ڈراؤنی پر ہیبت شکل جس کی آنکھوں سے شرارے نکلتے تھے اور آسمان کی طرف اُڑ جاتے تھے بیٹھی ہوئی تھی۔ ایک کرخت آواز اس دیوان میں گونجی "سر چارلس سلامتی کی خواہش ہے تو یہاں سے چلے جاؤ"!

"سلامتی کی خواہش! نہیں۔ مجھے اسیر شہزادی کو رہا کرنے کی خواہش ہے"!

(۵)

سر چارلس ایک میدان میں کھڑا تھا۔ سامنے ایک بُرج پر وہی حسین شہزادی اپنا رومال ہلا رہی تھی جو اس کے خوابوں اور ارمانوں کی تصویر تھی۔ یکایک آسمان پر تاریکی چھاگئی۔ ہولناک آوازیں فضا میں گونجنے لگیں۔ کریہ منظر شکلوں نے سر چارلس کو چاروں طرف سے گھیر لیا اور حملہ آور ہوئیں۔ سر چارلس ہر چہار طرف تلوار مارتا تھا۔ لیکن وہ مخلوقِ عجیب غول در غول آن موجود ہوتی۔ اور نہایت ہولناک چیخوں سے حملہ آور ہوتی تھی۔ مگر اس شور کے علاوہ ایک اور شور سر چارلس کو سنائی دیتا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا۔ کہ سمندر اپنے ہزاروں تھپیڑوں اور طوفانوں کی فوج لئے اس کی مدد کو آ رہا ہے۔

سر چارلس کے بازو تھک گئے۔ آخر کار اس نے اس قتل بے سود کو چھوڑ کر سامنے برج کیطرف راستہ صاف کرنے کا ارادہ کیا۔ جس طرف اس نے رُخ کیا ایک ایک قدم پر کُشتوں کے پُشتے لگ گئے۔ دروازے کو توڑ کر سر چارلس برج میں داخل ہوا۔

سمندر کا شور اب بہت بڑھ گیا تھا۔ غیر انسانی دشمن اُسے چھوڑ کر اپنی سلامتی کے لئے آوارہ و سرگردان اِدھر اُدھر پھر رہے تھے۔ سمندر کی لہریں ٹوٹ ٹوٹ کر قلعہ کی دیواروں سے ٹکراتی تھیں۔ زلزلۂ عظیم برپا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ طوفان لمحہ بھر میں تمام عالم کو فنا کردیگا۔

حسرت و مایوسی کا مرقع سر چارلس کے پیش نظر تھا۔ ایک حور تمثال شہزادی کی لاش فرش پر نظر آئی جسکے کپڑے خون آلود تھے۔ نزع کی تکلیف سے اُس کی شکل

نہایت دردناک معلوم ہوتی تھی۔ فضا کی تاریکی اس المناک منظر کی وحشت کو اور بڑھا رہی تھی۔ سر چارلس آگے بڑھا دیکھا تو ایک طرف اس غرقاب سلطنت کے آخری سلطان کی لاش پڑی ہوئی تھی۔ ایک ہاتھ شمشیر کے دستہ پر تھا جو اُس کے سینہ میں نیام ہو چکی تھی۔ اس کے مردہ لبوں میں کچھ خفیف سی حرکت پیدا ہوئی۔

"آہ محبت" اور وہ لب ہمیشہ ہمیشہ کے لئے خاموش ہو گئے۔

سمندر بہت چڑھ آیا تھا۔ زلزلے کے ہچکولوں سے وہ برج ہلا اور گر پڑا .... اُف سر چارلس! ایک عظیم الشان سلطنت کی جگہ طوفان کی تاریکی اور سمندر کا شور تھا۔ ممکن ہو کہ آجتک بحیرۂ شمالی کی تہ کی گہرائیوں میں ایک بادشاہ قلعہ کے کھنڈروں کے نیچے ان تین نامرادوں کی ہڈیاں پڑی ہوں

(نوٹ) محققین نے دریافت کیا ہے کہ کبھی سکاٹلینڈ سکنڈے نیویا سے خشکی کے ذریعے ملحق تھا۔ مگر کسی زلزلے یا طوفان کی وجہ سے اسکاٹلینڈ کے شمال کی خشکی زیر آب ہو گئی ممکن ہو یہی اس افسانے کا سبب ہو

محمد جمیل واسطی

بزمِ دوشیں

آہ! وُہ ناز ہائے بے انداز　　آہ! وہ لطفِ سجدہ ہائے نیاز
آہ! وہ برقہائے حُسن و جمال　　آہ! وہ شعلہ ہائے قلب گداز
آہ! وہ زخمہائے رُوح فزا　　آہ! وہ چشمہائے تیرانداز
آہ! وہ بزمہائے چشم فروز　　آہ! وہ نغمہ ہائے گوش نواز
آہ! وہ شور ہائے نوشا نوش　　آہ! وہ باد ہائے روح گداز
آہ! وہ جستجوئے عشرتِ نو　　آہ! وہ آرزوئے نو انداز

آہ! وہ نعرہ ہائے مستانہ
آہ! وہ ہاؤ ہوئے دیوانہ

اثر صہبائی

نغماتِ آزاد

کم و بیش ہر حوصلہ مٹ چکا ہے
نہ کچھ آرزو ہے نہ کچھ مدعا ہے

نہ اُمید ٹوٹے نہ ارمان نکلے
ہمارا مرض ہر طرح لادوا ہے

مقدر مخالف۔ زمانہ مخالف
جسے دیکھتا ہوں۔ ترا ہمنوا ہے

ذرا واشتہ داشتہ مہرباں ہو
کوئی چشمِ اُلفت سے ناآشنا ہے

جہانتک ہو۔ اغماض جائز نہ رکھیے
کہ اُمیدواروں کا دل ٹوٹتا ہے

خوشا وہ زمانہ کہ تجھ پر فدا تھے
دل ابتک وہی فرصتیں ڈھونڈھتا ہے

اچانک ترا یاد آنا ستم تھا
کوئی روح کھینچے لئے جا رہا ہے

نہ اگلا سا عالم نہ پہلی سی دُنیا
خداوند عالم! یہ کیا ماجرا ہے

بڑی سے بڑی کوششیں ختم ہولیں
اب امداد غیبی! ترا آسرا ہے

کبھی متصل کوششیں کر کے دیکھو
ہمیشہ سے ہمت کا حامی خدا ہے

کٹھن منزلو! رحم سے کام لیجو
کوئی پا پیادہ سفر کر رہا ہے

موافق ہواؤ! کچھ امداد کیجو
کہ ٹوٹی سی کشتی ہے طوفاں بپا ہے

تباہی کو بیڑے سے لاگ آپڑی ہے
خدا ہی مری ناؤ کا ناخدا ہے

تلاطم کے صدمے ڈبو کر رہیں گے
حقیقت میں بیڑے کا وقت آلگا ہے

اب آزاد آزادیاں بھول جاؤ
کہ قیدِ علائق سے پالا پڑا ہے

آزاد انصاری

تھی مصلحت کہ رُک کر ہجراں میں جان دیجے
دل کھول کر نہ غم میں میں ایک بار رویا
(میر)

روداد محبت

مصنفہ ٹالسٹائی

حصہ دوم

مترجمہ راز چاندپوری

پہلا باب

دن، ہفتے حتیٰ کہ دیہات کی زندگی کے دو مہینے ایک عالم خود فراموشی میں گذرے، لیکن اس کے ساتھ ہی ذوق وشوق، محسوسات اور مسرت سے لبریز یہ دو ماہ پوری زندگی سے بے نیاز کردینے والے تھے۔

اپنی دیہاتی زندگی کی تنظیم کے متعلق میرے اور اُس کے خیالات ہماری پیش بینی کے مطابق ظہور پذیر نہ ہوئے، مگر ہماری زندگی، ہمارے خیالات کے مقابلہ میں مایوس کن نہ تھی۔ میں اُس سے صرف اسکی محنت ومشقت، ادائے فرض، قربانی اور بے غرضانہ دوسروں کی خدمت گذاری کی وجہ ہی سے محبت نہ کرتی تھی بلکہ اس کے برخلاف میری حیات جذب وشوق، ایک دوسرے سے محبت کرنے، محبت کئے جانیکی خواہش، ایک مستمر مسرت اور دنیا کی ہر چیز سے بے خبری کی کیفیات سے لبریز تھی۔

بعض اوقات وہ کتب خانہ میں جاتا اور اپنے معاملات کی انجام دہی میں معروف ہوجاتا، کبھی وہ شہر چلاجاتا اور ریاست کے کاموں میں غرق ہونے کی وجہ سے مجھ سے جُدا رہتا، لیکن میں دیکھتی تھی کہ میری جدائی اس کو شاق گذرتی ہے اور وہ خود بھی اس کا معترف تھا کہ میرے بغیر دنیا کی ہر شے اُس کے لئے محض بیکار ہے اس کے لئے اس بات کا تصور بھی ممکن نہ تھا کہ میرے بغیر اُس کو کسی چیز سے دلچسپی ہوسکتی ہے۔

میری حالت بھی بالکل ایسی ہی تھی۔ میں کتابیں پڑھنے، نغمہ سرائی کرنے، اُس کی والدہ کے ساتھ گفتگو کرنے اور گھر کے کام کاج اور مدرسہ کے کاموں میں مصروف رہتی تھی، لیکن میں یہ سب کچھ محض اس وجہ سے کرتی تھی کہ ان میں سے ہر چیز سے اس کو تعلق تھا۔ مگر جب کبھی مجھے یہ خیال ہوتا کہ فلاں کام سے اسکا کوئی تعلق نہیں ہے تو میرے قوائے عمل بیکار ہوجاتے اور اس کے سوائے دنیا میں کسی اور کا خیال کرنا بہت

عجیب معلوم ہوتا۔

ممکن ہے کہ میرا یہ خیال لغو اور خود غرضی پر مبنی ہو، لیکن اس خیال سے مجھے ایک بے پایاں مسرّت حاصل ہوتی تھی اور میں اپنے آپ کو ساری دنیا سے برتر و اعلیٰ سمجھتی تھی۔

میری نگاہ میں ساری دنیا میں صرف وہ ایک شخص تھا اور میں اُس کو دنیا بھر میں سب سے زیادہ خوبصورت، لائق اور مکمل انسان خیال کرتی تھی، اس لئے میرا مقصد حیات صرف اس کے واسطے زندہ رہنا تھا یا اپنے آپ کو اس کے سامنے اُس حیثیت سے پیش کرنا تھا جو ہر امکانی صورت میں مکمل سمجھی جاسکتی ہے۔ اور میں بھی دنیا کی اس بہترین ہستی کی نظر میں ایسی ہی عورت بننے کی کوشش کرتی تھی۔

ایک بار وہ میرے کمرہ میں اُس وقت آیا جبکہ میں نماز میں مصروف تھی۔ میں نے اُس پر نظر ڈالی اور بدستور عبادت میں مصروف ہوگئی۔ وہ میز پر بیٹھ گیا اور اس خیال سے کہ میری نماز میں خلل نہ پڑے ایک کتاب کھول کر پڑھنے لگا، لیکن مجھے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ میری طرف دیکھ رہا ہے۔ میں نے گھور کر اُس کی طرف دیکھا۔ وہ مُسکرایا، مجھے بھی بے ساختہ ہنسی آگئی اور میں نماز کو جاری نہ رکھ سکی۔

میں نے پوچھا "کیا تم نماز پڑھ چکے ہو؟"

"ہاں۔ مگر تم اپنا فرض ادا کرو، میں جاتا ہوں۔"

"کیا تم نماز نہیں پڑھتے؟ مگر مجھے امید ہے کہ تم سجدہ دیا کرتے ہو۔"

اُس نے کوئی جواب نہ دیا اور میرے پاس سے جانے کے لئے کھڑا ہوگیا لیکن میں نے اُس کو روک لیا اور کہا:۔

"میرے پیارے! آج میری خاطر میرے ساتھ نماز پڑھ لو۔"

وہ بے قاعدہ طور سے اپنے ہاتھ نیچے کرکے میرے برابر کھڑا ہوگیا اور متین صورت بنائے رُک رُک کر نماز پڑھنے۔ وقتاً فوقتاً وہ میری طرف دیکھتا جاتا تھا تاکہ اُس کو معلوم ہو جائے کہ میرے چہرہ سے پسندیدگی اور مسرّت ظاہر بھی ہوتی ہے یا نہیں اور مجھے اُس کی ہمّت افزائی کا کما حقہ خیال ہے۔

جب وہ نماز پڑھ چکا تو میں نے قہقہہ مارا اور اُسکو اپنے سینہ سے لگالیا۔

اُس کا چہرہ سرخ ہوگیا اور اُس نے میرے ہاتھوں کو بوسہ دیکر کہا "یہ تمہارا ہی اثر ہے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گویا میں اب پھر دس برس کا بچّہ بن گیا ہوں۔"

ہمارا مکان دیہات کے اُن قدیم مکانوں میں

سے تھا جس میں ایک خاندان کی کئی نسلیں آپس میں ادب و تعظیم اور ادب کے ساتھ زندگیاں بسر کر چکی تھیں، وہ سراپا اُس خاندان کی محبت اور سچائی کا آئینہ تھا۔ اور جب مجھے اُس میں رہنا پڑا تو یکایک وہ اگلی محبت اور صداقت میرے افسانۂ محبت کا ایک جزو بن گئی۔

مکان اُس قدیم طریقہ پر آراستہ تھا جسکو ٹاٹیانا پسند کرتی تھی۔ یہ نہیں کہا جا سکتا کہ مکان کی آرائش کا سامان خوبصورت اور بیش قیمت تھا لیکن ملازم، فرنیچر اور خوراک، غرض ہر چیز کی یقیناً بہتات تھی۔ ہر ایک چیز صاف ستھری، باقاعدہ اور تعجب انگیز تھی۔ استقبالیہ کمرہ عمدگی اور قرینہ کے ساتھ فرنیچر سے آراستہ تھا۔ دیواروں پر تصاویر آویزاں تھیں بھاری بھاری چاندی بیش قیمت نفیس قالین فرش پر بچھے ہوئے تھے۔

ملاقات کے کمرے میں پرانی وضع کا ایک بڑا پیانو رکھا ہوا تھا اور اُسی میں دو مختلف الوضع الماریاں اور ایک سیب کی میز تھی ٹاٹیانا کی عنایت سے میرا خلوت کدہ مختلف صدیوں اور وضع کے خوبصورت فرنیچر سے آراستہ تھا منجملہ دوسری چیزوں کے وہاں ایک قدیم محراب دار آئینہ بھی تھا جس پر نظر ڈالتے ہوئے مجھے ہمیشہ حیا آتی تھی، لیکن آخر کار یہ آئینہ مثل ایک قدیم دوست کے میرے لئے ایک محبوب شے بن گیا۔

ٹاٹیانا کی آواز مکان میں سُنائی نہ دیتی تھی۔ یعنی وہ بہت آہستگی کے ساتھ گفتگو کرتی تھی مگر ہر کام گھڑی کی رفتار کی طرح جاری رہتا تھا۔ اگرچہ مکان میں ضرورت سے زیادہ خادم موجود تھے مگر شور و غل کا نام نہ تھا۔ یہ تمام خادم بغیر ایڑی کے ملائم جوتے پہنتے تھے کیونکہ ٹاٹیانا جوتوں کی چرچراہٹ اور ایڑیوں کی کھٹ کھٹ کو بہت ناپسند کرتی تھی۔ تمام خادم اس مکان میں رہنے پر نازاں تھے اور وہ ضعیف العمر خاتون کے سامنے جاتے ہوئے خوف کھاتے تھے اور میرے شوہر سے اور مجھ سے بزرگانہ شفقت کے متمنی رہتے تھے۔ حقیقت میں وہ اپنے فرائض ایک عجیب انہماک کے ساتھ انجام دیتے تھے۔

مستقلاً ہر شنبہ کو مکان کا فرش دھویا جاتا اور قالینوں کو جھاڑا جاتا تھا۔ ہر ماہ کی پہلی تاریخ کو "نغمۂ تشکر" کی محفل منعقد ہوتی تھی اور متبرک پانی چھڑکا جاتا تھا۔ ہر بار جبکہ ٹاٹیانا اُس کے لڑکے یا میری سالگرہ کا دن آتا (اور میرے لئے پہلی بار اس موسم خزاں میں یہ دن آیا تھا) تو تمام ہمسائے مدعو کئے جاتے تھے اور یہ رسم ٹاٹیانا نے جب سے ہوش سنبھالا تھا برابر ہوتی چلی آئی تھی۔

میرا شوہر خانگی معاملات میں دخل نہ دیتا تھا اور صرف کھیتی باڑی اور ملازموں کی دیکھ بھال کرتا تھا۔

اور یہ کام اُس کے لئے بہت کافی تھا۔ موسم سرما میں بھی وہ بہت سویرے اُٹھتا اور عموماً میرے بیدار ہونے سے پہلے ہی باہر چلا جاتا تھا۔ وہ عام طور پر صبح کی چائے کے وقت واپس آتا تھا جس کو ہم تنہا پیتے تھے۔ اُس وقت کام کی تکان اور پریشانی کے بعد قریب قریب ہمیشہ اُس کے چہرہ سے ایک ایسی مسرت کی کیفیت کا اظہار ہوتا تھا جس کو ہم "وحشیانہ جوش و خروش" کے نام سے موسوم کیا کرتے تھے۔

اکثر میں اُس کو اس امر کی ترغیب دیتی کہ وہ اپنی صبح کی کارگذاری بیان کرے اور وہ ایسی خرافات بکتا کہ ہنستے ہنستے ہمارے پیٹ میں بل پڑ جاتے۔ بعض اوقات میں اس سے اصرار کرتی کہ مجھے حقیقی واقعات بتائے اور وہ ان خرافات سے باز رہ کر مجھے اصلی حالات سُناتا۔ میں اُس کی نگاہوں اور اُس کے لبوں کی حرکت کو دیکھتی اور مجھے کوئی بات یاد نہ رہتی کیونکہ میں تو صرف اُسکو دیکھنے اور اُس کی آواز سننے کی مشتاق رہتی تھی۔

وہ کہتا "اچھا جو کچھ میں نے کہا ہے اُسکو بیان کرو" اور میں اُس کی گفتگو کا پہلا لفظ بھی نہ بتا سکتی۔ یہ بڑی خرابی تھی کہ وہ مجھ سے سوائے ہمارے ذاتی معاملات کے کسی اور شے کے متعلق بھی کچھ نہ کچھ کہتا رہتا تھا۔ میں مشکل سے تمیز کر سکتی تھی کہ جو کچھ وہ کرتا رہتا ہے وہ کیا ہے؟

بہت عرصہ کے بعد میں اس کے کاموں کو سمجھنے اور ان میں دلچسپی لینے کے قابل ہوئی۔

ٹاٹیانا دوپہر کے کھانے کے وقت تک ہمارے پاس نہ آتی تھی، وہ صبح کی چائے تنہا پیتی تھی اور صرف ایک خادمہ کو ہمارے پاس بھیجتی تھی۔ ہماری مخصوص محویت اور مسرت سے لبریز مختصر دنیا میں ٹاٹیانا کا یہ پیغام بالکل عجیب اور ہمارے جذبات سے اسقدر مختلف ہوتا تھا کہ اکثر میں خادمہ کی گفتگو سُنکر بے اختیار ہنس پڑتی تھی۔ خادمہ دست بستہ ہوکر سنجیدگی کے ساتھ "ٹاٹیانا نے دریافت کیا ہے کہ کل کی تفریح کے بعد آپ کی طبیعت کیسی رہی اور اُس نے اپنے متعلق یہ اطلاع دی ہے کہ میں رات بھر درد میں مبتلا رہی اور ایک بیوقوف کتا ساری رات گاؤں میں بھونکتا اور میری نیند میں خلل انداز ہوتا رہا۔ اور اُس نے یہ بھی دریافت کیا ہے کہ آج کا کھانا کیسا پکا ہے۔ اور یہ کہا ہے کہ آج ٹارس نے کھانا نہیں پکایا بلکہ نکولشکا کو تجربہ کے لئے آج پہلی بار کھانا پکانے کی اجازت ملی تھی اور غالباً اُس نے کچھ برا کھانا نہیں پکایا خصوصاً پوریاں بہت عمدہ پکائی ہیں۔ مگر اسکے ساتھ ہی اُس نے سنبوسے بہت زیادہ پکائے ہیں"۔

دوپہر کے کھانے کے وقت تک ہم بہت کم ایک جگہ بیٹھتے تھے۔ میں اپنا دل بہلانے کی غرض سے

کتابوں کا مطالعہ کرتی تھی۔ وہ کچھ لکھتا رہتا یا دو بارہ باہر چلا جاتا تھا لیکن چار بجے جب ہم دوپہر کا کھانا کھا چکتے تو ملاقات کے کمرے میں چلے جاتے۔ ٹاٹیانا اپنے کمرہ سے باہر آتی، چند ملنے والے اور شریف نادار خواتین جن میں سے اکثر ہمارے یہاں رہتی تھیں، ہمارے پاس جمع ہو جاتیں۔ عموماً ہر روز میرا شوہر قدیم رسم کے مطابق دوپہر کے کھانے کے لئے جاتے وقت، اپنا ہاتھ اپنی ماں کے ہاتھ میں ڈال لیتا تھا مگر وہ اصرار کرتی تھی کہ وہ اپنا دوسرا ہاتھ میرے ہاتھ میں ڈال لے اور عموماً روزانہ ہم دروازہ میں پھنس جاتے تھے کیونکہ دروازہ ہم سب کے ایک ساتھ گذرنے کیلئے کافی کشادہ نہ تھا۔ اُس کی ماں کھانے کے وقت صدر میں بیٹھتی اور مؤدب و مہذب طریقہ سے گفتگو کا آغاز ہوتا چند الفاظ جو میں اور میرا شوہر ایک دوسرے سے کہتے وہ کھانے کے وقت کی صحبتوں میں بالکل مختلف ہوتے تھے۔ وقتاً فوقتاً ماں بیٹوں میں مباحثہ ہوتا اور وہ ایک دوسرے کو طعن آمیز کلام سے مخاطب کرتے تھے۔ مجھے خصوصیت سے ان مباحثوں اور طعن و تشنیع سے بھر پور گفتگو میں لطف آتا تھا کیونکہ یہ مباحثے اُس محبت کو جو دونوں کو ایک دوسرے سے تھی واضح کر دیتے تھے۔

دوپہر کا کھانا کھانے کے بعد ٹاٹیانا استقبالیہ کمرہ میں چلی جاتی اور اپنی بڑی آرام کرسی پر بیٹھکر تمباکو پیتی یا نئی خرید کردہ کتابوں کے اوراق کاٹتی۔ میں اور میرا شوہر یا تو بلند آواز سے کوئی کتاب پڑھتے یا ملاقاتی کمرہ میں جا کر پیانو سے دل بہلاتے۔ ہم ان ایام میں بہت زیادہ مطالعہ میں منہمک رہتے تھے۔ مگر موسیقی ہماری دلکشی اور اعلیٰ درجہ کی مسرت کا باعث تھی، ہمارے دل اس سے ہر بار تازہ لطف حاصل کرتے تھے اور اس کے ذریعہ سے ہمیں ایک دوسرے کے حالات سے بار بار واقفیت حاصل ہوتی تھی جب میں اُس کے پسندیدہ ترانے بجاتی تو وہ کمرہ کے ایک گوشہ میں صوفے پر جا بیٹھتا جہاں میں اُسکو بمشکل دیکھ سکتی تھی اور وہ بہت ہی حجاب کے ساتھ ان جذبات و تاثرات کو پوشیدہ رکھنے کی کوشش کرتا جو موسیقی سے پیدا ہوتے تھے، لیکن اکثر جبکہ اس کو میرے وہاں پہنچنے کی اُمید نہ ہوتی تھی میں پیانو کو چھوڑ کر اُس کے پاس پہنچ جاتی اور اُس کے چہرہ کے تاثرات کا مشاہدہ کرتی اور اُس کی آنکھوں میں ایک غیر فطری چمک اور نمی دیکھتی جس کو وہ مجھ سے پوشیدہ رکھنے کی بے فائدہ کوشش کرتا۔ ٹاٹیانا اکثر ہم کو ملاقاتی کمرہ میں دیکھنے کی خواہش کرتی لیکن وہ ہماری صحبت میں خلل انداز ہونے سے ڈرتی تھی۔ کبھی کبھی وہ ایک مصنوعی متانت اور سنجیدگی کے ساتھ ہماری طرف بغیر نظر اُٹھائے کمرہ سے گذر جاتی۔ مگر نہیں جانتی تھی کہ اس کا اپنے کمرہ میں جانے کی کوئی ضرورت نہیں اور اس لئے

جلد واپس چلی جاتی تھی۔

شام کے وقت میں وسیع ملاقاتی کمرہ میں بیٹھ کر چائے انڈیلتی اور گھر کے تمام آدمی ایکبار پھر دسترخوان پر جمع ہوجاتے۔ صیقل شدہ سماوار کے سامنے اس مبارک رسم کو ادا کرنے کیلئے بیٹھنے اور گلاسوں اور پیالوں کو تقسیم کرنے سے میں عرصہ تک پریشان رہتی مجھے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ میں ہنوز اس ذمہ داری کے قابل نہیں ہوں اور بڑے سماوار سے چائے انڈیلنا اور پیالوں کو طشتری میں رکھ کر یہ کہنا کہ "یہ پیٹر کے لئے ہے اور یہ ماریا منچنا کے لئے۔ پھر یہ دریافت کرنا کہ آیا یہ چائے خوشگوار ہے یا نہیں" بعد ازاں دایہ اور خادموں کے آگے شکر رکھنا میرے لئے تکلیف دہ تھا۔

میرا شوہر عموماً کہا کرتا تھا "بہت عمدہ ہے، بہت خوب ہے۔ تم تو اس طرح کام کرتی ہو جیسے کہ ایک نوعمر حسین خاتون کرسکتی ہے"، اور اس کے الفاظ مجھے ہمیشہ پہلے سے زیادہ پریشان کردیتے تھے۔

چائے نوشی کے بعد ٹاٹیانا یا تو اپنے خلوتخانہ میں چلی جاتی تھی یا ماریا منچنا سے جشین گو بیاں سنتی تھی۔ اس کے بعد وہ ہمکو بوسہ دیتی اور ہمارے اوپر صلیب کا نشان بناتی اور ہم اپنے کمرہ میں واپس چلے جاتے۔ تاہم عموماً ہم آدھی رات تک بیٹھے رہتے اور یہ سب سے بہتر اور پر لطف وقت ہوتا تھا۔ وہ اپنے گذشتہ واقعات بیان کرتا اور ہم نئی نئی تجاویز سوچتے۔ بعض اوقات ہم فلسفیانہ گفتگو کرتے اور حتی الامکان بہت ہی آہستگی کے ساتھ سرگرم کلام ہوتے تاکہ ہماری آواز بالاخانہ پر نہ سنی جاسکے اور ٹاٹیانا کو، جو جلد سو جانا پسند کرتی تھی، کسی قسم کا شبہ نہ پیدا ہو۔ بعض اوقات ہمیں بھوک معلوم ہوتی، ہم دبے پاؤں الماری کے پاس جاتے۔ نکیتا کی دور اندیشی کی بدولت رات کے کھانے کا بچا ہوا کچھ ٹھنڈا کھانا ملجاتا اور اُسے ہم اپنے خلوتکدہ میں بیٹھکر صرف ایک شمع کی روشنی میں کھالیتے ہیں۔ قدیم شاندار مکان میں، جس پر ٹاٹیانا کی شکل میں قدامت کی روح عرصہ سے حکمراں تھی، ہم مثل مہمانوں کے رہتے تھے۔ نہ صرف ٹاٹیانا بلکہ ملازم، قدیم کنیزیں، فرنیچر اور نقاشی کو دیکھکر میرے دل میں ایک عزت کا احساس اور ایک قسم کا خوف پیدا ہوتا اور میں سمجھتی کہ ہم اس صحبت میں رہنے کے قابل نہیں ہیں اور نیز ہمارا فرض ہے کہ ہم یہاں بہت محتیاط اور ہوشیاری سے رہیں۔

اب ان گذشتہ واقعات پر غور کرتی ہوں تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہم کو واقعی بہت زیادہ بے اطمینانی اور تکلیف ہوئی تھی۔ وہ سخت گیر اور اٹل قواعد اور مکان کے اندر جاسوسوں کا مجمع ہمارے لئے یقیناً موجب پریشانی تھا، لیکن اُس وقت اس پابندی سے ہماری محبت استوار ہوگئی

اُس نے یا میں نے کبھی کسی طرح اسکو ظاہر نہ ہونے دیا کہ ہم کو کسی چیز سے تکلیف پہنچتی ہے۔ بلکہ اسکے برخلاف اُس نے باوجود اس حقیقت کے کہ یہ باتیں ہم کو ناپسند تھیں استقلال کے ساتھ نظر انداز کر دیا تھا۔ ممنکا کا ملازم مٹری، جو تمباکو پینے کا بہت ہی شائق تھا، دوپہر کے کھانے کے بعد روزانہ اُس وقت جبکہ ہم ملاقاتی کمرہ میں ہوتے تھے۔ میرے شوہر کے دار المطالعہ میں جاتا اور اُس کی الماری سے تمباکو نکال لیتا تھا۔ اُس وقت سر جیائی کی وہ حالت قابل دید ہوتی تھی جب وہ ایک بے اندازہ خوشی کی حالت میں دبے پاؤں میرے پاس آتا اور مجھے آگاہ کرنے کے لئے اپنی اُنگلی کو حرکت دے کر اور آنکھ جھپکا کر مٹری کی طرف اشارہ کرتا جسکو کبھی خیال بھی نہ ہوتا تھا کہ سر جیائی کو کچھ شک ہو گیا ہے۔ اور جب مٹری بغیر ہماری طرف دیکھے ہوئے دل ہی دل میں اپنی کامیابی پر خوش ہوتا ہوا واپس چلا جاتا تو میرا شوہر کہتا "تم بہت خوبصورت ہو" اور میرا بوسہ لے لیتا۔

بعض اوقات اس چشم پوشی، معافی اور صریح لاپروائی سے مجھے تکلیف ہوتی۔ مجھے اس بات کا خیال نہ ہوتا تھا کہ مجھ میں بھی ایسی ہی کمزوریاں موجود ہیں، مگر میں اس کی اس چشم پوشی کو اس کی کمزوری سے تعبیر کرتی تھی۔ میں اپنے دل میں کہتی کہ "وہ مثل ایک ایسے بچہ کے ہے جو اپنی خواہش کے ظاہر کرنے کی جرأت نہیں رکھتا"

ایک بار جب میں نے اُس سے کہا کہ مجھے تمہاری کمزوری پر تعجب ہے تو اُس نے جواب دیا "آہ! میری پیاری!! کیا میرے لئے یہ مناسب ہو سکتا ہے کہ میں کسی پر ناراض ہوں جبکہ میں ہر طرح خوش ہوں؟ میرے لئے یہ بہت آسان ہے کہ میں لوگوں پر سختی کرنے کے بجائے اُن کو اپنی حسب منشا کام کرنے دوں۔ مدت ہوئی کہ میں اس سے مطمئن ہو چکا ہوں اور کوئی بھی ایسی حالت نہیں ہے جس میں خوش رہنا ناممکن ہو۔ دیکھو ہم کس قدر مسرور ہیں۔ میں کسی پر ناراض نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ میرے لئے کسی پر ناراض ہونے کے برابر کوئی دوسری بُری چیز نہیں ہے۔ کیا تم میرا کہنا باور کرو گی اگر میں کہوں کہ جب میں دروازہ کی گھنٹی سُنتا ہوں یا کوئی خط پڑھتا ہوں یا عموماً جب میں سو کر اُٹھتا ہوں تو مجھے خوف معلوم ہوتا ہے، اس لئے کہ میں زندہ رہنا چاہتا ہوں۔ ممکن ہے کہ کوئی تبدیلی پیدا ہو جائے کیونکہ موجودہ حالت کے مقابلہ میں کوئی چیز بہتر نہیں ہو سکتی"

میں نے اُس کے کہنے کا یقین کر لیا۔ لیکن اسکا مطلب میری سمجھ میں نہ آیا۔ یہ امر میرے لئے موجب مسرت تھا لیکن مجھے ایسا معلوم ہوا کہ حالات ایسے ہیں جیسے ہونا چاہئیں اور ان میں کوئی تغیر ممکن نہیں اور ہمیشہ سب آدمیوں کے ساتھ ایسا ہی ہوتا ہے۔ ممکن ہے کہ دوسری جگہ دوسری

قسم کی خوشی ہو جو شاید اس سے مختلف ہو لیکن اس سے زیادہ نہیں ہو سکتی۔

اس طرح دو ماہ گذر گئے۔ موسم سرما، کہرے، اور پالے کے طوفان کے ساتھ آ گیا اور باوجود اس کے کہ ہمارے اندر کسی نئی بات کا اضافہ نہیں ہوا۔ مجھے محسوس ہوا کہ ہم ہمیشہ کے لئے اپنی گذشتہ حالت پر مراجعت کر رہے وہ اب پہلے کی بہ نسبت اپنے کاموں میں زیادہ مصروف رہنے لگا اور مجھے فراموش کر دیا۔ اور میرا پہلا خیال پھر میرے ذہن میں آ گیا کہ اس کی روح میں ایک خاص دنیا آباد ہے جس میں میں داخل نہیں ہو سکتی۔

اُس کی اس مستقل بُردباری سے مجھے پریشانی ہونے لگی۔ میں اس سے پہلے کی بہ نسبت کم محبت نہ کرتی تھی اور نہ مجھے اس کی محبت سے کچھ کم مسرت ہوتی تھی، لیکن میری محبت سکون پذیر اور اُس کی ترقی مسدود ہو چکی تھی اور اب محبت کے علاوہ بے چینی کی ایک نئی کیفیت میرے دل و دماغ پر طاری ہو رہی تھی۔

اس تجربہ کے بعد کہ مجھے اُس سے محبت ہے محبت کا سکون پذیر ہو جانا ناخوشگوار معلوم ہوتا تھا۔ میں جو چاہتی تھی وہ ہیجان و اضطراب تھا نہ کہ پُرسکون زندگی کی خاموشی، اور بجائے متین خیالات کے میں ذاتی قربانی کو پسند کرتی تھی۔ میرے اندر ایک غیر محدود طاقت تھی جس کے لئے ہماری خاموش زندگی میں بروئے کار آنے کا میدان نہ تھا۔ میں دلگیر اور اُداس رہتی تھی اور اپنی اس حالت کو ایک بُری چیز کی طرح پوشیدہ رکھنے کی کوشش کرتی تھی اور مصنوعی ملائمت، اور خوشی کا اظہار کرتی تھی جس سے وہ خوف زدہ ہو جاتا تھا۔

اُس نے مجھ سے پہلے میری دماغی حالت کا اندازہ کر لیا تھا اور تجویز کیا کہ ہم کو شہر میں چلنا چاہئے۔ مگر میں نے اس سے التجا کی کہ کہیں نہ جاؤ اور اپنے طرزِ زندگی کو تبدیل نہ کرو اور اپنی مسرّت کو ضائع نہ ہونے دو۔ دراصل میں خوش و خرّم تھی لیکن یہ خیال میرے لئے تکلیف دہ تھا کہ اس عالمِ مسرّت میں میرے لئے کوئی محنت اور قربانی کرنے کا موقع نہ تھا۔ حالانکہ میں ہر امکانی محنت برداشت کرنے اور ذاتی قربانی کرنے کے لئے بیچین تھی۔ مجھے اُس سے محبت تھی اور میں دیکھتی تھی کہ میں اس کے لئے سب کچھ ہوں، لیکن میں چاہتی تھی کہ سب لوگ ہماری محبت کو دیکھیں میری خواہش تھی کہ کوئی شے ہماری محبت میں سدِّ راہ ہو اور میں پھر بھی اس کی محبت میں بیخود بنی رہوں۔

نہ صرف میرا دماغ بلکہ میرے جذبات بھی سرگرم عمل تھے۔ مگر ان سب سے مقدّم ایک دوسرا جذبہ یعنی جذبۂ شباب تھا۔ مجھے جدوجہد کرنے کی آرزو تھی اور ہماری خاموش زندگی میں اس کا امکان نہ تھا۔

خدا جانے اُس نے مجھ سے کیوں کہا تھا کہ ہمیں شہر میں سکونت اختیار کرنا چاہئیے جبکہ میری خواہش صرف اسیقدر تھی؟ اگر وہ مجھ سے ایسا نہ کہتا تو شاید میں سمجھ لیتی کہ جس جذبہ سے میں تکلیف اُٹھا رہی ہوں وہ لغو اور فضول ہے اور میں غلطی پر ہوں کیونکہ وہ قربانی کا موقع جس کی میں متلاشی تھی مجھے اپنے اس جذبہ کو دبانے میں حاصل تھا۔

باوجود اس کوشش کے کہ ایسا نہ ہو یہ خیال متواتر پیدا ہوتا گیا کہ شہر میں جاکر اس افسردگی اور دلگیری سے نجات حاصل کرنا میرے اختیار میں ہے۔ مگر اس کے ساتھ ہی یہ بات نامناسب معلوم ہوتی تھی کہ میں محض اپنی تفریح طبع کے لئے اس کو ان سب چیزوں سے جدا کردوں جن سے اُس کو محبت ہے۔

لیکن وقت گذرتا گیا، مکان کی دیواروں پر برف کے تودے جم گئے اور ہم ہمیشہ اور ہمیشہ کے لئے تنہا رہنے لگے۔ تاہم ہمیشہ ایک دوسرے کی نگاہ میں وہی تھے جو پہلے سے تھے، مگر باہر دوسری جگہ روشنی اور زندگی کے دائرہ میں مردوں اور عورتوں کے گروہ تکلیف و راحت کے مزے لے رہے تھے اور ہمارے خیال یا ہمارے حقیر وجود سے بے خبر تھے۔

میرے لئے یہ احساس سب سے زیادہ تکلیف دہ تھا کہ ہماری زندگی ہر روز ایک منجمد صورت اختیار کرتی جاتی ہے، ہمارے احساسات سرد پڑتے جاتے ہیں اور ایک خاموش و مطمئن طریقہ ہمارا جزو زندگی بن رہا ہے۔ صبح کو ہم خوش رہتے، دوپہر کو مؤدب ہو جاتے اور شام کو ایک دوسرے کے ہمدرد بن جاتے تھے۔

میں نے اپنے دل میں کہا کہ "اس کا خیال جو ہے کہ نیکی کرنا اور قابل احترام زندگی بسر کرنا اچھی بات ہے اور ایسا کرنے کیلئے ہنوز ہمارے پاس وقت ہے، لیکن کوئی بات تو ہے جس کی وجہ سے ہنوز میرے دل میں خواہشات کا دریا موجزن ہے۔"

یہ وہ بات نہ تھی جو میں چاہتی تھی۔ مجھے ایک ہنگامہ کی ضرورت تھی۔ جو کچھ میں چاہتی تھی وہ یہ تھا کہ جذبات زندگی کی رہنمائی کریں نہ کہ زندگی جذبات کی رہبر بنے۔ میں چاہتی تھی کہ اس کے ساتھ ایک عمیق غار کے کنارے جاؤں اور کہوں "دیکھو میں آگے قدم بڑھاتی ہوں اور میں اس میں کود پڑونگی، دیکھو میں کودتی ہوں اور اپنی ہستی کو برباد کرتی ہوں۔" اور میری تمنا تھی کہ اس وقت اُس کا چہرہ زرد پڑ جائے اور وہ اپنے مضبوط بازوؤں میں مجھے پکڑکر اُس غار سے پیچھے ہٹالے حتیٰ کہ میرا جوش دل سرد پڑ جائے اور پھر وہ مجھ کو جہاں چاہے لے جائے۔

ان حالات اور واقعات نے میری صحت پر بُرا اثر

کیا اور میں کمزور ہونے لگی۔ ایک دن صبح کو میری حالت معمول
سے زیادہ خراب تھی۔ وہ اپنے فرائض کو انجام دے کر
افسردہ و دلگرفتہ واپس آیا جو ایک غیر معمولی واقعہ تھا میں نے
اُس کی افسردگی کو فوراً معلوم کر لیا اور اس سے پوچھا کہ
کیا بات ہے لیکن وہ مجھ سے کچھ کہنا نہ چاہتا تھا اور
صرف اسقدر کہا کہ "اس وقت اس کے اظہار کا موقع
نہیں ہے اور نہ اس کے بیان کرنے کی ضرورت ہے"
مجھے بعد میں معلوم ہوا پولیس انسپکٹر ہمارے کاشتکاروں
کے پاس آیا اور میرے شوہر سے گستاخانہ برتاؤ کرنیکے
علاوہ کاشتکاروں سے ایک ناجائز مطالبہ کرتا تھا۔ اُس نے
اُن کو ڈرایا دھمکایا۔ میرے شوہر پر اس ناگوار واقعہ کا اب تک
اثر باقی تھا۔ وہ مغلوب الغیض ہو رہا تھا اور اس لئے اُسنے
مجھ سے اس کا ذکر کرنا پسند نہ کیا۔ لیکن مجھے معلوم ہوا کہ
وہ مجھ سے محض اس واسطے اس واقعہ کو بیان کرنا نہیں چاہتا
کہ میں ہنوز اُس کی نظر میں مثل اُس بچّہ کے ہوں جو اُسکے
معاملات میں حصّہ نہ لے سکتا ہو۔

میں نے اُس کی طرف سے مُنہ پھیر لیا اور اپنی
زبان سے کچھ نہ کہا اور ماریا منچا کو جو ہماری مہمان تھی چائے
پینے کیلئے بُلا بھیجا۔ چائے نوشی کے بعد جس کو میں نے
بعجلت ختم کیا تھا، ماریا منچا کو ساتھ لے کر ملاقاتی کمرہ میں
چلی گئی اور زور زور سے ادھر اُدھر کی ایسی بیکار باتیں کرنے
لگی جن سے مجھے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ وہ کمرہ میں آیا اور وقتاً
فوقتاً ہماری طرف نظر ڈالتا رہا۔ اس کے بار بار دیکھنے سے
میرے دل پر ایسا عجیب اثر ہوا کہ مجھے گفتگو کرنے اور
مسرور ہونے کی بہت خواہش ہوئی۔ ہر ایک بات جو میری
زبان سے نکلتی یا ماریا منچا کہتی مجھے ہنسنے پر مجبور کرتی تھی۔
بغیر کچھ کہے ہوئے وہ اپنے دار المطالعہ میں چلا گیا۔ اور باہر
سے دروازہ بھیڑ لیا۔ جیسے ہی وہ ہم سے اتنی دور ہو گیا کہ
میری آواز اُس کے کانوں تک نہ پہنچ سکتی تھی۔ میرا
جوش مسرت یکایک سرد پڑ گیا جس کا احساس ماریا منچا
کو بھی ہوا اور اُس نے مجھ سے حقیقت حال دریافت کرنے
کی خواہش کی۔

میں نے اُس کے سوال کا کچھ جواب نہ دیا، میں
صوفے پر بیٹھ گئی اور میرا دل بھر آیا۔

میں نے اپنے دل سے پوچھا "وہ میری اس
حرکت کی نسبت کیا خیال کرتا ہوگا، شاید ایک بیکار شے
جو اُس کے لئے ضروری معلوم ہوتی ہے لیکن جب وہ مجھ سے
کچھ کہیگا تو میں اُس کو بتاؤں گی کہ واقعی یہ محض لغو اور بیکار
ہے۔ نہیں، شاید وہ مجھے بیوقوف سمجھتا ہے اور اس لئے
خاموش رہکر مجھے ذلیل کرنا اور خود بالاتر رہنا چاہتا ہے لیکن
اگرچہ اس جگہ کوئی دلچسپی نہیں ہے اور مجھے لطف زندگی
حاصل کرنے اور ادھر اُدھر گھومنے کی خواہش ہے۔ تاہم میں

اُسی طرح حق پر ہوں جس طرح وہ خود ہے۔ میری آرزو ہے
کہ ہمیشہ ایک ہی جگہ ہمارا قیام نہ رہے تاکہ مجھے اس بات کا
احساس نہ ہو کہ ہمارا وقت کس طرح گذر رہا ہے۔ میں ترقی
کرنا چاہتی ہوں اور ہر روز بلکہ ہر گھڑی ایک نیا انقلاب
دیکھنے کی متمنی ہیں مگر وہ ایک ہی جگہ خاموشی کے ساتھ دن
گذارنا اور مجھے بھی پیچھے روکنا چاہتا ہے۔ اور یہ اس کے
لئے بہت آسان ہے کیونکہ شہر میں جانا ضروری نہیں ہے
بلکہ خود اُس کو میری ہی طرح ہو جانا چاہئے۔ ظاہر دار نہ بننا
چاہئے۔ نہ کسی کا سدِ راہ ہونا چاہئے بلکہ سادگی سے زندگی
بسر کرنا چاہئے۔ یہ وہی نصیحت تھی جو اس نے مجھے کی تھی
لیکن وہ اس پر عمل نہ کرتا تھا اور یہی بڑی مصیبت تھی۔
مجھے محسوس ہوا کہ میرا دل اُمڈ رہا ہے اور میں اُس
سے ناخوش ہوں۔ جوشِ دل کی اس نمائش نے میں کانپ
اُٹھی اور اپنی جگہ سے اُٹھ کر اُس کے پاس چلی گئی وہ اپنے
دار المطالعہ میں بیٹھا ہوا کچھ لکھ رہا تھا۔ جب اُس نے میرے
پاؤں کی چاپ سُنی تو بے التفاتی اور لاپروائی سے ایک
لمحہ کے لئے میری طرف دیکھا اور پھر لکھنے میں ہو گیا۔ اس
کے اس طرزِ عمل کو دیکھ کر مجھے ملال ہوا اور میں اُس کے
نزدیک جانے کے بجائے اس میز کے کنارے کھڑی
ہو گئی جس پر وہ لکھ رہا تھا اور ایک کتاب کھولکر ورق گردانی
کرنے لگی۔ ایک مرتبہ پھر وہ لکھتے لکھتے رُک گیا اور میری طرف

دیکھکر بولا "دلربا! تم کچھ خفا سی ہو"
میں نے افسردگی کے ساتھ اُس کی طرف دیکھکر
جواب دیا "تم کیوں پوچھتے ہو؟ کیا صرف رازجوئی کیلئے؟"
اُس نے دلکش اور محبت آمیز تبسم کے ساتھ اپنا
سر ہلایا مگر اس کے جواب میں فوراً ہی میرے لبوں پر تبسم
نہ نمایاں ہوا اور یہ پہلا موقع تھا۔
میں نے دریافت کیا "آج تم کو کیا تکلیف پہنچی
ہے تم مجھ سے کیوں چھپاتے ہو؟"
اُس نے جواب دیا "صرف ایک معمولی بات ہے
ایک معمولی ناگوار واقعہ۔ تاہم میں اب تم کو بتا سکتا ہوں۔ دو
کاشتکار شہر میں بلائے گئے ہیں ـــــ"
مگر میں نے اُس کو اپنی بات ختم کرنے کا موقع نہیں
دیا اور کہا
"جب میں نے چائے کے وقت تم سے دریافت
کیا تھا تو تم نے کیوں نہیں بتایا تھا؟"
"اس لئے کہ شاید میں کوئی ناشائستہ بات نہ کہہ بیٹھوں
کیونکہ اُس وقت میں غصہ میں تھا۔"
"لیکن میں تو اُسی وقت پوچھنا چاہتی تھی۔"
"کیوں؟"
"اس لئے کہ تم خیال کرتے ہو کہ میں تم کو کوئی مدد
نہیں دے سکتی"

اُس نے قلم ہاتھ سے رکھ دیا اور کہا "یہ کیا بات ہے؟ میں تو سمجھتا ہوں کہ تمہارے بغیر میری زندگی دشوار ہے۔ تم نہ صرف مجھے ہر کام میں مدد دیتی ہو بلکہ ہر کام تم خود کرتی ہو۔ تم کو ایسا خیال کیونکر پیدا ہوا؟" پھر اُس نے ایک قہقہہ مارا اور کہا "میں صرف تمہارے لئے زندہ ہوں، ہر ایک چیز مجھے اچھی معلوم ہوتی ہے، میں محض تمہاری موجودگی کی وجہ سے خوش و خرّم رہتا ہوں کیونکہ تم کو ضرورت ——"

"ہاں میں جانتی ہوں کہ میں مثل ایک محبوب بچّہ کے ہوں جس کو خاموش رکھنے کی ضرورت ہے" میں نے یہ ایسے لب ولہجہ میں کہا جس سے وہ پریشان ہوگیا اور در اصل پہلی بار میری دماغی حالت کا اندازہ کرکے اُس نے میری طرف گھُور کر دیکھا۔ میں نے پھر کہا "میں خاموش رہنا نہیں چاہتی، تمہارے پاس کافی سکون موجود ہے جو ہم دونوں کے لئے کافی ہے۔"

اُس نے میری بات کاٹکر اور اس خیال سے خوفزدہ ہوکر کہ جو کچھ میرے دل میں ہے میں کہہ ڈالونگی جلد جلد کہنا شروع کیا "اچھا، اب سُنو کہ کیا بات ہے اور بتاؤ کہ کس طرح اس کا فیصلہ کرسکتی ہو؟"

اگرچہ مجھے اس واقعہ کو سُننے کا بہت اشتیاق تھا مگر میں نے اس کی خودداری کو شکست دینے کی غرض سے کہا "میں اب سُننا نہیں چاہتی۔ میں زندگی سے تسخر کرنا پسند نہیں کرتی۔ میں اُسی طرح رہنا چاہتی ہوں جس طرح کہ تم۔"

اُس کا چہرہ جو ہمیشہ ہر جذبہ سے بہت جلد متاثر ہو جاتا تھا رنج وغم اور متانت کے جذبات کا آئینہ بن گیا۔ میں نے کہا "میں اُسی طرح زندگی بسر کرنا چاہتی ہوں جس طرح تم لیکن تمہارے ماتحت نہیں ——"

مگر اُس کے چہرہ پر کچھ ایسے آثار ملال پیدا ہوگئے کہ میری زبان رُک گئی۔ وہ تھوڑی دیر تک خاموش بیٹھا رہا۔ اُس نے دریافت کیا "بیشک تم میری ہم پلہ ہو۔ ہم دونوں میں فرق مراتب کیا ہے؟ بجز اس کے کہ مجھے پولیس اور کاشتکاروں سے سابقہ پڑتا ہے اور تم کو نہیں۔"

میں نے جواب دیا "نہیں صرف یہی فرق نہیں ہے"

اُس نے سلسلۂ کلام کو جاری رکھتے ہوئے کہا "خدا کے واسطے میرا مطلب سمجھو۔ میں جانتا ہوں کہ ہمارے لئے متفکر رہنا ہمیشہ تکلیف دہ ہے۔ مجھے زندگی کا کافی تجربہ ہے اور میں اس سے بخوبی واقف ہوں۔ مجھے تم سے محبت ہے اور در اصل اسی لئے میں تم کو پریشانی سے بچانے سے باز نہیں رہ سکتا۔ میری زندگی صرف تمہاری محبت پر منحصر ہے اور اس لئے تم میری زندگی کو متالم نہ بناؤ"

میں نے بغیر اُس کی طرف آنکھ اُٹھائے ہوئے کہا "تم ہمیشہ سچ کہتے ہو۔"

مجھے اس احساس سے افسوس ہوا کہ اس کی طبیعت پھر صاف و سکون پذیر ہو گئی ہے حالانکہ میرا دل ہنوز پریشان اور رنج و ملال سے پُر تھا اور میں اپنی اس حرکت پر پشیمان تھی۔

اُس نے کہا "دلربا! تم کو یاد ہو گیا ہے؟ سوال یہ نہیں ہے کہ آیا تم حق پر ہو یا میں بلکہ صورت حال اسکے برخلاف ہے۔ اچھا بتاؤ تم کو مجھ سے کیا شکایت ہے؟ بغیر سوچے سمجھے گفتگو نہ کرو، پہلے اچھی طرح غور کرلو اور پھر مجھکو بتاؤ کہ تمہارے دل میں کیا ہے۔ تم مجھ سے ناخوش ہو اور یقیناً تمہارے پاس اس کی کوئی معقول وجہ ہوگی لیکن مجھے بھی تو بتاؤ کہ میں کس طرح قابلِ الزام ہوں؟"

مگر جو کچھ میرے دل میں تھا میں اس کو کس طرح ظاہر کرسکتی تھی اس لئے کہ اُس نے میرے خیالات کا فوراً اندازہ کرلیا تھا؛ میں اُس کے سامنے پھر مثل ایک بچّہ کے تھی اور بغیر اُس کی رائے اور مرضی بنی کے کچھ نہ کرسکتی تھی۔ ان سب باتوں نے مجھے اور بھی غضبناک بنا دیا۔

میں نے کہا "مجھے تم سے کسی قسم کی شکایت نہیں ہے، البتہ عموماً ہر چیز مجھے تکلیف دہ معلوم ہوتی ہے اور میں اس کو پسند نہیں کرتی، لیکن تم کہتے ہو کہ ایسا ہی ہونا چاہیئے اور اس لئے تم حق بجانب ہو"

میں نے یہ کہا تو مگر اُس کی طرف نظر نہ کی۔ میں اپنے مقصد میں کامیاب ہو گئی، اُس کا سکوت غائب ہو گیا اور تکلیف و خوف کے آثار اُس کے چہرہ پر چھا گئے۔

اُس نے آہستگی کے ساتھ پریشان لہجہ میں کہا "میں تم سے التجا کرتا ہوں کہ میری بات کا جواب نہ دو بلکہ جو کچھ میں کہتا ہوں اُس کو سنو۔ آخر تم مجھے کیوں ستاتی ہو؟"

لیکن میں نے اس کے سلسلۂ کلام کو منقطع کردیا اور کہا "میں جانتی ہوں کہ تم حق پر ہو۔ بہتر یہ ہے کہ تم کچھ نہ کہو۔" میں نے پھر کہا "ہاں تم حق پر ہو" گویا بولنے والی میں نہ تھی بلکہ کوئی ناپاک روح میرے اندر بول رہی تھی۔

اُس نے کانپتی ہوئی آواز میں کہا "اگر تم کو معلوم ہوتا کہ تم کیا کر رہی ہو ——"

میں نے بے اختیار رونا شروع کیا اور میرا دل کچھ ہلکا ہوا۔ وہ میرے قریب بیٹھ گیا۔ مگر اپنی زبان سے کچھ نہ کہا۔ مجھے اس کی حالت پر افسوس ہوا، اپنی حالت پر شرمندگی ہوئی۔ میں نے اُس کی طرف نظر نہ کی، مجھے محسوس ہو رہا تھا کہ وہ میری طرف سرد مہری یا تشویش سے ضرور دیکھ رہا ہے۔ میں نے نگاہ اُٹھائی، اُس کی بلکل محبّت آمیز نظر میرے چہرہ پر اس طرح جمی ہوئی تھی کہ گویا وہ مجھ سے معافی کا خواستگار ہے۔ میں نے اس کا ہاتھ پکڑ کر کہا:-

"مجھے معاف کرو۔ مجھے خود معلوم نہ تھا کہ میں کیا کہہ رہی ہوں"

"ہاں، لیکن میں جانتا ہوں کہ تم نے کیا کہا اور جو کچھ تم نے کہا سچ کہا"

"میں نے پوچھا "کیا؟"

اُس نے کہا "ہم کو پیٹرسبرگ جانا چاہیئے کیونکہ یہاں ہماری دلبستگی کا کوئی سامان نہیں ہے"

میں نے جواب دیا "جیسی تمہاری مرضی"

اُس نے مجھے گلے لگا کر بوسہ دیا اور کہا "مجھے معاف کرو، میں تمہارا گنا ہگار ہوں"

اُس شام کو میں دیر تک اُس کی خاطر سے باجا بجاتی رہی اور جبتک وہ کمرہ میں اِدھر اُدھر ٹہلتا رہا تو مُنہ ہی منہ میں کچھ کہتا رہا۔ اُس کو گنگنانے کی عادت تھی اور میں اکثر اُس سے پوچھا کرتی تھی کہ وہ کیا کہہ رہا ہے۔ وہ ہمیشہ ذرا سے غور کے بعد جو کچھ وہ کہتا ہوتا یا اُس کے مشابہ کوئی بات سُناتا۔ عموماً وہ کوئی شعر پڑھتا اور کبھی کبھی کوئی خوفناک بات کہتا۔ لیکن اس سے مجھے اندازہ ہو جاتا تھا کہ اسکا خیال کیا ہے۔

میں نے اُس سے پوچھا "تم آپ ہی آپ کیا کہہ رہے ہو؟"

وہ ٹہلتے ٹہلتے رُک گیا اور تھوڑی دیر غور کرنے کے بعد مُسکرایا اور لرمنٹف کا ایک شعر پڑھا جسکا مطلب یہ تھا۔

"وہ بیوقوف ہے جو ہنگامہ آرائی کا خواہشمند ہے اور سمجھتا ہے کہ ہنگامہ میں سکون قلب حاصل ہو جائے گا"

میں نے اپنے دل میں کہا "بیشک، اس کی حیثیت ایک آدمی سے بالا تر ہے، وہ ہر ایک بات جانتا ہے اُس سے محبت نہ کرنا کس طرح ممکن ہے"

میں آگے بڑھی، اُس کا بازو تھام لیا اور اُسکے ساتھ ٹہلنے اور اُس کے برابر چلنے کی کوشش کرنے لگی۔

اُس نے میری طرف دیکھتے ہوئے مُسکرا کر کہا "اچھا!"

"ہاں اچھا" میں نے آہستگی سے جواب دیا اور عجیب مسرت اور شادمانی نے ہم کو گھیر لیا۔ ہم لمبے لمبے قدم رکھتے ہوئے پنجوں کے بل، تمام کمروں میں دوڑتے پھرے اور ملاقاتی کمرے میں پہنچکر ٹھہر گئے اور ایک دوسرے کی طرف دیکھ کر ہنسنے لگے۔ ہماری اس حرکت پر گریگوری ناراض ہوا اور ٹاٹیانا کو بھی تعجب ہوا جو استقبالیہ کمرہ میں بیٹھی ہوئی تاش کھیل رہی تھی۔

دو ہفتہ کے بعد کرسمس سے پہلے، ہم پیٹرسبرگ پہنچ گئے +

(باقی باقی)

راز چاندپوری

غزل

زینت افزائے نظر جلوۂ رعنائی ہے
محو دیدار بھی مصروفِ خود آرائی ہے

خود نہیں تجھ کو خبر کون تماشائی ہے
خود فراموش تری شانِ خود آرائی ہے

کھِل گیا غنچۂ دل غنچۂ گُل کی صورت
کھلکھلاتی ہوئی گلشن میں بہار آئی ہے

تم تو کیا اب مجھے آتا نہیں اپنا بھی خیال
غفلت آباد مرا عالمِ تنہائی ہے

آہ جب دستِ جنوں سلسلہ جُنباں نہ رہا
تو سُنا ہم نے کہ گلشن میں بہار آئی ہے

ناصحو نشۂ مے ہے مجھے ہر موجِ شباب
کس طرح آپ میں آؤں کہ بہار آئی ہے

ہو گیا ترکِ تعلق سے اسیرِ خلوت
مجھکو گھیرے ہوئے ہنگامۂ تنہائی ہے

جلوۂ ساقیٔ فطرت کا ہوں دیوانہ میں
ساغرِ بادہ مجھے لالۂ صحرائی ہے

مقتلِ عشق سے بچ کر نہ گیا کوئی ہنر
اور تجھکو بھی یہاں آج قضا لائی ہے

پورن سنگھ ہنر

تخئیل

دیوانہ و عاشق و سخنور
تخئیل کے سر بسر ہیں پیکر

دیوانے کی چشمِ وحشت آگیں
ہے دیکھتی ہر طرف شیاطیں

عاشق، مبتلا جو وہم کا ہے
دیو اُس کی نظر میں مہ لقا ہے

حیرت آلودہ چشمِ شاعر
ہے فرش سے تا بہ عرش سائر

تخئیل کے زادگانِ موہوم
لوگوں کی نظر سے جو ہیں معدوم

دیتا ہے اُنہیں بصد لطافت
شاعر کا قلم کمالِ صورت

اشکال جو نیست ہیں سر دست
لیتی ہیں پہن وہ جامۂ ہست

(شیکسپیئر) محروم

آخری ارمان

مارس لیبلانک کے افسانے جیوش لیمپ کا ترجمہ

(بسلسلۂ گذشتہ)

آفتاب سطح دریا پر تیزی کے ساتھ چمک رہا تھا۔

کشتی سوار نے اپنی بڑی ٹوپی کا سایہ لیکر مچھلی کا شکار شروع کردیا تھا۔ اُس کی جاکٹ اور واسکٹ تہ کی ہوئی قریب رکھی تھیں۔ اُس کی ڈوگ اور پر سطح آب پر اِدھر اُدھر ہل رہا تھا۔ اور وہ بہت غور کے ساتھ کھٹکار کو دیکھتا جاتا تھا۔

ایک منٹ گذر گیا۔۔۔۔ مگر کیسا منٹ۔۔۔۔ جو بلا کی مُہیب وحشت خیز خاموشی سے پُر تھا۔

"اوہ۔ کیا یہ وہی ہے؟" شیرز کے دل میں یہ اذیت دہ خیال پیدا ہوا۔ اور یکایک اُس پر ساری حقیقت واضح ہوگئی۔

"یہ وُہی ہے۔ یقیناً وہی ہے۔ صرف وہی جو اس طرح کسی گھبراہٹ اور پریشانی کا اظہار کئے بغیر میرے سامنے بیٹھ سکتا ہو اور کسی قسم کے خوف و خدشہ سے متاثر نہ ہو۔ علاوہ بریں کتاب کی تصویروں کا حال اُس کے سوا دوسرا کون جان سکتا ہے۔ الا اُس نے ضرور کسی قاصد کے ذریعہ اُس کو تمام حالات سے آگاہ کردیا۔"

یکایک انگریز جاسوس کو محسوس ہوا۔ کہ اُس کے ہاتھ آپ سے آپ پستول کے کنڈے کو پکڑ لیا۔ اور معاً اُسکی آنکھیں اُس شخص کی پُشت پر ٹھیک گردن کے نیچے نشانہ لیکر جم گئیں۔ صرف ایک جنبش۔ اور فیصلہ ہے۔ ذرا گھوڑا دبانے کی دیر تھی۔ کہ اس عجیب و غریب انسان کی زندگی کا وہیں خاتمہ ہوجاتا۔

مگر کشتی سوار نے ذرا بھی حرکت نہ کی۔

شیرز نے خشمگیں انداز سے اپنے پستول کو فیر کرنے کی نیت سے اُٹھالیا۔ اور قریب تھا۔ کہ فیر کردے۔ مگر یکایک کسی خیال یا اس فعل کے ارتکاب کی ہیبت نے جس کو وہ دل سے ناپسند کرتا تھا۔ اُسے روک دیا۔ موت یقینی تھی۔ سارا کھیل بگڑ جاتا۔

"اوہ" اُس نے دل میں کہا۔ "اس کو ذرا اُٹھنے دو۔ تاکہ اپنی حفاظت کرلے۔ اگر نہیں۔ تو وہ صرف

اپنی ذاتی بیوقوفی کو الزام دے سکتا ہے۔ میں بری الذمہ ہو جاؤنگا۔۔۔ بس ایک سکنڈ اور۔۔۔۔۔ نہیں تو فیر کر دونگا۔۔۔۔" عین اُسی وقت قدموں کی چاپ سُنکر اُس نے اپنا سر موڑا۔ اور کیا دیکھتا ہے۔ کہ انسپکٹر گنیمارڈ معہ دوسرے مددگاروں کے آرہا ہے۔

معاً اپنا خیال بدل کر اُس نے جست کی۔ اور ایک ہی چھلانگ میں کشتی کے سکون کو جنبش میں بدلتا ہوا اُس شخص پر جا پڑا۔ اور اُس کو نہایت مضبوطی کے ساتھ دونوں ہاتھوں سے تھام لیا۔ کشمکش میں دونوں کشتی کی تہ میں گر پڑے۔

"کیا خوب" لوپن نے اپنے کو چھڑانیکی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ "اچھا پھر اس دھر پکڑ کا کیا مطلب فرض کیجے کہ ہم میں سو ایک کسی دوسرے پر حاوی ہو جائے تو کیا فائدہ۔ ابھی ہمیں اتنا معلوم نہیں۔ کہ آپکو میرے ساتھ یا مجکو آپ کے ساتھ کیا سلوک کرنا ہے۔ یہاں ٹھہر کر ہم دونوں بالکل بیوقوفوں کی طرح وقت ضایع کریں گے"

دونوں چپو پانی میں ڈالدیے گئے کشتی چلنے لگی۔ ساحل پر صدہا لوگوں نے چیخنا چلانا شروع کر دیا۔ اس طرف لوپن کہنے لگا:۔

"میرے مہربان یہ آخر یہ کیا ہو رہا ہے۔ کیا آپ نے ہر بات میں عقل سے کام لینا ختم کر دیا۔۔۔۔ یہ عمر۔۔۔ اور یہ بیوقوفی کی باتیں۔ لاحول ولاقوۃ۔۔۔۔۔۔ اے حضرت۔۔۔۔۔ کچھ ہوش کی دوا کیجئے۔۔۔۔۔۔ آپ کو شرم آنی چاہئے"

لوپن نے اپنے کو آزاد کر لیا۔

دوبارہ پکڑنے کا ارادہ ترک کر کے پریشانی و غصہ کی حالت میں شیرز نے اپنا ہاتھ جیبوں میں ڈالا۔ اور غصہ میں قسمیں کھانے لگا۔ اسی اثنا میں لوپن اُس کا پستول چھین کر اپنے قبضہ میں کر چکا تھا۔

شیرز نے اپنے گھٹنے خم کر دیئے۔ اور ایک چپو پکڑ کر کشتی کو کنارے کی طرف کھینے کی کوشش کی۔ اور اُس طرف لوپن نے دوسرا چپو لیکر سر توڑ کوشش کی کہ کشتی کو دھار میں گھسیٹ لے جائے۔

"فتح۔۔۔۔۔ یا شکست۔۔" لوپن نے کہا "بہر حال اس سے کوئی خاص فرق پیدا نہیں ہوتا۔ اگر آپ کشتی کے چلانے میں زور لگا رہے ہیں۔ تو میں بھی حتی الامکان کوشش کر رہا ہوں۔۔۔ یہی ہم اور آپ کر سکتے ہیں۔۔۔ اس واسطے کہ دَور زندگی میں ہم ایک کوشش بلا کسی پس و پیش کے شروع کر دیتے ہیں۔۔۔ مگر فیصلہ ہمیشہ قسمت کے ہاتھ ہوتا ہے۔۔۔۔ آپ دیکھتے ہیں۔۔۔ وہی قسمت آج بھی اپنے دیرینہ دوست ارسین لوپن ہی کے حق میں فیصلہ کر رہی ہے۔۔۔۔ فتح۔۔۔۔۔ پانی کا بہاؤ مجھے

مدد دے رہا ہے ۔ ۔ ۔ "

واقعی کشتی کنارے سے دور ہوتی جاتی تھی۔

" ذرا آنکھ اُٹھا کر دیکھ تو لیجئے" پولن نے چلاّ کر کہا۔

کنارے پر کسی شخص نے پستول کا نشانہ لیا۔ پولن نے فوراً سر جُھکا لیا۔ ایک فیر سُنائی دیا۔ اُن کے چاروں طرف کا تھوڑا سا پانی اُچھل گیا۔ پولن نے زور کا قہقہہ لگایا۔

" خدایا ۔ ۔ ۔ تیری مدد ۔ ۔ ۔ یہ ہمارا دوست مسٹر گنیمارڈ ہے۔ اوہو مسٹر گنیمارڈ ۔ ۔ ۔ دیکھئے آپ سخت غلطی کر رہے ہیں ۔ ۔ ۔ ذاتی حفاظت کی ضرورت کے بغیر آپ کو فیر کرنے کا کوئی حق نہیں۔ کیا غریب آرسین لوپن نے آپ کو اس درجہ غضبناک بنا دیا ہے۔ کہ آپ اپنے فرائض تک بھول گئے ۔ ۔ ۔ اُف دیکھئے۔ وہ دوبارہ تیار ہو رہا ہے۔ لیکن او بدبخت انسان ذرا ہوشیاری سے کہیں میرے دلی دوست شیرز کو نشانۂ ہلاکت نہ بنا دینا" اُس نے شیرز کو اپنے جسم کی آڑ میں چھپا لیا اور کشتی میں کھڑا ہو کر گنیمارڈ کی طرف رُخ کر لیا۔

" ہاں اب میں مطلق پروا نہیں کرتا۔ ارے میاں گنیمارڈ ۔ ۔ ۔ لو ۔ ۔ ۔ یہاں نشانہ لگاؤ۔ سیدھا میرے دل پر ۔ ۔ ۔ ذرا اونچا ۔ ۔ ۔ بائیں جانب ۔ ۔ ۔ دوبارہ خطا نہ ہو ۔ ۔ ۔ بات تیری بیوقوف کی ۔ ۔ ۔ ایک دوسرا فیر اور سہی ۔ ۔ ۔ لیکن حضرت آپ تو کانپ رہے ہیں۔ اچھا بس ۔ ۔ ۔ ہوشیار باش ۔ ۔ ۔ میں بالکل تیار ہوں ۔ ۔ ۔ ایک ۔ ۔ ۔ دو ۔ ۔ ۔ یہ تین ۔ ۔ ۔ "

فیر ہوا۔ مگر پھر خالی گیا"

" ان سب کو پھینک دو۔ توڑ ڈالو ۔ ۔ ۔ کیا سرکار آپ لوگوں کو بجائے پستول کے کھلونے پکڑا دیتی ہے "

لوپن نے ایک لانبا وزنی اور چپٹا ریوالور نکالا۔ اور بلا نشانہ کئے گولی چلا دی۔

انسپکٹر گنیمارڈ نے اپنا ہاتھ سر کی طرف بغرض حفاظت اُٹھایا۔ مگر گولی اُن کی ٹوپی میں سوراخ کرتی ہوئی نکل چکی تھی۔

" مسٹر گنیمارڈ ۔ ۔ ۔ کہئے۔ اس کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے۔ یہ کچھ عمدہ ساخت کا ہے چونکہ یہ ہمارے کرمفرما و شریف دوست مسٹر ہملاک شیرز کے پستول کی گولی ہے۔ اس لئے صرف ٹوپی اُڑاتی ہے۔ اگر میرے پستول کی ہوتی۔ تو آپ سمجھ سکتے ہیں۔ آپ کے بھیجے کا پتہ نہ لگتا" اور اُس نے پستول کو گھما کر کنارہ کی طرف پھینک دیا۔ جو انسپکٹر صاحب کے پیر کی داہنی جانب آ کر گرا۔

فیسرز بھی انداز تعریف سے مسکرادیا۔ اور دل ہی دل میں کہنے لگا۔ سبحان اللہ... کتنی پیاری زندگی ہے اور کس درجہ خالص و پاک مسرت! پھر اس سے لطف اندوز ہونے والے کا کیا کہنا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ خطرناک مواقع ہی اس کو ایک طبعی خوشی پہنچاتے ہیں یا اس عجیب و غریب ہستی کا واحد مقصد صرف یہی ہے کہ خطروں کی تلافی کرے۔ جو اس کے لئے حصول مسرت کا ذریعہ ہیں۔

اسی اثنا میں صدہا آدمی دریا کے دونوں کناروں پر جمع ہو گئے...

گیلمارڈ اور اس کے ہمراہی کشتی کا پیچھا کر رہے تھے۔ جو پانی کے بہاؤ کی طرف لہروں کے ساتھ آہستہ آہستہ چل رہی تھی۔ یہ امر یقینی تھا کہ یہ گرفتاری سے ہرگز نہ بچ سکتی تھی۔

"مشفق من۔ خیال تو کیجئے"۔ لوپن نے انگریز جاسوس کی طرف مخاطب ہو کر زور سے کہا۔ "کہ اگر اس وقت ٹرانسوال کی کل کانوں کا سونا بھی آپ کے سامنے پیش کیا جائے۔ تو بھی آپ اپنی جگہ سے ہٹ نہیں سکتے۔ آپ اس وقت پہلی قطار میں ہیں۔ لیکن اوّل اور سب سے پہلے۔ وہ تمہید یا دیباچہ جس کے بعد ہم دونوں سیدھے آخری ایکٹ میں قدم رکھیں گے۔ وہ

کیا ہے؟ آرسین لوپن کی گرفتاری یا بچ نکلنا... اس لئے عزیز دوست۔ میری آپ سے صرف ایک عرض ہے اور میں پُرزور التجا کرتا ہوں۔ کہ آپ اس کا جواب ہاں یا نہیں میں دیکر جملہ شکوک کا خاتمہ کر دیجئے.... میں کہتا ہوں۔ کہ آپ اس چوری کے معاملہ میں دلچسپی لینا چھوڑ دیجئے۔ ہنوز وقت ہے۔ اور میں اب بھی اس قابل ہوں کہ اُن تمام نقصانات سے جو آپنے کئے ہیں۔ درگذر کروں بعدہٗ میں بالکل مجبور ہو جاؤنگا۔ کہئے۔ آپ راضی ہیں؟"

"نہیں"

لوپن کے چہرہ پر مایوسی چھا گئی۔ یہ ضد اُسکو بہت تکلیف پہنچا رہی تھی۔ اُس نے پھر کہا "میں اصرار کرتا ہوں۔ اپنے لئے نہیں۔ صرف آپکی خاطر... اس لئے کہ مجھے یقین کامل ہے۔ کہ اس معاملہ کے آشکار ہونے پر سب سے پہلے شخص آپ ہونگے۔ جو اپنی بیجا دخل اندازی اور حماقت پر دست تاسف ملیں گے۔ ایک بار اور غور کیجئے.... کہئے... ہاں یا نہیں؟"

"نہیں"

لوپن نے زور سے اپنے پیروں کو پٹکا۔ اور کشتی کے حصۂ زیریں کے تختوں میں سے ایک کو علیحدہ کیا۔ اور چند منٹ تک اُس میں پیر سے کچھ کرتا رہا۔ جس کو شیرز نہیں دیکھ سکا۔ اس کے بعد وہ پھر اُٹھ کر انگریز جاسوس

کے پہلو میں بیٹھ گیا۔ اور یوں گویا ہوا۔
"میں یقین کرتا ہوں۔ کہ میں اور آپ دریا پر ایک
ہی غرض سے آئے تھے۔ یعنی اُس چیز کی تلاش میں
جس سے برتسن نے چھٹکارا حاصل کیا تھا۔ کیوں حضرت۔
میں صحیح عرض کرتا ہوں نا؟ میں نے اپنے چند دوستوں
سے ملنے کا وعدہ کر لیا تھا۔ اور یقین جانئے۔ کہ میں
نے دریائے سین کے اندر گہرائی میں کچھ دیر سیر کرنے کا
پہلے ہی سے تہیہ کر لیا تھا۔ جس کا ثبوت یہ ہے کہ میں
اپنے کپڑے علیحدہ کر چکا تھا کہ یکایک میرے دوستوں
نے آپ کے پہنچنے کی اطلاع دی۔ میں حلفیہ عرض کرتا
ہوں۔ کہ یہ اطلاع پانے پر مجھے ذرا بھی تعجب نہیں ہوا
میں آپ کو یقین دلاتا ہوں۔ کہ آپ کی تفتیش کی
کامیابی کی اطلاع اور خبر مجھکو ہر لحظہ پہنچتی رہتی تھی۔ اور
یہ بہت ہی آسانی کے ساتھ۔ یعنی جوں ہی کوئی بات میرے
متعلق رومریلو سے کہی گئی۔ اور اُنہوں نے فوراً مجھے مطلع
کیا۔ چنانچہ میں تمام و کمال واقف ہوں۔ اب آپ سمجھ
سکتے ہیں۔ کہ ان حالات میں ۔ ۔ ۔ ۔"

وہ رُک گیا۔ اس طرف وہ تختہ جس کو اُس نے
علیحدہ کیا تھا۔ کچھ تھوڑا سا اوپر اُٹھ آیا۔ اور پانی کے قطرات
کشتی کے اندر داخل ہونے لگے۔

"لاحول ولا قوۃ۔ میں نہیں سمجھتا۔ کہ اس کا کیا
انتظام کروں ۔ ۔ ۔ غالباً یہ بات ہے۔ کہ اس پرانی کشتی
کی تہ میں کوئی سوراخ ہو گیا ہے۔ کیوں مشفق من آپ
کچھ ہراساں تو نہیں؟"

شیرز نے اپنے شانوں کو حرکت دی۔ اور لوپن
نے اپنا سلسلۂ کلام یوں جاری رکھا۔

"ہاں تو آپ سمجھ سکتے ہیں۔ کہ ان حالات میں
یہ جانکر۔ کہ میں جسقدر اس معاملہ کو نظر انداز کرنیکی کوشش
کرونگا۔ اُسیقدر زیادہ آپ سختی کے ساتھ مقابلہ کے لئے
خواہشمند ہونگے ۔ ۔ ۔ میں اس خیال سے خوش تھا کہ
میرے آپ کے درمیان جنگ چھڑ جائے۔ اور اس
امر کو مدنظر رکھتے ہوئے کہ ہر بات میرے قبضہ میں ہے
نتیجہ بہرصورت میرے حق میں تھا۔ چنانچہ فطرتاً میری
خواہش یہ ہوئی۔ کہ ہم لوگ ایک بھاری مجمع کے سامنے
ایک دوسرے سے علیحدہ ہوں تاکہ آپ کی شکست
علانیہ طور پر ظاہر ہو جائے۔ اور خواہ کومٹی ڈی کروزن ہو
یا بیرن ڈی ایمبلولی۔ کوئی بھی میرے مقابلہ میں آپکی
مدد کا خواستگار نہ ہو ۔ ۔ ۔ اور اُس وقت تمام مجمع میں
میرے عزیز دوست۔ کسی کو بھی یہ دیکھنے کی زحمت
نہ ہو کہ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

اُس نے خود ہی قطع کلام کر دیا۔ اور اپنے نیم بند
ہاتھوں کو دوربین کی طرح آنکھوں پر لگا کر ساحل کی طرف

غور سے دیکھا۔

"خدا کی قسم۔ بھئی واہ۔ اُنہوں نے ایک شاندار کشتی کرایہ پر لی ہے۔ ایک بہت ہی باقاعدہ جنگی کشتی اور اُسے بڑی تیزی سے چلا رہے ہیں۔ .... یقیناً یہ لوگ پانچ منٹ میں یہاں پہنچ جائیں گے اور میری تباہی ناگزیر ہو جائیگی۔ .... مسٹر شیرز مناسب تو یہ معلوم ہوتا ہے۔ کہ آپ مجھ پر ٹوٹ پڑیں۔ اور پھرتی سے ہاتھ پیر باندھ کر۔ مجھے میرے ملکی قانون کے حوالہ کر دیں۔ .... یا پھر کیا یہ موزوں نہیں۔ کہ جبتک ہماری کشتی تباہ ہو۔ اس قلیل عرصہ کو کارآمد بنا لیا جائے۔ اور ہم باہم ایک دوسرے کو آخری وصیت کریں۔ فرمائیے۔ آپ کی کیا رائے ہے"

دونوں کی آنکھیں چار ہوئیں۔ اس مرتبہ لوپن کی حرکات شیرز کی سمجھ میں آئیں۔ کہ اُس نے خود کشتی کی تہ میں سوراخ کر دیا تھا۔ پانی برابر بھرتا آتا تھا۔ جوتوں کے تلے تو درکنار۔ اب اُن کے پیر بھی ڈوب گئے۔ مگر دونوں خاموش بیٹھے رہے۔

لیجئے۔ پانی ٹخنوں کے اوپر آ گیا۔ انگریز جاسوس نے اپنا تمباکو کا ڈبہ نکالا۔ اور ایک سگریٹ تیار کر کے جلائی لوپن نے کہا۔

"میرے مہربان دوست۔ اس تعاقبی جدوجہد کا مطلب اس سے زیادہ اور کچھ نہیں۔ کہ میں آپ کے مقابلہ میں اپنی کمزوری کا اقرار کر لوں۔ اور یہ گویا آپ سے شکست کھا جانے کے برابر ہے۔ کیونکہ آجتک میں نے صرف اُن مقابلوں کو پسند کیا ہے جس میں میری فتح و کامیابی یقینی ہو۔ اور مجھے میدان میں آ کر سامنا کرنے کی زحمت نہ گوارا کرنی پڑے۔ میں اسکا ضرور قائل ہوں کہ صرف ہلاک شیرز ہی ایک ایسا شخص ہے۔ جس کا مجھے کچھ خیال ہوتا ہے۔ میں معترف ہوں کہ جبتک وہ میرے راستہ سے نہ ہٹ جائے۔ پریشانیاں میرا پیچھا نہیں چھوڑتیں۔ خیر۔ عزیز دوست۔ .... خوش قسمتی سے آج بھی ایک ایسا موقعہ مل گیا۔ کہ میں آپ سے کھل کر گفتگو کر سکوں۔ .... مگر دیکھئے تو۔ کہنا بھی کیا ہے۔ .... ایک وصیت۔ .... افسوس تو صرف اسی بات کا ہے کہ گفتگو بھی ہوئی تو کب .... ہمارے پیر پانی میں ڈوبے ہوئے ہیں۔ .... میں خوب جانتا ہوں۔ کہ یہ صورت حال آپ کے شایان شان نہیں۔ مگر۔ .... ارے ہاں۔ تو میں کیا کہہ رہا تھا۔ .... پیر ڈوبے ہوئے۔ .... نہیں۔ .... بلکہ ٹخنے۔ ...."

واقعی پانی اُس تختہ تک پہنچ چکا تھا۔ جس پر یہ لوگ بیٹھے ہوئے تھے۔ اور کشتی ڈوبتی جاتی تھی۔

شیرز اپنی سگریٹ منہ میں دبائے اطمینان سے

آسمان کی طرف نظر کئے بیٹھا رہا۔۔۔ خدایا۔۔۔ کیا لوپن کی نظروں میں باوجود ان خطرات میں گھرا ہونے۔۔۔ مجمع کا مرکز نظر بننے۔۔۔ اور پولیس کی جماعت کو تعاقب میں پانے پر بھی۔ مذاق کا بحال رکھنا ضروری ہے۔ کیا دُنیا میں کوئی شے بھی ایسی نہیں جو اس کو ذرہ برابر اضطراب ظاہر کرنے پر مجبور کر سکے۔

"کیا!۔۔" دونوں کی زبان سے یک بیک نکلا "کیا لوگ ایسی ذرا ذرا سی باتوں سے گھبرا جایا کرتے ہیں۔۔۔ استغفر اللہ۔۔۔ کیا دریا میں غرق ہو جانا روزانہ پیش آنے والی باتیں نہیں۔۔۔ کیا یہ اس قسم کا واقعہ ہے۔۔۔ جس پر اتنا غور مچایا جائے۔۔"

ایک نے بڑبڑانا۔ اور دوسرے نے سُننا شروع کیا۔۔۔ یہانتک کہ دونوں نے اپنی خودداری برقرار رکھنے کے لئے ایک ہی قسم کے پردے نقاب کی آڑ لی۔۔۔ اور وہ کیا۔۔۔ خطرہ سے انتہائی لاپروائی۔۔۔

اب کشتی ڈوبنے میں منٹوں کی دیر رہ گئی۔

"خاص بات"۔ لوپن کہنے لگا۔ "یہ معلوم کرنا ہے کہ آیا ہم لوگ ان قانونی بہادروں کے آنے سے قبل ڈوبینگے یا بعد میں۔ اسی پر سب کچھ منحصر ہے۔۔۔ کیونکہ کشتی کی تباہی کا سوال اب قطعی ہے۔ عزیز دوست۔ وہ نازک موقعہ آگیا کہ ہم باہم دگر اپنی اپنی آخری وصیتیں کریں۔ میں اپنا کل ذاتی اثاث البیت اور ترکہ سلطنت برطانیہ کے ایک باشندے موسومی ہملاک شیرز کے نام چھوڑتا ہوں۔ لیکن۔۔۔۔ واللہ۔۔۔ یہ قانونی گرگے کسقدر تیزی سے اس طرف آرہے ہیں۔ واہ بے گدھو۔ تم لوگوں کی طرف دیکھنا بھی دلچسپی سے خالی نہیں۔۔۔ کیسے نپے تلے ہاتھ اُٹھ رہے ہیں۔۔۔ آہا۔۔۔ ذرا سرجنٹ فالنفانٹ کو تو دیکھئے۔۔ واہ پٹھے۔ شاباش۔ کیا کہنے۔ خدا کی قسم اس تعاقب کرنے والی کشتی کا خیال ہی دل خوش کن ہے۔ سرجنٹ فالنفانٹ میں اس مرتبہ آپ کے افسروں سے آپ کی سفارش ضرور کرونگا۔ اور آپ خاطر جمع رکھیں۔ کہ اس مرتبہ ایک تمغہ آپ کو یقیناً مل جائیگا۔۔۔ مگر آپ کے مسٹر ڈیوزی کہاں ہیں۔۔۔ اچھا شاید بائیں کنارے پر صدہا آدمیوں کے درمیان کھڑے تماشہ دیکھ رہے ہونگے۔ تاکہ اگر میں کشتی کی تباہی کے بعد بچ نکلوں تو اُن کے ساتھیوں کے ہاتھوں گرفتار ہوجاؤں۔ یا اگر دوسری طرف بھاگوں تو اپنے کنارے پر مسٹر گنیمارڈ اور نیوئلی کے باشندوں میں گھِر جاؤں۔۔۔۔ استغفر اللہ۔ کسقدر پوچ باتیں ہیں۔۔"

پانی نے زور کیا۔ کشتی چکر کھانے لگی۔۔۔۔

شیرز نے گھبرا کر کشتی کا کنارہ تھام لیا۔

"عزیز دوست"، لوپن نے کہا۔ "میری آخری التماس ہے۔ کہ آپ اپنی جاکٹ اُتار ڈالیں۔ اس سے آپکو تیرنے

میں زیادہ آسانی ہوگی۔ کیا آپ ایسا کرنے کے لئے تیار نہیں۔۔۔ تو لیجئے۔ بندہ بھی اپنی جاکٹ زیب بدن کئے لیتا ہے۔"

اُس نے بھی شیرز کی طرح اپنی جاکٹ پہن لی۔ اور ایک آہ بھر کر کہنے لگا۔

"آپ بھی کیا خوب آدمی ہیں۔۔۔ کسقدر افسوس کی بات ہے۔ کہ آپ ایک ایسے معاملہ میں ضد کر رہے ہیں۔ جس میں آپ کی بہتر سے بہتر کوشش بھی محض بیکار ثابت ہوگی۔۔۔ دراصل آپ اپنی مشہور قابلیت کو ضائع کر کے اپنی شہرت پر داغ لگا رہے ہیں۔"

"مہیدلوپن" آخر کار شیرز نے اپنی خاموشی کو توڑتے ہوئے جواب دیا "تم بہت ہی زیادہ گفتگو کرتے ہو۔ اور اسی وجہ سے اکثر اپنی انتہائی رازداری میں غلطیاں کر جاتے ہو۔"

"یہ ایک بہت ہی سخت ملامت ہے۔"

"ایک لمحہ قبل بہ سلسلہ گفتگو تم نے محض لاعلمی میں مجھے وہ اطلاع بہم پہنچائی۔ جس کا میں متلاشی تھا۔"

"وہ کیا۔۔۔ آپ کو کچھ معلومات کی ضرورت تھی۔ مگر آپ نے مجھ سے اس وقت تک ذکر نہیں کیا۔"

"اب مجھے تمہاری یا کسی شخص کی حاجت نہیں تین گھنٹہ کے اندر میں اس معمہ اور پریشان کن معاملہ کا حل مسٹر اور میڈم ڈی ایبلولی کے حوالہ کر دونگا۔ بس یہی میرا جواب ہے۔"

اُس نے بمشکل اپنا جملہ ختم کیا تھا۔ کہ کشتی ان دونوں کو اپنے ساتھ لئے ہوئے نیچے چلی گئی۔ چشم زدن میں سطح آب پر ابھری اور یکدم لوٹ کر اُلٹی تیرنے لگی۔۔۔۔

دونوں کناروں سے برابر چیخ پکار کی آوازیں آرہی تھیں۔ لوگ تشویشناک خاموشی کے ساتھ دیکھتے اور شور و غل مچانے لگتے تھے۔ کہ یکایک تباہ شدہ کشتی کا ایک آدمی دوبارہ نظر آیا۔

"یہ کون تھا۔ ہمارا انگریز سراغرساں شیرز۔

شیرز ایک عمدہ پیراک تھا۔ وہ نہایت تیزی سے فالنفانٹ کی کشتی کی طرف بڑھا۔۔۔

"مبارک مسٹر شیرز" خفیہ کے سرجنٹ نے چلا کر کہا "اللہ نے بڑا رحم کیا۔۔۔ ذرا بہت ہی احتیاط کے ساتھ۔۔۔ ہم لوگ اُس کی فکر بعد میں کریں گے۔ ہمنے اُس مقام کا خوب صحیح اندازہ کر لیا ہے۔۔۔۔ بس ایک کوشش اور۔۔۔ مسٹر شیرز۔۔۔ لیجئے۔۔۔ اسے پکڑیئے۔۔۔"

انگریز جاسوس نے اُس رسی کو جسے ان لوگوں نے پھینکا تھا۔ پکڑ لیا۔ لیکن جس وقت یہ لوگ اُس کو کشتی کی طرف کھینچ رہے تھے۔ یکایک پشت کی جانب سے یہ آواز آئی۔۔۔

"ہاں۔ میرے عزیز دوست۔ آپ حل تو ضرور کر لیں گے۔ مگر میں حیرت میں ہوں۔ کہ آپ کو اُس کے متعلق اس وقت تک حقیقی علم نہیں..... اور خدا معلوم اس سے آپ کو کیا نفع ہوگا۔ یاد رکھئے... اُس کے بعد معاملہ بالکل از دست رفتہ ہو جائیگا......"

تباہ شدہ کشتی کے پیندے پر آرام سے بیٹھے ہوئے۔ جس پر وہ یہ ضروری باتیں کرنے کے لئے چڑھ آیا تھا۔ آرسین لوپن نے اپنی تقریر سنجیدگی کے ساتھ اس طرح جاری رکھی۔ گویا وہ سننے والوں پر ایک خاص اثر ڈالنے کی اُمید رکھتا تھا۔

"میرے عزیز و کرمفرما دوست۔ ذرا خیال کیجئے... معاملہ کوئی معاملہ بھی تو ہو.... وہاں اللہ کی عنایت سے کوئی خاص راز ہی نہیں... پھر یاد رکھئے۔ آپ کی رنجیدہ حالت ایک ایسے معزز شخص کی طرح ہوگی۔ جو...."

فالنفانٹ نے اُس کی طرف پستول کا نشانہ لے کر کہا۔

"لوپن۔ خاموش۔ بس اب مطیع ہو جاؤ"

"سرجنٹ فالنفانٹ۔ تم ایک کمینہ خصلت انسان ہو۔ خواہ مخواہ میری بات کاٹ دی.... ہاں تو جناب... میں کیا کہہ رہا تھا... کہ......"

"لوپن۔ خبردار۔ ہتھیار ڈال دو"

"فالنفانٹ۔ یہ کیا بک بک لگائی ہے۔ کیا کوئی بھی شخص جو میری طرح اطمینان سے بیٹھا ہوا باتیں کر رہا ہو اور جسے کوئی خطرہ نہ ہو۔ تمہارے بکواس کرنے سے مطیع ہو سکتا ہے۔ ارے میاں تم ایک لمحہ کے لئے بھی اس خیال کو دل میں جگہ نہ دو.... کہ میں ذرہ برابر بھی خطرہ میں ہوں"

"آخری بار.... لوپن.... میں مطلع کرتا ہوں.... مطیع ہو جاؤ...."

"سرجنٹ فالنفانٹ۔ تم کہیں مجھے ہلاک تو نہیں کرنا چاہتے۔ میرا خیال ہے۔ کہ تم مجھے زخمی کر دینا چاہتے ہو۔ بھئی واہ۔ خدا کی قسم.... تمہیں میرے بچ نکلنے کا اتنا خوف ہے۔ ہات ترے بزدل کی.... اور فرض کرو کہ اتفاق سے زخم کاری لگ جائے تو...... اوہ۔ کمبخت بھلے آدمی... ذرا تو اپنی پیرانہ سالی اور ضعیفی کا خیال کر...."

گولی چلادی گئی۔

لوپن لڑکھڑا گیا۔ ذرا دیر تک ٹوٹی ہوئی کشتی سے سہارا لینے کی کوشش کی.... مگر ہاتھ چھوٹ گئے.... اور وہ پانی میں غرق ہو گیا۔

(۳)

ٹھیک تین بجے کا عمل تھا۔ جب یہ واقعات رونما

ہوئے اور ٹھیک چھ بجے جیسا کہ اُس نے اعلان کیا تھا
ہلاک شیرز تنگ پائجامہ ۔ ۔ ۔ چست جاکٹ جو اُس نے
نعولی میں سرائے کے منیجر سے عاریتاً لے لی تھی۔ ایک
ہلکی ٹوپی ۔ ۔ ۔ فلالین کی قمیص پہنے ۔ ہاتھ میں ریشم کی ایک
ڈوری اور ایک پُلندہ لئے ہوئے موتریلو میں داخل ہوا۔
۔ ۔ ۔ اور مسٹر و میڈم ڈی ایمبلولی کو ملاقات کا پیغام بھیجکر
کمرہ میں پہنچا۔

جس وقت یہ دونوں اُس کے کمرہ میں داخل
ہوئے۔ تو انہوں نے اُس کو اِدھر اُدھر ٹہلتے ہوئے
پایا۔ علاوہ بریں وہ اس لباس میں اس درجہ مضحکہ خیز نظر آیا۔
کہ وہ بمشکل اپنی ہنسی ضبط کر سکے۔ شیرز متفکرانہ انداز کے
ساتھ کمر جھکائے ایک متحرک مشین کی طرح۔ کھڑکی سے
دروازہ اور دروازہ سے کھڑکی کی سمت ہر مرتبہ ایک ہی
مقررہ رفتار سے۔ قدم اُٹھاتا ہوا ایک ہی مقام سے بار بار
لوٹتا ہوا ٹہل رہا تھا۔

وہ رُکا۔ ایک چھوٹا سا پارسل ہاتھ میں لیا۔ اُسکو
اچھی طرح دیکھا۔ اور پھر چہل قدمی شروع کر دی۔ آخر کار اُن
کے سامنے کھڑے ہو کر اُس نے دریافت کیا۔

"کیا میڈ میزل مکان ہی پر ہے"

"جی ہاں۔ باغ میں۔ بچوں کے ساتھ"

"موسیو ہربرن۔ چونکہ یہ ہمارے درمیان آخری
گفتگو ہے۔ لہذا میری خواہش ہے۔ کہ اس موقع پر
میڈ میزل ڈیمین بھی یہاں موجود رہے"

"گویا آپ اب یقیناً ۔ ۔ ۔ ۔"

"موسیو آپ ذرا صبر کیجئے ۔ ۔ ۔ حقیقت خود
واقعات کی تفصیل سے واضح ہو جائیگی۔ جس کو میں آپ
لوگوں کے سامنے حتی الامکان بہت ہی صحت کے ساتھ
بیان کرونگا ۔ ۔ ۔ ۔"

میڈم ڈی ایمبلولی اُٹھی۔ اور فوراً ہی مس
الائس ڈیمین کو اپنے ہمراہ لے کر واپس آ گئی۔ میڈ میزل جو
خلاف معمول کچھ زرد نظر آ رہی تھی۔ میز پر جھک کر کھڑی ہو گئی
اور اُس نے یہ تک دریافت نہیں کیا۔ کہ آخر اسے وہاں
کیوں طلب کیا گیا ہے۔

شیرز نے اس کی آمد پر مطلق توجہ نہ دے کر ایم ڈی
ایمبلولی کی طرف مخاطب ہو کر۔ یکدم اپنا بیان ایسے لہجہ
میں شروع کر دیا۔ کہ کسی جواب کی ضرورت ہی نہ پیش آئے

"کئی دن قائم رہنے والی تفتیش کے بعد۔ گو اکثر
واقعات کی بنا پر میرے خیالات درمیان میں تبدیل ہو گئے
تھے۔ تاہم اُس بات کا جو اوّلاً میرے ذہن میں آئی تھی
میں پھر اعادہ کرتا ہوں۔ کہ جیوش لیمپ کی چوری میں ضرور
ایسے شخص کا ہاتھ ہے۔ جو اسی مکان میں رہتا ہے ۔ ۔ ۔"

(باقی باقی)

قیمت سالانہ چھ روپے　　رجسٹرڈ نمبر ایل ۱۴۱۴　　قیمت ششماہی سہ؎ فی پرچہ ۱۰ار

ہزار داستان

آنریری ایڈیٹر: حکیم احمد شجاع بی۔ اے (علیگ)

ایڈیٹرز:-

محمد اسمٰعیل نعیم

سیّد عابد علی عابد بی۔ اے　　محمد ہادی حسین قرشی صدیقی

جلد ۵　　اشاعت ماہِ نومبر ۱۹۲۴ء　　نمبر ۵

نمبر شمار	مضمون	اثرِ خامہ	نمبر صفحہ
۱	دریا بہ حباب اندر	محمد اسمٰعیل نعیم	۳۲۲
۲	ہیگل کے فلسفۂ فنون لطیفہ کا مقدمہ	محمد ہادی حسین	۳۲۳
۳	دُنیائے اضطراب	جناب فرحت	۳۲۹
۴	ہستی	جناب ہادی مچھلی شہری	رر
۵	مخبر	سیّد عابد علی عابد بی۔ اے	۳۳۰
۶	صعودِ رُوح	جناب مولٰنا ابوالفخر سیماب	۳۴۰
۷	رودادِ محبّت	جناب سیّد راز چاندپوری	۳۴۱
۸	محسوسات	عابد	۳۵۳
۹	ضبطِ خواب	جناب خورشید بیگم تنویر	۳۵۴
۱۰	رموز رندانہ	جناب اثر صہبائی	۳۶۰
۱۱	تاروں بھری رات	عابد	۳۶۱
۱۲	خود فراموش	جناب تنویر میرٹھی	۳۶۲
۱۳	زلیخا	جناب راز چاندپوری	۳۷۶
۱۴	جنسِ ایمان	جناب ہشام میرٹھی	۳۷۸
۱۵	غزل	جناب محمد معراج الدین شامی	۳۸۳
۱۶	فغانِ مہجور	جناب ہادی مچھلی شہری	۳۸۴
۱۷	آخری ارمان	جناب شمیم بلہوری	۳۸۶
۱۸	اختلافِ جذبات	. . .	۴۰۰

تصویر: میر ببر علی انیس اعلی اللہ مقامہ

(مرکنٹائل پریس لاہور میں باہتمام لالہ گوپال داس پرنٹر چھپا اور محمد اسمٰعیل لکھیسر پبلشر و پروپرائیٹر نے دارالاشاعت ادب لطیف کے لئے چیمبرلین روڈ لاہور سے شائع کیا)

دریا بہ حباب اندر

صفحہ ادارت

اس ماہ سے ہزار داستان میں ایک خوشگوار تبدیلی نظر آئیگی۔ جو ایک لحاظ سے تبدیلی ہے اور ایک لحاظ سے "قصۂ پارینہ" کی تجدید یعنی میرے محترم دوست سیّد عابد علی صاحب عابد بی اے۔ اور محمد ہادی حسین صاحب قریشی صدیقی ادارت میں میرے رفقائے کار ہیں ہزار داستان کے اس گزشتہ دور کی طرف جو انکی ادارت میں گزر چکا ہے۔ مَیں کسی قسم کا اشارہ کرنا تحصیل حاصل سمجھتا ہوں۔ کیونکہ اس دور کے مضامین اور افسانے مقبولیت عام حاصل کر چکے ہیں۔

ہیگل کا فلسفہ جمالیات اُردو ادب میں ایک بالکل نئی چیز ہے۔ مکرمی محمد ہادی حسین صاحب کے معیارِ انتخاب کی رفعت اور حسنِ تحریر کے متعلق "غم نصیب" ایک بدیہی ثبوت ہے۔ لیکن جس خوبی و خوش اسلوبی سے اُنہوں نے اس ترجمے کی دِقّتوں کو سُلجھایا ہے۔ وہ مبارکباد کے قابل ہے۔ دُعا ہے کہ ان کی وہ کوششیں جو ادبِ عالیہ کی ترجمانی میں صرف کر رہے ہیں، سرسبز ثابت ہوں۔

"مخبر" کا تصوّر اساسی جوزف کانراڈ جو دورِ حاضرہ کے انگریز مصنّفین میں ایک امتیازی پایہ رکھتا ہے کے ایک افسانے سے اخذ کیا گیا ہے لیکن موضوع کی نشوونما واقعات کی ترتیب اور تکمیل تمامتر سیّد صاحب موصوف کے قلم کی مرہونِ منت ہے۔ اور اس زاویہ نگاہ سے یہ افسانہ اُنہی کا کہا جاسکتا ہے۔

"خود فراموش" ایک انگریزی افسانے کا ترجمہ ہے۔ جو انگریزی زبان کے بہترین افسانوں میں شمار کیا جاتا ہے۔ اس قسم کے افسانوں کا کمال یہ ہے۔ کہ ناظر کی کیفیات افرادِ قصّہ کی کیفیات سے بالکل مُمتزج ہو جاتی ہیں۔ صرف اسی صورت میں اس بھول بھلیاں کو قائم رکھا جاسکتا ہے۔ جو ایسے افسانوں کی خصوصیتِ امتیازی ہے۔ جناب تنویر صاحب اس کامیاب ترجمے کے لئے مستحق ستائش ہیں۔

"ضبطِ خواب" کے متعلق جو کچھ جناب خورشید بیگم صاحبہ تنویر نے سپردِ قلم کیا ہے۔ اس سے ہمیں اتفاق ہو یا نہ ہو لیکن ہم ان کی فاضلانہ علمی کاوش اور طریقِ استدلال کے ربط و ضبط پر مبارکباد دیتے بغیر نہیں رہ سکتے۔ ہمیں امید ہے کہ یہ مضمون ان کے آئندہ علمی مضامین کی پہلی قسط ثابت ہوگا۔ اور اس کے بعد ان کے اکثر ایسے ہی مفید مضامین زینتِ اوراقِ ہزار داستان ہوا کریں گے۔

"آخری ارمان" کی آخری قسط اس ماہ شائع ہو رہی ہے۔ مَیں جناب شمیم بلہوری کی خدمت میں اس افسانے کو کامیابی سے انجام تک پہنچانے پر اپنی طرف سے اور ناظرین ہزار داستان کی طرف سے شکریہ پیش کرتا ہوں!

محمد اسمٰعیل نعیم

ہیگل[۴] کے فلسفۂ فنونِ لطیفہ کا مقدمہ

ہم اس مضمون میں جمالیات[۵] سے بحث کرنا چاہتے ہیں۔ یہ موضوع یوں تو عمومی حیثیت میں تمام عالمِ حسن پر حاوی ہے۔ لیکن اُسے خاص طور پر صنعت اور وہ بھی صنعت کے ایک شعبۂ منفردہ یعنی فنونِ لطیفہ سے تعلق ہے۔

ایک ایسے موضوع کے لئے یونانی زبان کا لفظ استھیٹک جو عام طور پر مستعمل ہے۔ اپنے لغوی معنوں میں موزون و مناسب نہیں، کیونکہ اُس کے لغوی معنی جذبات و احساسات کے علم کے ہیں۔ اس کو اوّل اوّل وُلف اور اُس کے متبعین نے ایک علم کا نام قرار دیا۔ اُنہوں نے ایک نئے علم کو یا یہ کہنا چاہئے کہ معلوماتِ انسانی کی ایک ایسی صنف کو جو کچھ مدّت کے بعد فلسفے کی ایک مستقل شاخ کا درجہ حاصل کرنے والی تھی، اس لفظ سے موسوم کیا۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ جرمنی میں صنعت کا ایک نفسیاتی معیار قائم تھا یعنی اُس کی اختراعات اُن جذبات و احساسات کے نقطۂ نگاہ سے دیکھی جاتی تھیں۔ جن کا اُنہیں محرک تصوّر کیا جاتا تھا مثلاً لذّت، تحسین، خوف، ترحّم وغیرہ۔ یہ نام اس قدر دُور از کار اور وسیع المفہوم ہونے کی وجہ سے اس درجہ غیر معیّن تھا کہ کوئی دوسرا نام وضع کرنے کی ضرورت در پیش ہوئی۔ چنانچہ مثال کے طور پر ایک لفظ کالسٹک رواج بھی پا گیا۔ لیکن یہ بھی کچھ تسلی بخش نہیں۔ کیونکہ وہ علم جس کو اس سے تعبیر کیا گیا۔ حسن سے بہیئت مجموعی تعلق نہیں رکھتا بلکہ صرف اُس کے ایک جزو یعنی صنعتی حسن سے۔ بہرحال ہمیں چونکہ ناموں کے درست یا نادرست استعمال سے براہ راست کچھ علاقہ نہیں۔ اس لئے ہم عرفِ عام کی سند کو معتبر سمجھ کر جمالیات کے لفظ ہی کو قابلِ قبول فرض کئے لیتے ہیں۔ تاہم یہ حقیقت نفس الامری ذہن نشین کر لینا

---

۵ جمالیات کا لفظ جو اُردو میں استھیٹک کا مترادف تجویز کیا گیا ہے۔ صحیح مطلب کو ادا نہیں کرتا۔ اور اُسی مغالطے میں مبتلا ہے جس کا ذکر مصنف نے استھیٹک کے لفظ سے بحث کرتے ہوئے کیا ہے۔ میں اس کے جواز کی وہی دلیل پیش کرتا ہوں جو مصنف نے استھیٹک کے حق میں پیش کی ہے۔ (مترجم)

ازبس ضروری ہے۔ کہ ہمارے موضوع کے لئے مناسب لفظ فلسفۂ صنعت' بلکہ اُس سے کہیں انسب فلسفۂ فنونِ لطیفہ ہے مندرجہ بالا عبارت حسنِ قدرت کو خارج از بحث قرار دیتی ہے۔ ہمارے موضوع کی یہ تحدید و تعیین غالباً اس اصول پر مبنی تصوّر کی جائیگی۔ کہ ہر علم کو اپنی حدود قائم کرنے کا مطلق اختیار حاصل ہے۔ ہم یہ واضح کر دینا لازمی سمجھتے ہیں کہ ہم کچھ اس بنا پر جمالیات کے مبحث کو حُسنِ صنعت کے ساتھ مخصوص نہیں کرتے۔ بلکہ جیسا ہم کہہ چکے ہیں۔ اُس کا دائرہ حقیقت میں صرف حسنِ صنعت کو محیط ہے۔ اس میں کچھ شک نہیں کہ ہم اپنی روزمرّہ میں علی العموم مختلف چیزوں کو حُسن و خوبی کی صفت سے موصوف کرتے ہیں۔ مثلاً انسان کے حسن، پھولوں کی خوبصورتی کا تو ذکر ہی کیا۔ ہم رنگ، آسمان، دریا جیسی چیزوں کے ساتھ حسین اور اُس کے مترادفات کا استعمال کرتے ہیں۔ ہم فی الحال اس متنازعہ فیہ مسئلہ کے متعلق بحث نہیں چھیڑنا چاہتے کہ ان اشیاء پر حُسن کی صفت کا اطلاق کہانتک جائز ہے۔ یا بالفاظ دیگر حسنِ صنعت کے پہلو بہ پہلو حسنِ قدرت کا وجود تسلیم کرنا کس حد تک قرین صحت ہے۔ ان ثانوی مسائل سے قطع نظر کرکے ہم نفسِ مضمون کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔ ہمارا دعوےٰ ہے کہ صنعتی حسن قدرتی حُسن سے اعلےٰ ہے۔ اور اس دعوے کی دلیل یہ ہے کہ صنعتی حسن کا سرچشمہ وجودِ نفس ہے۔ اور جس

نسبت سے نفس اور اسکی ابداعات و اختراعات قدرت اور اُس کے موالید و مظاہر سے افضل ہیں۔ اُسی نسبت سے صنعتی حُسن کو قدرتی حسن پر تفوّق حاصل ہے۔ یہانتک کہ ہم ایک اعتبار سے یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ کوئی ادنےٰ سے ادنےٰ خیال جو کسی انسان کے ذہن میں وارد ہو سکتا ہے۔ قدرت کی بہترین مخلوق سے زیادہ پایہ رکھتا ہے۔ کیونکہ وہ خیال چاہے کتنا ہی پست کیوں نہ ہو۔ اُسے ایک وجودِ مطلق حاصل ہے اور اُس کی ہستی ایک ذہنی ہستی ہے۔ جو موجوداتِ خارجی سے آزاد ہے۔ دوسری حیثیت سے غور کیا جائے تو اس کے برعکس آفتاب ہمیں نظام کائنات کا ایک جزوِ لاینفک معلوم ہوتا ہے۔ اور ایک خیال اُس کے مقابلہ میں لاشئے محض تاہم فی نفسہٖ آفتاب کی قسم کا کوئی قدرتی وجود اپنی ہستی کا ثبوت نہیں دے سکتا۔ نہ اُسے اپنی ذات کا شعور ہے اور نہ وہ اُسے اپنے آپ سے ممتاز بنانے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ اس لئے جب ہم اشیاء ماسوا کے تعلق میں اُس پر غور کرتے ہیں۔ تو نہ وہ قائم بالذات ثابت ہوتا ہے اور نہ مقصود بالذات، حاصل کلام ہم اُسے حسین نہیں کہہ سکتے بلا توضیح مطلب یہ کہہ دینا کہ نفس اور اُسکی تخلیقات قدرت سے اعلےٰ ہیں۔ کسی بات پر بیّن دلالت نہیں کرتا۔ کیونکہ اعلےٰ ایک ایسا لفظ ہے جو یہ ظاہر کرتا ہے۔ کہ گویا حسن قدرت اور حسن صنعت ہماری فضائے تصوّر میں ایکدوسرے

کے متصل مقام پذیر ہیں۔ اور اُن کے درمیان بُعدِ مکانی کی
ایک حدِّ فاصل حائل ہے۔ بالفاظ دیگر وہ ایک ایسا مابہ الامتیاز
مقرر کرتا ہے جو مقداری ہے۔ اور اسلئے بالکل خارجی فی الحقیقت
جب ہم نفس اور اُس کی تخلیقات کو قدرت سے اعلیٰ کہتے ہیں
تو اس سے ہمارا مُدّعا اُن کا مقابلہ کرکے اُن کے اختلاف باہم
کو نمایاں کرنا نہیں ہوتا۔ کیونکہ نفس لاشریک اور آپ اپنی
صفات کا حامل ہے۔ یہ نفس اور صرف نفس کی صفت ہے
کہ وہ حقیقت پر قادر اور بجائے خود تمام کائنات و موجودات کا
مجموعہ ہے۔ حتےٰ کہ کوئی حسین چیز صرف اُس وقت حقیقی معنوں
میں حسین ہو سکتی ہے۔ جب اُس کی تخلیق و تکوین میں عنصر عالیہ
شریک ہو۔ اس نقطۂ نگاہ سے دیکھا جائے تو قدرت کا حُسن
اُس حُسن کا فقط ایک پرتو ہے جو نفس سے تعلق رکھتا ہے۔
یعنی وہ ایک ناقص اور غیر مکمّل شے ہے۔ جس کا جوہرِ اصلی
نفس میں موجود ہے۔

مزید برآں، ہم آگے چلکر دیکھیں گے کہ ہم نے جو صرف
فنونِ لطیفہ سے سروکار رکھا ہے۔ تو یہ امر فطری ہے۔ کیونکہ
اگر ایک طرف متقدّمین نے قدرت کی خوبصورتیوں پر بہت کچھ
زورِ تقریر و تحریر صرف کیا ہے۔ اور ہم اُن سے بھی زیادہ ان کی
نسبت خیالات کا اظہار کرتے رہتے ہیں، تو دوسری طرف
یہ بات بھی موجود ہے کہ آجتک کسی کے ذہن میں قدرتی اشیا
کے حُسن کی تحلیل، تشریح اور اُس کو ایک مستقل علم کا موضوع
بنانے کا خیال نہ آیا۔ اس میں کلام نہیں کہ افادہ کا پہلو مختلف
صورتوں میں من حیث العلم نمایاں کیا گیا ہے۔ مثال کے طور
پر ہم دیکھتے ہیں، کہ ادویات، یعنی دافعِ مرض قدرتی چیزوں
کا ایک علم مرتب کیا گیا ہے۔ جو جمادات، نباتات، حیوانات
اور کیمیاوی پیداوار کے بیان پر مشتمل ہے۔ اس کے
برخلاف قُدرت کے حسن کو ضابطہ کے تحت میں لانے کی
کوئی مثال ہمیں نظر نہیں آتی۔ قُدرتی حسن سے بحث کرنے
میں مشکل یہ پیش آتی ہے کہ ہم اپنے آپ کو ایک غیر محدود وسعت
میں پاتے ہیں۔ اور کوئی مقررہ کردہ معیار یا اصل الاصول
ہمارے لئے دلیلِ راہ نہیں ہوتا۔ یہی وجہ ہے کہ حسنِ قدرت
کو ایک منضبط علم کا موضوع بنانے کی کوئی کوشش ابتک
رُونما نہیں ہوئی۔

سطورِ بالا جو قدرت اور صنعت کے حُسن، اُن کے
رابطۂ باہمی اور اوّل الذکر کے نفسِ مطلب سے خارج ہونے
کے متعلق بطورِ تمہید لکھی گئی ہیں۔ اُن کا مقصد اس بات کو
واضح کر دینا ہے کہ ہم نے اپنے موضوع کی تعیین و تخصیص
اپنی رضا و رغبت سے نہیں کی۔ ہم سرِدست، اس امر کو
پایۂ ثبوت تک پہنچانے کی کوشش نہیں کرنا چاہتے کیونکہ
یہ بحث خود ہمارے موضوع کا ایک حصّہ ہے۔ اور اس لئے
ہم مقامِ مناسب کے لئے اُسے اٹھا رکھتے ہیں۔

اب اگر یہ تسلیم کر لیا جائے کہ ہمیں فی الحال صرف

حسنِ صنعت سے بحث ہے۔ تو یہ تسلیم کرتے ہی ہم تازہ مشکلات
سے دوچار ہو جاتے ہیں۔

سب سے پہلے یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آیا فنونِ لطیفہ
کو علمی بحث کا مستحق بھی قرار دیا جا سکتا ہے یا نہیں۔ اس
بدیہی امر سے کس کو انکار ہوگا کہ صنعت اور حُسن زندگی کے
تمام شعبوں میں مسرت کی رُوحِ رواں بنکر جاری وساری ہیں کیا ہماری
مادی اور کیا ہماری ذہنی دُنیا' دونوں پر اُنہوں نے ایک رنگین پردہ
ڈال رکھا ہے۔ وہ ہمیں حقیقت کی تلخی سے تلخ کام نہیں ہونے
دیتے' اور حوادث کے ہنگامۂ شور وشر کو خوش آہنگی میں تبدیل
کئے ہوئے ہیں۔ اگر وہ ہماری زندگی میں ایک خوشگوار تنوع
نہ پیدا کرتے رہتے تو ہمارے لئے جینا وبالِ جان ہو جاتا
اور سب سے زیادہ یہ کہ جب کوئی نیک کام ہماری طبیعت
کو مصروف رکھنے کے لئے موجود نہیں ہوتا' تو وہ ہمیں اپنی
طرف مائل کر کے بدی سے بچا لیتے ہیں۔ یہ سب دُرست
ہے۔ لیکن صنعت کے وہ جاذبِ نظر نقش ونگار جو زندگی کی
زینت ہیں۔ غیر مہذب اقوام کی بدوضع شکلوں اور
ناتراشیدہ ہتھیاروں سے لیکر عروجِ تہذیب کی عالیشان
عمارتوں تک جن کی ساخت وپرداخت میں انسانی دماغ
کی انتہائی قوتیں صرف ہو جاتی ہیں —— ان میں کوئی
چیز ایسی نظر نہیں آتی جو زندگی کی غایتِ حقیقی کو پورا
کر رہی ہو۔ اور اگر یہ بھی مان لیا جائے کہ صنعت کی تخلیقات
ہمارے مقاصدِ اصلی کے حصول میں مُخل نہیں ہوتیں' بلکہ ہمیں
بدی سے بچا کر ہمارے لئے تہذیب وتکمیل کا باعث اور
حصولِ مُراد کا ذریعہ بنتی ہیں۔ پھر بھی یہ کہنا پڑتا ہے کہ اُن
کا کام صرف اتنا ہے کہ ہمارے نفس کے لئے تفریح کا سامان
بہم پہنچائیں۔ زندگی کی حقیقی غرض وغایت اس کے برخلاف
جدّوجہد چاہتی ہے۔ ان وجوہ کی بنا پر صنعت کے حسن سے
ایک علمی بحث کرنا اور اُسے ایک اہم مسئلہ سمجھ کر اُس میں
موشگافیاں کرنا ایسا معلوم ہوتا ہے۔ جیسے کوہ کندن
کاہ برآوردن۔ بہرکیف اس نقطۂ نگاہ سے دیکھا جائے
تو صنعت ایک تبعی اور غیر ضروری چیز معلوم ہوتی ہے۔
خواہ ہم اس سے بھی قطع نظر کیوں نہ کرلیں۔ کہ حسن کا اشتغال و
انہماک ہمارے لئے ذہنی تفریح کا سامان مہیّا کر کے ہماری
قوتوں کو آرام پسند بنا دیتا ہے۔ اور ہمارے مفادِ عملی کے
حق میں مضر ثابت ہوتا ہے۔ اس دعوئے مفروض کی بنا پر کہ
حسن ہمارے لئے عشرت کا سامان مہیا کرتا ہے۔ یہ بارہا
ضروری خیال کیا گیا ہے کہ زندگی کے لوازمِ عملی اور خاص طور
پر اخلاق ومذہب سے اُس کا رابطہ قریبی دکھا کر اُسکی قدر وقیمت
جتائی جائے۔ اور چونکہ یہ قطعاً دلائل وبراہین سے ثابت نہیں
کیا جا سکتا۔ کہ وہ ایک بالکل غیر مضر چیز ہے۔ اس لئے کم ازکم
اس بات کو قرین قیاس ظاہر کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ یہ
عشرت نقصان کی بجائے نفع کے پہلو زیادہ رکھتی ہے اس

لحاظ سے اہم مقاصد صنعت کی طرف منسوب کیئے گئے ہیں اور بعض لوگوں کی رائے میں وہ عقل اور حواس کو ایک رشتہ ارتباط میں وابستہ کئے ہوئے ہے۔ اور ضمیر اور نفسانی خواہشات کی مخالف قوتوں کے درمیان جو آپس میں ایک دائمی کشاکش جاری رکھتی ہیں، مصالحت قائم کر کے اُن کے تنازع باہمی کا انسداد کرتی ہے۔ لیکن اسکے برخلاف یہ رائے پیش کی جاسکتی ہے۔ کہ اگر صنعت کے ان مقاصد کا وجود تسلیم بھی کر لیا جائے، اور یہ بھی مان لیا جائے کہ وہ بہت اہم اور سنجیدہ ہیں۔ تو اس سے یہ ہرگز لازم نہیں آتا کہ عقل یا ضمیر کو صنعت کی وساطت سے کوئی فایدہ پہنچ جاتا ہے۔ جس کی وجہ ظاہر ہے۔ عقل اور حواس یا ضمیر اور خواہشات کو آپس میں متحد کرنے کی کوشش لاحاصل ہے۔ کیونکہ وہ فی نفس الامر ارتباط و اختلاط کی صلاحیت نہیں رکھتے اور ہمیشہ ان خصائص طبعیہ کو جو ان میں موجود ہیں، برقرار رکھتے ہیں۔

اگر بالفرض صنعت اس کوشش میں کامیاب بھی ہوجائے تو اُس حالت میں بھی وہ علمی مباحث کی کچھ زیادہ مستحق نہیں ثابت ہوسکتی۔ کیونکہ اُس کو اس طرح کوئی ممتاز حیثیت نہیں حاصل ہوتی۔ وہ محض ایک ادنے خادم بن کر رہ جاتی ہے۔ جو اگر ایک طرف اعلے مقاصد کا تابع ہے۔ تو دوسری طرف لہو و لعب اور بیکاری کا حلقہ بگوش بھی ہے۔ نتیجہ کلام اُسے ایک ایسی چیز کی حیثیت نصیب ہوتی ہے۔ جو بذات خود مقصود نہیں۔ بلکہ کسی دوسری چیز کے حصول میں مفید مطلب ہے۔ یعنی ایک وسیلہ کی حیثیت۔ پھر بلحاظ وسیلہ کے بھی وہ نقص سے مبرا نہیں۔ اُس کا نقص یہ ہے کہ چاہے یہ بھی کیوں نہ مان لیا جائے۔ کہ وہ اعلے مقاصد کے ماتحت عمل کر کے عظیم نتائج پیدا کرتی ہے۔ تاہم اُس کا آلہ کار فریب آفرینی ہے۔ کیونکہ حسن کا تو وجود ہی سراسر ظاہر سے تعلق رکھتا ہے۔ صنعت کا یہ آلہ کار اعتراض کے قابل ہے۔ اس لیئے کہ ایک ایسا مقصد جو حقیقی و معنوی ہو فریب کے ذریعے سے نہ پورا کرنا چاہیئے۔ اور اگر بامرِ اتفاق کبھی اس طرح کامیابی ہو بھی جائے تو وہ کامیابی بہت محدود ہوگی۔ اور اس استثنائی حالت میں بھی فریب اپنے جواز کی کوئی دلیل نہیں پیش کرسکتا۔ اسباب و وسائل کو مقاصد کی عظمت کے موافق ہونا چاہیئے حقیقی و معنوی چیزیں حقیقی و معنوی چیزوں سے پیدا ہوسکتی ہیں۔ نہ کہ مجاز و باطل سے اسی بات کو مدِ نظر رکھتے ہوئے علم کا کام یہ ہے کہ نفس کے حقیقی مقاصد کا ایسے طریقے سے مطالعہ کرے جو حقائقِ اشیاء کے مطابق ہو۔ اور عرفانِ حقیقت کا اصلی طریقہ ہو۔

مذکورۃ الصدر وجوہ کی بنا پر یہ نتیجہ اخذ کیا جانا ممکن ہے کہ صنعت علمی تحقیق و تدقیق کے قابل نہیں۔ کہا جاسکتا

ہے۔ کہ وہ زیادہ سے زیادہ گذرِ اوقات کا ایک مشغلہ ہے اور اگرچہ اہم مقاصد اُس کی طرف منسوب کئے جاسکتے ہیں تاہم فی نفس الامر وہ اُن کے منافی ہے اور اُس سے اُن کی تکمیل نہیں ہوتی۔ اعلیٰ سے اعلیٰ حیثیت جو اُسے دی جاسکتی ہے وہ ایک وسیلہ کی ہے۔ جو تفریح کا سامان مہیّا کرنے میں بھی ممدو معاون ہے۔ اور اہم مقاصد کیلئے بھی استعمال کیا جاسکتا ہے۔ فریب و تلبیس کے سوا اُس کے پاس نہ کوئی اپنا مدارِ وجود ہے نہ ذریعۂ عمل۔

اس مسئلہ کا ایک اور قرینِ قیاس پہلو یہ بھی ہے کہ چاہے صنعت عمومی طور پر فلسفیانہ تخیّلات کی جولانگاہ بن سکے۔ لیکن مخصوص معنوں میں مستقل علمی بحث کے لئے مناسب نہیں۔ حُسنِ صنعت کا تعلق حسّ و احساس اور وہم و خیال سے ہے۔ قوّتِ متفکّرہ سے اُسے کچھ نسبت نہیں۔ وہ معقولات سے خطاب نہیں کرتی۔ بلکہ محسوسات سے۔ اس لئے اس کی تخلیقات کا ادراک علمی ذہنیّت سے جُدا کوئی قوت چاہتا ہے۔ علاوہ بریں صنعتی حسن کے جس خاص وصف سے ہم لذّت اندوز ہوتے ہیں وہ اُسکی اختراعی قوت کی آزادی ہے۔ یعنی اُس کا مطالعہ کرتے وقت قواعد و ضوابط کی پابندیاں ہم پر عاید نہیں ہوتیں۔ صنعت کی تخلیقات میں ہم قانون کی سخت گیری اور غور و فکر کی کاوش کی بجائے راحت و نشاط کے متلاشی ہوتے ہیں۔ اور مجرّد افکار کی مُبہم دُنیا کے مقابلہ میں الوان و اشکال کی روشن دُنیا کو ترجیح دیتے ہیں۔ صنعت کی حسین مخلوقات متخیلہ کی خودمختار فعلیّت کا نتیجہ ہیں۔ وہ خود قدرت سے زیادہ قید و حصر سے بیگانہ ہیں۔ صنعت کے قبضۂ تصرّف میں صرف خارجی دُنیا کی گوناگوں شکلیں ہی نہیں، بلکہ متخیّلہ کی قوتِ آفرینش اُن میں اپنی طرف سے بھی غیر محدود اضافہ کرسکتی ہے۔ جہاں الہامی قوتیں اس قدر مختلف و متعدد شکلوں میں ظہور پذیر ہوں، وہاں تعجب نہیں کہ قوّتِ متفکّرہ عاجز آجائے۔ اُس کو اتنی جُراَت نہ ہوگی کہ اس وسیع و بسیط موضوع پر تنقیدی نظر ڈال سکے۔ اور جزئیات کے اس دفترِ بے پایاں کو اپنے کلّیوں کے تحت میں لاسکے۔ (باقی دارد)

محمد ہادی حسین

زدردِ آشکارا ہم نشیں من زار مینالم
دلِ من اے۔ دلِ من۔ زود کارِ من توقف کن
چہ میپرسی چہ لذّت نہاں در سوزِ پنہانست

خوشا دردے کہ از ہم رازو از ناصح نہاں باشد
مآلِ دلفریبی اش بہ رسم تا چساں باشد
چہ خوش باشد اگر مارا حیات جاوداں باشد

ذوالفقار علی بخاری

روداد محبّت

مُصنّفہ ٹالسٹائی حِصّہ دوم مترجمہ راز چاند پوری

دوسرا باب

ہمارا پیٹرسبرگ کا سفر، ماسکو میں ہمارا ہفتہ بھر کا قیام، اس کے اور میرے رشتہ دار، ہمارا نئے مکان میں رہنے کا انتظام کرنا، سڑکیں، عجیب شہر اور مختلف صورتیں، غرض سب کچھ مثل ایک خواب کے گزر گیا۔ یہ تمام چیزیں اس کی دور اندیشی اور اس کی محبت کی وجہ سے اسقدر مختلف الوضع، ایسی نئی اور خوشگوار، ایسی دلکش اور فرحت بخش تھیں کہ ان کے مقابلہ میں دیہات کی ساکت وصامت زندگی ہیچ معلوم ہوتی تھی۔

مجھے کسقدر تعجب ہوا جب دُنیاوی فخر ومباہات اور بے پروائی کے بجائے جس کی سوسائٹی میں ملنے کی ہمیں امید تھی۔ سب لوگ (نہ صرف میرے رشتہ دار بلکہ اجنبی بھی) مجھ سے ایسی سچّی محبت اور خلوص سے ملے کہ گویا وہ سب میرا ہی خیال کر رہے تھے۔ اور اپنی مسرت کی تکمیل کے لئے صرف میری آمد کے منتظر تھے۔ بالکل خلاف امید میرے شوہر کو بھی اس حلقہ شناسائی میں چند آشنا مل گئے۔ یہ لوگ سب سے بہتر معلوم ہوتے تھے۔ اُس نے مجھ سے ان کا ذکر کبھی نہ کیا تھا۔ اور اکثر اوقات جب وہ ان اشخاص کے خلاف کسی رائے کا اظہار کرتا جو مجھے نیک معلوم ہوتے تھے۔ مجھے تعجب ہوتا اور میں اُس کو ناپسند کرتی۔ میری سمجھ میں نہ آتا تھا کہ وہ انسے کیوں اسقدر رُکھائی سے پیش آتا ہے۔ اور اُن دوستوں سے الگ رہنے کی کیوں کوشش کرتا ہے۔ جن کو میں پسند کرتی ہوں۔ مجھے معلوم ہوتا تھا کہ نیک لوگوں کے ساتھ جسقدر تعلقات بڑھ سکیں۔ اسی قدر بہتر ہے۔ اور وہ سب نیکدل آدمی تھے۔

دیہات کو خیرباد کہنے سے پہلے اُس نے کہا تھا۔ "دیکھو تم جانتی ہو کہ ہم کس طرح یہاں زندگی بسر کر رہی ہیں۔ یہاں پر ہم بالکل تنہائی کی زندگی بسر نہیں کرتے۔ لیکن وہاں ہم دولت سے بہت دُور ہونگے۔ اور اس لئے ہم کو ایسٹرتک شہر میں قیام کرنا چاہئے۔ مگر یہاں کی سوسائٹی میں شریک نہ ہونا چاہئے ورنہ ہم مصیبت میں مبتلا ہو جائینگے۔ ہاں تمہاری خاطر سے مجھے ایسی خواہش ——"

میں نے پُوچھا۔ "ہم سوسائٹی میں کیوں شریک نہ ہوں؟"

ہم کو صرف تھیٹر میں جانا، اپنے اعزا سے ملنا، تماشہ گاہوں میں جاکر دل بہلانا اور خوشگوار نغمے سننا چاہئیں اور ہم ایسٹر سے بہت پہلے دیہات واپس آجائینگے۔"

لیکن جیسے ہی ہم پیٹرسبرگ پہنچے یہ تمام تجاویز فراموش ہوگئیں۔ یکایک میں نے اپنے آپ کو ایک ایسی نئی دنیا میں پایا۔ مجھے اسقدر نئی نئی مسرتیں حاصل ہوئیں اور ایسی نو بہ نو دلچسپیاں رونما ہوئیں کہ فوراً گزشتہ زمانے اور تمام تجاویز کا خیال، اس حالتِ بے خبری میں بالکل جاتا رہا۔

میں نے اپنے دل میں کہا۔ "وہ سب باتیں فضول تھیں، میں ابھی تک لطف زندگی سے ناآشنا تھی۔ یہ حقیقی زندگی ہے۔ وہاں ہمارے واسطے اور کیا رکھا ہے!"

وہ پریشانی و افسردگی جو دیہات میں مجھے ستاتی رہتی تھی۔ یکبارگی پورے طور پر مثل سحر کے غائب ہوگئی۔ اپنی رفیق زندگی کے ساتھ مجھے جو محبت تھی اُس میں سکون پیدا ہوگیا۔ اور اب یہ خیال، کہ یہ محبت کم ہوتی جاتی ہے کبھی میرے دل میں پیدا نہ ہوا۔ ہاں مجھے اس کی محبت پر شبہ نہ ہوسکا۔ میرے ہر خیال کو وہ فوراً سمجھ لیتا۔ میرے ہر جذبہ کو وہ معلوم کرلیتا اور میری ہر خواہش کو پورا کردیتا تھا۔ اس کی غیر معمولی بے حسی اب جاتی رہی تھی۔ یا کم از کم اب وہ میرے لئے تکلیف دہ نہ رہی تھی۔

علاوہ ازیں مجھے اس کا احساس تھا کہ پہلے سے زیادہ اب وہ مجھ سے محبت کرتا ہے۔ اکثر کسی نئے ملاقاتی کے یہاں جانے یا اپنے مکان پر دوسروں سے ملنے کے بعد جب کہ میں میزبانی کے فرائض انجام دیتی اور دل ہی دل میں کسی فروگذاشت کے ہونے سے ڈرتی رہتی تو وہ مجھ سے کہتا۔

"میری پیاری! تم پریشان نہ ہو۔ یقیناً تم نے خوب مہمان نوازی کی۔"

میں بہت خوش و خرم تھی۔ ہمارے پیٹرسبرگ پہنچنے کے بعد فوراً ہی اُس نے اپنی والدہ کو خط لکھا جب اُس نے مجھے بلایا۔ کہ میں بھی اپنی جانب سے کچھ لکھ دوں تو وہ اس پر تیار نہ ہوا۔ کہ میں اس خط کو پڑھ لوں۔ اور معلوم کرلوں، کہ اُس نے کیا لکھا ہے۔ مگر بعد میں میں نے وہی کیا جو میں چاہتی تھی۔ میں نے اس خط کو پڑھ لیا۔

اُس نے لکھا تھا۔ "تم دلربا سے واقف نہیں ہو۔ اور میں خود بھی اس سے بہت کم واقف ہوں۔ خدا جانے اُس نے یہ نیک مزاجی، حلم و بردباری، خوش خلقی، ذہانت و ذکاوت اور حسن کہاں سے حاصل کیا ہے؟ یہ سب باتیں تکلف سے بری اور لطف آمیز ہیں۔ ہر شخص کے دل میں اس کی جگہ ہے حتےٰ کہ اگر مجھ کو خود بھی اُس سے محبت کرنے کا زیادہ موقع ملتا تو میں اس کی محبت کا حق ادا نہ کرسکتا۔"

میں نے اپنے دل میں کہا۔ "اوہو! میں ایسی ہوں کیا واقعی میں ایسی ہی ہوں؟" مجھے بے حد مسرت حاصل

ہوئی اور یہ بھی محسوس ہوا کہ میں پہلے سے زیادہ اب اس سے محبت کرتی ہوں۔ بالکل خلاف امید تمام شناساؤں سے رشتہ اتحاد قائم ہو گیا تھا۔ میرے کانوں میں ہر طرف سے یہی صدا آئی تھی کہ فلاں چچا مجھ سے بہت خوش ہیں۔ اور فلاں پھوپھی مجھ سے بے حد محبت رکھتی ہیں۔ ایک شخص نے مجھ سے کہا۔ کہ پیٹرسبرگ میں میرے مثل کوئی دوسری عورت نہیں ہے۔ ایک اور شخص نے مجھ سے کہا۔ کہ یہ بات میرے اختیار میں ہے۔ کہ میں سوسائٹی میں بہترین عورت بن سکوں اس کے علاوہ میرے شوہر کی چچازاد بہن شہزادی ڈی نے جو ایک دیرینہ مجلس نشیں عورت تھی۔ اور اتفاقیہ طور پر بہت زیادہ میری دلدادہ بن گئی تھی۔ مجھ سے بہت ہی چاپلوسی کی باتیں کیں۔ جن کو سنکر میں مغرور بن گئی۔ جب اس نے سب سے پہلے مجھے محفل رقص میں چلنے کی دعوت دی اور میں نے اپنے شوہر سے وہاں جانے کی اجازت مانگی تو وہ میری طرف مخاطب ہوا اور فریب آمیز تبسم کے ساتھ مجھ سے دریافت کیا۔ "کیا تم جانا چاہتی ہو؟" میں نے اظہار رضامندی کے لئے اپنا سر ہلایا اور مجھے محسوس ہوا۔ کہ میرا چہرہ سرخ ہو گیا ہے۔

اس نے خوش مزاجی سے قہقہہ مار کر کہا۔ "گنہگار! اپنی خواہش کا اقرار کرتی ہے۔"

میں نے متبسم ہو کر اجازت طلب نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا اور کہا۔ "کیوں؟ تم نے تو کہا تھا کہ سوسائٹی میں شریک ہونا ناممکن ہوگا۔ اور اس کی شرکت تم کو پسند نہیں ہے۔"

اس نے کہا۔ "اگر تم کو وہاں جانے کی ایسی ہی خواہش ہے تو ہم چلیں گے۔"

"بہتر ہے۔ اس سے زیادہ اچھی بات اور کیا ہو سکتی ہے"

اس نے پھر پوچھا۔ "کیا تم واقعی وہاں جانا چاہتی ہو۔ اور تم وہاں جانے کی بہت مشتاق ہو؟"

میں نے کوئی جواب نہ دیا۔

اس نے کہا "سوسائٹی بذاتہ کوئی بڑی چیز نہیں ہے لیکن دنیا کی ناقابل حصول تمنائیں ضرور بری اور ناپسندیدہ ہیں" اور بالآخر اس نے زور دیکر کہا۔ "یقیناً ہم کو وہاں جانا چاہئے۔ اور ہم ضرور چلینگے"

میں نے کہا۔ "سچ تو یہ ہے۔ کہ دنیا میں مجھے کسی اور شے کی اسقدر آرزو نہیں ہے۔ جسقدر اس محفل رقص میں جانیکی"

ہم وہاں گئے۔ اور امید سے زیادہ مجھے خوشی حاصل ہوئی۔ محفل رقص میں مجھے ایسا معلوم ہوا کہ ہمیشہ سے زیادہ میں ایک مرکز ہوں۔ اور ہر شے میرے چاروں طرف گردش کر رہی ہے۔ گویا صرف میری ہی خاطر سے ملاقاتی کمرہ روشن کیا گیا ہے۔ اور میرے ہی لئے نغمہ سرائی ہو رہی ہے۔ اور میری ہی تعریف کرنے کے لئے یہ اجتماع ہوا ہے مجھے

محسوس ہوا کہ سب لوگ، مشاطہ اور خادمہ سے لے کر ان
نوجوانوں تک جو رقص کر رہے تھے۔ اور ضعیف العمر ہستیاں
جو صرف تماشہ دیکھ رہی تھیں۔ میرا ہی ذکر کر رہے ہیں اور
مجھے یہ سمجھاتے ہیں کہ وہ مجھے پسند کرتے ہیں محفل رقص میں
میرے متعلق جمہور کی رائے، جس کا ذکر مجھ سے شہزادی
ڈی نے کیا تھا، یہ تھی:۔

"میں ایک عدیم المثال اور لاجواب عورت ہوں اور
مجھ میں ایک عجیب سادگی، یکرنگی اور خوش وضعی پائی جاتی
ہے۔"

اس کامیابی نے میرا دل ایسا بڑھایا کہ میں نے سنجیدگی
کے ساتھ اپنے شوہر سے کہا۔ کہ امسال دو تین بار اور میں
محفل رقص میں جانا چاہتی ہوں۔ تاکہ ایک بار تو مجھے پورا پورا
اطمینان حاصل ہو جائے۔ لیکن یہ سب کچھ میرے ضمیر کے خلاف تھا
میرا شوہر رضامند ہو گیا۔ اور مجھے معلوم ہوا کہ وہ میری
کامیابی سے خوش ہے۔ اور اس نے اپنے پہلے خیالات کو فراموش
کر دیا ہے۔ اور وہ پہلی بار بخوشی میرے ساتھ گیا۔

آخر کار وہ اس طرز زندگی سے جو ہم نے اختیار کر رکھا
تھا بظاہر اکتانے اور پریشان ہونے لگا۔ مگر میری حالت
ایسی نہ تھی۔ باوجود اس کے کہ وقتاً فوقتاً میں اس کی استفہامیہ
نگاہ اپنے اوپر جمی ہوئی دیکھتی تھی۔ مگر میں اس کے معنی نظر انداز
کر دیتی تھی۔ غیر لوگوں کو جو دلچسپی مجھ سے پیدا ہو گئی تھی۔ اور جس کا
اظہار وہ میرے سامنے کرتے تھے۔ مجھے اس پر بڑا ناز تھا۔
مسرت سے لبریز فضا میں رہنے اور نئی نئی باتوں کا زندگی بھر
میں اب پہلی بار مجھے تجربہ ہوا تھا۔ اس کا اخلاقی دباؤ اور اثر
یکایک غائب ہو گیا تھا۔ اور مجھے محسوس ہوتا تھا۔ کہ اس
نئی دنیا میں میں نہ صرف اس کے ہم پلہ تھی۔ بلکہ اس سے
بالاتر اور برتر حیثیت رکھتی تھی۔ اور اس لئے پہلے سے زیادہ
اس سے محبت کر سکتی تھی۔ میں پہلے نہیں سمجھ سکتی تھی کہ وہ
میری زندگی میں میرے لئے کوئی ناخوشگوار بات کس طرح پیدا
کر سکیگا۔ جب محفل رقص میں داخل ہوتے وقت ہر ایک کی
نگاہ میرے اوپر پڑتی تو میرے دل میں خودداری اور غرور کا
ایک نیا جذبہ پیدا ہو جاتا۔ مگر وہ اس مجمع کے سامنے مجھ پر
اپنا حق جتانے پر مجبور ہو کر جلدی سے مجھ سے علیحدہ ہو جاتا
اور لوگوں کے مجمع میں میری نظر سے غائب ہو جاتا تھا۔

میں اکثر دل ہی دل میں اس کو مخاطب کر کے کہتی۔
"تھوڑی دیر ٹھہرو۔ اس وقت تک صبر کرو کہ ہم گھر واپس
چلیں۔ تم کو معلوم ہو جائیگا۔ کہ کس کی خاطر سے میں حسین و
خوش وضع بننے کی کوشش کرتی ہوں۔ اور ان لوگوں میں سے
جو آج شام کو مجھے ہر چہار طرف سے گھیرے ہوئے تھے۔
کس سے محبت کرتی ہوں۔"

دراصل مجھے یہ معلوم ہوتا تھا کہ میں اپنی کامیابی پر محض
اس لئے خوش ہوں کہ اپنی تمام کامیابی اس پر نثار کر سکتی ہوں

مَیں خیال کرتی کہ ایک طریقہ سے یہ سوسائٹی میرے لئے نقصان دہ ہوسکتی ہے۔ یعنی مَیں ان لوگوں میں سے جو مجھے سوسائٹی میں ملتے تھے کسی کو اپنا گرویدہ بنالوں اور اپنے شوہر کے لئے رشک وحسد کا آتشکدہ تیار کردوں لیکن اُس کو میرے اُوپر اس قدر بھروسہ تھا۔ وہ ایسا خاموش اور مطمئن حالت میں رہتا تھا کہ یہ تمام نوجوان اس کے مقابلہ میں ذلیل معلوم ہوتے تھے اور جہانتک مَیں خیال کرسکتی تھی ان صحبتوں میں میرے لئے کوئی خطرہ نہ تھا۔ مگر پھر بھی سوسائٹی کے ان نوعمر لوگوں میں سے اکثر اشخاص کی توجہ نے میرے غرور میں اضافہ کردیا میری خودغرضی کو بڑھا دیا۔ اور مجھے سمجھا دیا کہ میرے لئے اپنے شوہر ہی سے محبت کرنا بہتر ہے۔ اور مجھے اس کی طرف سے ایک حد تک آزاد اور شاید کچھ بے پروا بنا دیا تھا۔

ایک دن جب ہم محفل رقص سے واپس آرہے تھے مَیں نے اس سے کہا۔ "اوہو! تم اِبن اِبن سے کسقدر انہماک کے ساتھ گفتگو کررہے تھے"! اور پیٹرسبرگ کی ایک مشہور عورت کا نام لیتے ہوئے جس کے ساتھ وہ اس شام کو دراصل ہمکلام تھا۔ اپنی اُنگلی کے اشارے سے اس کو دھمکایا۔ مَیں نے صرف اس کو جوش دلانے کے لئے یہ کہا تھا کیونکہ وہ غیر معمولی طور پر خاموش اور افسردہ تھا۔

مگر اُس کے ماتھے پر شکن پڑگئی۔ گویا وہ کسی اندرونی تکلیف میں مبتلا تھا۔ اور اُس نے غصّہ کے ساتھ کہا۔ "آہ! تم ایسی بات کیوں کہتی ہو۔ دلربا! تمہارے لئے ایسی بات کہنا کہاں تک مناسب ہے؟ تم کو اور مجھ کو ان باتوں سے کوئی تعلق نہیں یہ باتیں دوسروں کے لئے چھوڑ دو۔ یہ جھوٹے تعلقات ہمارے سکون قلب کو برباد کردینگے۔ یاد رکھو کہ اصلیّت کبھی ضایع نہیں ہوسکتی"۔

مَیں محجوب ہوگئی اور مَیں نے کچھ نہیں کہا۔

اُس نے پوچھا "دلربا! تمہارا کیا خیال ہے؟"

مَیں نے جواب دیا۔ "لاریب، حقیقت کبھی برباد نہیں ہوئی۔ اور نہ کبھی ہوگی۔" اور اس وقت مجھے ایسا معلوم ہوا کہ واقعی یہی بات ہے۔

اُس نے کہا۔ "خدا کرے وہ برباد نہ ہو ورنہ ہم کو دیہات واپس جانا پڑیگا۔"

مگر صرف اسی مرتبہ اُس نے مجھ سے ایسا کہا تھا۔ اس کے علاوہ مجھے معلوم ہوتا تھا کہ وہ اس طرح خوش وخرّم ہے جس طرح مَیں خود مسرور ہوں۔ اور اس احساس کے بعد مجھے بیحد خوشی حاصل ہوتی۔ اگر وہ کبھی پریشان ہوتا تو مَیں یہ سوچ کر کہ اُس کی وجہ سے مَیں دیہات میں پریشان رہ چکی ہوں۔ اپنے دل کو تسکین دیتی اور سوچتی کہ موسم گرما کے آتے ہی پھر وہی اگلی سی حالت ہوجائیگی۔ اور ہم پھر نکولسکوئی میں ٹاٹیانا کے ساتھ ہونگے۔

اس طرح موسم سرما ایک عالم بے خبری میں گذر گیا۔

اور اپنی تجویز کے خلاف ہم نے ایسٹر بھی پیٹرسبرگ میں گزار دیا۔ دوسرے ہفتہ میں جب ہم روانگی کے واسطے تیار تھے اسباب باندھ لیا گیا تھا۔ اور میرا شوہر مختلف تحائف پھول اور دوسری چیزیں دیہات میں خانگی استعمال کے لئے خرید چکا۔ اور وہ بہت مسرور تھا، اس کی چچازاد بہن شہزادی ڈی ہم سے ملنے آئی اور شنبہ تک قیام کرنے کے لئے ہم سے اصرار کیا۔ تاکہ ہم کاؤنٹیس آر کے استقبالیہ جلسہ میں شریک ہوسکیں۔ اُس نے کہا کہ "کاؤنٹیس آر تمہاری موجودگی کی بہت متمنی ہے۔ اور شہزادہ ایم جو اس وقت پیٹرسبرگ میں موجود ہے گزشتہ محفل رقص سے تم سے متعارف ہونے کا خواہشمند ہے اور صرف اسی وجہ سے استقبالیہ جماعت کے ساتھ جانے پر آمادہ ہے۔" اور کہنے لگی کہ "تم روس میں بہترین حسین عورت ہو۔ تمام شہر استقبال میں حصہ لیگا۔ مختصر یہ کہ اگر تم اس میں شریک نہ ہوئیں تو کوئی لطف نہ آئے گا۔"

میرا شوہر کمرہ کے دوسرے حصہ میں کسی سے گفتگو کر رہا تھا۔

ہماری عموزاد بہن نے پوچھا۔ "ماریا! کیا تم استقبالیہ جلسہ میں شریک ہوگی؟" میں نے مشکوک نظروں سے اپنے شوہر کی طرف دیکھ کر جواب دیا۔ "ہم تو پرسوں دیہات جانے والے ہیں۔" ہماری نگاہیں ملیں اور وہ جلدی سے دوسری طرف چلا گیا۔

ہماری چچازاد بہن نے کہا۔ "میں اس سے ٹھہرنے کے لئے کہونگی۔ پھر ہم شہر چلینگے اور تمام باتیں طے ہوجائینگی کیا ——؟"

میں نے کسی قدر رضامندی کے ساتھ جواب دیا۔ "لیکن اس صورت میں ہماری تجاویز بدل جائیں گی۔ اور اس کے علاوہ ہمارا سامان بندھ چکا ہے۔"

میرے شوہر نے کمرہ کے دوسرے حصہ میں سے غصہ اور حقارت کے لہجہ میں جس کو میں نے کبھی پہلے نہ سنا تھا کہا۔ "ہاں ان کے لئے مناسب ہے کہ یہ آج شام شہزادہ کو سلام کر آئیں۔"

ہماری چچازاد بہن نے کہا۔ "اوہو! مجھے آج پہلی بار معلوم ہوا کہ وہ بدگمانی میں مبتلا ہے۔" اور پھر اُس نے اُس سے مخاطب ہوکر کہا۔ "لیکن سرجیائی! تم کو معلوم ہونا چاہیئے کہ میں شہزادہ کی طرف سے کچھ نہیں کہہ رہی بلکہ سب لوگوں کی طرف سے کہہ رہی ہوں۔ کاؤنٹیس آر ان کی شرکت کی بہت آرزومند ہے۔"

میرے شوہر نے بے دلی سے جواب دیا۔ "یہ صرف ان ہی پر منحصر ہے۔" اور یہ کہکر وہ کمرہ سے باہر چلا گیا۔

میں نے دیکھا کہ وہ معمول سے زیادہ برافروختہ ہو رہا ہے۔ اور اس لئے میں نے اپنی بہن کو کوئی فیصلہ کن جواب

نہیں دیا۔

جیسے ہی وہ چلی گئی میں اپنے شوہر کے پاس گئی۔ وہ متفکرانہ انداز سے اِدھر اُدھر ٹہل رہا تھا۔ اور جب میں دبے پاؤں کمرہ میں پہنچی تو اُس نے نہ میرے قدموں کی آہٹ سُنی اور نہ میری طرف دیکھا۔

جب میری نظر اُس کے چہرہ پر پڑی تو میں نے اپنے دل میں کہا۔ "وہ نکولسکوئی کی یاد میں محو ہے۔" اور میں نے اپنے دل میں یہ فیصلہ کیا کہ نہ صرف آراستہ استقبالیہ کمرہ میں شام کا قہوہ، کھیت، مزارعین نشستگاہ میں شام کی نشست اور ہمارا پوشیدہ طور پر رات کا کھانا بلکہ دُنیا بھر کی محافل رقص وسرود اور شہزادوں کی دل خوش کن باتیں اس کی مسرت آمیز حالت کے مقابلہ میں ہیچ ہیں۔

میں اُس سے کہنا ہی چاہتی تھی کہ میں استقبالیہ جلوس میں شریک نہ ہونگی۔ اور مجھے اس میں شامل ہونیکی ضرورت نہیں ہے۔ کہ اُس نے یکایک میری طرف دیکھا۔ اور اُس کے چہرہ سے تردد و فکر کے آثار دُور ہو گئے۔ ایک بار پھر تیز فہمی، دانشمندی اور مربیانہ خاموشی کے نشانات اُس کے چہرہ پر رونما ہوتے۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ میں اس کو صرف ایک انسان کی حیثیت سے دیکھوں۔ بلکہ وہ ہمیشہ میرے سامنے ایک دیوتا کی حیثیت سے رونما ہونا پسند کرتا تھا۔

اُس نے میری طرف مخاطب ہو کر بے پروائی سے کہا۔ "میری پیاری! تم کیا چاہتی ہو؟"

میں نے کوئی جواب نہیں دیا۔

اس کے اس تجاہل عارفانہ اور ظاہرداری سے میری رُوح کو صدمہ پہنچا۔ کیونکہ سب سے زیادہ مجھے اُس سے محبت تھی۔

اُس نے پُوچھا۔ "تو تم استقبال کے جلوس میں شرکت کرنا پسند کرتی ہو؟"

میں نے جواب دیا۔ "ہاں میں پسند تو کرتی ہوں مگر میں جانتی ہوں کہ تم کو میری شرکت پسند نہیں ہے۔ مزید برآں ہمارا سامان بھی بندھ چکا ہے۔"

اس نے کبھی پہلے ایسی بے پروائی سے میری طرف نہ دیکھا تھا۔ اور نہ کبھی ایسی بے اعتنائی سے مجھ سے گفتگو کی تھی۔

اُس نے کہا۔ "اچھا میں سہ شنبہ تک نہ جاؤنگا۔ اور تمام اسباب بھی کھول دیا جائیگا۔ اگر تم استقبال میں شریک ہونا چاہتی ہو تو وہاں جا سکتی ہو۔ مہربانی کر کے تم جاؤ مگر میں شہر سے باہر نہ جاؤں گا۔"

حسب معمول اس نے کمرہ میں اِدھر اُدھر ٹہلنا شروع کیا۔ (غصّہ کی حالت میں ہمیشہ اس کی یہی کیفیت ہُوا کرتی

تھی) اور میری طرف نظر نہ کی۔

میں جہاں تھی وہیں کھڑی رہی۔ اور اپنی جگہ سے نہ ہلی۔ اور صرف نگاہوں سے اس کا تعاقب کرتے ہوئے کہا "دراصل میں تمہارا مطلب نہیں سمجھ سکتی۔ تم کہتے ہو کہ تم ہمیشہ ایسے ہی مطمئن رہتے ہو۔ (مگر اُس نے مجھ سے کبھی ایسا نہ کہا تھا) تم مجھ سے ایسی عجیب باتیں کیوں کرتے ہو؟ تمہاری خاطر میں اس مسرت سے محروم رہنے کے لئے تیار ہوں۔ مگر تم مجھ سے ایسے طعن آمیز لہجہ میں اور ایسے طریقہ سے گفتگو کر رہے ہو کہ اب سے پہلے کبھی تم نے ایسا برتاؤ نہ کیا تھا اور لطف یہ ہے کہ مجھے جلوس استقبال میں شریک ہونے کے لئے مجبور بھی کرتے ہو۔"

"اچھا تو تم گویا قربانی کر رہی ہو (اُس نے "قربانی" کے لفظ پر زور دیا) خیر میں اپنی قربانی کرتا ہوں۔ اور یہی بہتر ہے۔ یہ عالی دماغی کی جنگ ہے، یہ خاندانی مسرتوں کی حقیقت ہے۔ تمہارا کیا خیال ہے؟"

یہ پہلا موقع تھا کہ اُس نے ایسے سخت طنزیہ الفاظ کا استعمال کیا تھا۔ اس کے طعن و تشنیع سے میرے دل پر کوئی اثر نہ ہوا۔ بلکہ مجھے غصّہ آ گیا۔ اور اس تلخی سے بجائے خوف کے میرے دل میں اور سختی پیدا ہو گئی۔ کیا یہ ممکن ہو سکتا ہے کہ اُس نے جو ہمیشہ ظاہرداری برتنے سے خوف کھاتا تھا۔ اور جو ہمیشہ سچائی اور سادگی کا دلدادہ تھا۔ ایسی باتیں کہیں تھیں؟

میرا قصور صرف یہ تھا کہ میں اس کی خاطر سے اس خوشی سے محروم رہنا چاہتی تھی۔ جس میں کوئی نقصان نہ تھا اور یا یہ کہ ایک لمحہ پیشتر میں نے اس کا مطلب سمجھ لیا تھا۔ اور میں اس سے محبت کرتی تھی۔ ہماری تجاویز بدل گئیں۔ اُس نے میرے سچّے اور سادہ الفاظ کو نہ سُنا۔ اور مجھے اس کا ملال ہُوا۔

میں نے ایک گہری سانس لیکر کہا۔ "تمہارا مزاج بہت کچھ بدل گیا ہے۔ تمہاری نگاہ میں میں کس گناہ کی مرتکب ہوئی ہوں؟ —— اس کی وجہ صرف جلوس استقبال کی شرکت ہی نہیں ہو سکتی بلکہ کوئی دیرینہ کینہ میری طرف سے تمہارے دل میں موجود ہے۔ آج تم سچائی سے کیوں گریز کرتے ہو۔ حالانکہ پیشتر ایک بار بھی تم نے راستبازی سے مُنہ نہیں موڑا۔ ایمانداری سے بتاؤ کہ تم نے میرا کیا قصور دیکھا ہے؟" اور اس بات کو یاد کر کے کہ موسم سرما میں کبھی اس نے میری کوئی خطا نہیں دیکھی اپنے دل کو مطمئن بنا کر میں خیال کرنے لگی کہ اس کا جواب اُس کے پاس کیا ہو گا؟

میں کمرہ کے درمیان میں جا کھڑی ہُوئی تا کہ وہ میرے نزدیک ہو کر گزرے۔ اور اس کی طرف دیکھنے لگی میں نے خیال کیا۔ کہ وہ میرے پاس آئیگا۔ مجھے گلے لگائیگا۔ اور

اس شکر رنجی کا خاتمہ ہو جائیگا۔ اور مجھے افسوس ہوا۔ کہ مجھے اسکی غلطی ظاہر کرنے کا موقع نہیں ملا لیکن وہ کمرہ کے دوسرے کنارہ ہی پر ٹھہر گیا اور میری طرف دیکھنے لگا۔

اُس نے پوچھا "تو تم ابھی تک میرا مطلب نہیں سمجھیں؟"

"نہیں"

"اچھا، میں تم کو سمجھاؤنگا وہ جذبہ، جو میرے دل میں موجزن ہے اور جس سے متاثر ہوئے بغیر میں نہیں رہ سکتا جو مجھے پریشان کر رہا ہے۔ اور جس کی وجہ سے میں بہت زیادہ مضطرب ہوں۔" وہ ٹھہر گیا اور دراصل اپنی آواز کی تیزی سے اُس کو خود حیرت ہوئی۔

میری آنکھوں میں غصہ اور حقارت کی وجہ سے آنسو بھر آئے۔ اور میں نے پوچھا "تو وہ کیا بات ہے؟"

"میرے لئے یہ امر موجب پریشانی ہے کہ یہ شہزادہ خیال کرتا ہے کہ تم حسین ہو وہ تم سے تعارف حاصل کرنے کا خواہشمند ہے۔ اور تمہارے شوہر اور خود تمہارے مرتبہ کو، جو بحیثیت ایک عورت ہونے کے ہے۔ ملحوظ نہیں رکھتا اور تم اُس جذبہ کو جو تمہارے شوہر کے دل میں ہے سمجھنا نہیں چاہتیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ عورت ہونے کی حیثیت سے جو تمہارا رتبہ ہے تم کو اس کا مطلق خیال نہیں اور اس کے برخلاف تم اپنے شوہر سے کہتی ہو کہ میں اپنے آپ کو قربان کر رہی ہوں یا بالفاظ دیگر یہ کہ شہزادہ کے حضور میں پہنچکر میری عزت افزائی ہوتی۔ مگر میں تمہارے لئے اس سے محروم رہنے پر آمادہ ہوں"

جسقدر اُس نے گفتگو کو طول دیا۔ اُسی قدر اسکا جوش بڑھتا گیا۔ اور اس کی آواز سے سختی، ترشی اور وحشت برسنے لگی۔ میں نے اس کو کبھی اس حالت میں نہ دیکھا تھا اور نہ مجھے کبھی ایسی امید تھی۔ میرا خون کھولنے لگا۔ اور میں خوفزدہ ہوگئی لیکن اس کے ساتھ ہی ناروا نقصان برداشت کرنے اور اپنی اہانت کے احساس سے میرا دل قوی ہوگیا۔ اور مجھے اس کا بدلہ لینا ضروری معلوم ہوا۔

میں نے کہا "مجھے عرصہ سے اس کی امید تھی اور جو کچھ کہنا چاہو کہہ لو۔"

اُس نے کہا "میں نہیں سمجھ سکتا۔ کہ تم کو کس بات کی امید تھی۔ بدگمان ہونے کے لئے میرے پاس کافی وجوہ ہیں۔ میں دیکھتا ہوں کہ اس بیوقوف سوسائٹی کے سبب سے تم دن بدن نکمی، کاہل اور عیش پسند ہوتی جاتی ہو۔ اور مجھے روزِ اوّل ہی سے اس کی امید تھی۔ اس کی وجہ سے مجھے ایسی پریشانی اور تکلیف ہے کہ کبھی پہلے نہ ہوئی تھی۔ مجھے افسوس ہے کہ تمہاری سہیلی اپنے بھدّے ہاتھوں سے میرے دل میں جگہ کرنا چاہتی ہے۔ اور میری بدگمانی کا ذکر کرتی ہے۔ ہاں میری بدگمانی کا اور پھر کس کے مقابلہ میں؟ اس شخص کے مقابلہ میں جس سے ہم دونوں میں سے کوئی بھی واقف

نہیں ہیں۔ اور تم گو باعمداً میرا مطلب سمجھنا نہیں چاہتیں۔ اور میرے لئے قربانی کرنے کا ذکر کرتی ہو۔ کس بات کی قربانی؟ —— تم کو شرم آنی چاہئے۔ اور پشیمان ہونا چاہئے۔ اپنے اخلاقی تنزل پر —— بیشک قربانی ——"

مَیں نے اپنے دل میں کہا۔ "اوہو! آج مجھے ایک شوہر کی طاقت معلوم ہوئی۔ کہ وہ عورت کو جس سے کوئی قصور سرزد نہ ہوا ہو۔ کس طرح حقیر و ذلیل کر سکتا ہے۔ یہی بات شوہر کے حقوق میں داخل ہے۔ مگر مَیں اس کو کب مانتی ہوں" یہ احساس کر کے کہ میرا سانس پھولا ہوا تھا۔ اور میرا چہرہ سرخ ہو گیا تھا۔ مَیں نے کہا۔ "نہیں مَیں تمہارے لئے کوئی قربانی نہ کرونگی۔ مَیں شنبہ کو ضرور استقبالیہ جلوس میں شریک ہونگی۔ اور کوئی طاقت مجھے اس سے نہیں روک سکتی۔"

اُس نے غصہ سے بے اختیار ہو کر کہا۔ "بہتر ہے۔ خدا تم کو خوش و خرم رکھے لیکن آج سے ہمارے تعلقات منقطع ہو گئے۔ آج سے مجھے تمہاری وجہ سے کوئی تکلیف نہ ہو گی۔ مَیں نے بڑی بیوقوفی کی۔ جب مَیں نے ——"

اُس نے پھر کچھ کہنا چاہا۔ اور جملہ کو پورا کرنے کی کوشش کی مگر وہ کچھ نہ کر سکا۔

مجھے اُس سے خوف معلوم ہونے لگا۔ اور مَیں اس سے نفرت کرنے لگی۔ میرے دل میں بہت سی باتیں تھیں جو مَیں اپنی توہین کے جواب میں اُس سے کہنا چاہتی تھی لیکن اگر مَیں کچھ بھی کہتی تو میرے آنسو نکل پڑتے اور مَیں اسکی نگاہوں سے گر جاتی، اس لئے مَیں بغیر کچھ کہے ہوئے کمرہ سے نکل گئی۔ لیکن جیسے ہی اس کے قدموں کی آواز آنا بند ہوئی۔ مَیں اپنی موجودہ حالت کا اندازہ کر کے کانپ اٹھی مَیں نے محسوس کیا کہ وہ تعلق جس پر میری مسرت کا انحصار تھا۔ ہمیشہ کے واسطے منقطع ہو گیا۔ اور مجھے خواہش ہوئی کہ مَیں اس کے پاس پھر واپس جاؤں۔

مَیں نے اپنے دل میں کہا۔ "اگر مَیں رحمدل نگاہوں سے اس کی طرف دیکھ کر اس کو سینے سے لگانے کے لئے ہاتھ پھیلاؤں تو کیا وہ میرا مطلب سمجھنے میں بے اعتنائی سے کام نہ لیگا؟ کیا وہ میری عالی ہمتی کی داد دیگا؟ اور باوجود اس کے کہ وہ اپنے آپ کو حق پر سمجھتا ہے۔ اور اپنی خاموشی پر مغرور ہے۔ کیا وہ میرے اظہار تاسف کو قبول کر کے مجھے معاف کر دیگا؟ آخر اُس نے جو میری محبت کا دعویدار ہے۔ کیوں ایسے نفرت آمیز طریقہ سے میری توہین کی؟"

مَیں اس کے پاس نہ گئی۔ بلکہ اپنے کمرہ میں چلی گئی۔ جہاں عرصہ تک مَیں عالم تنہائی میں اس گفتگو کو جو ہمارے درمیان ہو چکی تھی یاد کر کے خوفزدہ ہو کر روتی رہی اور ان الفاظ کے مقابلہ میں دوسرے دوستانہ الفاظ کا خیال کرتی رہی اور پھر خوف و توہین کے احساس نے پورا منظر میرے

پیش نظر کر دیا۔

جب میں شام کو چائے پینے کے لئے گئی اور ایلس کے سامنے جو ہمارے یہاں مقیم تھی اپنے شوہر سے ملی تو مجھے محسوس ہوا کہ ہمارے درمیان اختلاف کی ایک خلیج حائل ہو گئی ہے۔ ایلس نے مجھ سے پوچھا کہ تم لوگ کب جاؤ گے؟ مگر قبل اس کے کہ میں کچھ جواب دوں میرے شوہر نے کہا۔ "آئندہ شنبہ کو۔ ہم کاؤنٹیس آر کے استقبال میں شریک ہونگے۔" پھر اُس نے میری طرف مخاطب ہو کر کہا۔

"کیا تم استقبالیہ جلوس میں شرکت کرو گی؟"

میں اس سادگی کے ساتھ اس کو سوال کرتے ہوئے دیکھ کر خوفزدہ ہو گئی۔ اور بزدلانہ طریقہ سے اس کی طرف دیکھنے لگی۔ اس کی نظر میرے اوپر جمی ہوئی تھی۔ اس کی نگاہوں سے غصّہ اور حقارت ٹپک رہی تھی۔ اور اس کی آواز پُر استقلال اور افسردہ تھی۔

میں نے جواب دیا۔ "ہاں میں استقبال میں شریک ہونگی۔"

شام کو جب میں تنہا بیٹھی ہوئی تھی وہ میرے پاس آیا اور اپنا ہاتھ میری طرف بڑھا کر کہا۔ "میں نے جو کچھ تم سے کہا ہے براہِ عنایت اس کو بھول جاؤ۔"

میں نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ میرے لبوں پر تبسّم کی لہریں دوڑ گئیں اور میری آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ مگر اس نے اپنا ہاتھ کھینچ لیا۔ گویا وہ ان جذبات سے جو اس منظر سے پیدا ہونے والے تھے۔ خائف تھا۔ اور مجھ سے دور ایک آرام کرسی پر جا بیٹھا۔

میں نے خیال کیا "کسقدر حیرت ہے کہ وہ اپنے آپ کو حق بجانب سمجھتا ہے۔" اور میں اس سے صلح کرنے کے لئے آمادہ ہوئی۔ اور استقبالیہ جلوس میں شریک نہ ہونے کی درخواست کرنے ہی کو تھی کہ اُس نے کہا۔ "مجھے اپنی والدہ کو اطلاع دے دینی چاہیئے۔ کہ ہم نے واپسی کا ارادہ ملتوی کر دیا ہے۔ ورنہ وہ پریشان ہونگی۔"

میں نے پوچھا۔ "تو ہم یہاں سے کب تک روانہ ہونگے؟"

اس نے جواب دیا۔ "سہ شنبہ کو' استقبال کے بعد"

میں نے اس سے نگاہ ملا کر کہا۔ "مجھے امید ہے کہ تم میری خاطر سے ایسا نہیں کر رہے ہو۔" مگر اُس نے میری طرف صرف دیکھا۔ اور زبان سے کچھ نہ کہا۔ میرے اور اُس کے درمیان مغائرت کا پردہ حائل تھا اور یکایک مجھے اس کے چہرہ پر ضعیفی اور افسردگی کی علامتیں نظر آنے لگیں۔

ہم استقبال میں شریک ہوتے اور بظاہر ہمارے تعلقات میں کوئی تغیّر واقع نہ ہوا۔ مگر حقیقت میں اب یہ تعلقات پہلے سے نہ رہے تھے۔

میں محفل میں دوسری خواتین کے ساتھ بیٹھی ہوئی تھی کہ شہزادہ میرے پاس آیا اور اُس سے گفتگو کرنے کے لئے

مجبوراً مجھے کھڑا ہونا پڑا۔ کھڑے ہوتے ہوتے میں نے بلاقصد اپنے شوہر کی تلاش میں اِدھر اُدھر نگاہ دوڑائی اور اس کو ملاقاتی کمرہ کے دوسرے کنارہ پر بیٹھا ہُوا دیکھا۔ اُس نے میری طرف دیکھ کر اپنا منہ پھیر لیا۔ یکایک میں ندامت اور غصہ کے احساس سے پریشان ہوگئی۔ اور شہزادہ کو اپنے بالوں پر نگاہ جمائے ہوئے دیکھ کر مجھے حجاب معلوم ہوا۔ لیکن میں کھڑے ہونے اور اس سے ہمکلام ہونے کے لئے مجبور تھی۔ جب میں کھڑی ہوئی تو اُس نے میرے سراپا پر نظر ڈالی۔

ہماری گفتگو بہت مختصر تھی۔ کیونکہ میرے نزدیک اس کے بیٹھنے کیلئے کوئی جگہ نہ تھی اور اس کو معلوم ہورہا تھا کہ میرے لئے اُس سے ہمکلام ہونا شاق ہے۔ ہم نے گزشتہ محفل رقص کے متعلق گفتگو کی۔ اور اس جگہ کے متعلق جہاں ہم موسم گرما میں رہے تھے۔ چند الفاظ کہے۔ اور چند فقرے دوسری باتوں کے متعلق ہوئے۔ اس کے بعد وہ میرے پاس سے چلا گیا۔ اور اُس نے میرے شوہر سے تعارف پیدا کرنے کی خواہش ظاہر کی۔ میں نے کمرہ کے دوسرے سرے پر ان دونوں کو ملتے ہوئے اور آپس میں گفتگو کرتے ہوئے دیکھا۔ شہزادہ دراصل میرے متعلق گفتگو کر رہا تھا۔ کیونکہ دورانِ گفتگو میں وہ میری طرف دیکھ کر مسکراتا جاتا تھا۔

میرے شوہر کا چہرہ یکایک سُرخ ہوگیا۔ اُس نے باادب سلام کیا اور شہزادہ کے پاس سے علیحدہ ہوگیا مجھے بھی ندامت ہوئی۔ کیونکہ میں شہزادہ کی اس گفتگو سے جو اُس نے میرے متعلق میرے شوہر سے کی تھی پریشان تھی اور خصوصیت سے اپنے شوہر کے متعلق اسکی رائے سُنکر مضطرب تھی۔ ایسا معلوم ہُوا کہ اس وقت جبکہ میں شہزادہ سے ہمکلام تھی۔ سب لوگوں نے میرے حیا آمیز اضطراب کو ضرور دیکھا ہوگا۔ اور میرے شوہر کی بے اعتنائی بھی اُنسے پوشیدہ نہ رہی ہوگی۔ خدا ہی جانے ان لوگوں نے اسکے کیا معنی لئے ہونگے۔ کیا یہ ممکن تھا کہ لوگوں کو اس شکر رنجی سے آگاہی ہوگئی تھی۔ جو میرے اور میرے شوہر کے درمیان ہوگئی تھی؟

میری چچازاد بہن مجھے گھر لے آئی۔ اور راستہ میں میرے شوہر کے متعلق گفتگو ہوتی رہی۔ میں نے اُس سے وہ تمام باتیں بیان کیں جو اس ناخوشگوار استقبال کی بدولت پیدا ہوگئی تھیں۔ اور اُس نے مجھے یہ کہکر تسلی دی کہ یہ ایک غلط فہمی ہے۔ اور ازدواجی زندگی میں اکثر ایسا ہوتا ہے۔ مگر اس کا کوئی خاص اثر نہیں ہوتا۔ اُس نے میرے شوہر کے متعلق اپنی رائے ان الفاظ میں ظاہر کی کہ وہ خاموش اور مغرور ہے۔ میں نے اس کی رائے سے اتفاق کیا اور مجھے ایسا معلوم ہُوا کہ اب میں خود بھی اس کی طبیعت کا بہتر اندازہ کرسکتی ہوں۔

لیکن جب مجھے اپنے شوہر کے ساتھ پھر تنہائی کا موقع ملا۔ تو اسکے متعلق میرا یہ فیصلہ میرے ضمیر کے خلاف معلوم ہُوا۔ اور مجھے محسوس ہُوا کہ ہمارے درمیان جو اختلاف رونما ہوچکا تھا اب اس میں اور بھی ترقی ہوگئی ہے۔ (باقی باقی)

محسوسات

ستم بھی اس ادا فہم محبت کے کرم نکلے
یہ نکتہ دیکھنے والے مگر محفل میں کم نکلے

ریاضِ خلد میں واعظ نگاہیں ہم نے دوڑائیں
تو لاکھوں بندۂ پیرِ مغاں تیری قسم نکلے

نگاہیں پاک تھیں صورت پرستانِ مجازی کی
یہی صورت کے بندے واقفِ لوح و قلم نکلے

نہ اُن کی آستیں میں جذب ہوں آنسو تو کیا رونا
نکلنے کو تو اے دِل آرزوئے چشم نم نکلے

الٰہی اس جگہ ہم مشربوں کو دِل ترستا ہے
کوئی تو بے نیازِ فتنۂ دیر و حرم نکلے

نہایت غور سے ہم نے کتابِ زندگی دیکھی
بہت افسانہ ہائے بیکسی زیبِ رقم نکلے

تری چشمِ خمار آلود سے دُوری بہت اچھی
کہیں ایسا نہ ہو اس بادۂ رنگیں میں سم نکلے

کشاکشہائے فرقت نے ہمیں بے حال کر ڈالا
خُدایا! کیا مصیبت ہے نہ غم جائے نہ دم نکلے

ہمیں ہستی پہ اپنی اعتمادِ کامرانی ہے
مزا آئے جو یہ بھی پردۂ روئے صنم نکلے

جہاں سارا اسیرِ شیوۂ فرزانگی نکلا
فدائے راحتِ دیوانگی نکلے تو ہم نکلے

جنونِ عشق تھا جن کو اُنہیں آزادِ غم پایا
غرورِ عیش تھا جن کو وہی پابندِ غم نکلے

نہ کر اصرارِ جامِ پے بہ پے پر اس طرح عابدؔ
کہ آنکھیں پھیر لے ساقی تو محفل میں بھرم نکلے

عابدؔ

ضبطِ خواب

ایک مشہور انگریز مصنّف کا مقولہ ہے کہ " اگر اِس عالمِ امکان میں ہم خواب کے متعلق قطعی اختیارات کے مالک ہو سکتے۔ تو ہماری متخیلہ عجیب جانفزا واقعات و ممکنات کی آماجگاہ بن جاتی۔ ذرا غور تو کرو۔ کہ جہان بھر کی وہ کونسی چیز ہے۔ جس کے متعلق خواب دیکھنے کی خواہش پیدا نہ ہوتی۔ محو شدہ چہرے، خوشگوار احساسات غرضیکہ ہر گزشتہ یاد کا ایک معاینہ ثانی کس قدر تعجب خیز۔ اور مسرور ہوتا۔"

حقیقت میں پچھلے دس پندرہ سالوں سے ماہرینِ نفسیات اس بات کی کوشش کرتے رہے ہیں۔ کہ کوئی ایسا طریقہ دریافت ہو جائے جس کی مدد سے ہم خواب کے متعلق اور نہیں تو چند معمولی اختیارات کے مالک ہو سکیں ہر چند کہ یہ مسلّمہ ہے کہ خواب نہایت نازک رگ و ریشے سے تخلیق پاتے ہیں۔ اور اس لئے ہماری قوّتِ مدرکہ ان کی یاد کو برقرار رکھنے میں کبھی پوری طرح کامیاب نہیں ہو سکتی لیکن ان تمام باتوں کے باوجود مجھے اس حقیقت کے اظہار کرنے میں کوئی تامل نہیں۔ کہ کوشش سے چند ایسے طریقے دستیاب ہو سکتے ہیں۔ جن کی مدد سے ہم خواب کے متعلق معمولی اختیارات حاصل کر سکیں۔ اور بلا شبہ انھی وسائل کی مدد سے مشق بہم پہنچا کر خوابوں پر اچھا خاصہ ضبط حاصل کر لینا کوئی بڑی بات نہیں۔ اسی صورت میں ہم خواب کی تمام خوشگوار کیفیات سے لذّت اندوز ہو سکتے ہیں جب ہمیں خوشگوار خواب دیکھنے کی قوّت حاصل ہو جائے۔ اور جزوی طور پر تمام خوابوں کے متعلق ان کے موضوع کو انتخاب کرنے میں کوئی حصّہ حاصل ہو۔ یہ ظاہر ہے کہ اس ذریعے کے اثرات دیرپا ہونگے لیکن اس پر اعتراض کیا جا سکتا ہے۔ کہ خواب کی خصوصیات میں کوئی نمایاں تغیّر پیدا کرنا تقریباً ناممکن ہے۔ اور اسی لئے ہم کبھی ناخوشگوار اور خوفناک خواب نہ دیکھنے کی قوّت حاصل ہی نہیں کر سکتے عام طور پر کہا جاتا ہے۔ کہ حالتِ خواب میں دماغ تمام بیداری کی کیفیات سے بے نیاز ہو کر کام کرتا ہے۔ یہاں تک کہ برگسان جیسا مشہور فلسفی اور ماہرِ نفسیات اپنے نظریہ ہائے خواب کو اس قسم کے تصوراتِ اساسی پر قائم کرتا ہے۔ اور اس بات کو پہلے ہی فرض کئے لیتا ہے کہ دماغ کے خصائصِ نیم شعوری خصائص شعوری سے قطعاً مختلف ہوتے ہیں لیکن تازہ ترین تحقیقات اس بات کی مظہر ہے کہ ارادہ دماغ کے خصائصِ نیم شعوری کو بھی متاثر کرتا ہے اور اسی لئے

لازمی طور پر یہ نتیجہ نکلتا ہے۔ کہ اگر ارادہ اس طرح متاثر کر سکتا ہے تو کوشش کرنے سے ہمارے خواب سراسر ارادی ہو سکتے ہیں۔ مختصراً کہا جا سکتا ہے۔ کہ ناخوشگوار اور خوفناک خواب نہ دیکھنا ایک ارادی فعل ہو سکتا ہے۔ اور مشق پیہم سے ایک خاص حد تک ہم خواب میں اپنے ارادے سے اسی طرح ترمیم و تنسیخ کر سکتے ہیں۔ جس طرح ہم عالم بیداری میں اپنے خیالات و احساسات میں کرتے رہتے ہیں۔ اس طرح کی مشق کرنے سے معلوم ہوگا۔ کہ ہم خوشگوار خوابوں کو اپنے ارادے سے دُہرا سکتے ہیں۔ اور یہ کہ ہم ان میں اپنے مذاق کے مطابق ایزاد بھی کر سکتے ہیں۔ اس قوت کا حاصل کر لینا کوئی ایسا تعجب خیز امر نہیں۔ کیونکہ سائنس کی تحقیقات سے بھی اسی طرح کے اشارے ثابت ہوتے ہیں۔

اگر ہم فرض کر لیں۔ کہ یہ نظریہ جس کی بنا پر انسانی فطرت دو ممیز شخصیتوں سے مرکب ہے۔ ایک وہ جو عام طور پر کام کرتی رہتی ہے۔ دوسری وہ جو خواب میں یا مسمریزم اور ہپناٹزم کے زیر اثر کام کرنے لگتی ہے۔" تو ہمیں معلوم ہوگا کہ اس نظریے کو مان لینے کے بعد ہماری بہت سی مشکلات کا حل خود بخود پیش نظر ہو جاتا ہے۔ مستند شہادتوں نے ثابت کر دیا ہے کہ ہپناٹزم کے زیر اثر معمول کے دماغ اور اعصاب پر ضبطِ کُلی حاصل کیا جا سکتا ہے۔ اس کے علاوہ حواس اور حافظہ بھی زیر اثر لائے جا سکتے ہیں۔ اگر اثر پذیری کے اس عمل سے ممکن ہے کہ ایک دماغ دوسرے دماغ کو اس طرح مطیع و منقاد کر لے۔ تو کیا یہ ناممکن ہے کہ ہماری شعوری حالت جزئی طور پر ہماری غیر شعوری حالت کو اثر پذیر کر سکے۔ اسی کے ساتھ ہی ہمیں اس بات کا احساس کرنا چاہیئے۔ کہ ہم اپنے ارادے سے اپنے اعصاب کو بھی وقتاً فوقتاً متاثر کرتے رہتے ہیں۔ جن اشخاص نے اپنے جسم اور دماغ کو ایک باقاعدہ نظامِ ارادی کے ماتحت رکھا ہے۔ ان کے لئے اس بات کو مان لینے میں کوئی دقت نہیں۔ کہ ہم دماغ کی نیم شعوری حالت کو اپنے ارادے سے متاثر کر سکتے ہیں۔

سوال یہ ہے کہ ہم یہ قوت حاصل کس طرح کر سکتے ہیں وہ کس قسم کی مشق ہے۔ جس کی وجہ سے ہمارا دماغ اپنی نیم شعوری حالت میں ہمارے ارادی احکام کو ماننے کے لئے تیار رہا کرے۔ مسٹر فریڈرک میرز اپنے تجربات کی بنا پر چند وسائل پیش کرتے ہیں۔ لیکن عام طور پر ایسے وسائل خواہ انفرادی حیثیت سے کیسے ہی نفع رساں کیوں نہ ہوں۔ اجتماعی طور پر تقریباً بے سود ثابت ہوتے ہیں۔ کیونکہ ہر دماغ اپنی خصوصیاتِ امتیازی کے لحاظ سے متاثر ہوتا ہے۔

ہم جو طریقہ پیش کرنے والے ہیں وہ دو حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔

اوّل تو یہ۔ کہ اس طریقے سے ہولناک اور ناخوشگوار خوابوں کا اعادہ روک دیا جائے۔

حقیقت میں اس قسم کے خواب نہایت کاہش خیز ہوتے ہیں۔ کئی بچّوں اور پختہ عمر اشخاص کی زبانی معلوم ہوتا ہے کہ وہ کسی خاص خوفناک خواب دیکھنے کے ڈر کی وجہ سے تمام عمر خواب نہ دیکھنا پسند کرینگے۔

ایک مشہور مصنّف اپنے بچپن کے احساسات کو بیان کرتے ہوئے لکھتا ہے۔ " مجھے ذہنی خطرات سے بہت سخت خوف آیا کرتا تھا۔ رات کا وقت، تنہائی اور گھُپ اندھیرا میرے لئے دوزخ کا نمونہ تھے۔ چار سال سے لے کر آٹھ سال کی عمر تک مَیں نے کبھی اپنے تکیئے پر سونے کے لئے سر نہیں رکھا۔ جب مجھے خیال نہ آیا ہو۔ کہ مَیں کوئی خوفناک خواب دیکھونگا۔ اور اکثر و بیشتر میری یہ پیشینگوئیاں دردناک طور پر صحیح ثابت ہوتی تھیں" اسی طرح بہت کم اشخاص ہونگے۔ جو بچپن میں اس قسم کے خوابوں سے مامون رہ سکے ہوں۔ جن لوگوں کو اس قسم کے خواب آتے ہوں۔ اُنہیں ناصحانہ انداز میں یہ سُنا دینا کہ سب کچھ ہاضمے کی خرابی کا فتور ہے۔ حقیقت کے ایک جزو کی تشریح ہے۔ یہ درست ہے کہ اس قسم کے خواب عام طور پر معدے کی خرابی وغیرہ سے جس کے اثرات دماغ پر مترتب ہو چکتے ہیں۔ پیدا ہوتے ہیں یا پھر ان کا مخزن کوئی خاص خیال یا جذبہ ہوتا ہے جو شعوری حالت میں اور ہنگامی کیفیات میں دبا رہتا ہے۔ لیکن آپ اس بات کی بھی کوئی تاویل نہیں کر سکتے کہ کئی ایک خواب جو مذکورہ بالا اسباب کے باہم ہو جانے پر پیدا ہوتے ہیں۔ ان اسباب کے ہٹ جانے کے بعد بھی برسوں اپنے اعادے سے دماغ کو پریشان کرتے رہتے ہیں۔ عین اسی طرح جس طرح کوئی آواز کسی وادی میں پہاڑوں سے ٹکرا ٹکرا کر بار بار گونجتی رہے۔ یا اُن ہزاروں روشنیوں کی طرح جو ایک شیشے کا عکس دوسرے شیشے پر ڈالنے سے پیدا ہوتی ہیں۔ یہ خواب بھی اپنے مخزن کے فنا ہو جانے کے بعد باقی رہتے ہیں۔ ہماری کوشش یہ ہونی چاہیئے۔ کہ ہم اس قسم کے خوابوں کے اعادے کو ناممکن بنا دیں، یا کم از کم ان پر ایسا ضبط حاصل کر لیں، کہ ہمارے ایک ارادی حکم پر خواب کا سلسلہ فوراً منقطع ہو جائے۔ یہ طریقہ بالکل عام تجربوں سے اخذ کیا گیا ہے۔ قارئینِ کرام میں سے اکثر نے محسوس کیا ہوگا۔ کہ خواب میں ہم کئی دفعہ اپنے آپ کو یہ یقین دلاتے ہیں۔ کہ ہم خواب دیکھ رہے ہیں۔ اور ڈرنے کی کوئی وجہ نہیں اسی عام تجربے میں وہ طریقہ پنہاں ہے جس کی وجہ سے ہم اس قسم کے ناخوشگوار اعادے کو منقطع کر سکتے ہیں۔ اس بات کا احساس ہونا چاہیئے کہ ناخوشگوار خواب کے شروع ہوتے ہی ہمارا دماغ فوراً یہ خیال کر لے۔ کہ یہ ایک خواب ہے۔ جس وقت مشق سے یہ بات پیدا ہو جائیگی

توہمارے ڈرنے کی کوئی وجہ باقی نہ رہے گی۔ کیونکہ ہم محسوس کرینگے کہ یہ تمام ایک خواب ہے۔ اور ہم جب چاہیں جاگ کر اس سلسلے کو منقطع کر سکتے ہیں۔ اس راز کو سمجھ لینے کے بعد کوشش کرنی چاہیئے۔ کہ آدمی وقتاً فوقتاً اس قسم کے فقرات دُہراتا رہے۔ "یہ ایک خواب ہے۔ مجھے اب جاگنا چاہیئے" حتےٰ کہ بار بار دُہرانے سے یہ فقرہ ہماری غیر شعوری کیفیات پر اسقدر حاوی ہو جائے کہ کسی خواب کا نقش اُسے مٹا نہ سکے"۔ اس کے بعد ہر ناخوشگوار خواب کے شروع میں خود بخود دماغ یہ فقرہ دُہرانے لگے گا۔ "کہ یہ ایک خواب ہے۔ مجھے اب جاگنا چاہیئے۔" شروع شروع میں آپ کی نیند فوراً کُھل جائیگی۔ لیکن بعد ازاں جب آپ کو اچھی طرح مشق ہو جائیگی۔ تو آپ کی نیند نہیں کُھلے گی۔ اور خواب بھی جاری رہیگا۔ لیکن خواب کے خوفناک عناصر فنا ہو جائینگے۔ اس سادہ طریقے میں کوئی ایسی بات نہیں۔ جسے ہر شخص آسانی سے نہ کر سکے۔ دماغ کی تمام کیفیات کو ان الفاظ پر مجتمع کرنے کی کوشش کرنی چاہیئے۔ جو شروع میں دُہرائے جا چکے ہیں۔ تجربات سے معلوم ہوتا ہے کہ ان الفاظ کو بار بار دُہرانا وقتاً فوقتاً اونچی آواز میں کہنا اور ہمیشہ انہی الفاظ کا استعمال کرنا بہت سود مند ثابت ہوتا ہے۔ سونے سے پیشتر ان الفاظ کو دُہرا لینا اشد ضروری ہے اور یہ مشق اس وقت تک جاری رکھنی چاہیئے۔ جب تک یہ فقرہ اور نہ صرف یہ فقرہ بلکہ وہ نفسیاتی نکتہ جو اس فقرے میں مضمر ہے۔ دماغ پر پُوری طرح مستولی ہو جائے۔ اسقدر مشق کرنے کے بعد شروع شروع میں ناخوشگوار خواب کی ابتدا ہی میں دماغ ایک قطعی حکم دے کر یہ سلسلہ منقطع کر دیگا۔ لیکن مشق کے انتہائی مدارج طے کرنے کے بعد آپکو محسوس ہوگا۔ کہ دماغ کے حکم دینے کے بعد خواب جاری رہتا ہے مگر جیسا کہ ہم پہلے کہہ چکے ہیں۔ خواب میں سے خوف کا عنصر جاتا رہتا ہے۔ مندرجہ ذیل خواب جو راقم الحروف کا ذاتی تجربہ ہے۔ اس نظریئے کو زیادہ واضح کرنے کے لئے پیش کیا جاتا ہے۔

ایک طویل خواب کے دوران میں مجھے محسوس ہُوا گویا میرے مُلک کے خلاف ایک نہایت عظیم سازش کیجا رہی ہے۔ سازش میں حصّہ لینے والوں کو کسی نہ کسی طرح معلوم ہوگیا۔ کہ مَیں ان کے راز سے واقف ہوں۔ اب مجھ پر خوف طاری ہونے لگا۔ مَیں نے بے تحاشہ بھاگنا شروع کیا۔ اور سازشی اشخاص کا قاید میرے پیچھے پیچھے بھاگا۔ میری پیشانی پر پسینے کے قطرات نمودار ہو گئے۔ اور مَیں نے خوف سے تھر تھر کانپنا شروع کیا۔ عین اسی وقت میرے دماغ میں ردِ عمل کی ایک رو دوڑ گئی۔ اور مجھے فوراً وہ فقرہ سوجھ گیا جس کو کہنے کے بعد خواب کا سلسلہ منقطع کیا جا سکتا تھا۔ لیکن اس کے ساتھ ہی مَیں نے خواب میں ہی نیم شعوری طور

پر یہ خیال کرنا شروع کیا۔ کہ میرا جاگنا وطن کے لئے خطرناک
ہوگا۔ کیونکہ اس صورت میں مجھے سازش کی تمام جزئیات
کا علم حاصل نہ ہوگا۔ عجیب مخمصہ تھا۔ ایک طرف میری طبیعت
یہ چاہتی تھی۔ کہ میں فوراً خواب سے جاگ اٹھوں۔ دوسری
طرف خواب ہی میں مجھے اس فرض کا احساس ہوتا تھا کہ مجھے
تمام جزئیات کا پتہ لگانا چاہئے۔ ازبس میری مشق تکمیل
تک پہنچ چکی تھی۔ اور خواب میں بھی میرا دماغ جزوی طور پر ارادے
کے ماتحت کام کر سکتا تھا۔ میں نے یہ سوچ لیا۔ کہ یہ محض
ایک خواب ہے۔ اور میرے لئے ہر وقت جاگنا ممکن ہے
لیکن ساتھ ہی میری طبیعت کا اقتضا تھا۔ کہ میں اس واقعات
سے لبریز فضا کو تھوڑا عرصہ اور قائم رکھوں۔ کیونکہ واقعات
بہت عجیب تھے۔ اور مجھے ان میں لطف محسوس ہو رہا تھا۔
خواب ہی خواب میں یہ سوچ کر میں نے اپنی بھاگ دوڑ جاری
رکھی۔ اب مجھے اطمینان تھا۔ کیونکہ اپنی خواہش کے مطابق
خواب کا سلسلہ توڑ دیا جا سکتا تھا۔ مجھے تمام سازش کی
جزئیات کا علم ہوگیا۔ اور اس کے بعد نہایت اطمینان
سے میری جاگ کھل گئی۔ اور میرا دماغ غالب کے اس
مصرع پر غور کرنے لگا کہ ع

ہیں خواب میں ہنوز جو جاگے ہیں خواب میں

اس مشق کو بہم پہنچانے کا سوال اور بھی اہم ہو جاتا ہے
جب ہم محسوس کرتے ہیں۔ کہ اس قسم کے خواب بچوں کی صحت
اور تندرستی پر بہت بُرا اثر ڈالتے ہیں۔ کیونکہ وہ حالت جس
کی طرف اُوپر ایک مصنّف کے الفاظ میں اشارہ کیا جا چکا ہے
عام طور پر بچوں پر طاری ہوتی رہتی ہے۔ اس قسم کی دماغی
کاہش ان کے ذہنی اور جسمانی نشوونما کے لئے سم قاتل کا
کام کرتی ہے۔ یقیناً یہ ایک بہت بڑی کامیابی ہوگی اگر
ہم کوشش سے اپنے نونہالوں کو ان کی مشکلات کا حل سمجھا
سکیں۔ اور انہیں ایسے طریقوں سے آشنا کر سکیں۔ جو سادہ
عام فہم اور سود مند ہوں۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ کوشش
کرنے سے بچوں کو ایسی فضا سے دُور رکھا جا سکتا ہے۔
جہاں ان کے ذہن پر اس قسم کے خوابوں کے خیالات مرتب
ہو سکیں۔ لیکن اس کوشش کو کامیاب مان لینے کے بعد
بھی اعتراض کیا جا سکتا ہے۔ کہ بچے کی متخیلہ ایک نہایت
ہی بے ضرر شے مثلاً کسی جانور کی تصویر سے اس طرح متاثر
ہو گی کہ قانون ائتلاف افکار کے ماتحت کبھی نہ کبھی وہ اسی
بے ضرر شے کو اپنے لئے دماغی پریشانی کا موجب بنا لیگا۔
چارلس لیمب کے بچپن کا مشہور واقعہ ہے۔ کہ وہ ایک
خوبصورت تصویر دیکھ کر سویا۔ مگر رات کو اس کی متخیلہ نے اسی
تصویر کو ایسے رنگوں میں رنگ کر پیش کیا کہ اسی کے الفاظ
میں "میں نے کبھی ایسا خوفناک خواب نہیں دیکھا جیسا اس
رات" اس حقیقت کا اظہار ہوتا ہے۔ یہ ایک نہایت
تعجب خیز بات ہے کہ بچوں کے لئے ہر ایک بے معنی چیز

جو عام حالتِ بیداری میں کبھی خوف کا موجب نہیں بن سکتی نیم شعوری حالت میں تخیّل کے ہوّا سے بھی زیادہ مرعوب کن اور خوفناک ہو جاتی ہے۔ پھر اس پرستزاد ان کے وُہ امتیازی خصائل ہیں۔ جن کی وجہ سے وہ اس قسم کے خوابوں کو کسی اور سے بیان نہیں کرتا۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اس کے ذہن پر ایک ناقابلِ برداشت بوجھ کی طرح حملہ کرتے رہتے ہیں۔ وہ اپنے اچھے خوابوں کو بیان کرنے سے کبھی نہیں چوکتا لیکن بُرے خوابوں کے متعلق کسی کو رازدار بنا لینا اس کی فطرت میں داخل نہیں۔ اس بات کا امکان کہ اس کا بیان مضحکہ خیز سمجھا جائیگا۔ اسے خاموش رہنے پہ مجبور کرتا ہے اسی لئے ضروری ہے کہ سب سے پہلے اسے اس بات کا یقین دلایا جائے۔ کہ اس کا کوئی خواب مضحکہ خیز تصور نہیں کیا جائیگا۔ اور یہ کہ ہر طرح اس کی دلدہی اور دلجوئی کی جائیگی۔ اگر بچہ اس قسم کے خوابوں کو اپنی ماں کے آگے بیان کر دیتا ہے۔ تو یہ اس بات کا بہت بڑا ثبوت ہے۔ کہ اسے اپنی والدہ پر پُورا اعتماد ہے۔ اور ہمدردی کا یقین۔

ہم نے فرض کر لیا کہ اسے اس قسم کے یقین دلائے گئے ہیں۔ اب آگے کیا کرنا چاہیئے۔ بعض لوگ جواب دینگے کچھ بھی نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن مَیں اس بات پر مصر ہوں کہ اوائلِ عمر میں مندرجہ بالا طریقے سے اسے وہ آسان اور عام فہم اصول بتائے جا سکتے ہیں۔ جن کی بنا پر وہ ضبطِ خواب کی طاقت حاصل کر سکے۔ اس کی وجہ ظاہر ہے۔ حقیقت میں اگر بچے کو بتا دیا جائے کہ ناامید ہونے کی کوئی وجہ نہیں۔ اور خود اس کے پاس ایسے وسائل موجود ہیں۔ جن سے کام لیکر وہ اپنی تکالیف کا ازالہ کر سکتا ہے۔ تو کوئی وجہ نہیں کہ وُہ ان سے کام نہ لے۔ یہ ضروری ہے کہ جو الفاظ اس طریق پر عمل کرنے کے لئے بچے کو سمجھائے جائیں۔ وہ عام فہم اور مختصر ہوں۔ مثلاً یہ کہ یہ ایک خواب ہے۔ اب مجھے جاگنا چاہیئے۔ اور اسی طرح کے ہزاروں فقرے تراشے جا سکتے ہیں بچّوں کے معاملے میں ان ہدایات پر جو اُوپر مذکور ہو چکی ہیں۔ بہت احتیاط سے عمل کرنا چاہیئے۔ کیونکہ بچے کی متخیلہ پختہ عمر اشخاص کی متخیلہ سے اس خاص معاملے میں جزدی اختلاف رکھتی ہے۔ ذاتی تجربات کی بنا پر کہا جا سکتا ہے۔ کہ اسّی فیصدی اس طریقے میں کامیابی ہوگی۔ تھوڑا عرصہ ہُوا۔ کہ انگلستان کی ایک نمائش میں توہماتِ پیشین کے چند نمونے پیش کئے گئے تھے۔ انہی میں دو ایک پتھر تھے۔ جن میں سوراخ کئے گئے تھے۔ اور جن کی نسبت یہ خیال کیا جاتا تھا کہ ان کو پہن کر سونے والا ہمیشہ خوشگوار خواب دیکھیگا ان پتھروں پر بچّوں کی تصویریں بھی ثبت تھیں۔ اس واقعہ کے بیان کرنے سے میرا مقصود یہ تھا۔ کہ زمانۂ پیشین ہی سے لوگ کوشش کرتے آتے ہیں کہ بچّوں کو بُرے خوابوں سے نجات دلائی جائے۔ کیونکہ ہم فرض کئے لیتے ہیں کہ

بچوں کی تصویریں اس بات کی مظہر تھیں۔ کہ وہ بچوں کے لئے وضع کئے گئے ہیں۔ مجھے اس بات کا بھی احساس ہے کہ میں نے گزشتہ سطور میں یہ فرض کر لیا ہے۔ کہ آپ عام طور پر بُرے خوابوں سے نجات حاصل کرنا پسند کرینگے لیکن میرے خیال میں ستر فیصدی اشخاص میرے ہم خیال ہونگے۔ بلاشبہ فرائڈ کے مقلدین اس قوت ضبط پر اعتراض کر سکتے ہیں کہ حقیقت میں اس قسم کے بُرے خواب معہود ذہنی کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اور ان کے بین السطور میں کئی مافوق الفطرت قوتوں کی طرف سے انسان کو آنے والے خطروں سے مطلع کیا جاتا ہے اور ان خطروں کی پرواہ نہ کرنا بالکل اس بات کے مشابہ ہے۔ کہ ہم کسی خطرناک بیماری کے ابتدائی علامات سے بے نیاز ہو کر بیٹھ رہیں۔ ظاہر ہے کہ اس صورت میں بیماری کا دفعیہ بہت مشکل اور کبھی دفعۃً ناممکن ہو جاتا ہے! اسی استدلال کی بنا پر وہ کہتا ہے۔ "ثابت ہوا کہ اس قسم کے خوابوں پر ایسا اختیار کلی حاصل کر لینا کہ ہم انکے اعادے کو حسب خواہش رد کر سکیں، خطرناک ہوگا۔ کیونکہ اس صورت میں ہم انکی حقیقی علت غائی کی پردہ پوشی کر رہے ہونگے۔ ضروری ہے کہ ہم برے اور خطرناک خوابوں کو ذہنی یا جسمانی خطرے کی علامت تصور کریں اور اس کے بعد مناسب تدابیر اختیار کریں۔ نہ کہ اس کے برعکس ہو اس قسم کے خوابوں کو روک دینے کی لاحاصل کوشش میں مصروف رہیں۔ جسکا نتیجہ یقیناً بُری صورت اختیار کر سکتا ہے۔"

اس کے جواب میں کہا جا سکتا ہے کہ بُرے خوابوں کو علامت تصور کرنا اسی وقت ممکن ہے کہ ہم ان مافوق الفطرت قوتوں پر پورا اعتماد رکھیں جنکو فرائڈ انسانی فطرت کے لئے ایک نعمت تصور کرتا ہے اور جبتک ہم ان قوتوں کی ماہیت سے پورے طور پر واقف نہ ہو لیں اور علاوہ ازیں واقف ہو کر ان سے استفادہ حاصل کرنا نہ سیکھ لیں۔ ان بُرے خوابوں کے متعلق مذکورہ بالا نظریہ سے متاثر ہونا اور اس پر عمل کرنا بے سود ہوگا۔

خورشید بیگم تنویر

رموزِ رندانہ

خود ہی میخوار، خود ہی میخانہ — خود ہی ساقی ہوں، خود ہی پیمانہ

میں ہوں اور جامہائے بادۂ حسن — میں ہوں اور نغمہائے مستانہ

میں ہوں اور نعرہ ہائے نوشا نوش — میں ہوں اور ہاؤ ہوئے دیوانہ

بے نیازِ سبو و ساقی ہوں، — محفلِ دل ہے رشکِ میخانہ

اے اثر اہلِ خرقہ و تسبیح — خاک سمجھیں رموزِ رندانہ

اثر صہبائی

تاروں بھری رات

کیا دلکشا ہے تاروں بھری رات کا سماں تنویرِ کہکشاں سے ہے معمور آسماں
یوں مرتعش ہیں قافلہ ہائے سیارگاں جیسے کسی حسین کی آنکھوں کی پتلیاں
ہیں پھول طشتِ چرخ میں بکھرے پڑے ہوئے
یا دامنِ افق میں ہیں موتی جڑے ہوئے

طاری ہے گو جہاں پہ فسونِ ردائے شب یاقوت و لعل سے ہے مزیّن قبائے شب
ہے رشکِ نور ظلمتِ رنگیں ادائے شب تاروں بھرا ہے گیسوئے لیلا نمائے شب
آنچل ہے سطحِ چرخ کسی گلعذار کا
اور وہ بھی پارہ ہائے جواہر نگار کا

طاری ہے کائنات پہ عالم سکون کا گویا کہ خواب میں ہے ہر اک چیز مبتلا
کیفیّتِ سرور میں ڈوبی ہوئی ہوا داماں آبشار سے آتی ہے یوں صدا
جیسے کوئی رباب بجائے فراق میں
رو رو کے دوسروں کو رلائے فراق میں

وہ کیف کا ہجوم وہ انوار کا وفور وہ روشنی کا فرش سرِ عرش دُور دُور
وہ تابشیں کہ ماند ہو رنگِ ضیائے طُور تارے چمک رہے تھے مثالِ نگاہِ حُور
یکسر سفید پوش گلستاں بنے ہوئے
سب لالہ زار یاسمنستاں بنے ہوئے

تارے ہیں آسماں پہ زمیں پہ بہارِ گُل اللہ رے یہ جلوۂ رنگیں عذارِ گل
آخر نسیم آکے ہوئی ہم کنارِ گل عنبر فشاں ہوا نفسِ مشکبارِ گل
برپا ہے باغ و راغ میں طوفانِ رنگ و بو
شیرازہ نظر ہے پریشان رنگ و بو

عابدؔ

خود فراموش

(۱)

"نوروز مبارکباد" کی آواز بازگشت ہنوز میرے کانوں میں گونج رہی ہے۔ یاد پڑتا ہے کہ کبھی یہ آواز کانوں کو بھلی معلوم ہُوا کرتی تھی۔ اور اس کے ساز طرب پر دل کے اندر سینکڑوں نغمہ ہائے مسرت چھڑ جایا کرتے تھے لیکن آج کیفیت دگرگوں ہے۔ اس آواز سے طبیعت گھبراتی اور دل پریشان ہُوا جاتا ہے۔ عجیب انقلاب زمانہ ہے تعجب تو یہ ہے کہ آج شام سے اس وقت تک جتنی بار یہ آواز کانوں میں آئی، میرے مُنہ سے بھی بے اختیار عادۃً یہی کلمہ نکلا۔ لیکن فوراً ہی ایسا معلوم ہُوا کہ کسی نے اندر ہی اندر کلیجہ مسل دیا۔ "کیا حقیقت میں آنیوالا سال میرے لئے خیر و برکت کا پیش خیمہ بنیگا؟" حیف صد حیف اب اس خیال سے بھی تسکین نہیں ہوتی۔

ان خیالات میں مستغرق نوجوان جُولین اپنے مکان کے دروازہ پر پُہنچ گیا۔ جہاں اس کا پُرانا خادم والٹر اُس کے انتظار ہی میں کھڑا تھا۔ والٹر نے جھک کر سلام کیا۔ اور اپنے مالک کے ہاتھ سے کوٹ۔ ٹوپی اور بید لیکر مؤدبانہ عرض کی۔ "آج شام سے جو لوگ حضور کو بذریعہ ٹیلیفون نوروز کی مبارکباد دیتے رہے ہیں اُن کے ناموں کی فہرست کتب خانہ کی میز پر موجود ہے"

جُولین کے سینہ سے بے اختیار ایک آہ نکلی۔ اور وہ والٹر کو پانی لانے کا حکم دیکر اپنے مطالعہ کے کمرہ میں داخل ہوگیا۔ والٹر پانی لیکر آیا۔ تو اپنے مالک کو سر جھکائے خاموش اور متفکر دیکھ کر ایک طرف کھڑا ہوگیا۔ چند منٹ گزر جانے کے بعد جولین نے سر اُٹھایا۔ والٹر کے ہاتھ سے پانی کا گلاس لیکر میز پر رکھ دیا۔ اور والٹر سے یوں کہنے لگا۔ "والٹر تم میرے بلکہ میرے خاندان کے پُرانے معتمد ہو تم کو معلوم ہے کہ والدہ کی طرف سے جو ورثہ مجھے ملا تھا۔ پچھلے سال کے اندر اندر مَیں وہ سب صرف کر چکا۔ اور اس وقت سوا اس مکان کے اور اس کے سامان کے مَیں دُنیا میں کسی اور چیز کا مالک نہیں۔ مَیں نے سخت ترین محنت برداشت کی۔ اور تین ڈرامے تصنیف کئے۔ لیکن افسوس ان میں سے ایک بھی مقبول عام نہ ہُوا۔ اب اس کے سوا کوئی چارہ نہیں۔ کہ تم کو اور دوسرے ملازمین کو رُخصت کر دوں۔ اور خود بھی اس مکان کو خیرباد کہکر کسی گمنامی کے گوشہ میں اسی مکان کے

کرایہ پر بسر کروں۔ اور اسی نامرادی کے عالم میں زندگی کے باقی دن گزاردوں۔ والٹر تمہاری کتنی تنخواہ واجب ہے؟"

والٹر:"صرف پندرہ روپے۔"

جولین نے اپنی جیبیں ٹٹول کر نہایت مایوسانہ لہجہ میں کہا۔"افسوس والٹر میرے پاس اتنی رقم بھی نہیں۔ کہ تمہاری تنخواہ ہی دے سکوں۔ چودہ سال تم نے میری خدمت کی۔ اب تم سے جدا ہونے سے دلی رنج ہے۔"

والٹر:"جی ہاں۔ جدائی مجبوری ہے۔ کل صبح سے چلا جاؤنگا۔ اور جس وقت آپ کا مکان کرایہ پر اُٹھ گیا آکر تنخواہ لیجاؤنگا۔"

جولین۔ والٹر اگر اُس وقت بھی میں تمہاری تنخواہ نہ دیسکا؟"

والٹر:"پھر مجبور ہو کر نالش کرنی پڑیگی۔"

یہ کہکر والٹر کمرے سے باہر چلا گیا۔ اور جولین اس پرانے خادم کی بیوفائی دیکھ کر متحیّر رہ گیا۔ چند لمحوں کے لئے جملہ حسیات ظاہری و باطنی معطل ہوگئیں۔ پھر ایسا معلوم ہوا کہ خشکی سے دم حلق میں گھٹا جاتا ہے۔ ہاتھ بڑھا کر میز سے پانی کا گلاس اُٹھایا۔ اور ایک سانس میں خالی کر دیا۔ پھر گلاس میز پر پٹخ دیا۔ اور اس کے منہ سے بے اختیار نکلا۔

"سال گزشتہ میری عمر میں کیسا کمبخت سال تھا۔ کہ میری تمام آرزوئیں ظالم نے خاک میں ملادیں۔"

گرم و خشک دماغ پر ٹھنڈے پانی نے اپنا اثر دکھایا۔ آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا گیا۔ دماغ میں دھواں بھر گیا۔ اس نے اپنا سر آرام کرسی کی پشت پر رکھ دیا۔ ایسا معلوم ہوا کہ کمرہ کی برقی روشنی یکایک گل ہوگئی۔ اور اس تاریکی میں کمرہ کے دوسرے سرے پر ایک نہایت لاغر شخص کی شبیہ حرکت کرتی ہوئی نظر آئی۔ جولین نے پوچھا

"کون؟"

شبیہ نے جواب دیا۔"میں سالِ گزشتہ کی روح ہوں ابھی چند لمحے گزرے کہ تم مجھ کو برا بھلا کہہ رہے تھے۔ افسوس میں تمہارے لئے کامرانی و مسرت کا مژدہ لایا تھا۔ میں نے حسنِ عمل کے بہترین موقعے تمہارے سامنے پیش کئے۔ لیکن آج تم اپنی بھدی تدابیر کا الزام میرے سر لگاتے ہو۔ وقت گزشتہ کو برا کہنا ایک سنگین جرم ہے جس کی پاداش تم کو بھگتنی پڑیگی۔ لو سنو میں تم کو بد دعا دیتا ہوں۔ کہ سال نو مولود تمہارے لئے مسعود ہوگا لیکن سال کے اختتام پر اس کی یاد تمہارے صفحۂ دل سے قطعی محو ہو جائے گی۔"

جولین اپنی کرسی سے کود کر کھڑا ہو گیا۔ شبیہ غائب ہو چکی تھی۔ اور کمرہ پھر برقی روشنی میں جگمگا رہا تھا۔

(۲)

ایک سال اور گزر چکا۔ گھڑی نے ٹن ٹن رات کے بارہ بجا دئے۔ نیا سال شروع ہو گیا۔ جولین نے جواشنت

ایک آرام کرسی پر بیٹھا ہوا تھا۔ چاروں طرف آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھا۔ حیران تھا کہ یہ کیا منظر پیش نظر ہے۔ وسیع کمرہ۔ بیش بہا سامانِ آرائش۔ متعدد مردوں عورتوں کا مجمع جو اپنی وضع ولباس، تراش خراش، چال ڈھال کے لحاظ سے طبقۂ اعلےٰ کے افراد معلوم ہوتے تھے۔ یہ تمام چیزیں ایک سے زیادہ حیرت زا و ہوشربا تھیں۔

وہ خواب دیکھ رہا ہے یا کسی سنیما کے پردہ پہ متحرک صورتیں اور خوشنما مناظر نظر آ رہے ہیں؟ جسقدر غور کرتا تھا اُس کا استعجاب بڑھتا جاتا تھا۔ اور ایک ایک چیز سے حقیقت کا ثبوت ملتا تھا۔ پھر کیا وہ آج کسی دوسرے کا مہمان ہے؟ ہرگز نہیں۔ بلکہ صاحبِ خانہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ غرض جسقدر غور کرتا تھا۔ اس راز کا عقدہ لاینحل معلوم ہوتا تھا۔

ایک عورت آگے بڑھی اور مسکرا کر بولی "جولین! نوروز مبارک" اس کا جواب جولین کے منہ سے محض عادةً نکلا لیکن وہ حیران تھا کہ میں اس عورت کے نام سے بھی واقف نہیں پھر اسقدر بے تکلفی کے کیا معنی؟"

قریب کے کسی کمرہ سے پیانو کے بجنے کی آواز کانوں میں آئی۔ اور جملہ حاضرین اس کمرہ سے باہر چلے گئے اب خلوت میں پھر جولین نے ایک بار محو شدہ ماضی کو یاد کرنے کی سخت کوشش کی۔ اُسے خوب یاد تھا کہ وہ نہایت درجہ مایوسی کے عالم میں گھر لوٹ کر آیا۔ اُسکا بیوفا ملازم والٹر اُسکو تنہا چھوڑ کر چلا گیا۔ اُسکو یہ بھی یاد تھا کہ وفور یاس میں اُسنے سال گزشتہ کو بُرا بھلا کہا۔ اور سال گزشتہ کی شبیہ نے ظاہر ہو کر اس کو بددعا دی کہ سال نومولود اس کے لئے مسعود ہوگا لیکن اختتام پر اس کی یاد اس کے دل سے محو ہو جائیگی۔ بس یہ خیال آتے ہی اُس نے فوراً اپنا ہاتھ جیب میں ڈالا۔ یہ وہی جیب تھی جس میں سے والٹر کی تنخواہ دینے کے لئے پندرہ روپیہ نہ نکلے تھے۔ اب اسی جیب سے ایک نوٹ بک برآمد ہوئی، جو بینک کے نوٹوں سے پُر تھی۔

اب تو جولین خوشی سے اچھل پڑا۔ اس میں ذرا بھی شبہہ کی گنجائش نہ تھی۔ کہ وہ اب ایک دولتمند رئیس ہے اور آج نوروز کی خوشی میں اپنے نئے دوستوں کو دعوت دے رہا ہے۔ یہ عالیشان مکان اُسی کی ملکیت ہے۔

اس جمودِ حسّی و ذہنی اور سال گزشتہ کی خود فراموشی کے باعث جو مشکلات اس کی راہ میں حائل ہوگئی تھیں۔ ان کا مردانہ وار مقابلہ کرنے اور ان پر غالب آنے کا اُس نے عزم بالجزم کر لیا۔ رقص و سرود کے کمرہ سے واپس آنے والوں میں سب سے پہلا ایک ادھیڑ عمر کا شخص تھا جس کو لوگ ہنری کہتے تھے۔ یہ مسکراتا ہوا کمرہ میں داخل ہوا۔ اور جولین کے قریب ایک کرسی پر آ بیٹھا۔ جولین نے سگار کیس اس کی طرف بڑھایا۔ جو اس نے شکریہ کے ساتھ لے لیا۔

اور پُوچھنے لگا۔" جولین آج تم کسی قدر پژمردہ خاطر ہو رہے ہو۔ معلوم ہوتا ہے۔اس دوران میں بہت زیادہ محنت کرتے رہے .... شادی کے بعد سے ابتک تم سے ملنے کا اتفاق ہی نہیں ہوا۔"

جولین۔" جی ہاں اُس روز کے بعد آج ہی ملنے کا موقعہ ملا۔"

ہنری۔" اُس روز تو تمہارا چہرہ خوشی سے اسقدر دمک رہا تھا کہ آج مقابلتہً اُترا ہوا معلوم ہوتا ہے۔"

جولین۔" نہیں یہ تو آپ کا خیال ہے۔میرا دل اب بھی نوروز کی خوشی اور دوستوں کی محبت میں ویسا ہی مسرّت سے لبریز ہے .... شادی کا منظر تو آپ کو خوب یاد ہوگا۔"

ہنری۔"خوب"

جولین۔" دُلہن کے حسن کا کیا خوب عالم تھا؟"

ہنری۔" کیا کہنا ہے! جنّت کی حور تھی یا پریوں کی شہزادی۔اُس کی سُنہری زلفوں اور سفید لباس کی یاد سے اب بھی رُوح کو تازگی حاصل ہوتی ہے۔اور دل پر ایک کیفیّت طاری ہوجاتی ہے۔"

جولین۔" خیر غنیمت ہے۔"

ہنری۔" اس سے تمہارا کیا مطلب ہے؟"

جولین (گھبرا کر)" جی ہاں۔نہیں کچھ نہیں۔میرا یہ مطلب ہے کہ اگر ایک شخص شادی کرلے۔یعنی ایک شخص اتنا احمق ہو کہ وہ اس بیوقوفی کا ارتکاب کر بیٹھے ...... اچھا فرض کیجئے آپ شادی کرلیں توکم ازکم اس نقصان کی تلافی ایک حدتک اسی خیال سے ہوجاتی ہے کہ بیوی توخوبصورت ہے۔"

ہنری (اس لایعنی گفتگو سے پریشان خیال ہوکر)" جولین یہ کیا بہکی بہکی باتیں ہیں۔"

اسی وقت جولین کے اور دوست بھی اس کمرے میں داخل ہوئے۔لڑکیوں میں سے ایک جس کو لوگ فلورا کہتے ہیں ہنری کے قریب آبیٹھی۔جولین نے دیکھا کہ اس کا حُسن دلاویز تھا۔پھر اس کی نگاہ دو اور عورتوں پر پڑی۔جو اس وقت کمرہ میں موجود تھیں۔ان میں سے صوفیا کا حسنِ نوخیز زہد شکن و ملائک فریب تھا۔اور بہت ممکن تھا۔کہ جس عروسِ نو کا ذکر ہنری نے ابھی کیا تھا وہ یہی ہو۔

دوسری چہل سالہ فربہ اندام اور بلیح میری تھی۔

کیا یہ تینوں شادی شدہ تھیں؟ اور تھیں تو ان کے شوہر کون تھے؟

جولین نے غور سے دیکھا کہ میری اور فلورا کی اُنگلیوں میں شادی کی انگوٹھیاں موجود تھیں۔لیکن صوفیا کا ہاتھ کچھ اس انداز سے رکھا ہُوا تھا۔کہ اس کی دوشیزگی یا منکوحہ ہونے کا ثبوت پوشیدہ تھا۔اس وقت خدام نے ہر مہمان کے سامنے میز پر خالی گلاس برف۔شربت اور کیک لاکر رکھے۔ سن رسیدہ ہنری نے جولین کو مخاطب کرکے یوں تقریر کی۔

"میرے عزیز دوست جولین! میں ان تمام دوستوں کی طرف سے جو آج یہاں جمع ہیں۔ تم کو مبارکباد دیتے ہوئے نوروز کی خوشی میں تمہاری" نئی نویلی دلہن" کا جام صحت تجویز کرتا ہوں۔"

تمام حاضرین نے خوشی کا نعرہ بلند کیا۔ اور اپنے اپنے گلاس ایک گھونٹ میں خالی کر دئے۔ لیکن جولین کے کانپتے ہوئے ہاتھ سے گلاس چھوٹ کر چور چور ہو گیا۔ ہنری نے دوسرا گلاس ہاتھ میں لیا۔ اور یہ کہتے ہوئے خالی کر دیا" میں اپنی بیوی کا جام صحت پیتا ہوں۔"

یہ سنکر دوستوں نے چاروں طرف سے قہقہہ لگایا۔

ایک بار پھر رقص و سرود کے کمرہ سے پیانو کی مسحور کن آواز بلند ہوئی۔ اور لوگ مست ہو کر پھر ادھر متوجہ ہوئے صوفیا جولین کے قریب سے گزری اور اس دفعہ اس نے خوب اچھی طرح دیکھ لیا۔ کہ اس کی انگلی شادی کی انگشتری سے خالی تھی۔ ۔ ۔ ۔ ۔ تھوڑی دیر میں کمرہ پھر خالی ہو گیا اور غریب جولین حیران و پریشان کھڑا رہ گیا اب یہ امر یقینی ہو چکا تھا۔ کہ اس کی شادی ہو چکی۔ اور ان عورتوں میں سے جو یہاں موجود تھیں کوئی نہ کوئی اس کی بیوی تھی۔ ان سب میں صرف ایک لڑکی صوفیا ہی ایسی تھی جس کی طرف اس کا دل کھنچا جاتا تھا۔ اور جس کے شوہر بننے کی اس کو تمنا تھی صوفیا ابتک کسی دوسرے کی نہ تھی لیکن اگر کسی دوسرے کی نہ تھی۔ تو جولین کی بھی نہ ہو سکتی تھی کیونکہ جولین کی شادی تو ہو چکی تھی۔ اس میں شک نہیں کہ فلورا خوبصورت عورت تھی۔ لیکن اس کی طرف جولین کی طبیعت ہی مائل نہ ہوتی تھی۔ دوسرے ہنری کے ساتھ اس کے تعلقات کچھ زن و شوہر کے سے معلوم ہوتے تھے۔

غریطہ جس کو لوگ چچی غریطہ کہتے تھے اتنی بوڑھی اور لاغر تھی کہ اس کا ذکر ہی فضول ہے۔ اب رہی فربہ اندام چہل سالہ میری تو اس کی نسبت بھی کم ہی گمان ہوتا تھا۔

۔ ۔ ۔ ۔ یکایک جولین کے دماغ میں ایک عجیب خیال پیدا ہوا۔ جس سے اس کا رنگ زرد پڑ گیا۔

"میں اسقدر جلد یعنی صرف ایک سال کے عرصہ میں اتنا متمول کیونکر ہو گیا۔ اس کا صرف ایک ہی حل ہے۔ کہ میں نے دولت کی خاطر شادی کی ہے۔ اور بجائے گلرو معشوقہ کے زرد رو دولت میری زندگی کی شریک ہے۔ اُف اُف میرے تمام جذبات فاضلہ تباہ ہو گئے۔ اور اب یہ ایک کھلی ہوئی بات ہے کہ میری میری بیوی ہے۔ یا غریطہ"

اس نے مضطرب ہو کر گھنٹی بجائی۔ جس کے جواب میں ایک نوجوان خادم حاضر ہوا۔

جولین۔" دیکھو کل صبح سورج نکلتے ہی کسی اخبار کے دفتر میں جاؤ اور سال گزشتہ کے تمام پرچہ لاکر ہماری میز پر رکھ دو۔"

"بہت خوب۔ سر جولین" یہ کہکر خادم کمرے سے باہر چلا گیا۔ اور اُس کے چلے جانے کے بعد جولین پر پھر حیرت کا عالم طاری تھا۔

"یہ اس نے کیا کہا۔ سر جولین۔ نہیں نہیں میں نے غلط سُنا۔ خالی 'جولین' کہا ہوگا۔ لیکن ایک نوکر اسقدر گستاخ کیونکر ہوسکتا ہے کہ آدھا نام لے۔ نہیں نہیں۔ میں نے خوب سُنا۔ ضرور اُس نے سر جولین ہی کہا۔ او ہو تو کیا مجھے نائٹ کا خطاب بھی مل گیا۔ کیا عجیب معاملہ ہے۔ 'سر جولین' میرے نام کے ساتھ یہ خطاب سجتا تو خوب ہے۔" اس خیال سے اس کے چہرہ پر خوشی کے آثار ظاہر ہوئے۔ اور وہ اپنی جگہ سے اُٹھا اور قدآدم آئینہ کے قریب جو دیوار میں نصب تھا آکھڑا ہوا۔ ہنوز یہ استعجاب دُور نہ ہوا تھا کہ کسی نے پیچھے سے شانہ پر ہاتھ رکھ دیا۔ اس نے چونک کر پوچھا۔ "کون؟" جواب ملا "تمہاری جولیا"

جولین کے سامنے ایک کمسن شوخ چشم حوروش نظر سے نظر ملائے کھڑی تھی۔ جولین نے دیکھا کہ اس کی انگلی میں شادی کی انگشتری بھی چمک رہی تھی۔ بس بس بہت دیر سے جس کی تلاش تھی وہ آگئی۔ جولین نے خیال کیا کہ ضرور میری بیوی جولیا ہی ہے۔ جو اب تک اِدھر اُدھر مہمان نوازی و انتظام خانہ داری میں مشغول تھی۔ اس کے حُسن گلوسوز و غمزۂ جگر دوز کی تیز کرنیں اس کے دل تک پہنچکر گدگدی پیدا کرنے لگیں۔

جولیا۔ "پیارے جولین! اب تو آپ بالکل مطمئن ہیں؟"

جولین۔ "پیاری جولیا! تمہارا شکریہ ....."

جولیا۔ "پیاری! آہ یہ لفظ تمہارے مُنہ سے سُنکر میرا دل خوشی سے اچھل پڑتا ہے۔"

جولین۔ "تو کیا اکثر یہ لفظ میں تمہارے لئے استعمال نہیں کرتا۔"

جولیا۔ "ہاں کیا کرتے تھے .... لیکن کچھ دنوں سے چھوڑ دیا ہے۔"

جولین۔ "مجھے کچھ شرم سی آتی ہے۔ یہ خیال ہوتا ہے کہ اگر میں ہر وقت پیاری پیاری کہتا رہوں تو لوگ تم پر خوشامد پسندی اور مجھ پر چھچھورپن کا الزام لگا دینگے۔"

جولیا۔ "اور اگر مجھے ہی پسند ہو تو؟"

جولین۔ "تو پھر میں بھی اپنی عادت بدل ڈالونگا" یہ کہکر اُس نے اپنا ہاتھ نہایت بے تکلفی سے اس عورت کی کمر میں ڈال دیا۔ اور غایت درجہ سادگی سے بوسہ لے لیا۔ پھر غور سے اس کی سحر آگیں سیاہ آنکھوں کو دیکھ کر دل میں خوش ہونے لگا۔ اور سوچنے لگا۔ کہ خواہ کسی طرح اس سے شادی ہوئی ہو۔ لیکن انتخاب کچھ بُرا نہیں رہا .....

مہ جبین جولیا نے پھر اپنے مخملیں رُخسار اس کے لبوں سے قریب تر کر دئے۔ اور اُس نے پھر ایک بار نئے خنیا

ہو کر کہا۔

جولیا۔ "مجھے خبر نہ تھی کہ تم ایک بیوہ پر ایسی مہربانی کرو گے"

یہ کہکر ظالم نے ناز آفریں تبسم سے بیچارے جولین کے

از خود رفتہ دل پر سینکڑوں بجلیاں گرادیں۔

جولین (بیوہ کے نام سے چونک کر) "تو کیا تم بیوہ تھیں؟"

جولیا۔ "تو کیا آپ کو اس بات کے علم سے انکار ہے؟ کیا

ابتدا ہی سے مَیں نے اس معاملہ میں صاف گوئی سے کام نہیں لیا؟"

جولین۔ "نہیں نہیں میری پیاری جولیا۔ میرا یہ مطلب

ہرگز نہیں۔ مجھے معاف کرو۔ مَیں اس وقت کچھ اور سوچ رہا

تھا۔ حقیقت میں آج میری طبیعت کچھ خراب ہو رہی ہے اور

سر چکرا رہا ہے۔"

جولیا۔ "اس وقت آپ کی طبیعت کا خراب ہونا نہایت

بے موقع اور از حد قابلِ افسوس ہے۔ کل تو آپ کو دیوان میں

بہت کچھ کام کرنا ہے۔"

جولین۔ "مجھے دیوانخانہ میں کام کرنا ہے؟ نہیں ہرگز نہیں

مَیں آجکل کوئی کام کرنے کے لئے تیار نہیں۔ مجھے آرام کی سخت

ضرورت ہے۔"

جولیا۔ دیکھو جولین۔ اگر تم نے ایسی باتیں کیں تو پھر ہم تم سے

ملنا چھوڑ دینگے۔

جولین۔ "تو پھر آخر مَیں کیا کروں؟ فرش بچھاؤں؟ تصویریں

لٹکاؤں؟ میز سجاؤں؟ کرسیاں جھاڑوں؟ وہ کونسا ایسا کام

ہے۔ جس کے نہ کرنے سے آپ مجھ سے ناراض ہو جائینگی؟"

جولیا (مسکرا کر) "ابھی تو آپ فرماتے تھے کہ طبیعت اچھی

نہیں۔ لیکن باتوں سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ نہایت زوروں

پر ہے۔ اللہ ری آپ کی ستم ظریفی اور تجاہل عارفانہ۔ میں

نے غلطی کی کہ بجائے "دیوان عام" کے محض "دیوان" کہہ دیا۔

جس کو آپ نے پہلے تو دیوانخانہ بنایا۔ اور پھر لگے اُس کے

لوازم گنوانے۔"

جولین۔ "کیسا دیوان عام؟"

جولیا (پھر مسکرا کر) وزیر اعظم اس وقت اگر آپ کی گفتگو

سن پائیں تو کس درجہ ہراساں ہوں۔"

جولین نے دل میں سوچا۔ "اوہو تو مَیں پارلیمنٹ کے

دیوانِ عام[۵] کا بھی ممبر ہو گیا۔ العجب! العجب!!"

جولیا۔ "دیکھو جولین! دیوانِ عام میں تمہاری روزانہ حاضری

ضروری ہے۔ اور تم کو میری خاطر پابندی کرنی پڑیگی۔"

جولین۔ "تمہاری خاطر؟"

جولیا۔ "ہاں ہاں میری خاطر۔ سیاسیات میری رُوح

ہے میری زندگی ہے۔ اور مَیں اپنی پارلیمنٹ کی ممبری

پر ناز کرتی ہوں۔"

جولین۔ "تم؟"

۵ "ہاؤس آف کامنز" کے لئے عام طور پر "دار العوام" کا لفظ رائج ہے لیکن ذومعنیں کا جو پہلو "دیوانِ عام" سے نکلتا ہے اُس سے نہ نکلتا۔ ایڈیٹر

جولیا۔ "ہاں ہاں ہیں ـــــ اور اگر تم کو میرے ساتھ محبت ہے۔ تو تم کو بھی میرا اور میری پارٹی (فریق) کا ساتھ دینا پڑیگا۔

جولین۔ "مجھے افسوس کے ساتھ اقرار کرنا پڑتا ہے۔ کہ یہ امر میری طبیعت کے بالکل منافی ہے۔ کہ میں حق و ناحق کسی پارٹی کا ساتھ دیتا رہوں۔"

جولیا یہ سنکر آنکھوں میں آنسو بھر لائی۔ اور رومال سے پونچھ کر کہنے لگی۔ "ہائے افسوس مجھے یہ خبر نہ تھی کہ تم اِس ہمدردی سے انکار کر دو گے۔ مجھے اس کا خوف ضرور تھا۔ میں خوب سمجھتی تھی کہ اس کا باعث صرف تمہاری "نئی نویلی دُلہن" ہے۔"

جولیا یہ کہتے ہی دوسرے کمرے میں چلی گئی۔

جولین حیران و پریشان جولین، دماغی کشمکش سے تھک کر کرسی پر آ بیٹھا۔ اور پھر سوچنے لگا۔ "یہ بیوی کا مسئلہ بھی کیسا عذاب جان ہو گیا۔ کسی طرح طے ہی نہیں ہوتا۔ جولیا بھی بیوی نہ نکلی۔ توبہ! توبہ!! اس مغالطہ نے مجھے کسقدر ذلیل کیا۔ خیر میں تو ایک حد تک معذور بھی ہوں لیکن اس کمبخت کو دیکھو جان بوجھ کر ایک غیر مرد سے جس کی شادی بھی ہو چکی ہو۔ اس درجہ اختلاط کی گفتگو۔ ایسی ہی عورتوں نے فرقہ اناث کو بدنام کیا ہے۔ یعنی اگر میں سیاسیات میں اُس کی رائے سے اتفاق کر لیتا تو گویا وہ میرے آغوش گناہ میں لطف زندگی سے بہرہ اندوز ہونے کے لئے بالکل تیار تھی۔ خیریت ہوئی بچ گیا۔"

بس اب اس کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو چکا تھا۔ اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اگر چند لمحے اور اسی بیخبری میں گذر رہے۔ اور بیوی کا پتہ نہ چلا تو یقیناً ہوش و حواس سے بھی ہاتھ دھو بیٹھے گا۔

اس نے گھنٹی کا بٹن دبایا۔ جس کے جواب میں فوراً ایک خادم حاضر ہوا۔

جولین۔ "لیڈی صاحبہ سے عرض کرو۔ کہ کیا چند منٹ کے لئے وہ یہاں تشریف لا سکتی ہیں؟"

خادم۔ "بہت خوب۔ سر جولین"

اس وقت جولین کا دماغ متضاد جذبات کے بار بار اور جلد جلد پیدا ہونے اور مٹنے سے تقریباً مختل ہو چکا تھا پسینہ کے بڑے بڑے قطرے اسکی پیشانی پر بار بار نمودار ہو جاتے تھے۔ جن کو یہ رومال سے پونچھتا اور سر کو دونوں ہاتھوں میں دباتا تھا۔ آخر اُس نے اپنا سر آرام کرسی کے گدے دار تختوں پر رکھ کر آنکھیں بند کر لیں تھوڑی ہی دیر گذری تھی کہ ایک آواز کانوں میں آئی۔

جھان! تان!!

آواز پہچانتے ہی جولین کا دل بیٹھنے اور کلیجہ پھٹنے لگا سر اُٹھا کر دیکھا۔ تو گمان صحیح نکلا۔ فربہ اندام چہل سالہ میری اس کے نہایت قریب ایک کرسی پر بیٹھی۔ نہایت بھدے

طریقے سے مُسکرا رہی تھی۔ دیکھتے ہی دل کباب ہوگیا۔

میری۔ "جولین جولین۔ اکیلے سو رہے ہو۔ لاؤ ہم اپنے جولین جولین کا سر دبا دیں۔"

یہ کہکر میری اپنے گداز ہاتھ بڑھاکر جولین کے خوبصورت سیاہ بالوں پر آہستہ آہستہ پھیرنے لگی۔ اور جولین ہے کہ ناکامی اور نامرادی کی زندہ تصویر بنا ہُوا لیٹا سوچ رہا ہے۔ "لو آخر وہی ہُوا جس کا خیال پہلے سے سوہان رُوح تھا۔ بس بس میں نے "محبت کی دیوی" کے بجائے "دولت کی دیوی" کی قربانگاہ پر اپنی جوانی نثار کر دی۔ اسی دولت کی دیوی کے یہ سارے کرشمے ہیں۔ اسی کی بدولت مجھے ثروت ملی۔ خطاب ملا۔ پارلیمنٹ کی ممبری ملی۔ اُف مجھ سے زیادہ احمق دُنیا میں کون ہوگا کہ بیش بہا عزّت اور نہ آنے والی جوانی کے بدلے میں نے یہ کھلونے خرید لئے۔ میرا ضمیر مجھ پر لعنت کرتا ہے۔"

میری اپنے کام میں نہایت ذوق شوق سے مشغول تھی۔ اور برابر جولین کے سر پر نہایت شفقت سے ہاتھ پھیر رہی تھی۔

جولین نے میری کا ہاتھ پکڑ کر علیحدہ کر دیا۔ اور بولا۔ "میری یہ کیا کرتی ہو۔ مجھے یہ باتیں پسند نہیں۔ نہ میں نے کبھی ایسی باتوں کی خواہش کی ہے۔"

میری (کمال غرور سے تن کر) "اور اس سے پہلے میں نے ہی ایسا کب کیا۔"

جولین۔ "نہیں نہیں لیکن دوسری عورتیں۔۔۔۔"

میری۔ "دوسری عورتیں؟"

جولین۔ "دیکھو دیکھو میری حسد بُری چیز ہے۔ میرے اُوپر بھروسہ کرو۔ اور میرے الفاظ سے مشتبہ معنی پیدا نہ کرو۔"

میری۔ نہیں جولین جولین مجھے تم پر اعتبار ہے۔

جولین۔ "تم میرا نام دو دو دفعہ کیوں لیتی ہو۔ کیا میں تم کو بجائے ایک کے دو نظر آتا ہوں؟"

میری کھڑی ہوگئی اور اُس کی آنکھوں سے شعلے نکلنے لگے۔ "آج تو تم نہایت ناشائستہ گفتگو کر رہے ہو۔"

جولین۔ "یہ تو ایک نہ ایک دن پیش آنی ہی تھی خدا معلوم میری آنکھیں پھوٹ گئی تھیں۔ بائیں پاگل ہوگیا تھا۔ بس کل ہمارا تمہارا فیصلہ ہو جائیگا۔"

میری نے ایک اُنگلی ہونٹوں پر رکھ کر جولین کو بولنے سے منع کیا اور دوسرے ہاتھ سے کُھلتے ہُوئے دروازے کی جانب اشارہ کیا۔ جولین نے نظر اُٹھا کر دیکھا کہ دروازہ کُھلتے ہی لاغر اندام پنجاہ سالہ چچی غریطہ کمرہ میں داخل ہوئیں ان کے باسی چہرہ پر ایک وحشت خیز تبسّم نمودار ہُوا۔ اور فرمانے لگیں۔ "جولین کیا آپ نے مجھے ابھی یاد کیا تھا۔"

یہ سُنتے ہی غریب جولین کے مُنہ سے ایک چیخ نکل گئی۔ اور وہ بیہوش ہوگیا۔

تمام مہمان جولین کی اچانک علالت سے سخت پریشان تھے۔ فوراً ہوش میں لانے کی تدابیر عمل میں لائی گئیں۔ تھوڑی دیر کے بعد اُس نے آنکھ کھولی، تو تمام مہمان اس کے گرد جمع تھے۔ کوئی کہتا تھا کہ انہوں نے گزشتہ ایام میں دماغی محنت ضرورت سے زیادہ کی۔ کوئی تجویز کرتا تھا۔ کہ تبدیل آب وہوا کی اشد ضرورت ہے۔ غرض ہر شخص اپنی اپنی کہہ رہا تھا۔ اور جولین لیٹے لیٹے خاموشی سے سب کی باتیں سُن رہا تھا آخر کار بولا۔

جولین ۔" میں آپ لوگوں کی ہمدردی پر شکریہ عرض کرتا ہوں۔ میرا بھی یہی خیال ہے۔ کہ مجھ کو تبدیلی آب و ہوا کی سخت ضرورت ہے۔ اس کے متعلق میں غریطہ سے کچھ گفتگو کرنا چاہتا ہوں۔ اور ارادہ یہ ہے کہ آج ہی شب کو یہاں سے چلا جاؤں۔

لوگ یہ اشارہ پاکر کچھ دُور جا بیٹھے۔ اور غریطہ نے جولین سے کہا۔

غریطہ ۔" لیکن اب تو رات زیادہ جا چکی - - - مجھ سے کیا کہنا چاہتے ہو؟"

جولین ۔"تم میرے چلے جانے سے کچھ ناراض تو نہ ہوگی؟"

غریطہ (کچھ سوچ کر) "نہیں"

جولین ۔" تمہاری عنایت کا شکریہ۔ لیکن تم مجھے پرلے درجہ کا احسان فراموش خیال کروگی؟"

غریطہ ۔" توبہ! توبہ!! احسان تو تمہارے ہی میرے اُوپر ہیں۔"

جولین ۔" نہیں نہیں۔ یہ دولت۔ نائٹ کا خطاب۔ پارلیمنٹ کی ممبری یہ چیزیں کچھ معمولی تو نہیں۔ کچھ نہ کچھ اہمیت ضرور رکھتی ہیں۔"

غریطہ ۔" میرے عزیز جولین۔ میرے لئے فخر اور خوشی کا باعث ہے۔ کہ میں کسی طرح تمہارے کام آسکی۔ اور مدد کرسکی۔ لیکن یہ باتیں دوہرانے کے قابل نہیں۔ یہ محض تمہاری سعادتمندی ہے۔ کہ تم میری جانب سے ایسے خیالات رکھتے ہو - - - - ہیں! یہ آواز کیسی آئی؟"

سب لوگ اس آواز کی جانب متوجہ ہوئے جو اُوپر کی منزل پر کسی کمرے سے آئی تھی۔ غریطہ زینہ کی طرف دوڑی اتنے میں ایک دایہ ایک بچّے کو گود میں لئے کمرہ میں آئی۔ بچّہ سوتے سوتے بچھونے سے زمین پر گر کر رو پڑا تھا۔ چونکہ اتفاقاً چوٹ بالکل نہ لگی تھی۔ اس لئے عورتوں میں سے ہر ایک نے یکے بعد دیگرے اس کو گود میں لے لیکر پیار کیا۔ آخر میں صوفیا اس کو گود میں لیکر جولین کے پاس لائی اور بچّہ کو پیار کرنے کی خواہش اُس نے بھی ظاہر کی

جولین (مُنہ بنا کر) مجھے یہ عادت نہیں۔

اسی مجمع میں کسی نے کہا "دیکھو بچہ اپنے باپ سے کسقدر مشابہ ہے۔"

صوفیا۔ "جولین تمہارے خیال میں کس کی شکل ہے؟"

جولین۔ "ملکہ وکٹوریہ کی"

یہ سُنکر سب ہنس پڑے۔ اس کے بعد غربطہ نے تجویز کیا۔ کہ اب رات زیادہ جا چکی ہے۔ بس اب سب آرام کریں ...... سب ایک دوسرے سے رُخصت ہوکر سونے کے لئے اپنے اپنے کمروں میں چلے گئے۔ تھوڑی دیر بعد خادم کسی ضرورت سے کمرہ میں آیا۔ تو جولین نے حکم دیا کہ "صبح بہت سویرے باہر جانے کا ارادہ ہے۔ میرے کمرہ میں جاکر اسباب سفر تیار کر دو۔"

خادم آگے آگے گیا۔ اور آپ پیچھے پیچھے چلا۔ خادم زینہ پر چڑھا اور اوپر پہنچکر داہنی جانب مڑا۔ اور سب سے آخر کے کمرے میں داخل ہوا۔ جولین بھی وہیں پہنچا۔ راستہ میں جس چیز کو دیکھتا ہے۔ نگاہیں اُس سے ناآشنا ہیں۔ یہ خیال ہی نہیں آتا کہ کبھی یہ مکان پہلے دیکھا بھی ہے یا نہیں۔ کمرہ کے اندر پہنچا اور خادم کو یہ کہکر رُخصت کر دیا کہ میں نے ارادہ تبدیل کر دیا ہے۔ اس وقت اسباب باندھنے کی ضرورت نہیں ہے۔ صبح دیکھا جائیگا۔"

خادم کے باہر جاتے ہی اس نے دروازہ بند کیا۔ کپڑے اُتارے اور قریب تھا کہ روشنی گُل کر کے سو رہے کہ یکایک اس کی نگاہ ایک تصویر پر پڑی۔ جو اسکے پلنگ کے بالکل سامنے دیوار پر آویزاں تھی۔ غور سے دیکھا تو بھولی بھالی صوفیا کی مُسکراتی ہوئی شبیہ تھی۔ جو جولین کے صفحۂ دل پر بھی ایسی ہی صاف منقش تھی۔ جیسی صفحۂ قرطاس پر۔

(۲۳)

جولین جب صبح کے وقت نیچے اترا۔ تو تقریباً سب مہمان ناشتہ کر چکے تھے۔ اور رُخصت ہونے کی تیاریاں کر رہے تھے۔ سب سے پہلے غربطہ جانے کو تیار ہوئیں۔ اور کہنے لگیں۔" جولین! میں شاید تم سے کئی روز نہ مل سکوں میرے خیال میں تم کو تبدیل آب وہوا کی سخت ضرورت ہے۔ جو صحت افزا مقام تم اپنے لئے پسند کرو۔ وہاں پہنچکر مجھے اطلاع ضرور دینا۔

جولین۔ "ضرور خدا حافظ" "خدا حافظ"

تھوڑی دیر میں تقریباً تمام مہمان رُخصت ہو گئے سب سے آخر میں ایک پرائیویٹ گاڑی آئی۔ اور ہنری اور فلورا جو پہلے سے باہر سیڑھیوں پر انتظار کر رہے تھے۔ اس میں جا بیٹھے۔ جولین بھی گاڑی کے دروازے کے قریب کھڑے ہوکر ان سے باتیں کرنے لگا۔ جب انکا تمام اسباب رکھا جا چکا۔ تو جولین نے اپنے ہاتھ سے گاڑی کا دروازہ بند کیا۔ لیکن ہنری نے مُسکرا کر پھر کھول دیا اور کہنے لگا۔" ابھی تو میں نے تمہارا شکریہ بھی نہیں ادا کیا۔ تمہاری صحبت میں گزشتہ ہفتہ بڑے لطف کے ساتھ گزرا

جولین۔ "یہ تو خانہ بے تکلف ہے جس وقت جی چاہے

تشریف لائیے۔"

یہ کہکر جولین نے خدا حافظ کہتے ہوئے اپنا داہنا ہاتھ مصافحہ کے لئے بڑھایا۔ اور باتیں سے پھر گاڑی کا دروازہ بند کر دیا۔

فلورا نے مسکراکر پھر دروازہ کھول دیا اور کہنے لگی۔

"جولین تم کو دروازہ بند کرنے کا بڑا شوق ہے۔"

جولین (شرمندہ ہوکر) کیوں کیا تم جانے کے لئے تیار نہیں۔ کیا کوئی چیز رہ گئی۔"

فلورا۔" ہاں ایک چیز ابھی باقی ہے۔" یہ کہہ کر فلورا اور ہنری دونوں نے قہقہہ لگایا۔ اتنی دیر میں ایک انا رات والا بچہ گود میں لئے آئی۔ اور مع بچہ کے گاڑی کے اندر بیٹھ گئی اور گاڑی چل دی۔ ان کو رخصت کرنے کے بعد جولین پھر ملاقات کے کمرہ میں آیا۔ اور خانساماں سے دریافت کیا۔

"کیا سب مہمان رخصت ہوگئے۔

خادم۔" حضور صرف مس میرتین باقی ہیں۔"

مس صوفیا میرتین کمرے کے دوسرے سرے پر ایک زینہ سے اترتی ہوئی نظر آئیں۔ اور جولین انکے استقبال کے لئے آگے بڑھے

جولین (مسکراکر) آہا صوفیا تم نے ناشتہ سونے ہی کے کمرے میں کیا۔"

صوفیا۔" جی ہاں۔"

جولین۔" رات شاید کچھ تکان زیادہ ہو رات سوئے بھی تو بہت دیر سے۔"

صوفیا۔" نہیں۔ میرے خیال میں تو رات سویرے ہی سو گئے تھے۔"

یہ الفاظ کچھ اس لہجہ سے ادا کئے گئے تھے جس سے جولین کے دل کو تکلیف پہنچی۔ وہ سمجھ گیا کہ صوفیا کسی وجہ سے اس سے ناراض ہے۔

جولین۔" تم مجھ سے کچھ ناخوش معلوم ہوتی ہو۔"

صوفیا۔" مجھے کیا ضرورت ہے (نوکر سے) جاؤ جی گاڑی لاؤ۔"

خادم۔" حضور۔ گاڑی حاضر ہے۔ آپ کا اسباب بھی رکھ دیا گیا۔"

یہ سنکر صوفیا نے سیدھا دروازے کی طرف رخ کیا۔

جولین نے پھر آگے بڑھ کر سوال کیا۔" لیکن صوفیا آخر میں نے کیا کیا؟"

صوفیا۔ بس اپنے دل سے پوچھئے۔"

جولین۔" میں قسم کھاتا ہوں کہ میں نے کوئی بات ارادۃً ایسی نہیں کی جو تمہاری ناخوشی کا باعث ہو۔"

صوفیا۔ حسین صوفیا نے ایک عجیب دلکش انداز سے جولین کی طرف دیکھا۔ اور گاڑی میں بیٹھ کر بغیر خدا حافظ کہے گاڑی والے کو روانگی کا حکم دیدیا۔ غریب جولین کا دل صوفیا کے

تیر نظر کا شکار ہو چکا تھا۔ اُسے خیال ہوا کہ جس وقت نظر سے نظر ملی۔ تو صوفیا کی آنکھیں اشکباری سے سُرخ تھیں صوفیا کی گاڑی جب نظر سے اوجھل ہوگئی تو جولین بادلِ ناخواستہ اپنے مطالعہ کے کمرہ میں گیا۔ میز پر اخباروں کا ایک انبار لگا ہوا تھا۔ جو ملازم نے اس کی ہدایت کے مطابق صبح سویرے ہی لا رکھے تھے۔ نہایت دلچسپی کے ساتھ ان کی ورق گردانی اور مطالعہ میں مشغول ہوگیا۔ ان میں جو بات اور جو واقعہ پڑھتا تھا بالکل نیا معلوم ہوتا تھا۔ بہت سے ایسے نام مذکور تھے جن سے اس کے کان آشنا نہ معلوم ہوتے تھے۔ کچھ سوچنے کے بعد سامنے کی الماری سے ڈھونڈھ کر ایک کتاب نکالی جس کے سرورق پر جلی قلم سے زریں حروف میں یہ نام لکھا ہوا تھا۔ " اسماء الرجال دور حاضرہ" پہلے جولین کا خیال تھا کہ اور لوگوں کے نام اس میں تلاش کرے۔ پھر اُس نے سوچا کہ وہ خود بھی کافی ذی رتبہ آدمی ہے۔ پہلے اپنا ہی نام کیوں نہ دیکھے۔ تھوڑی سی تلاش کے بعد اس کی نظر اپنے نام پر پڑی۔ تو خوشی سے اُچھل پڑا۔ کتاب کی تحریر حسب ذیل تھی۔

"مسٹر جولین مائلز۔ آپ سر فلپ مائلز آنجہانی کے چھوٹے بھائی مسٹر گاڈون کے اکلوتے بیٹے ہیں۔ اسی سال ماہ جنوری میں سر فلپ نے انتقال کیا۔ اور اسی ماہ میں اخبار ٹائمز نے شائع کیا۔ کہ سر فلپ کے دونوں بیٹے امریکہ سے سولن نامی جہاز میں انگلینڈ واپس آتے ہوئے جہاز کے غرق ہو جانے کے باعث فوت ہوگئے۔ سرکاری اطلاع سے اس خبر کی تصدیق ہوتے ہی سر جولین سر فلپ کی تمام جائداد کے وارثِ قانونی قرار پائے۔ گورنمنٹ نے ان کو "بیرونٹ" کا خطاب بھی عطا فرمایا۔ اور وزیر اعظم نے ان کو اسی سال علاقہ ...... کی جانب سے دیوانِ عام کی ممبری سے مفتخر فرمایا آپ ...... یونیورسٹی کے ممتاز گریجوایٹ اور نہایت عمدہ ذوقِ علمی رکھتے ہیں۔ آپ مصنّف بھی ہیں۔ حال ہی میں آپ نے ایک ڈراما "بطلان" نامی تصنیف کیا ہے جس کو ...... کمپنی ...... تھیٹر میں دو ہفتہ سے برابر اسٹیج کر رہی ہے۔ ہر روز تماشائیوں کا اتنا ہجوم ہوتا ہے۔ اور مختلف روزانہ اخباروں میں اس قدر ریویو اس کے محاسن پر نکل رہے ہیں کہ یقین کے ساتھ کہا جاسکتا ہے کہ عرصہ سے کوئی ڈرامہ اسقدر کامیاب نہ ہوا تھا۔"

جولین اپنی تعریفیں پڑھ پڑھ کر پھولا نہ سماتا تھا یہ سارا کرشمہ دولت کا ہے۔ وُہی جولین ہے اور وہی اُسکی قابلیت وہی ڈرامہ ہے (صرف نام بدلا ہوا ہے) جو ایک سال پہلے ناکامی کا داغ لگا چکا تھا۔ کل بغیر دولت و اقتدار کوئی بات بھی نہ پوچھتا تھا۔ آج ہر طرف سے تعریفوں کی بوچھاڑ ہے۔ اب سوچنے لگا کہ شادی کا تو کہیں اس میں ذکر ہی نہیں۔ ممکن ہے کہ یہ کتاب شائع ہونے کے بعد شادی ہوئی ہو۔ لیکن کتاب کے دیباچہ کے آخر میں تاریخ اشاعت ۱۰ دسمبر تھی۔

یعنی صرف بیس دن کا عرصہ درمیان تھا۔ تقریباً ناممکن تھا کہ اس زمانے میں شادی ہو جاتی۔ تو پھر یہ کیا مذاق تھا کہ دوست بار بار بیوی کا ذکر کرتے تھے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اس نے پھر یکم جنوری کا اخبار نکالکر پڑھنا شروع کیا۔ دیکھتے دیکھتے اخبار کے آخری صفحہ پر نظر پڑی تو ایک اشتہار ایک تھیٹریکل کمپنی کی جانب سے نہایت جلی قلم سے لکھا ہوا موجود تھا۔

"آج مسٹر جولین کا بالکل نیا ڈرامہ المعروف بہ "نئی نویلی دلہن" پہلی دفعہ اسٹیج کیا جائیگا۔ تمام ملک کے بہترین ممتاز اور نامور ایکٹروں اور ایکٹرسوں نے اس میں حصہ لیکر اس کو پوری طرح کامیاب بنانے کا قصد کیا ہے۔ مشہور مس صوفیا میرلین ہیروئن کا پارٹ کریگی۔ اور لیڈی غریطہ مذاقیہ پارٹ دکھائینگی۔ پلاٹ کی عمدگی۔ زبان کی خوبی اور جذبات نگاری محتاج تعریف نہیں صرف مصنف کا نام ہی کافی ہے۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

بس اب تمام راز منکشف ہو چکے۔ ناظرین سمجھ گئے ہونگے۔ کہ جولین کی شادی نہیں ہوئی تھی جس "نئی نویلی دلہن" کی اُس کو مبارکباد دی گئی تھی وہ اس کی نئی تصنیف کا نام تھا اُس نے ارادہ کیا کہ اسی شب اپنے ڈرامے کو اسٹیج ہوتے دیکھے۔ چنانچہ اسی وقت اپنے ارادہ سے تھیٹر کے مینجر کو ٹیلیفون کے ذریعے سے مطلع کیا۔ جس نے غایت درجہ خوشی کا اظہار کرتے ہوئے ان کو مدعو کیا۔

تماشہ ختم ہونے کے بعد جولین صوفیا کے پرائیویٹ کمرہ میں پہنچا صوفیا نے بڑی بے توجہی سے اُسکا استقبال کیا۔ آخر جولین کی سخت خوشامد پر اتنا بتایا "رات تم نے ہم سے ایک وعدہ فراموشی کی"۔

جولین ۔ "خُدا کے لئے یہ تو بتاؤ کہ وہ وعدہ کیا تھا"۔

صوفیا ۔ یہ تو میں ہرگز نہ بتاؤنگی۔

جولین صوفیا کے پیروں کے قریب گھٹنوں کے بل جھک گیا اور اُسنے صوفیا کے نرم و نازک ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لیکر نہایت لجاجت کے ساتھ کہا۔ "میں قسم کھاتا ہوں کہ مجھے قطعی یاد نہیں کہ میں نے تم سے کیا وعدہ کیا تھا۔ رات کی غشی کے بعد سے میرا دماغ کچھ اس درجہ کمزور ہو گیا ہے کہ مجھے اپنی یاد پر بھروسہ باقی نہیں رہا۔ خدا کیلئے میرے حال پر رحم کرو۔ اور بتا دو کہ میرا وعدہ کیا تھا"۔

صوفیا کی آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا آئے اس نے اپنی آنکھیں رومال سے ڈھک لیں۔ اور مُنہ پھیر کر کہنے لگی۔

"جولین مجھے کہتے ہوئے شرم آتی ہے اور تم کو میری اس پریشانی سے خوشی ہوتی ہے۔ ۔ ۔ ۔ ۔ تم نے وعدہ نہیں کیا تھا کہ نوروز کی رات کو ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ مہمانوں کی موجودگی میں منگنی کی انگوٹھی کس کی اُنگلی میں پہناؤ گے"۔

جولین کا دل خوشی سے بلیوں اُچھلنے لگا۔ اُس نے اپنی جیب سے ایک بیش قیمت انگوٹھی نکالی۔ اور صوفیا کے بائیں ہاتھ کی بیچ کی اُنگلی میں پہنا دی۔ اور صوفیا نے شرما کر اپنا مُنہ جولین کی آغوش میں چھپا لیا۔

تنویر میرٹھی

زُلیخا

(عالم یاس میں)

وہ زُلیخا، وہ پرستارِ جمالِ یُوسفیؑ
مسندِ زرّیں پہ ہے بیٹھی ہُوئی اندوہگیں

چشمِ پُرنم، زرد چہرہ، ہونٹ سوکھے دِل اُداس
بن رہی ہے دردِ دل کا آئینہ اس کی جبیں

سر بزانو اس طرح محوِ خیالِ یار ہے
فکر اپنی جان وتن کی مطلقاً اُس کو نہیں

ڈھل گیا ہے سر سے آنچل، بال ہیں بکھرے ہُوئے
دوش پہ لہرا رہی ہے اُس کی زلفِ عنبریں

گوشۂ خلوت میں تنہا ہے وہ وقفِ اضطراب
غمگسار اس وقت ہے کوئی، نہ کوئی ہمنشیں

دیکھتی ہے جب کبھی حسرت سے سوئے آسماں
کھنچ کے آجاتی ہے لب تک دِل سے آہِ آتشیں

دِل کو ہاتھوں سے دبائے، غرقِ بحرِ فکر ہے
کہہ رہی ہے اپنے دل سے خود بخود وُہ نازنیں

وائے محرومی! رہی محروم وصلِ یار سے
وائے قسمت! اب کوئی تدبیر بن پڑتی نہیں

ہائے کیسی مَیں زمانے بھر میں رُسوا ہوگئی
اب عزیزِ مصر کی بھی وہ نظر مجھ پر نہیں

اقربا دیتے ہیں طعنے، خندہ زن ہے اِک جہاں
اپنے بیگانے ہُوئے، کوئی بھی اب میرا نہیں

کون سُنتا ہے حدیثِ خونفشانیہائے چشم
کس کو یارب! مَیں دکھاؤں یہ بہارِ آستیں

حیف! مَیں بیٹھی رہوں عشرتکدے میں اس طرح
اور جائے قید خانے میں نگارِ مہ جبیں

خاک ایسی زندگی پر، جی کے اب مَیں کیا کروں؟
سیر ہوں میں زندگی سے لطف جینے کا نہیں

زندگی ہے اِک عذابِ جاں، آلٰہی رحم کر!
اب اُٹھالے آسماں ہی یا نگل جائے زمیں

مَیں وہی ہوں ملکۂ آفاق تھا جس کا لقب
سامنے میرے جُھکا کرتی تھی ہر اک کی جبیں

مَیں وُہی ہوں حُسن کی دیوی جسے کہتے تھے سب
سر بسجدہ روبرو میرے تھے دُنیا کے حسیں

مَیں وہی تو ہوں کہ جس پر جان دیتا تھا عزیز
میری ہی صورت تو تھی ہر وقت اُس کے دِلنشیں

ہاں وہی مَیں ہوں کہ جس کی اِک نگاہِ لطف کے
رات دِن رہتے تھے خواہاں مصر کے سارے حسیں

اب وہی مَیں ہوں کہ ہوں اِک پیکرِ جوشِ جنوں
اب وہی مَیں ہوں کہ ہوں افسردہ و اندوہگیں

اب وہی مَیں ہوں کہ ہوں منت پذیرِ بیکسی
اب وہی مَیں ہوں کہ مجھ کو پوچھتا کوئی نہیں

ہائے مَیں نظروں سے گر کر خلق میں زندہ رہوں
پھٹ پڑے اے کاش! میرے سر پہ چرخِ چنبریں

خیر آ ئیگی قضا جس دم مری، مر جاؤں گی
سخت حیرت ہے مجھے، یہ بھید کیوں کھُلتا نہیں

کس لئے ہنستی ہے دُنیا میرے حالِ زار پر؟
حُسن کی تاثیر سے شاید کہ وہ واقف نہیں!

کیا انوکھی ایک مَیں ہی ہوں پرستارِ جمال؟
کیا کوئی صورت نہیں دل میں کسی کے جاگزیں؟

کیا اکیلی مَیں ہی دُنیا میں ہوں پابندِ جنوں؟
کیا کوئی دیوانۂ اُلفت زمانے میں نہیں؟

آج جو دیتی ہیں مجھ کو طعنہ ہائے دلخراش
اُن کے دل میں کچھ خدا کا خوف بھی مطلق نہیں

کل اُنہیں نے کاٹ لی تھیں اپنی اپنی اُنگلیاں
آج یہ اُن کی ڈھٹائی! آفریں صد آفریں!!

میری حالت پر زنانِ مصر ہنستی ہیں، ہنسیں
مَیں گرفتارِ محبّت ہوں، مجھے پروا نہیں

ہاں ٹھہر اے نا امیدی! کیوں ستاتی ہے مجھے؟
تا بکے رکھے گی مجھ کو اس طرح اندوہگیں؟

آ مری امید رفتہ، دے مجھے پیغامِ عیش
بس کرم اے یاس! اب تجھ سے مجھے مطلب نہیں

اے خیالِ یار، اے چشم و چراغِ زندگی!
آ، کہ تیرا منتظر ہے یہ دِل اندوہگیں

آ، کہ تو ہے ناخدائے آرزو، اے یادِ دوست!
ڈوبتی ہے بحرِ غم میں کشتیِ جانِ حزیں

یہ ہجومِ نامرادی اور یہ انبوہِ غم!!
کس مصیبت میں ہے میری جان، او جاں آفریں!

ہو کسی صورت تو قلبِ مضطرب کو کچھ سکوں
موت ہی آ جائے یارب! وصل اگر ممکن نہیں

راز

جنسِ ایمان

(۱)

ہم پچیس محرروں نے "بندے ماترم" لکھ انگریزی سوداگر "سینڈر کمپنی" کی ملازمت سے کنارہ کشی کی۔ ملک میں شہرت ہوگئی۔ ہندوستانی اخبارات کے کالم ہماری تعریفوں میں سیاہ ہونے لگے۔ لیڈروں نے ملک و قوم سے ہماری پُرزور سفارشیں کیں، اور ہموطن حسب توفیق امداد دینے لگے۔

لیکن جس جوش نے مجھے مصیبت کا بوجھ سر پر اُٹھانے کے لئے آمادہ کیا تھا۔ اُس کے فرو ہو جانے پر بھی میں اپنی قوم کے آگے ہاتھ نہ پھیلا سکا۔ ملازمت کی ہر چند جستجو کی لیکن کہیں روزی کی صورت نہ ہوئی۔ ضعیف العمر بوا نے کہا۔ "بیٹا! تم نے کیا سوچ کر ملازمت چھوڑ دی۔ کیوں گھر آئی ہوئی لکشمی کو ٹھکرا دیا۔"

میں کیا جواب دیتا، کیا کہتا، سرلا ہنستی ہوئی ہمیں کھانا کھلاتی لیکن آپ دن بھر میں ایک مرتبہ کھایا کرتی۔ میرا دل مغموم رہنے لگا۔ اُس کا پھول سا چہرہ کمھلانے لگا ہائے ہائے کیا سوچ کر میں نے ایسا کیا تھا۔

سرلا کے بھائی متمول تھے اس لئے جہاں تک ممکن ہوتا میں اُن کے گھر نہ جاتا تھا۔ اُنھوں نے مجھ سے ناخوش ہو کر ایک طرح سے تعلق ترک کر رکھا تھا لیکن سرلا تو اُن کی بہن ہی تھی۔ میرے دل میں قسم قسم کے خیالات پیدا ہوتے تھے۔ میں اپنے آپ سے بیحد ناراض تھا میں نے اُس کا ہاتھ پکڑ کر کہا۔ "سُنتی ہو، تم مجھ کو اور مایوس کئے دیتی ہو، تم کچھ روز کے لئے اپنے بھائیوں کے گھر چلی جاؤ۔ اپنی حالت درست ہوتے ہی تم کو فوراً بُلا لُونگا۔"

اُس نے ہنس کر جواب دیا۔ "کیوں تمہیں عزت دار ہو، میں بھائیوں کی روٹی کس طرح کھاؤں؟"

میری آنکھوں میں آنسو بھر آئے میں نے کہا "کیوں؟ اس لئے کہ تمہارا نالائق خاوند تمہیں روٹی کھلانے کے قابل بھی نہیں رہا۔"

اُس نے ہنس کر کہا۔ "کیا آپ کے انہیں خیالات نے دھرم کے لئے ہڑتال کی ہے؟"

سرلا نے اُس روز سے دونوں وقت کھانا شروع کر دیا لیکن جو کچھ گھر میں تھا وہ دو ماہ کے اندر صرف ہوگیا ہر آنے والی گھڑی کا خوف لگا رہتا تھا کہ کیا کریں گے،

کہاں سے لائینگے؟ بعدہ، جب سرلا کو اس سے آگاہی ہو گئی
تو بس آنکھیں بند کئے پڑا رہا کرتا تھا، وہ میرے جسم پر ہاتھ
پھیر کر دیکھتی تھی۔ بدن پر بہت سی ہڈیاں اُبھر آئی تھیں۔
اور آنکھوں میں حلقے پڑ گئے تھے۔ اُس کی آنکھوں سے
گرم گرم آنسو روزانہ میرے جسم پر گرا کرتے تھے میں بیان
نہیں کر سکتا کہ میرے دل میں کیا کیا خیال گذرتے تھے۔
میرے تن بدن میں ایک آگ سی لگ رہی تھی۔

(۲)

آج خدا نے روزی کا باب نہ کھولا تو کل فاقہ کرنا ہوگا
اپنی تو کچھ فکر نہ تھی۔ فکر تھی دراصل اُن بدنصیبوں کی جو
میرے آسرے پر جیتے تھے۔ بُوا ہمیں ہمت دلاتی
تھیں۔ مگر دل میں وہ جس تکلیف کو محسوس کر رہی تھیں
اس سے میں آگاہ تھا۔ جس کے ساتھ میں نے شادی کی
تھی۔ اُس کے منہ میں ایک لقمہ تک نہیں پہنچا سکتا تھا۔
افسوس اسے پرماتما!

شام کے بعد مکان سے نکلا۔ بوندیں پڑ رہی تھیں
آسمان ابر آلود تھا۔ راستہ میں کیچڑ اور پھسلن تھی۔ باہر جاتے
وقت سرلا نے پوچھا۔ "کہاں جاتے ہو؟" میں نے کہا۔
کہ "ایک شخص نے اسی وقت ملاقات کا وعدہ کیا ہے ممکن
ہے کہ کچھ کام مل جائے۔" دراصل میں نے جھوٹ بولا تھا
سرلا نے میری بات سنکر کچھ شبہ نہ کیا۔ میں برآمدہ میں جوتا
پہن رہا تھا۔ گھر کے اندر بُوا نے آہستہ سے کہا۔

"بہو! تُو نے اُسے کیوں جانے دیا، مصیبت کی
وجہ سے کہیں کچھ ...." سرلا نے جواب دیا۔
"بُوا جی! پاگل ہو گئی ہیں۔ وہ کیا ہم دونوں کو چھوڑ کر کہیں
جا سکتے ہیں۔ کہیں نوکری کی تلاش میں گئے ہیں! درگا دیوی
کرپا کرینگی۔"

میں اپنی آنکھوں سے آنسو پونچھتا ہوا باہر نکلا۔
دن کے وقت مزدوری کرتے ہوئے شرم آتی تھی، آج
رات میں نے عزت اور بیعزتی کا کچھ خیال نہ کیا۔ رات میں
کسی کا بوجھ ہی اُٹھا کر شکم سیری کی فکر کرونگا۔ اس وقت
کون دیکھنے والا ہوگا، ہاتھ پیر کے ہوتے بھوکوں مرنا یہ
مجھ سے نہیں ہوتا۔ سرلا نے درست کہا تھا اُن دونوں
کو کس کے سپرد کرونگا۔"

بارش میں بھیگتا ہوا کوچہ و بازار میں مارا مارا پھرنے
لگا۔ لیکن مزدوری ہاتھ نہ آئی۔ ایک دُکان سے ایک
مالدار آدمی بہت سے کپڑے خرید کر باہر نکلا۔ میں اُس
کے قریب پہنچا۔ لیکن منہ سے کوئی بات نہ نکلتی تھی کچھ دیر
اِدھر اُدھر دیکھ کر میں اُس کے پیچھے چلنے لگا۔ اُس نے
شک کی نگاہوں سے میری طرف دیکھ کر کہا۔

"کیوں صاحب"

میں نے خوب کھانس کر لرزتی ہوئی آواز سے کہا۔

"مزدور چاہیئے؟" وہ بولا "کیا لوگے؟"

مَیں نے کہا۔ "صاحب! میرے گھر میں اناج نہیں۔ آپ کا بوجھ اُٹھاکر دو پیسے مل جائینگے، تو کچھ چنے وغیرہ ......"

اُس نے کہا۔ "کیوں مذاق کرتے ہو؟ تم نے بھیک منگوں کی آواز کی تو خوب نقل اُتاری ہے۔ لیکن پوشاک ٹھیک نہ کر سکے!"

مَیں نے اپنی پوشاک کی طرف دیکھا۔ بیشک مَیں نے غلطی کی تھی۔ اس بھیس میں بوجھ کا کام نہیں چل سکتا ہے۔ اُس شخص کے چلے جانے کے بعد مَیں بہت دیر تک اُس کو [illegible] دیکھتا رہا۔ اب بارش بھی خوب زور سے ہونے لگی تھی۔ مَیں راستہ ہی میں ایک برآمدے میں کھڑا ہوگیا۔ سڑک پر کوئی آدمی نہ تھا۔ ایک کُتّا میرے قریب آکر بیٹھ گیا۔ اُس کے چہرہ پر بھی پژمُردگی تھی۔ معلوم ہوتا تھا کہ وہ بھی میری طرح مصیبت زدہ ہے۔

مَیں اُس کے جسم پر ہاتھ پھیرنے لگا۔ وہ محبت کی وجہ سے زمین پر لوٹنے لگا۔ میرے پاؤں چاٹنے لگا۔ اور دم ہلانے لگا۔

بارش تھم گئی۔ مَیں گھر کی طرف چلا۔ کچھ دُور آگے بڑھ کر دیکھا کہ کُتّا پیچھے چلا آرہا ہے۔ مَیں اُسے دیکھ کر بھاگا۔ وہ دُم ہلانے لگا۔ مَیں نے قدم اُٹھایا تو وہ بھی میرے پیچھے چلا۔ اُسے کیا معلوم تھا کہ میرے گھر آکر فاقہ کشی کرنا ہوگی؟ مَیں کچھ دُور آگے گیا۔ مگر اُس نے اب بھی میرا پیچھا نہ چھوڑا۔ مجھے بہت بُرا معلوم ہُوا۔ کُتّے کے مَیں نے ایک ٹھوکر ماری۔ وہ پھر زمین پر لوٹ کر دم ہلانے لگا۔ مجھ سے ناراض نہ ہُوا۔ اُس نے مخلصانہ نگاہ سے میری طرف دیکھا۔

کُتّا میرے پیچھے چلا آرہا تھا۔ میں پھر کھڑا ہوگیا۔ وہ میرے پاؤں پر گرکر خوشامد کرنے لگا۔ مَیں بھی اس پر ناراض نہ ہُوا۔ بلکہ چمکار کر کہا۔ "اچھا چل، جہاں تین بھوکے مرتے ہیں وہاں چوتھا اور سہی۔"

وہ بیحد مسرور معلوم ہوتا تھا۔ اس مرتبہ وہ چور کی طرح پیچھے نہیں چل رہا تھا۔ بلکہ کبھی وہ آگے کی طرف دوڑتا تھا۔ اور کبھی میرے دائیں بائیں، درمیان وہ کبھی کبھی بھونکتا بھی تھا۔ اُسے بڑی خوشی تھی کہ مَیں نے اُسے ساتھ چلنے کا حکم دیدیا۔

وہ ایک طرف سے ایک پوٹلی لیکر آیا۔ میرا دل خوشی سے دھڑکنے لگا۔ پوٹلی میں کچھ ہو۔ شاید خدا نے اسی لئے اس کو میرے پاس بھیجا ہو۔"

(۲)

ہاں! دولت تھی، دس روپیہ کے چھ نوٹ، مَیں خوشی کی وجہ سے تالیاں بجاکر ناچنے لگا۔ کُتّے کو پیار سے

گود میں اُٹھا لیا۔ کیسی خوشی کا عالم تھا۔ لیکن اسی وقت طمع دُور ہو گئی۔ یہ روپیہ کس کا ہے؟ کون اس کا مالک ہے؟

اُن نوٹوں کے ساتھ ایک دستاویز بھی تھی گیس کی روشنی میں مَیں نے مالک کا نام پڑھا۔ اور پتہ بھی دیکھا۔ راستہ میں جاتے ہُوئے اُس سے پوٹلی گر گئی ہے تھوڑی کوشش کرنے سے یہ پوٹلی اُس کے مالک کو دی جا سکتی ہے۔

پھر خیال کیا۔ بھگوان نے جب بھوکے کے سامنے اناج رکھا ہے۔ تو کیا اُس اناج کا منظور نہ کرنا گناہ نہیں۔ ساتھ ہی دونوں غریب عورتوں کا خیال آیا۔ اس روپیہ کے واپس کرنے سے اُنہیں اور مجھے فاقہ کرنا ہوگا۔

لیکن یہ ایمانداری نہیں۔ اس سے تو بھیک مانگنا اچھا ہے۔ اس روپیہ کے حاصل کرنے میں ہمیں کوئی محنت نہیں اُٹھانا پڑی۔ مگر جن کا یہ مال ہے۔ وہ نہایت مالدار ہیں۔ دستاویز سے بھی یہی ثابت ہوتا ہے۔ مَیں اُن کو بعد میں یہ روپیہ واپس کر سکتا ہوں۔ اُن کے اس ساٹھ روپیہ سے میرا تین ماہ کا کام چل سکتا ہے۔ اس درمیان میں نوکری مل جانے پر اُن کا روپیہ واپس کر دُونگا۔ اب اس وقت ہاتھ آئی ہُوئی چیز کو نہ چھوڑنا چاہیئے۔ اچھا روپیہ کو اپنے پاس رکھونگا۔

گھر کی طرف بڑھنے لگا۔ جس ہاتھ میں پوٹلی تھی وہ ہاتھ گویا جلا جاتا تھا۔ اگرچہ برابر مینہ سے بھیگ رہا تھا۔ کچھ دیر قبل سردی کی وجہ سے مَیں کانپ رہا تھا۔ لیکن اس وقت تمام جسم سے آگ کی چنگاریاں نکل رہی تھیں مَیں نے دل کو مضبوط کر لیا تھا۔ ڈُوب کر مرنا ہوگا تو مرونگا مگر اس روپیہ کو ہرگز نہ چھوڑونگا۔ عورتوں کو فاقوں سے ہلاک نہ ہونے دُونگا۔ بعد کو چاہے دوزخ میں جانا پڑے۔ اس دُنیا میں تو لوگ یہ نہ کہیں گے کہ مَیں نے اپنی بیوی اور بُڈھی ماں کو بھوکوں مار ڈالا۔

گلی کے موڑ پر پُہنچ گیا تھا۔ کُتّا اُچھلتا کُودتا ہُوا جا رہا تھا۔ دِل دھک دھک کر رہا تھا۔ رگوں میں خُون تیزی سے دوڑ رہا تھا۔ ہاتھ پاؤں اور آنکھیں جل رہی تھیں۔ زبان خُشک ہُوئی جاتی تھی۔ سر میں چکّر آ رہے تھے۔ اتنے میں محلہ کے چوکیدار نے میرے جوتے کی آہٹ پاکر آواز دی۔ ”کون ہے؟“

اگر مَیں گیس کے کھمبے کو نہ پکڑ لیتا تو یقیناً گر پڑتا۔ میری حالت کو دیکھ کر کُتّا میرے قدموں میں لوٹنے لگا۔ پہرہ والے نے دوبارہ دریافت کیا۔

”کون ہے؟“

مَیں نے فوراً اُس پوٹلی کو جیب میں رکھ لیا مَیں ڈر رہا تھا کہ کہیں جیب سے نوٹ نہ گر پڑیں۔

چوکیدار نے چہرے کو دیکھ کر کہا۔ ”بابو آپ ہیں؟

اتنی رات ؟"

میں نے کچھ نہیں کہا۔ ہنسنے لگا۔

پہرہ والے نے کہا "بابو! اسلام۔ آپ بیمار ہو جائینگے۔ گھر جائیے۔"

(۴)

سرلا نے کہا "کیا کرتے ہو؟ کیا دیوانے ہوگئے ہو۔ کپڑے کیوں نہیں بدلتے"

میں نے اُس کے سامنے نوٹ رکھ دئے۔ ہاتھ کانپ رہے تھے۔

سرلا نے کہا۔ "دیکھئے نا' محنت کرنے سے ہی بھگوان مہربانی کرتے ہیں۔ اچھا کپڑے تو بدلو۔"

کُتّا ابتک پیچھے تھا' سرلا نے اُسے نہ دیکھا تھا وہ میرے پاس آرہا تھا۔ سرلا نے ڈرتے ہُوئے کہا "ارے یہ کیا؟"

میں نے خوب کوشش کر کے زبان کو تر کیا۔ اس کے بعد بولا۔ "سرلا آج سے یہ ہمارے ہاں رہیگا۔ اگر آج یہ نہ ملتا تو کل ہم سب کو فاقہ کرنا پڑتا۔"

سرلا نے کہا "کیوں؟"

میں نے اُس سے تمام باتیں کہہ دیں۔ اس کے چہرہ کو دیکھ کر مجھے ہمّت نہ ہوئی کہ میں اس روپیہ کو ہضم کر سکوں۔ میں نے اس سے کہا۔ کہ جس وقت ہمارے پاس روپیہ آجائیگا۔ ہم اُنہیں واپس کر دینگے۔ بھگوان نے ہمیں دُکھ سے بچانے کے واسطے یہ روپے بھیجے ہیں۔"

سرلا نے کہا۔ "افسوس! افسوس!!"

اُس کی ایک ہی بات سے میں بدحواس ہوگیا۔ اور مجھے معلوم ہُوا کہ میرے سامنے ایک دیوی کھڑی ہے۔ میں چلنے لگا۔ اُس نے ہاتھ پکڑ کر کہا "کہاں جاتے ہو؟"

میں نے کہا" نوٹ واپس کرنے کو۔"

اُس نے کہا۔ "کل صبح دے آنا۔ اس وقت کپڑے بدل ڈالو۔"

میں نے کہا "سرلا! جل مروں! انہیں میں ابھی جاؤنگا۔ تمہارے لئے گناہ کرنا چاہتا تھا۔ لیکن اب معلوم ہوگیا کہ تم فاقوں میں خوش ہو" اُس نے ہاتھ چھوڑ دیا۔ اور میں چلدیا۔

(۵)

چوکیدار' بھوت' پریت آدمی اب کسی کا خوف نہ تھا۔ اس وقت بھی پہلے کی طرح ہاتھ پاؤں اور بدن سے آگ نکل رہی تھی۔ حرارت کا امتحان ختم ہو چکا تھا۔ کُتّا بھی ساتھ چل رہا تھا۔ اس وقت شاید اُسے خوشی تھی۔

آدھی رات کے وقت ایک رئیس آدمی کو جگانے میں میں نے کچھ تامّل نہ کیا۔ وہ بہت خوش ہُوئے۔ نوٹ ملنے پر نہیں۔ بلکہ دستاویز پا کر۔

اِدھر اُدھر کی باتیں کرنے کے بعد وہ مجھے چالیس روپیہ انعام میں دینے لگے۔ میں نے اُن سے کہا۔

"میں سینٹرل کمپنی کی ہڑتال کا ایک آدمی ہوں مجھے اس وقت تک کوئی ملازمت نہیں ملی۔ گھر میں اناج تک نہیں۔ اس پر بھی میں نے بھیک مانگنا گوارا نہ کیا۔ معلوم ہوتا ہے کل ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ جانے دیجئے۔ اب چلتا ہوں۔"

وہ شرمندہ ہوگئے۔ اور مجھ سے معافی مانگنے لگے، اُنھوں نے کہا۔ مجھے اپنے ایک لڑکے کے لئے ایک اُستاد کی ضرورت ہے۔ آپ دس روپیہ پیشگی لئے جایئے اور کل سے پڑھانا شروع کر دیجئے۔ ایک ہفتہ ہی میں ہمارے دفتر میں کوئی جگہ آپ کو مل جائیگی۔"

(۶)

سرلا نے کہا۔ "انعام!"

میں نے کہا۔ "نہیں پیشگی تنخواہ۔ کل سے اُن کے لڑکے کو تعلیم دینی ہوگی۔ جس نے اتنے دنوں کی مصیبت برداشت کی۔ اور ذرا مغموم نہ ہوئی۔ وہ آج رونے لگی۔ آنسو پونچھتے ہوئے اُس نے کہا۔

"بھگوان کی کرپا آپ نے دیکھی! اُس نے اس کُتّے کے ذریعہ سے خوراک بھیجی ہے۔"

میں نے کہا۔ "اور تم جیسی دیوی کے لئے مجھے چور نہ بننا پڑا۔"

اُف! میں لرز اُٹھا۔

(ترجمہ) ہشام

غزل

مردہ دل بھی دِل شگفتہ ہو میانِ کوئے دوست
زندگی اُن کی ہے جو ہیں ساکنانِ کوئے دوست

کیا کریں واعظ بیاں ہم عزّ و شانِ کوئے دوست
کہتے ہیں رضواں جسے ہے پاسبانِ کوئے دوست

ایک سنگِ آستاں سے کام کس کس کا چلے
مجھ سے دیوانے بہت ہیں ساکنانِ کوئے دوست

غیر ممکن ہے جگا دے فتنۂ محشر اُنہیں
سوئے ہیں کچھ اس طرح خوابیدگانِ کوئے دوست

خاک اُڑائی اتنی لوگوں نے کہ آخر بن گیا
اور زیرِ آسماں اِک آسمانِ کوئے دوست

شامی

فغانِ مہجور

یہ بھیانک شب کا سناٹا یہ شدت درد کی
یہ تپش یہ بیکلی یہ آگ سی بھڑکی ہوئی

میری ہی مانند شاید چاند بھی غمکوش ہے
پردۂ افتادگی میں ورنہ کیوں روپوش ہے

بے سبب کب ہے تمہارا بھی یہ رنگِ اضطراب
کچھ نہ کچھ تارو! تمہاری جان کو بھی ہے عذاب

غم تو ہے میرے لئے اُس سے تمہیں کیا واسطا
سب مری قسمت میں قسامِ ازل نے لکھ دیا

ہو بھی کچھ باقی تو اُس کو بھی مجھی کو بھیج دو
شاد کامِ مدعا ہو کر فلک پر تم رہو

چاند آ- تجھ کو دکھاؤں مَیں بھی اپنے دل کا داغ
میرے آگے جل نہیں سکتا کبھی تیرا چراغ

داغ تیرا رائیگاں، میرا بھرا لذّات سے
امن میں ہوں مَیں تجھے فرصت نہیں آفات سے

ہر مہینے بدر سے ہوتا ہے تو گھٹ کر ہلال
میرے داغِ دل کا یہ ہوتا نہیں لیکن مآل

جوف سے جس دم کواڑوں کے گزرتی ہے ہوا
صاف میرے ہی نوائے غم کی آتی ہے صدا

نغمۂ مطرب سے نالے میرے ہرگز کم نہیں
کون کہتا ہے کہ ان میں کیفِ زیر و بم نہیں

میری ہستی اِک عجب رنج و محن کا ساز ہے
جس کے سُننے کو مصیبت گوش بر آواز ہے

آہ اب باقی نہیں ہے نالۂ غم کی بھی تاب
ہو گیا سوزِ دروں سے جل کے دِل مثلِ کباب

بسترِ غم پر نہیں ملتا کسی پہلو قرار
کروٹیں بدلا کروں اس طرح کبتک باربار

بیکسی کی ہو گئی اب تو الٰہی انتہا
چشمِ تر سے نیند بھی رہنے لگی نا آشنا

راز بھی بیچارگی کا میری کچھ کھُلتا نہیں
دِل دھڑکتا ہے مگر مفہومِ دل پیدا نہیں

ہو گئی لبریز مایوسی زمانے کی فضا
ہر طرف مجھ کو نظر آتا ہے نقشہ یاس کا

چشمِ تر تو بھی نہیں دھوتی مرے دل کا غبار
فایدہ کیا اس طرح رہنے سے ہردم اشکبار

اے خیالِ شوق تیری چارہ سازی کیا ہوئی
ایک مایوس تمنّا کی بچا لے زندگی

کیا پرِ پرواز تیرے جل گئے اے آہِ غم
دل ہی میں گھٹ گھٹ کے مجھ پر ڈھائیگی کبتک ستم

اے خدا کب تک رہیگی سوز کی حالت یہی
اشکِ حسرت کی روانی کیا نہ کم ہوگی کبھی

دل ذرا صبر و سکوں سے آشنا ہوتا نہیں
ہاتھ سینے سے کوئی دم کو جدا ہوتا نہیں

میں جو ہم آہنگ ہر دم نالۂ پیہم سے ہوں
غم سری قسمت سے وابستہ ہے اور میں غم سے ہوں

جب کوئی تسکین کا باقی نہیں ہے آسرا
صبر کی حد سے دِل بیتاب باہر ہو چکا

کیوں نہ اس کی بیوفائی پر فدا ہو جاؤں میں
جان دے کر فرضِ اُلفت سے ادا ہو جاؤں میں

ہادی مچھلی شہری

غزل

پچھتانے سے کیا حاصل، پچھتانے سے کیا ہوگا؟
کچھ تو نے کیا ہوگا، کچھ تجھ سے ہُوا ہوگا؟

دیوانۂ اُلفت نے سودائے محبت میں
جو کام کیا ہوگا، بے مثل کیا ہوگا

تنہائی کی یہ راتیں، مرجانے کے یہ ساماں!
اللہ! کوئی کیونکر فرقت میں جیا ہوگا؟

جینے کا مزہ جب ہے، جینے سے ہو کچھ حاصل
یوں لاکھ جئے کوئی، اُس جینے سے کیا ہوگا؟

آغازِ محبت میں انجام کا کیا کھٹکا!
یہ دردِ جگر شاید کچھ اور سوا ہوگا

پُرسش کی نہیں حاجت، پُرسش کی ضرورت کیا؟
معلوم ہے سب تجھ کو جو کچھ کہ ہُوا ہوگا

جب تک ہے خودی دِل میں ہوگی نہ پذیرائی
بیکار ہیں یہ سجدے، ان سجدوں سے کیا ہوگا

جیسی بھی گزرتی ہے، اے رازؔ گزرتی ہے
انجام کو روتا ہوں، انجام میں کیا ہوگا؟

رازؔ چاندپوری

آخری ارمان

مارس لیبلانک کے افسانے جیوش لیمپ کا ترجمہ

(بسلسلہ گزشتہ)

"اس کا نام ؟"

"میں اس کو خوب پہچانتا ہوں۔"

"آخر کوئی ثبوت"

"یہی ثبوت جو میرے پاس ہے۔ ملزم کو ہراساں کر دینے کے لئے بہت کافی ہے۔"

"ملزم کا گھبرا جانا کافی دلیل نہیں..... یقیناً رہائی..."

"جیوش لیمپ اس وقت میرے پاس ہے۔"

"اور وہ موتیوں کا ہار۔ مرصع صندوقچہ....."

"موتیوں کا ہار اور مرصع صندوقچہ بھی۔ غرضکہ ہر ایک چیز جو دوسری مرتبہ چوری گئی۔ میرے قبضہ میں ہے۔" شیرز نے اسی سادہ وسنجیدہ طریقہ سے اپنی کامیابی کے اظہار کو مناسب سمجھا واقعی بیرن اور اس کی بیوی ہکے بکے سے معلوم ہوتے تھے۔ اور ان کی نظریں خاموش استعجاب و اشتیاق کے ساتھ شیرز پر پڑ رہی تھیں۔ اور یہ صورت حال انتہائی تعریف کے برابر تھی۔

اس کے بعد مفصل حالات سے جو اس کو گزشتہ تین یوم میں پیش آئے تھے۔ آگاہ کیا۔ اس نے بتایا کہ کس طرح اس نے تصویروں کی کتاب حاصل کی۔ اور ایک کاغذ کے ٹکڑے پر وہ جملہ جو کٹے ہوئے الفاظ سے بنتا تھا۔ لکھا۔ بعدہٗ بریس کے دریائے سین تک جانے اور خودکشی، اور آخر میں اس کشمکش کا جو اس نے ذرا دیر پہلے لوپن کے ساتھ کی تھی۔ کشتی کی تباہی اور لوپن کے غائب ہو جانے کا تمام ماجرا مع کل تفصیلی واقعات کے بیان کیا۔

جب وہ ختم کر چکا تو بیرن نے دبی آواز میں کہا۔

"بس اب صرف ایک بات باقی رہ گئی۔ وہ یہ کہ آپ چور کا نام بتلائیں۔ آپ کس کو مجرم قرار دیتے ہیں۔"

"میں اس شخص کو ملزم گردانتا ہوں جس نے ان حروف کو کاٹا۔ اور ان کے ذریعہ آرسین لوپن سے خط و کتابت کی۔"

"یہ آپ نے کیونکر جانا کہ اس شخص کی خط و کتابت آرسین لوپن سے تھی۔"

"خود لوپن سے"

اس نے ایک نم آلود اور بوسیدہ پرزہ نکالا۔

یہ وہی ورق تھا جس کو کشتی میں لوپن نے اپنی نوٹ بک سے پھاڑکر اور وہ جملہ لکھکر اس کے حوالہ کیا تھا۔

"لیجئے۔ ملاحظہ فرمائیے۔" شیرز نے باطمینان اسے اس کی طرف بڑھاکر کہا۔ "دیکھئے۔ اس موقع پر کوئی بھی بات ایسی نہ تھی کہ وہ یہ پرچہ دینے یا اپنی ہستی ظاہر کرنے پر مجبور ہوتا۔ مگر اُس کی نظروں میں ایسی باتیں بازیچۂ اطفال ہیں۔ لیکن مجھے اسکے ذریعہ ایک ایسی زبردست اطلاع مل گئی جسکو میں تلاش کر رہا تھا۔"

"وہ کونسی اطلاع" بیرن نے دریافت کیا۔ "میں تو کچھ بھی نہیں دیکھتا۔ کہ ...."

شیرز نے پنسل سے اُن حروف اور ہندسوں کو نقل کیا۔

ک۔ ر۔ ج۔ ب۔ ا۔ د۔ و۔ ع۔ ی۔ ج ۔۔۔ ۲۳۷

"بہت خوب" ایم۔ ڈی ایمبلولی نے کہا۔ "یہی وہ معما ہے۔ جو ابھی آپ نے ہم کو بتایا تھا۔"

"جی نہیں۔ اگر آپ بھی میری طرح اس کو بار بار الٹیں پلٹیں گے۔ تو آپ کو معلوم ہوگا۔ کہ اس میں دو حروف ا۔ ک زائد ہیں۔"

"اوہو، میں نے خیال نہیں کیا۔"

"اب ان دو حروف کو ی اور د کے قریب رکھئے۔ آپ دیکھینگے کہ اس سے جو ممکن لفظ بن سکتا ہے۔ وہ 'ایکو' ہے۔"

"جس کے معنی"

"جس کے معنی اخبار ایکو ڈی فرانس، یعنے لوپن کا اخبار اُس کا خاص اخبار۔ اور کیسا خاص جسکے لئے اسکے سرکاری حقوق تک محفوظ ہیں۔ اب اس کل جملہ کا مطلب ملاحظہ ہو۔ "جواب ایکو ڈی فرانس، کے آخری کالم ۲۳۷ میں بھیجو۔" یہی کلید تھی جس کے لئے میں نے اتنے عرصہ تک دماغ سوزی کی۔ اور جسکو ازراہِ عنایت' لوپن نے خود ہی بتا دیا۔ میں ابھی ابھی سیدھا ایکو ڈی فرانس، کے دفتر ہی سے آیا ہوں۔"

"اچھا تو آپ نے وہاں کیا پایا۔"

"مجھے آرسین لوپن اور اُسکے رفیق ..... کا سارا حال معلوم ہوگیا۔"

شیرز نے اخبار کے سات پرچے نکالے اور ہر ایک کا آخری صفحہ کھولکر میز پر پھیلایا۔ اور حسب ذیل سطور کا انتخاب پیش کیا۔

۱۔ آرس۔ لوپ۔ خاتون۔ الت۔ بچالو ۵۴۰ یعنے (آرسین لوپن سے خاتون التجا کرتی ہے کہ اُسے بچالے۔ ۵۴۰)

۲۔ ۵۴۰۔ تشر۔ کا۔ منتظر۔ ا... ل (۵۴۰ تشریح کا منتظر۔ آرسین لوپن)

۳۔ ا... ل۔ دشمن... کے... حلق... ہیں۔ مجبور (اے آرسین لوپن میں دشمن کے حلقہ میں مجبور رہوں)

۴۔ ۵۴۰ ... پتہ ... میں... کر لونگا۔ تحق (۵۴۰ کا پتہ لکھو میں تحقیق کر لونگا)

۵۔ ا... ل... موریلو (اے آرسین لوپن محلہ موریلو)

۶۔ ۵۴۰۔ باغیچہ میں... ۳ بجے... بنفش (۵۴۰ باغیچہ میں ۳ بجے

درخت بنفشہ کے نیچے انتظار کریگا)

۷۔ ۲۳/۷۔ طے شدہ شنب ... باغ ... ضرور ... صبح یکشنب

(۲۳/۷۔ تو بس شنبہ کو طے ہوگیا باغ میں ضرور ملنا یعنے صبح یکشنبہ کو)

" واہ حضرت، خوب۔ آپ اس کو مشرح قصّہ بناتے ہیں"

ایم ڈی ایبلولی نے کہا۔

"یقیناً۔ بلاشک اور اگر آپ بھی غور سے کام لینگے۔ تو آپ کو بھی معلوم ہو جائیگا کہ سب سے پہلے ایک خاتون جسکے دستخط کا اشارہ ہندسہ ۵۴۰ ہے۔ آرسین لوپن سے حفاظت کی درخواست کرتی ہے۔ اس پر لوپن تفصیل کے لئے لکھتا ہے خاتون جواب دیتی ہے۔ کہ وہ دشمن کے حلقہ میں مجبور ہے اور وہ دشمن کون۔ وہی بریسن، اور اب اگر اُس کی (خاتون کی) کسی نے مدد نہ کی۔ تو وہ یقیناً برباد ہو جائیگی لیکن لوپن کو ہنوز شک ہے۔ اور وہ یکدم کسی اجنبی سے ملاقات کرتے ہوئے جھجکتا ہے۔ اس لئے وہ پتہ دریافت کرتا ہے۔ تاکہ اُس کی تحقیقات کرے۔ خاتون چار دن تک پس و پیش کرتی ہے۔ تاریخ ملاحظہ کیجئے۔ اخبار کی تاریخوں میں ۴ دن کا فرق ہے۔ آخرکار پریشان کن واقعات اور بریسن کے دباؤ کے زیر اثر مجبور ہو کر وہ اپنے کوچہ کا پتہ دیتی ہے۔ رومریلو۔ دوسرے آرسین لوپن جواب دیتا ہے۔ کہ وہ ۳ بجے باغیچہ مانشو میں ہوگا۔ اب اجنبی کاتب کا جواب ہے۔ کہ وہ حسب تحریر باغیچہ میں موجود ہوگی اور نشان کے طور پر گلہائے بنفشہ سینے پر لگا لیگی۔ یا درخت کے نیچے کھڑی ہوگی۔ یہانتک خط و کتابت ہونے کے بعد آٹھ روز کا وقفہ ہے۔ اب آرسین لوپن یا خاتون کو اخبار کے ذریعہ لکھنے کی کوئی ضرورت نہیں رہی۔ بلکہ براہ راست ملاقات اور رقعوں سے گفتگو ہونے لگی۔

اب سازش شروع ہوگئی۔ کہ بریسن کی خواہشات کو پورا کرنے کے لئے خاتون جیوش لیمپ چرا لے جائیگی۔ دن مقرر کرنا رہ گیا۔ وہ خاتون جو الفاظ کو کاٹ اور جوڑ کر خط و کتابت کرتی ہے۔ شنبہ کا دن مقرر کرتی ہے۔ اور لکھتی ہے کہ جواب ایکو ۲۳/۷ پر بھیجو۔ لوپن جواب دیتا ہے۔ کہ شنبہ کا دن طے شدہ ہے اور وہ اتوار کی صبح کو پارک میں ہوگا۔ چنانچہ اتوار کی صبح کو چوری واقع ہوئی۔"

"ہاں پھر تو ہر ایک بات درست معلوم ہوتی ہے۔" بیرن نے تصدیق کے طور پر کہا۔ "اور قصّہ بھی مکمل معلوم ہوتا ہے۔"

شیرز نے اپنا سلسلہ تقریر جاری رکھتے ہوئے کہا۔

"چوری اس طرح ہوئی کہ خاتون اتوار کی صبح کو مع جیوش لیمپ کے باہر جاتی ہے۔ اور لوپن سے کل حال بیان کرتی ہے کہ اُس نے کیا کیا۔ وہی خود لیمپ کو بریسن کے پاس لے جاتی ہے۔ اس کے بعد جس طرح لوپن نے پیش بینی کے طور پر چند نشانات چوری کے بنا دئے تھے۔ پولیس کھلی کھڑکی پاکر فوراً دھوکا کھا گئی۔ چار سوراخ زمین پر اور دو نشانات پیل پائے پر۔ لیجئے نقب زنی کی واردات تسلیم ہوگئی اور خاتون کے پریشان دل کو اطمینان

حاصل ہو گیا۔"

"بہت خوب" بیرن نے کہا۔" میں اس تفصیل کو بہمہ وجوہ صحیح تسلیم کئے لیتا ہوں۔ لیکن پھر اس کے بعد وہ دوسری چوری۔۔۔۔"

"دوسری چوری پہلی کا نتیجہ تھی۔ اخباروں کے بیانات شائع ہونے پر کہ جیوش لیمپ کس طرح چوری گیا۔ کسی نے خیال کیا۔ کہ چلو جو کچھ رہ گیا ہے۔ اُس پر بھی ہاتھ صاف کر لو چنانچہ یہ مصنوعی نہیں۔ بلکہ اصلی چوری تھی۔ کھُلی نقب زنی سیڑھی وغیرہ سب"

"مگر کیا وہی لوپن"

"جی نہیں، لوپن کبھی ایسے بیوقوفی کے کام نہیں کرتا اور نہ کسی پر کافی وجوہ کے بغیر فیر کرتا ہے۔"

"پھر یہ کون تھا۔"

"بلاشک وشبہ وہی بریسن جو اس خاتون کی لاعلمی سے فایدہ اُٹھانا چاہتا تھا۔ یہ خود بریسن تھا۔ جو یہاں اندر گھُسا۔ جس کا میں نے اور میرے دوست ولسن نے تعاقب کیا۔ اور جس نے بعد ازاں ولسن کو زخمی کر دیا۔"

"کیا آپ کو کامل یقین ہے۔"

"پورے طور پر بریسن کے ساتھیوں میں سے ایک نے اس کو قبل خودکشی کے ایک خط لکھا ہے۔ جو یہ ظاہر کرتا ہے کہ لوپن اور اس کا ایک رفیق آپ کے مکان کی کل گمشدہ اشیا اس کے (بریسن کے) پاس سے واپس لینے کی تدابیر کر رہے ہیں۔ لوپن نے ہر چیز کا تقاضا کیا تھا۔ یعنے جیوش لیمپ اور وہ تمام چیزیں جو دوسری مرتبہ چوری گئیں۔ بریسن کی طرف سے لیت ولعل ہونے پر، لوپن نے اس کی نگرانی شروع کر دی۔ گزشتہ شام کو جب بریسن دریائے سین کے کنارے گیا۔ تو لوپن کا ایک ہمراہی بھی ہم لوگوں کی طرح اس کے تعاقب میں لگا ہوا تھا۔"

"دریائے سین کے کنارے بریسن کا کیا کام"

"میری کامیاب تفتیش کی اطلاع پا کر"

"اطلاع کس نے دی۔"

"اُسی خاتون نے جس کا یہ خیال بالکل صحیح تھا۔ کہ اگر جیوش لیمپ اس صورت سے مل گیا تو اُس کے بھی تمام مخفی حالات ظاہر ہو جائینگے۔ اس لئے بریسن نے اطلاع پاتے ہی اُن تمام اشیاء کو جو اُس کی گرفتاری کا باعث ہو سکتی تھیں ایک پارسل میں باندھ کر دریا میں ایسی جگہ ڈال دیا۔ جہاں سے وہ خطرہ گزر جانے کے بعد بآسانی نکال سکے۔ اُس کے واپس ہونے پر جب میں اور گینمارڈ اس کے مکان تک پہنچ گئے۔ تو اُس نے اپنے گزشتہ افعال کی سزا کا خیال کر کے خود ہی خودکشی کر لی۔"

"لیکن اُس پارسل میں کیا تھا۔"

"جیوش لیمپ اور آپکی دیگر اشیاء مسروقہ۔"

"اچھا۔ تو کیا وہ پارسل آپ کے قبضہ میں نہیں ہے؟"

لوپن کے غائب ہونے کے بعد ہی میں نے غسل کرنے کا اچھا موقع پایا۔ چنانچہ ٹھیک اُسی مقام پر جس کو بریسن نے منتخب کیا تھا۔ میں نے اپنا بدن دھویا اور وہیں پانی کے اندر آپ کی تمام گمشدہ چیزیں ایک موم جامے میں لپٹی ہوئی مل گئیں۔ دیکھئے وہ پلندہ میز پر رکھا ہے۔"

اس کا کوئی جواب دئے بغیر بیرن نے پارسل کے تاگے کو کاٹا۔ ریشمی نم کپڑے کو چاک کیا۔ لیمپ کو باہر نکالا۔ اور ایک کھٹکے کو دبا کر لیمپ کو پیر سے پکڑ کر دونوں ہاتھوں پر زور دیا۔ لیمپ فوراً دو برابر حصّوں میں درمیان سے علیحدہ ہوگیا اور بیرن کیا دیکھتا ہے کہ وہ جواہرات سے مرصع زیور بجنسہ بحفاظت تمام موجود ہے۔

(۴)

اس تمام منظر میں جو ظاہرا بالکل قدرتی اور معمولی واقعات پر مبنی تھا۔ کوئی ایسی بات بھی تھی جس نے اس کو ایک دردناک صورت بھی دے رکھی تھی۔ ایک طرف تو شیرز کے وہ مدلل باضابطہ اور ناقابل تردید دعاوی کی بھرمار۔ جن کا مقصد میڈموازل کو ملزم بنانا تھا۔ اور دوسری طرف الائس ڈیمن کی ناقابل شکست خاموشی۔

ان لانبے چوڑے اور شدید الزامات کو سُنکر بھی اس کے چہرہ پر ایک شکن تک نہ آئی۔ اور نہ اس کے خوبصورت چہرہ پر کسی قسم کے خوف و پریشانی کے آثار نمایاں ہوتے۔ خدا معلوم وہ کیا غور کر رہی تھی؟ سوال تو یہ تھا کہ وہ اسوقت کیا کریگی۔ جب اُس کے لئے جواب دینا ضروری ہوگا۔ تاکہ وہ اپنے آپ کو بچاتے۔ اور اُس آہنی حلقہ کو توڑنے کی کوشش کرے۔ جس کو انگریز جاسوس نے اُس کے گرد ایسی برجستگی سے آویزاں کر دیا تھا۔

وہ وقت بھی آگیا۔ مگر دوشیزہ خوش تھی۔

"بولو۔ بولو" ایم ڈی ایمبلولی نے چلا کر کہا۔

وہ بدستور خاموش رہی۔

بیرن نے پھر اصرار کیا۔

"محض ایک لفظ سے تمہاری صفائی ہوجائیگی بس انکار کا ایک لفظ اور میں تم پر اعتبار کر لونگا۔"

مگر دوشیزہ نے وہ لفظ نہیں کہا۔

بیرن تیزی سے کمرہ کے اندر ٹہلنے لگا۔ دو تین مرتبہ اِدھر سے اُدھر چکر لگا کر وہ شیرز سے یوں مخاطب ہوا۔

"نہیں نہیں..... اچھا جناب۔ میں اس الزام کو سچ سمجھنے سے قاصر ہوں۔ یہ ایک ایسی بات ہے جو سراسر غیر ممکن ہے اور اس سے میری معلومات اور اس پر جو میں نے ایک سال کے عرصہ میں اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔ ایک مخالفانہ اثر پڑتا ہے۔" اور یکدم اُس نے اپنا ہاتھ انگریز جاسوس کے شانہ پر رکھ دیا۔ "لیکن کیا جناب آپ کو اپنی ذات پر پورا

اعتماد ہے۔ کہ آپ غلطی نہیں کر رہے ہیں۔"

مثل اُن اشخاص کے جن پر بے خبری کے عالم میں حملہ کیا جائے۔ اور وہ یکدم اپنے کو اُس حملہ سے محفوظ نہ رکھ سکیں شیرز نے پس و پیش کیا۔ بہر حال وہ مسکرایا اور یوں کہنے لگا۔

"میں ضمنی طور پر کہہ سکتا ہوں کہ جس کو میں نے ملزم قرار دیا ہے۔ اور جو آپ کے مکان میں ایک خاص جگہ پر مقرر ہے سوائے اس کے اور کسی کو ہرگز اس کا علم نہیں ہو سکتا تھا۔ کہ جیوش لیمپ کے اندر جواہرات ہیں۔"

"میں اس پر یقین کرنے سے انکار کرتا ہوں ۔" بیرن نے کہا۔

"اُس سے خود دریافت کیجئے۔"

بس ایک یہی بات رہ گئی تھی۔ جس کو اُس نے دوشیزہ پر اعتبار کرنے کی وجہ سے نہیں پوچھا تھا لیکن اب مزید شہادت کی موجودگی میں انکار کرنے کی گنجائش ہی نہ رہی۔

وہ دوشیزہ کے پاس گیا اور اس سے نگاہیں چار ہوتے ہی دریافت کیا۔

"میڈموازل۔ کیا واقعی تم ہی تھیں۔ کیا تم ہی نے جیوش لیمپ چرایا۔ تم ہی نے آرسین لوپن سے خط و کتابت کر کے اس چوری کا ارتکاب کیا۔"

اس نے جواب دیا۔

"جی ہاں حضور"

اور معاً اُس نے اپنا سر جھکا لیا۔ اُس کے چہرہ پر نہ شرم کے آثار نمایاں ہوئے۔ اور نہ پریشان نظر آئی۔

"اوہو کیا یہ ممکنات سے ہے۔" ایم ڈی ایمبلولی نے کانپتی ہوئی آواز سے کہا۔ "میں حشر تک یقین نہ کرتا تم آخری شخص ہوتیں۔ جس پر میں شبہ کر سکتا۔ اف۔ بدقسمت لڑکی.... تم نے اس کو کس طرح انجام تک پہنچایا۔"

اُس نے کہا۔

میں نے اُس کو مسٹر شیرز کے بیان کے مطابق انجام دیا۔ شنبہ کی شب کو میں خاص کمرہ میں داخل ہوئی۔ لیمپ چرایا اور صبح.... اس آدمی کے پاس لے گئی۔

"ہرگز نہیں۔" بیرن نے تعریض کے طور پر کہا۔ "جو کچھ تم کہتی ہو۔ غیر ممکن ہے۔"

"غیر ممکن!.... یہ کیوں۔"

"اس لئے کہ میں نے صبح کو خاص کمرہ کا دروازہ مقفل پایا تھا۔"

دوشیزہ کا چہرہ متغیر ہو گیا اور اُس نے شیرز کی طرف ایسی نگاہ سے دیکھا۔ گویا وہ اس سے کسی مشورہ کی خواستگار ہے۔ انگریز جاسوس بیرن کے اعتراض سے زیادہ الاتس کی اس گھبراہٹ سے متوحش ہو گیا۔ کیا اُس کے پاس اس کا کوئی جواب نہیں...... ہائیں کیا اس اقرار میں غلط بیانی پوشیدہ ہے۔ جس سے شیرز کے ظاہر کردہ بیانات کو جو اُس

نے جیوش لیمپ کی چوری کی بابت دِ تے تھے۔ کسی قدر صدمہ پہنچتا تھا۔ مگر اب غور کرنے سے معلوم ہوتا تھا کہ ضرور کوئی بات ہے۔

بیرن نے یوں سلسلہ کلام جاری رکھا۔

"میں پھر کہتا ہوں کہ دروازہ مقفل تھا میں کامل وثوق کے ساتھ کہہ سکتا ہوں۔ کہ اُس کی چٹخنیاں مجھے بالکل اُسی حالت میں ملیں۔ جس طرح میں نے شب کو نہیں بند کیا تھا اب اگر تم اپنے اقرار کے مطابق اسی راستہ سے آئیں۔ تو ضرور کسی نے اندر سے تمہارے لئے دروازہ کھولا۔ یعنے یا تو کمرہ خاص سے یا ہماری خوابگاہ سے۔ اور ان دونوں کمروں میں سوائے میرے اور میری بیوی کے اور کوئی غیر شخص نہیں تھا۔"

شیبرز نے فوراً اپنی گردن نیچی کر کے اپنا چہرہ دونوں ہاتھوں سے چھپا لیا۔ وہ فرط ندامت سے سرخ ہوگیا تھا کسی ایسے اثر نے جو آناً فاناً آنے والی روشنی کے مشابہ ہو اسے بوکھلا دیا۔ اور یہی نہیں بلکہ ایسے راحت افزا موقعہ پر جبکہ وہ اپنے خیال کے مطابق ملزم کو دریافت کر چکا تھا۔ اُسے پژمردہ و پریشان بنا دیا۔ اب اس معاملہ کا ہر پہلو ایسا نظر آ رہا تھا جس سے حسرت و نا امیدی کی جھلک عیاں ہونے لگی ہو۔

الائس ڈیمن بیگناہ تھی۔

الائس ڈیمن بے قصور تھی۔ یہ ایک لاریب و یقینی واقعہ تھا۔ اس خیال نے آتے ہی اُن تمام پریشانیوں کو آنکھوں کے سامنے پیش کر دیا۔ جو اسے اس دوشیزہ کے خلاف الزام لگانے میں روز اول ہی سے محسوس ہوئی تھیں اُسے اب صاف نظر آ رہا تھا۔ وہ سمجھ رہا تھا کہ بس صرف ایک ذرا سی کسر باقی تھی۔ وہ بھی عمل میں آگئی۔ اور اصل ملزم کا حال کھل گیا۔

اُس نے اپنا سر اُٹھایا۔ اور چند سکنڈ تک حتی الامکان اپنے فطری انداز سے اُس نے میڈم ڈی ایسلولی کی طرف دیکھا۔ وہ زردی جو ہر فانی انسان کے چہرہ پر شمع حیات گل ہونے کی آخری ساعتوں میں چھا جاتی ہے۔ اس وقت میڈم ڈی ایسلولی کے خوبصورت چہرہ پر عیاں تھی۔ اس کے ہاتھ جن کو وہ بہت کچھ قابو میں لانے کی کوشش کر رہی تھی۔ نمایاں طور پر کانپ رہے تھے۔

"بس ایک دو سکنڈ اور" شیبرز نے اپنے دل میں کہا۔ "وہ خود حقیقت کا اعتراف کر دیگی"۔

شیبرز یکایک اس کے اور اس کے شوہر کے درمیان حائل ہو کر کھڑا ہوگیا۔ تاکہ اس خوفناک خطرہ کو جو محض اُس کی غلطی و ضد کی وجہ سے ان میاں بیوی میں پیدا ہوگیا تھا۔ خوش اسلوبی سے ٹال دے۔ لیکن بیرن پر نظر پڑتے ہی وہ مارے ہیبت کے کانپنے لگا۔

وہی فوری اثر جس نے اس کو اپنی نوعیت سے محو حیرت

کردیا۔ اب ایم ڈی ایبسلولی پر حاوی تھا۔ وہی خیال اس وقت شوہر کے دماغ میں چکر لگا رہا تھا۔ آہ۔ اب اس نے سمجھا اور دیکھ لیا۔

نہایت دلیری اور بیباکی سے الائس ڈیبن نے اس ہولناک حقیقت کی مخالفت کرنے کی کوشش کی۔

"حضور آپ صحیح فرما رہے ہیں۔ میں نے ذرا غلط بیانی سے کام لیا۔ اب اگر آپ امر واقعہ دریافت کرتے ہیں تو میں اس راستے سے نہیں آئی۔ بلکہ میں بڑے کمرہ اور باغیچہ سے ہوتی ہوئی ایک سیڑھی کی مدد سے اندر داخل ہوئی تھی۔"

یہ صداقت بیانی کی ایک مثال تھی۔ لیکن محض بیکار۔ الفاظ صحت کے ساتھ ادا نہ ہو سکے۔ آواز سے استقلال رخصت ہو چکا۔ افسوس۔ حسین و وفادار دوشیزہ اس سے زیادہ متانت و سنجیدگی برقرار نہ رکھ سکی۔ اس نے اپنا سر وفور حسرت کے ساتھ جھکا لیا۔

خوفناک خاموشی چھا گئی۔ میڈم ڈی ایبسلولی منتظر کھڑی رہی۔ اُس کے چہرہ کا رنگ غم و غصہ سے دگرگوں ہو گیا۔ بیرن اب بھی غلطاں و پیچاں نظر آ رہا تھا۔ وہ ان شہادتوں کی موجودگی میں بھی یقین کرنے سے احتراز کرنا چاہتا تھا۔

آخر کار اُس نے کہا۔

"بولو۔ بولو۔ تم خود بیان کرو!"

"میرے حقیقی ہمدرد مجھے کچھ بھی نہیں کہنا ہے" میڈم نے بہت ہی آہستگی کے ساتھ چہرہ پر انتہائی حزن و ملال کے آثار ظاہر کرتے ہوئے کہا۔

"پھر میڈموازل"

"میڈموازل نے محض محبت و وفاداری کے زیر اثر مجھے بچانے کی کوشش کی۔ اور خود ملزم ہونے کا اعتراف کر لیا۔"

"تم کو بچایا... کس چیز سے.... کس شخص سے۔"

"اُسی کمبخت شخص سے"

"بریسن سے"

"ہاں، اس نے مجھ کو اپنی دھمکیوں سے مرعوب کر لیا۔ محض اتفاق سے میری اور اُس کی ملاقات ایک دوست کے مکان پر ہو گئی۔ اب میں کس طرح اپنی اس دیوانگی کا اعتراف کروں کہ میں نے اُس کی باتیں سننا گوارا کیا۔ اُو ایسی کوئی بات نہیں جسے تم معاف نہ کر سکو۔ لیکن کسی زمانے میں میں نے اس کو دو خطوط لکھے تھے۔ وہ میں ابھی آپ کو دکھاؤں گی۔ بس یہی دھمکی تھی۔ جو وہ مجھ کو بدنام کرنے کے لئے دیتا تھا۔ میں نے اس کو دوبارہ خرید لیا۔ مگر کس طرح۔ آپ جانتے ہیں مجھ پر رحم کیجئے گا۔ میں سخت مصیبت میں تھی۔"

"تم آہ۔ تم پیاری سوزینی۔"

اُس کو مارنے اور جان سے مار ڈالنے کے لئے اُس نے اپنی بند مٹھیوں کو حرکت دی۔ مگر یک بہ یک اُس کے

باز و نیچے ہو گئے۔ اور اُس نے چیخ کر کہا۔

"آہ .... سوزینی .... تم ..... ارے تم ......

کیا یہ ممکن ہے۔"

مختصر اور ٹوٹے پھوٹے جملوں میں اُس نے اپنی دلشکن اور گذری ہوئی داستان بیان کی۔ اس بدمعاش شخص کی ذلت آفریں کوششوں کے مقابلہ میں اپنا خوفناک انجام اپنی ندامت، اپنی دیوانگی اور الاتس ڈاہین کے قابل تعریف سلوک کا حال بھی من وعن بیان کیا۔ کہ کس طرح اس دوشیزہ نے اپنی مالکہ کو مایوسی کا شکار دیکھ کر مجھ سے کل حالات معلوم کئے۔ لوپن کو لکھا۔ جس نے اس معاملہ کو ایک چوری کی واردات کا رنگ دیدیا۔ تاکہ میں بریسن کے پنجوں سے محفوظ ہو جاؤں۔

"افسوس ... صد افسوس ... تم سوزینی .... تم"

ایم ڈی ایمبلولی نے دوبارہ اور زیادہ زور دیکر کہا۔ "آہ تم نے کس طرح .... کیونکہ یہ ......"

(۵)

اسی دن شام کو کیلے سے ڈوور جانے والا جہاز ول ڈی الانڈرس آہستگی کے ساتھ ساکت پانی پر جنباں تھا۔ رات تاریک و پُرسکون تھی۔ جہاز کے اوپر تو کیا ہر چار طرف ہلکے بادل سایہ فگن معلوم ہوتے تھے۔ کہر کی ہلکی اور باریک چادریں جہاز اور اُس حد نظر تک پھیلنے والے منظر کے درمیان حائل تھیں۔ جس کو ماہتاب اور ستاروں کی خنک و فرحت بخش مگر ناقابل محسوس روشنی تابناک بنائے ہوئے تھی۔

مسافروں کی ایک خاص تعداد اپنے اپنے کمروں یا آرامگاہوں کو جا چکی تھی۔ مگر ان میں سے چند جو نسبتاً زیادہ بے فکرے تھے۔ یا تو ادھر اُدھر ڈک پر تفریح میں مشغول تھے یا آرام کرسیوں پر کمبل اوڑھے اُونگھ رہے تھے کبھی اس طرف کبھی اُس طرف سلگتے ہوئے سگار کی چمک نظر آجاتی تھی۔ ہوا کے ہلکے ہلکے جھونکوں کے ساتھ آوازوں کی بھنبھناہٹ رات کی پرسکون خاموشی میں اس طرح سُنائی دیتی تھی۔ گویا بولنے والے خود ہی زور سے بولنا گناہ سمجھتے ہوں۔

انہیں مسافروں میں سے ایک جو اِدھر اُدھر لانبے قدموں سے ٹہل رہا تھا۔ ایک بنچ پر لیٹے ہوئے شخص کے پہلو میں آکر بیٹھ گیا۔ ذرا دیر تک اُس کی طرف غور سے دیکھا اور جونہی اُس نے حرکت کی تو کہنے لگا۔

"مس الاتس۔ میں نے تو یہ خیال کیا تھا کہ تم میٹھی نیند کے مزے لے رہی ہوگی۔"

"نہیں۔ مسٹر شیرز۔ میری آنکھوں میں قطعی نیند نہیں کسی خیال میں غرق لیٹی ہوئی تھی۔"

"خیال .... کس بات کا خیال۔ کیا میں یہ دریافت کر سکتا ہوں۔"

"جی ہاں .... میں میڈم ڈی ایمبلولی کا خیال کر رہی تھی۔ وہ کیسی کچھ رنجیدہ و مغموم ہوگی۔ اس کی زندگی تباہ ہوگئی"

"ذرّہ برابر بھی نہیں ..... قطعی نہیں۔" شیرز نے اشتیاق آمیز لہجہ میں جواب دیا۔ اس کا قصور ایسا سنگین نہیں کہ کبھی معاف ہی نہ کیا جا سکے۔ ایم ڈی ایمبلولی اس غلطی کو بہت جلد فراموش کر دینگے۔ جس وقت میں روانہ ہُوا ہوں۔ اُسی وقت وہ اُس کو زیادہ تیز نگاہوں سے نہیں گھور رہے تھے"

"شاید..... بہرحال فراموش کرنے کے لئے بھی ایک عرصہ دراز چاہیے۔ میڈم کی پریشانی تو جان گھلاتی رہیگی"

"کیا تم کو اس سے اتنی زیادہ محبت ہے۔"

"بہت زیادہ۔ جب میں آپ کے چہرہ پر نظر کر کے مارے خوف کے کانپ رہی تھی۔ اور میں حتی الامکان آپ کی نظر بچانا چاہتی تھی۔ تو یہ اُسی دفورِ محبت کا نتیجہ تھا۔ کہ مجھ میں مُسکرانے کی قوت پیدا ہو گئی تھی"

"اچھا تو کیا تم اُس سے جدا ہونے پر رنجیدہ ہو"

"رنجیدہ اور بغایت رنجیدہ۔ میرا کوئی عزیز دوست نہیں۔ مجھے صرف اسی سے ....."

"تمہیں بہت سے دوست مِل جائینگے" انگریز جاسوس نے کہا۔ جو خود اپنے دل میں اپنی حماقت پر غمگین تھا۔ "میں تم سے وعدہ کرتا ہوں کہ میرے تعلقات معمولی نہیں۔ میں بہت ہی زیادہ اثر و رسوخ رکھتا ہوں اور میں تمہیں یقین دلانا چاہتا ہوں کہ تم اپنی یہ آسامی کھونے پر کبھی افسوس نہ کرو گی"

"ہاں، شاید..... لیکن وہاں میڈم ڈی ایمبلولی تو نہ ہو گی"

اس سے زیادہ کوئی گفتگو نہیں ہُوئی۔ ہملاک شیرز نے دو یا تین چکّر اور لگائے۔ اور پھر لوٹ کر اپنے ہمراہی کے قریب آرام کرسی پر لیٹ گیا۔ کہر کا پردہ چاک ہو گیا۔ بادل آسمان سے ہٹتے ہُوئے نظر آئے۔ ستارے یکے بعد دیگرے رونما ہونے لگے۔ چاند کی روشنی فرحت پہنچانے لگی۔

(۶)

شیرز نے اپنی جیب سے پائپ نکالکر بھرا..... اور یکے بعد دیگرے چار دیا سلائیاں جلائیں۔ مگر پھر بھی اُسے سلگانے میں ناکامیاب رہا۔ جب اُسکے پاس ایک بھی دیا سلائی نہ رہی۔ تو وہ اُٹھا۔ اور اپنے قریب چند قدم کے فاصلہ پر بیٹھے ہُوئے ایک معزز شخص سے کہا۔

"حضرت۔ کیا آپ براہ عنایت ایک دیا سلائی مرحمت فرمائیں گے"

اس شخص نے فوراً ڈبیا کھولکر ایک دیا سلائی جلائی۔ ایک شعلہ اُٹھا۔ اور روشنی میں شیرز کیا دیکھتا ہے کہ آرسین لوپن بیٹھا ہُوا ہے۔

اگر انگریز جاسوس ایک ناقابل محسوس طریق پر نہ چونک پڑتا تو شاید لوپن یہی خیال کرتا کہ جہاز پر اُس کی موجودگی کا علم شیرز کو ہے۔ مگر شیرز نے اس موقع پر انتہائی ضبط و خودداری سے کام لیا۔ اور کسی استعجاب و حیرت کا اظہار کئے بغیر

اس کی طرف بڑھ کر ہاتھ ہلایا۔

"اہا کہیئے لوپن صاحب۔ مزاج شریف"

"مرحبا" لوپن اپنے جذبہ تعریف کو نہ روک سکا اور چلا کر کہا۔

"ایں .... یہ مرحبا .... کس بات پر"

"کس بات پر .... حضرت دریائے سین میں بہری غرقابی کا مشاہدہ کرنے کے بعد آپ مجھ کو دوبارہ اپنے روبرو موجود پاتے ہیں۔ لیکن واہ ری آپ کا معجز نما ضبطِ نفس جو واقعی انگریزی باشندوں ہی کے لئے مخصوص ہے۔ آپ ذرا بھی متعجب نہیں ہوئے۔ آپ کی زبان سے ایک بھی کلمہ حیرت نہ نکلا۔ مَیں پھر ایک بار اعادہ کرتا ہوں۔ مرحبا۔ صد آفرین .... واللہ قابل تحسین ...."

"یہ تحسین و آفرین سب فضول ہے۔ جب تم کشتی سے گرے ہو۔ تو مَیں نے دیکھ لیا تھا۔ کہ عمداً گرے ہو۔ سارجنٹ کی گولی تمہارے نہیں لگی تھی۔"

"اور کیا آپ بلا اس کی جانچ کئے۔ کہ آخر میرا کیا حشر ہوا۔ چلے گئے تھے۔"

"تمہارا کیا حشر ہوا .... مَیں سمجھتا تھا کہ تقریباً پانچ سو آدمی ساحل پر پون میل تک پھیلے ہوتے دونوں کناروں کی حفاظت کر رہے تھے۔ اگر تم موت کے پنجہ سے نجات پا جاتے تو تمہاری گرفتاری لابدی تھی۔"

"تاہم میں یہاں موجود ہوں۔"

"ایم لوپن، اس دنیا میں صرف دو ہستیاں ایسی ہیں۔ جن کے کسی فعل پر مجھے حیرت نہیں ہو سکتی ... اول تو اینجانب دوسرے آنجناب" دونوں حریفوں میں مصالحت ہو گئی۔

(۷)

اگر شیر زآرسین لوپن کے خلاف کارروائیوں میں ناکامیاب رہا۔ یا لوپن اُس کا خاص دشمن جس کی گرفتاری کے لئے اُس نے اسقدر کوشش کی، ہنوز آزاد رہا۔ یہ سب باتیں بالکل اہم نہ تھیں۔ اگر اس تمام معرکہ میں سہرا لوپن کے سر رہا۔ پھر بھی انگریز جاسوس اپنی اہم ترین کوششوں کا معترف تھا جن کے زیرِ اثر اُس نے جیوش لیمپ کو بھی بالکل اسی طرح پالیا۔ جس طرح نیلگوں ہیرے کو حاصل کیا تھا .... ہاں اس مرتبہ نتیجہ زیادہ شاندار نہ تھا۔ خاصکر عوام کے نقطۂ نگاہ سے کیونکہ معاملہ کا انکشاف ہوتے ہی شیر ز اس راز کو پوشیدہ رکھنے کا کوشاں تھا۔ کہ جیوش لیمپ کس نے چرایا۔ اور وہ کس طرح حاصل ہوا۔ اور ساتھ ہی ساتھ وہ اصل ملزم کا نام بھی ظاہر نہیں کرنا چاہتا تھا۔ لیکن لوپن اور شیر ز یعنی چور اور جاسوس کے درمیان یہ معمولی باتیں تھیں۔ نہ وہاں کامیابی کا خیال نہ شکست کا۔ ان میں سے ہر ایک مساوی کامیابی کے لئے اظہار خوشی کر سکتا تھا۔

چنانچہ یہ دونوں با اخلاق دشمنوں کی طرح جنھوں نے

اپنے ہتھیاروں کو علیحدہ رکھ دیا ہو۔ اور جو ایک دوسرے کو سچی قابلیت کی داد دے رہے ہوں۔ باہم گفتگو کر رہے تھے۔

شیرز کی التجا پر لوپن نے اپنے بچنے کی داستان بیان کی.....

اُس نے کہا۔ "اگر در حقیقت" آپ اس کو کچھ اہم سمجھتے ہوں۔ تو میں کہہ سکتا ہوں۔ کہ یہ محض بچوں کا کھیل تھا۔ میرے رفقاء اسی وقت سے جبکہ ہم نے جیوش لیمپ کو تلاش کرنے کا تہیہ کیا تھا۔ میری نگہبانی پر تھے۔ چنانچہ کشتی کے اُلٹنے کے بعد تقریباً آدھ گھنٹہ تک میں اس کے اُلٹے ہوئے پیندے کے نیچے پڑا رہا۔ اسی اثناء میں فالنفانٹ اور اُس کے ہمراہی کنارے پر میری لاش کی جستجو میں تھے۔ میں دوبارہ کشتی پر چڑھ آیا۔ اور میرے دوستوں نے سب کے سامنے پھرتی سے مجھے اپنی تیز رو کشتی میں سوار کر لیا اور پانچسو آدمیوں گینمارڈ اور فالنفانٹ کی حیران آنکھوں میں خاک جھونک کر لے گئے۔

"سبحان اللہ" شیرز بولا۔ "بہترین کامیابی...

اچھا تو کیا اب انگلستان کا عزم ہے۔"

"ہاں چند حسابات طے کرنا ہیں۔ لیکن میں بھولا جاتا ہوں۔ ایم ڈی ایمبلولی"

"اُسے سب معلوم ہو گیا۔"

"افسوس میرے پیارے دوست۔ میں نے آپ سے کیا کہا تھا؟ اب نقصان ہو گیا۔ جس کی تلافی غیر ممکن ہے۔ کیا یہ بہتر نہ ہوتا کہ آپ مجھ کو میری مرضی کے مطابق کام کرنے دیتے۔ ایک یا دو دن کے بعد میں خود جیوش لیمپ اور دیگر اشیاء برین سے حاصل کر لیتا اور اُنہیں ڈی ایمبلولی کے پاس روانہ کر دیتا۔ اور وہ دونوں میاں بیوی اطمینان سے باہمی زندگی بسر کرتے رہتے۔ جس کی بجائے...."

"جس کی بجائے" شیرز نے کہا۔ "میں نے ہر چیز غتر بود کر دی اور ایک خاندان میں جس کی آپ حفاظت کر رہے تھے۔ ناموافقت پھیلا دی۔"

"خوب، ہاں، کیا آپ ہی حفاظت کرنا جانتے ہیں! کیا یہ ناممکن ہے کہ مجھ سا شخص ہمیشہ چوری کرے فریب دے۔ اور نقصان پہنچائے؟"

"اچھا تو کیا تم نیکی بھی کرتے ہو؟"

"ہاں جب مجھے وقت ملتا ہے۔ علاوہ ازیں اس سے مجھے خوشی بھی حاصل ہوتی ہے۔ میں اس کو نہایت اچھا مذاق سمجھتا ہوں کہ ہر معرکہ آرائی میں بہتر شخص ثابت ہوں۔ چنانچہ اس معاملہ میں میں نیکی و حفاظت کر رہا تھا۔ اور آپ وہ شخص ہیں جس نے دو ہستیوں میں بدمزگی و ناموافقت پھیلا دی۔"

"بدمزگی! بدمزگی!" انگریزی جاسوس نے کہا۔

" بیشک! ڈی ایبلولی کے گھر میں ماتم برپا کر دیا اور الائس ڈیمین رو رہی ہے۔"

" وہ بچ نہیں سکتی تھی۔ گینمارڈ اس کو تلاش کر کے چھوڑتا..... اور اُس کے ذریعہ سے انہیں بھی میڈم ڈی ایبلولی کا راز معلوم ہو جاتا۔"

" عزیز دوست اس پر میرا بھی صاد ہے۔ لیکن یہ قصور کس کا تھا؟"

اُن کے سامنے سے دو آدمی گزرے۔ شیرز نے لوپن سے ایک ایسی آواز میں جس کا لہجہ کچھ بدلا سا معلوم ہوتا تھا کہا!

" کیا آپ جانتے ہیں۔ کہ وہ دونوں اصحاب کون ہیں؟"

" مَیں خیال کرتا ہوں کہ یہ کسی جہاز کا کپتان تھا۔"

" اور دوسرا"

" مَیں نہیں جانتا"

" یہ مسٹر آسٹین گلٹ ہیں۔ جو انگلستان میں ایک ایسے عہدے پر فائز ہیں۔ جو آپ کے ایم ڈوڈوائیس کے مقابلہ کا ہے۔"

" اہا۔ کیسا خوش قسمت ہے! کیا آپ مہربانی کر کے اس سے میرا تعارف کرادینگے؟ ایم ڈوائیں میرا بہت بڑا دوست ہے۔ اور مجھے غایت درجہ خوشی حاصل ہوگی کہ مَیں مسٹر آسٹین گلٹ کو بھی انہیں الفاظ سے یاد کروں۔"

وہ دونوں اصحاب پھر دکھائی دئے۔

" اور فرض کیجئے کہ مَیں ذرا دیر کے لئے آپ کو اسی وقت گرفتار کر لوں.....؟ شیرز نے اُٹھتے ہوئے کہا۔

اُس نے آرسین لوپن کی کلائی نہایت مضبوطی سے پکڑ لی۔

" آپ اسقدر سختی سے کیوں پکڑتے ہیں۔ مَیں آپ کے ساتھ چلنے کے لئے بالکل تیار ہوں۔"

اُس نے بلا کسی مزاحمت کے ساتھ چلنا منظور کر لیا۔ وہ دونوں اصحاب اُن کے سامنے سے دُور ہوتے جا رہے تھے۔

شیرز نے اپنا قدم بڑھایا۔ اُس کے ناخن لوپن کے گوشت میں گھس رہے تھے۔

" آیئے، آیئے، اُس نے ہمدردانہ لہجہ میں کہا۔ گویا ہر چیز کو جسقدر جلد ممکن ہو سکتا تھا طے کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔" تشریف لایئے! جلدی کیجئے!"

لیکن وہ رُک گیا۔ الائس ڈیمین اُن کے پیچھے آ رہی تھی۔

" تم کیا کر رہی ہو۔ میڈموازل، تم کو اس تکلیف گوارا کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے!"

یہ لوپن تھا جس نے جواب دیا۔

" مَیں آپ سے غور کرنے کی التجا کرتا ہوں۔ کہ میڈموازل

اپنی خواہش سے نہیں آرہی ہے۔ میں اس کی کلائی اتنی ہی
سختی سے پکڑے ہوں جتنی کہ آپ میری"

"یہ کیوں؟"

"کیوں؟ جناب میں اُس کو بھی لیجانا چاہتا ہوں۔ اس
لئے کہ جیوش لیمپ کے معاملہ میں اس کا عمل مجھ سے بھی زیادہ
اہم ہے..... آرسین لوپن کی شریک اور بیرن سے ملی ہوئی
وہ خود بھی ضرور بیرن ڈی ایمبلولی کے واقعات بیان
کریگی۔ جو یقین ہے کہ پولیس کے لئے بہت زیادہ دلچسپی کا
باعث ہوگا۔ اور اس طرح سے آپ اپنی مداخلت کا اظہار
کر دینگے۔ میرے مہربان شیرز!"

چند سکنڈ تک وہ بلا حرکت کھڑے ایک دوسرے
کو تکتے رہے۔ اس کے بعد شیرز واپس جاکر اپنی بنچ پر بیٹھ گیا
لوپن اور دوشیزہ اپنی اپنی جگہوں پہ چلے گئے....

(۸)

ایک طویل خاموشی دیر تک حائل رہی۔ اس کے
بعد لوپن کہنے لگا۔

میرے دوست... آپ نے دیکھ لیا۔ کہ ہم خواہ کچھ
بھی کریں۔ بہرحال ہمارے راستے ہمیشہ جداگانہ رہیں گے۔
آپ اگر غار کے اِس جانب ہونگے، تو بندہ اُس جانب....
ہم خم ہوکر ہاتھ ملالیں..... دو چار لمحوں کی گفتگو بھی کرلیں۔
مگر وہ خلیج بدستور قائم رہیگی۔ آپ ہمیشہ بلا شک شیرز مشہور
جاسوس رہیں گے۔ اور بندہ وہی شریف چور آرسین لوپن
آپ بلا شک شیرز ہمیشہ اُسی قابلیت...... کم و بیش
مستعدی کے ساتھ اپنی جاسوسانہ روش کی تقلید میں اُس
چور کو پکڑ لینے اور گرفتار کرنے کی کوشش کرینگے.... اور
آرسین لوپن ایک چور کی حیثیت میں نہایت سرگرمی کے
ساتھ یہ کوشش کرے کہ وار خالی جائے۔ اور وہ مشہور
جاسوس کا بحدِّ امکان مضحکہ اُڑائے...... چنانچہ آج
یہی موقع ہے.... ہا.... ہا..... ہا..... آہا...."

اُس نے عیارانہ طریق پر بیحد سخت اور نمائشی قہقہہ لگایا۔
اس کے بعد یکدم سنجیدگی اختیار کر کے وہ دوشیزہ کی طرف
متوجہ ہوگیا۔

"میڈموازل... یقین کرو........ کہ انتہا
تک میں نے تمہارے معاملہ کو ظاہر نہیں کیا۔ آرسین لوپن
کبھی دغابازی نہیں کرتا...... اور خصوصاً ان کے ساتھ
جن سے اُسے محبت اور ہمدردی ہے۔ اور مجھے
اجازت دو۔ کہ میں صاف الفاظ میں تم پر واضح کردوں۔
کہ میں تمہاری غمزدہ..... دلکش ہنسی کی قدر کرتا
ہوں..."

اُس نے ایک ملاقاتی کارڈ اپنی جیب سے نکالا اور
اُس کے وسط سے دو ٹکڑے کر کے آدھا دوشیزہ کے حوالے
کر کے نہایت ہی مؤثر و بااخلاق لہجہ میں کہنے لگا۔

"مبڈموازل..... اگر مسٹر شیبرز اپنی کارروائیوں میں ناکامیاب رہیں تو براہِ عنایت تم سیدھی میڈم اسٹرانگ بارو کے پاس چلی جانا اُس کا پتہ تم کو بآسانی معلوم ہو سکتا ہے تم اُس کو میری یہ حقیقی یادگار دکھا دینا. .... وہ خاتون تمہارے ساتھ بہن کا برتاؤ کرے گی۔

"مَیں آپ کا شکریہ ادا کرتی ہوں" دوشیزہ نے جواب دیا۔ "مَیں کل اُن کے پاس جاؤنگی۔"

"اچھا اب مشفق من" لوپن نے ایک ایسے شخص کے لہجہ میں جو اپنا فرض ادا کر چکا ہو --- باطمینان کہا۔ "رخصتی آداب بجالانا چاہتے۔ کہر کی وجہ سے بہت رات معلوم ہوتے بغیر گزر گئی تاہم ابھی تھوڑی دیر پلک جھپکانے کا موقعہ ہے۔" انشاء اللہ پھر کبھی نیاز حاصل ہوگا" وہ بازوؤں کا تکیہ بنا کر ایک بنچ پر دراز ہو گیا۔

(۹)

سارا آسمان ماہتاب کی روشنی سے تاباں نظر آ رہا تھا اور اُس کی مصفا روشنی ستاروں کے گرد اور سمندر پر پوری تیزی سے پڑ رہی تھی۔ اُس کا سطحِ آب پر جھلملا جھلملا کر پڑنا خصوصاً اُس جگہ پر جہاں کہ کہر کی آخری لکیریں ایک ایک کر کے جذب ہوتی جاتی تھیں۔ ایک ایسا سماں تھا جس کا لطف اسی وقت کے لئے مخصوص ہے۔

دائرہ افق سے ساحل کا حاشیہ علیحدہ نظر آ رہا تھا۔ مسافروں کی آمد شروع ہو گئی۔ اور ذرا ہی دیر میں جہاز مسافروں سے بھر گیا۔ ...... مسٹر آسٹین گلٹ بھی دو ہمراہیوں کی معیت میں سامنے سے گزرا ...... جس کو دیکھ کر مسٹر شیبرز تاڑ گیا .... کہ یہ لوگ انگریزی خفیہ پولیس کے ممبر ہیں۔

دوسری طرف بنچ پر لوپن مزے سے سو رہا تھا۔

اختلافِ جذبات باتحادِ قوافی

لے دے کے اِک تمہیں تو ہو سرمایۂ حیات　　پُوچھو تمہیں نہ بات تو پھر کیا کرے کوئی

ہادی

مانا کہ بزمِ حسن کے آداب ہیں بہت　　جب دِل پہ اختیار نہ ہو کیا کرے کوئی

عزیز

قیمت سالانہ چھ روپے　　رجسٹرڈ نمبر ایل ۱۴۱۴　　قیمت ششماہی ۳؎ فی پرچہ ۱۰؍

ہزار داستان

آنریری ایڈیٹر:- حکیم احمد شجاع بی۔ اے (علیگ)

ایڈیٹرز:

سیّد عابد علی عابد بی اے　　محمد اسمٰعیل نعیم　　محمد ہادی حسین قریشی صدیقی

جلد ۵　　اشاعت ماہ دسمبر ۱۹۲۴ء　　نمبر ۶

فہرست مضامین

نمبر شمار	مضمون	اثر خامہ	نمبر صفحہ
۱	دریا بہ حباب اندر	ایڈیٹر	۴۰۲
۲	ہیگل کے فلسفۂ فنون لطیفہ کا مقدمہ	محمد ہادی حسین	۴۰۴
۳	گنگا اشنان	جناب ڈاکٹر سید احمد سعید	۴۰۷
۴	وجدانیات	سیّد عابد علی عابد بی۔ اے	۴۰۸
۵	عشرتِ باقی	" "	۴۰۹
۶	غزلیات	جناب اثر صہبائی و احسن علوی	۴۲۱
۷	جمشید	جناب اثر صہبائی	۴۲۲
۸	تخیّلات	جناب صاحبزادہ محمد معراج الدین شامی	۴۴۴
۹	نفسیات اور مومن	جناب خورشید	۴۴۵
۱۰	برقِ بلا	جناب سلیم نیدوردی	۴۴۹
۱۱	محسوساتِ جلیل	جناب جلیل قدوائی	۴۶۳
۱۲	ایک تصویر کو دیکھ کر	عابد	۴۶۴
۱۳	جانِ آرزو	جناب فرحت کانپوری	۴۶۵
۱۴	نوائے راز	جناب ابوالفاضل سید راز چاندپوری	"
۱۵	رودادِ محبت	" "	۴۶۶
۱۶	حقیقتِ حیات	جناب ہادی مچھلی شہری	۴۷۷
۱۷	نقد و نظر	ایڈیٹر	۴۷۸
۱۸	اشتہارات		۴۸۰

[illegible]

دریا بہ حباب اندر

صفحہ ادارت

ہزار داستان اپنے سفر اشاعت کے پانچ مرحلے طے کر چکا ہے، اور ابھی افق کی فریب انگیز رنگینیوں کی طرح منزلِ مقصود اُسے دُور سے جادہ پیمائی کی دعوت دے رہی ہے۔ اس کا فیصلہ مستقبل کریگا۔ کہ "ہزار داستان" نے جس مقصد کو دلیلِ راہ بنایا، اُس کے حصول میں کامیابی کہانتک ممکن ہے۔ فی الحال ہم اس کے گزشتہ دور پر ایک تنقیدی نظر ڈال کر یہ دیکھنا چاہتے ہیں کہ جو راہ اُس نے اختیار کی تھی۔ اُس پر ثبات و استقلال سے گامزن رہا یا نہیں

ہزار داستان کا مقصد ادبِ لطیف کی خدمت کرنا تھا۔ اور اہل الرائے سے یہ حقیقت پوشیدہ نہیں کہ ان دنوں ہماری زبان میں اس صنفِ ادب کے ذوق کو جو فروغ حاصل ہُوا ہے۔ اُس کے اسباب کی جستجو کی جائے۔ تو اُن میں ایک قابلِ قدر حِصّہ اس کی ناچیز کوششوں کا پایا جائے گا۔

ہم اعتراف کرتے ہیں کہ ہم نے اپنے دائرۂ عمل کو تمام متفرقاتِ ادب پر حاوی کرنے کی کوشش نہیں کی۔ بلکہ ایک صنف کو اپنے لئے مخصوص کر لیا۔ لیکن جیسا کہ بعض قدرشناسوں کی منصفانہ رائے ہے۔ اس محدود حلقے میں اُس نے جو خدمات انجام دی ہیں۔ وہ اُس کے لئے کافی سرمایۂ فخر و مباہات ہیں۔ ہماری مُراد افسانے سے ہے۔ یہ ایک ایسی صنفِ ادب ہے جس کا تمغائے امتیاز صرف یہی نہیں کہ قدیم الایّام سے انسانی فطرت کی انتہائی گہرائیوں میں اُس کا رجحان موجود رہا ہے۔ بلکہ اس عروج تہذیب کے زمانے میں بھی وہ اقوام عالم کے ادب کا عنصر غالب ہے۔

افسانہ، ڈرامے کے بعد ادب کا معراج کمال ہے۔ ڈرامے کا عنصر ہزار داستان میں مفقود تو نہیں رہا۔ لیکن افسانے کی بہ نسبت کمزور۔ واقعات کو دیکھتے ہُوئے کہنا پڑتا ہے۔ کہ ہنوز اُردو کی ادبی فضا ڈرامے کی نشو و نما کے مناسب حال نہیں۔ ڈرامہ انسانی جذبات کی شدّتِ تلاطم کا سب سے زیادہ پُر زور اظہار ہے۔ جمہورِ اردو نے اس کا مفہوم سراسر غلط سمجھا ہے۔ وہ محض مقفّٰے مکالموں کا ایک مجموعہ اور مصنوعی جذبات کی غیر فطری نمائش نہیں

جناب اثر صہبائی نے جمشید میں اپنی پرستش حسن کا جس حسین انداز میں اظہار کیا ہے۔ وہ اس افسانے کی اور خوبیوں سے کہیں زیادہ قابلِ تعریف ہے قطری مناظر کی دلکشی اور افسانے کا حسرتناک انجام دونوں مل کر تاثر کے تمام عناصر کو تحریک دینے کا باعث بن گئے ہیں۔ اور اس تقابل کی وجہ سے افسانہ ایک بہترین افسانے کی تمام خوبیوں سے مزین ہو گیا ہے

"نفسیات اور مومن" ایک نہایت قابلِ قدر مضمون ہے۔ اور مضمون نگار کی روشن دماغی اور اصابت رائے کا ایک مکمل ثبوت۔ غالب تو اب اچھی طرح جمہور سے متعارف ہو چکا لیکن ضروری ہے کہ کوئی ہمت کر کے مومن کے کلام پر ایک مکمل اور مفصل تبصرہ سپردِ قلم کرے۔ غالب کے بعد مومن کا جدید اندازِ بیان۔ شوکت الفاظ اور عمق تخیل۔ کچھ کم رتبہ نہیں رکھتا مجھے امید ہے کہ یہ نقش اوّل کتی اور انشا پردازوں کے لئے محرک عمل ثابت ہوگا۔

سراغرسانی کے متعلق عام افسانوں میں یہ نقص بالعموم پایا جاتا ہے کہ "حل طلب عنصر" جسقدر پیچیدہ اور اسی لئے ضروری طور پر جاذب نظر اور دلچسپ ہوتا ہے۔ اسی قدر "انکشاف راز" کی ترتیب و تکمیل میں ناکامیابی ہوتی ہے۔ کیونکہ خوارق عادات واقعات کے حل کو قطعاً فطری اور قابل یقین بنا دینا بہت مشکل ہوتا ہے۔ ایسے افسانوں کا انتہائی نقطۂ عروج یہ ہے کہ واقعات جسقدر حیرت خیز ہوں۔ حل اسی قدر فطری اور سادہ ہو۔

ناظر کا ذہن خوارق عادات واقعات کے حل کے لئے عام پہلوؤں کی طرف کبھی متوجہ نہیں ہوتا۔ اور مصنف کی کوشش بھی یہی ہوتی ہے۔ کہ ناظر کا ذہن صحیح حل کی طرف منتقل نہ ہونے پاتے۔ آرسین لوپن کے افسانے اس بات کو مدِ نظر رکھ کر لکھے گئے ہیں۔ برقِ بلا انہیں افسانوں میں سے ایک افسانے کا ترجمہ ہے۔

عشرتِ باقی محض ایک تخیلی افسانہ ہے۔ روپ متی اور باز بہادر کے رومان کا ذکر محض اسلئے کیا گیا ہے تا کہ رجال قصہ کے امتیازی خصائص کو واضح کیا جا سکے۔ معزالدین اور صلابت یار جنگ اس رومان کے متعلق اپنے اپنے زاویہ نگاہ سے "محبت" کے موضوع پر خیالات کا اظہار کرتے ہیں۔ اور انہیں خیالات کے تقابل سے عشرت باقی کے معانی بین السطور کو نمایاں کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

ایڈیٹر

ہیگل کے فلسفۂ فنونِ لطیفہ

کا

مقدمہ

گذشتہ سے پیوستہ

یہ اور اس قسم کے اور اعتراض جو فنونِ لطیفہ سے ایک خالص علمی بحث کرنے کی نسبت وارد کئے جاتے ہیں۔ ان کا ماخذ جمہور کے افکارِ متداولہ، مختلف زاویہ ہائے نگاہ اور مختلف آرائے عمومیہ ہیں۔ جن کا باضابطہ بیان تسلی بخش طور پر قدما کے ادب میں، بالخصوص اُن فرانسیسی مصنفین کی تحریروں میں جنھوں نے فنونِ لطیفہ کو اپنا موضوعِ کلام بنایا ہے۔ پڑھا جا سکتا ہے۔ ان تحریروں میں آپ کو بعض ایسی باتیں ملینگی جن میں کسی حد تک صداقت کا عنصر موجود ہے۔ اور جن میں آپ ایسے دلائل کی بُنیاد رکھ سکتے ہیں۔ جو کم از کم بادی النظر میں قابلِ قبول ہیں۔ مثال کے طور پر اس امر کو لیجئے۔ کہ حُسن جتنا عام اور عالمگیر ہے۔ اُتنی ہی متفرق صورتوں میں تشکل پذیر ہوتا ہے۔ اب اگر ہم چاہیں تو اس سے یہ نتیجہ نکال سکتے ہیں کہ عام انسانوں کی طبیعت میں حُسن کی طرف ایک جبلی رجحان و میلان ودیعت کیا گیا ہے۔ اور پھر اس سے ہم ایک اور نتیجہ اخذ کر سکتے ہیں۔ وہ یہ ہے کہ چونکہ مختلف لوگوں کے ذہن میں حُسن کے متعلق اس قدر مختلف تصوّر ہیں۔ جن کا کچھ حد و حساب نہیں۔ اس لئے لازم آتا ہے کہ حُسن اور حُسن شناسی کے متعلق کوئی جامع اور کُلّی قوانین وضع نہ کئے جا سکیں

اس سے پیشتر کہ ہم ان مباحث سے توجہ ہٹا کر حقیقت الامر کے متعلق اپنی ذاتی رائے کا اظہار کریں۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ تمہیداً ان سوالات پر روشنی ڈالی جائے۔ جو صنعت سے علمی بحث کرنے پر اُٹھائے جاتے ہیں۔

سب سے پہلے یہ مسئلہ ہمیں دعوتِ حل دیتا ہے۔ کہ صنعت علمی تحقیق و تدقیق کا موضوع بننے کا استحقاق رکھتی ہے یا نہیں۔ اس کے بارے میں سُنئے۔ یہ بیشک درست ہے کہ صنعت دِل بہلاؤ کے طور پر استعمال

کیجا سکتی ہے۔ اُس سے یہ کام لیا جا سکتا ہے۔ کہ اپنے
گرد و پیش کی چیزوں کو آراستہ کیا جائے۔ اور زندگی کے
ظاہری حالات کو دلخوش کن بنایا جائے۔ جب صنعت
اس مصرف میں لائی جائے تو بلاشبہ اس کی حیثیت بجائے خود
کچھ نہیں رہتی۔ بلکہ وہ دوسرے مقاصد کے زیر فرمان ہو کر
رہ جاتی ہے۔ لیکن جاننا چاہیے۔ کہ جس قسم کی صنعت سے
ہم بحث کرنا چاہتے ہیں۔ وہ ایسی صنعت ہے۔ جو
بلا وساطت غیرے آپ اپنی مقصود ہے۔

رہی یہ بات کہ صنعت غیر مقاصد کی تابع فرمان
ہو سکتی ہے۔ اور گزر اوقات کا ایک دلچسپ مشغلہ بھی
بن سکتی ہے، سو یہ وصف فکر اور صنعت کے درمیان
ما بہ الاشتراک ہے۔ کیونکہ خود فکر بھی جب ایسے علوم کی صورت
اختیار کر لے۔ جو منافع علمی کو اپنا مطمح نظر بناتے ہیں۔
تو وہ ایک ادنےٰ حیثیت قبول کر لیتی ہے۔ اور محدود مقاصد
کی تابع اور اُن کے حصول کا ایک ذریعہ بن جاتی ہے۔ اس
صورت میں علم کے مفید اوصاف از خود پیدا نہیں ہوتے
بلکہ کسی غیر کے مرہونِ منت ہوتے ہیں۔ لیکن اس کے
ساتھ ہی علم میں یہ صلاحیت بھی ہے کہ محدود مقاصد کی
غلامی سے آزاد ہو کر حقیقت الحقائق کی جستجو میں مصروف
ہو جائے۔ اور جب وہ اس درجہ ترقی پر پہنچ جائے تو
کسی قسم کی مزاحمت کے بغیر اپنے اعلےٰ مقاصد کی تکمیل
میں کوشاں ہو جاتا ہے۔

فنونِ لطیفہ اگر عملی مقاصد سے بے نیاز نہ ہو جائیں
تو صحیح معنی میں صنعت کے نام کے مستحق نہیں۔ اور وہ
اُس وقت تک اپنے اصلی فرض سے عہدہ برآ نہیں ہوتے
جب تک وہ مذہب اور فلسفے کے دائرے میں قدم نہ رکھ
لیں، یعنی ضمیرِ کائنات، نوعِ بشر کے وسیع ترین مقاصد
اور نفس کے عمیق ترین معارفِ روحانی کے اظہار اور
شعور کے سامنے لانے کا ذریعہ نہ بن جائیں۔

یہ صنعت اور صرف صنعت کا طغرائے امتیاز ہے
کہ قوموں نے اُسے اپنے قلبی جذبات کی آئینہ داری سونپی
ہے۔ اُس میں اپنی روحِ معانی نکال کر رکھ دی ہے۔
اور اُس میں اپنے دل و دماغ کے سب سے گراں بہا
خزانے مخفی کر دئے ہیں۔ اور اکثر و بیشتر فنونِ لطیفہ قوموں
کے صحیفۂ حکمت کی تفسیر، بلکہ واحد تفسیر ہوتے ہیں۔

یہ ایک ایسی صفت ہے جو مذہب و فلسفہ اور صنعت
کو ایک رشتۂ یگانگت میں مربوط کئے ہوتے ہے۔ صنعت
میں یہ خصوصیت مستزاد ہے کہ وہ بلند سے لیکر پست
تک ہر قسم کے افکار کو حواس کا خلعت پہناتی ہے اور
پیکرِ محسوس میں متشکل کرتی ہے۔ اور اس طرح اُنکو قدرت
اور اُس کے طریقِ ظہور کے قریب تر کر دیتی ہے۔ یعنی
ہماری محسوسات کی دُنیا سے اُن کے ڈانڈے ملا دیتی

ہے۔ وہ دُنیا جس کی گہرائیوں میں قوّتِ متفکرہ سرگرمِ جولاں رہتی ہے۔ ایک ایسی دُنیا ہے۔ جو حواس سے بالاتر اور ہمارے شعور کی سرحد سے پرے ہے۔ یوں کہئے کہ ہمارا نفس کائناتِ محسوس کی رشتہ بپائی سے اپنے کو آزاد کر کے غیر محدود اور دور و دراز فضاؤں میں مصروفِ پرواز ہو جاتا ہے۔ لیکن نفس میں یہ قابلیت بدرجۂ اتم موجود ہے کہ عالمِ محسوسات اور عالمِ معقولات کے درمیان ربط و ضبط کا سلسلہ قائم رکھے۔ اور اُن میں کوئی فاصلہ حائل نہ ہونے دے۔ وہ محض اپنے لاانتہا ہی قوائے تخلیق کی بنا پر ایسے بدائع صنعت خلق کرتی ہے۔ جو خارجی اور ذہنی دُنیا میں قرب و انصال پیدا کرتے ہیں۔ اور مظاہرِ موجودات اور عقل کو ایک دوسرے سے وابستہ کر دیتے ہیں۔

یہ اعتراض، جیسا کہ ہم اُوپر بیان کر آئے ہیں، اکثر کیا جاتا ہے کہ اگر ہم صنعت پر بحیثیت مجموعی نظر ڈالیں، تو وہ اس بات کی اہل نہیں ثابت ہوتی کہ اُس کے متعلق کدو کاوش کی جائے۔ کیونکہ فریب آفرینی اور ظاہر آرائی اُس کے لوازم میں سے ہے۔ ہم اس اعتراض کو قاطع اور ناقابلِ تردید مان لیتے، اگر یہ تفرض کر لینا حق بجانب ہوتا کہ ظاہر کو موجود ہونے کا کوئی استحقاق نہیں، کیونکہ اُس کا ہونا بالکل غیر ضروری ہے۔ بہر کیف اثبات حقیقت کے لئے ظہور کا ہونا ضروریاتِ اوّلیہ میں سے ہے اگر حقیقت منصۂ ظہور پر نہ آتی تو معدوم ہوتی۔ بلکہ یہ کہنا زیادہ موزوں ہوگا کہ وہ خواہ بجائے خود کیوں نہ موجود ہو، تاہم جبتک وہ کسی ذی عقل ہستی کے نزدیک متحقق نہ ہو جائے۔ اُس وقت تک معدوم ہے۔ اس سے یہ نتیجہ برآمد ہوتا ہے کہ مذکورۂ بالا اعتراض ظہور پر بحیثیت مجموعی وارد نہیں ہوتا، بلکہ کسی مخصوص اسلوبِ اظہار پر جس سے صنعت کسی ذہنی و باطنی حقیقت کو منظرِ عام پر لاتی ہے۔ اگر صنعت کے اس اسلوبِ اظہار پر جس کے ذریعے وہ اپنی اختراعات کو ایک وجودِ محقق دے کر حقائق ثابتہ کے درجے تک پہنچا دیتی ہے۔ یہ اعتراض عاید کیا جائے کہ وہ سراسر فریب آفرینی پر مبنی ہے۔ تو اِس اعتراض کا صحیح مفہوم سمجھنے کے لئے ضروری ہوگا۔ کہ ہم اس کا مقابلہ مظاہرِ قدرتی کی خارجی دُنیا سے، اور اس دُنیا کو ہم سے بحیثیت وجودِ مادی کے جو علاقہ براہِ راست اور بلاواسطہ ہے کریں، یا اپنی باطنی دُنیا سے اُس کا موازنہ کریں، بالفاظِ دیگر اپنے محسوسات کے معیار پر اُسے جانچیں۔

(باقی)

محمد ہادی حسین

گنگا اشنان

گنگا کے کنارے تم اشنان کیے جاؤ
مشتاق نگاہوں پر احسان کیے جاؤ

مذہب کی یہ پابندی اور اپنا یہ سن دیکھو
یہ وقت سحر دیکھو جاڑے کے یہ دن دیکھو

او حسن سے بے پروا او دھرم کی متوالی
مٹ جائے نہ سردی سے رُخسار کی یہ لالی

منظر لب دریا کا تھا یوں ہی بہت پیارا
سونے پہ سُہاگہ ہے یہ صبح کا نظارا

مشتاقِ تماشا ہے ہر اک رُخِ تاباں کا
سُورج نے بھی چپکے سے دیکھو وہ تمہیں جھانکا

مستغنی از آرائش کیا وضع نکالی ہے
ٹیکہ ہے نہ جھومر ہے پتّے ہیں نہ بالی ہے

یہ سادگی بہتر ہے ہر ایک بناوٹ سے
اچھا ہے یہ بھولا پن ہر ایک لگاوٹ سے

ستّارِ تنِ نازک گو ہلکی سی ساری ہے
ہے قول نزاکت کا پھر بھی کہ یہ بھاری ہے

بھیگے ہُوئے کپڑوں سے ہے رنگِ بدن پیدا
یا ہلکے سے بادل سے سُورج کی کرن پیدا

گو شانِ تقدّس بھی چہرے سے نمایاں ہے
شوخیِ ادا لیکن غارت گرِ ایماں ہے

اُس کو بھی پسند آئی یہ شکل ہی پیاری ہے
تصویر جو یوں دل میں دریا نے اُتاری ہے

جب پانی چڑھائیگی یہ صورتِ نورانی
ڈر ہے کہ نہ سُورج پر پڑ جائے گھڑوں پانی

یہ فتنۂ محشر ہے یا بانکی ادائیں ہیں
یہ گیسوئے پُرخم ہیں یا کالی بلائیں ہیں

اُوپر کو اُٹھاؤ تو تم بہرِ خدا آنکھیں
یہ سحر بھری آنکھیں تصویرِ حیا آنکھیں

تم یُونہی نہانے کو اُن پر بھی کھڑی ہوتیں
اے کاش مری آنکھیں پتھر میں جڑی ہوتیں

گنگا میں تمہیں پیاری اشنان مُبارک ہو
اس دل کو محبت کا ارمان مُبارک ہو

(ڈاکٹر) سعید احمد سعید

وجدانیات

کہتے نہ تھے کہ عشق بھی ہے راہ راہ کا — اب دل اُٹھائے لطف ذرا آہ آہ کا

برسوں رہا ستم پہ تمہارے گمانِ لطف — برسوں کھُلا نہ رازِ فریبِ نگاہ کا

ایسا غرور ہے مجھے بن کر فقیرِ عشق — گویا ہے آسمان پہ گوشہ کلاہ کا

برباد گو کیا مجھے بختِ سیاہ نے — کچھ دخل تھا حضور کی چشمِ سیاہ کا

عرضِ کرم کروں تو گنہگار جانئے — افسانہ سُن تو لیں مرے حالِ تباہ کا

تم اور یوں نوازشِ پیہم کی بارشیں — تم خود کہو مقام نہیں اشتباہ کا

ہم صدقِ دل سے شکرِ جفا بھی تو کر چکے — اب تم بتاؤ کوئی طریقہ نباہ کا

بگڑینگے وہ جو گرم نظر پائینگے مجھے — پھر کیا جو اعتراف کیا بھی گناہ کا

آئینۂ خیال پہ ہو جائیے فدا — اُترا ہے جس میں عکس تری جلوہ گاہ کا

تعریف سے حضور کو چڑ ہے یوں ہی سہی — لو ذکر چھیڑتا ہوں مَیں خورشید و ماہ کا

عابدؔ خلوصِ شوق نے اُن پر کیا اثر

پھر سلسلہ ہُوا کرم گاہ گاہ کا

عابدؔ

غزلیات

(۱)

کیا سحر تھے وہ تیری نگاہوں کے تار میں
بھر دی ہیں بجلیاں جو دلِ بے قرار میں

ہے برقِ حسن باعثِ صد اضطرابِ دل
لیکن وہی ضیا بھی ہے شبہائے تار میں

دل پر بھی اختیار نہیں ہے جو تم نہیں
تم ہو تو چرخ بھی ہے مرے اختیار میں

ہے برقِ اضطرار، کبھی سازِ بے قرار
کیا کیا ہیں اضطرابِ دلِ بے قرار میں

آخر ابد کی نیند وہ تھک تھک کے سو گیا
جھپکی نہ جس نے آنکھ شبِ انتظار میں

جبکہ خزاں بھی ایک فریبِ نگاہ ہے
بہتر ہے مبتلا ہوں فریبِ بہار میں

آنکھوں کو جستجو ہے تری اور تو نہیں
کیونکر نہ ہو جنوں مجھے فصلِ بہار میں

سمجھاؤں کس طرح سے دلِ بے قرار کو
تم اختیار میں ہو کہ دل اختیار میں؟

پیتے ہیں جھوم جھوم کے رندانِ بادہ نوش
رحمت کو دیکھ دیکھ کے ابرِ بہار میں

اس کی خزاں پہ لاکھ بہاریں نثار ہوں
وہ رشکِ صد بہار ہو جس کے کنار میں

منزل بہت قریب تھی پر کیا کروں اثر
تاریکیوں نے گھیر لیا رہگذار میں

اثر صہبائی

(۲)

ہم کو دماغِ سیرِ فضائے چمن کہاں
حسرت زدوں سے ذکرِ تماشا نہ چاہیے

ممکن ہے مرغِ دل تری پرواز عرش تک
ذوقِ جنون و شوقِ گدایا نہ چاہیے

ہے بے نیازیوں سے تری بے نیاز دل
ورنہ ہمارے شوق کو کیا کیا نہ چاہیے

احسن علوی لودھیانوی

جمشید

(۱)

"خدا کی ہستی بھی عجیب معما ہے! کوئی نظریہ ایسا نہیں، جو دلائلِ عقلیہ کے حملوں سے جانبر ہو سکے۔ سب سے زیادہ معقول اور ہمہ گیر مسئلہ وحدت الوجود کا ہے۔ لیکن اگر اس کا بھی صحیح طور پر تجزیہ کیا جائے تو اغلاط کا مجموعہ ہی ثابت ہوتا ہے۔ اگر وہ ہستی ایک ہی ہے اور دوسرا کوئی نہیں تو پھر کائنات کا ذرّہ ذرّہ خدا ہے۔ ہم تم سب خدا ہیں۔ اور اگر انسان اور خدا کی حقیقت ایک ہی ہے تو پھر مسئلہ جبر و اختیار کی بحث ہی فضول ہے۔ اور اگر اختیار قطعاً مفقود ہے تو پھر سزا و جزا، جنّت اور دوزخ کا تذکرہ لایعنی ہے۔ اور اگر یہ سب باتیں لایعنی ہیں تو پھر مذہب کی حقیقت بھی اظہر من الشمس ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے۔ کہ جس طرح خوفناک تاریکی میں ہم خود اپنے ہی خیال سے کئی دہشتناک اشیاء کی تخلیق کرتے ہیں۔ اسی طرح جب توانین قدرت کو ہم صحیح طور پر نہیں سمجھ سکتے۔ اور جب ہماری فطری کمزوری ہم پر غالب آجاتی ہے تو ہم ایک وجود کو خود بخود پیدا کر کے اس کی پرستش اور عبودیت شروع کر دیتے ہیں۔ ابتدائے آفرینش سے آج تک اس موہوم ہستی کے متعلق ہزاروں اور کروڑوں ہی نظریے قائم ہوتے ہیں۔ اور سب ایک دوسرے سے مختلف جس کی وجہ ظاہر ہے۔ کیونکہ افراد کی ہیئت دماغی ہی مختلف ہوتی ہے"

پروفیسر جمشید جو آرام کرسی میں لیٹا ہُوا ان خیالات میں محو تھا۔ آخری خیال پر پہنچکر نہایت خوش ہُوا۔ کیونکہ وہ خالقِ کل کو مخلوق ثابت کر رہا تھا۔ جو عامۃ الناس کے معتقدات کے سخت مخالف تھا۔ لیکن دفعتاً اس نے کپکپی سی محسوس کی دیگر انسانوں کی طرح وہ بھی اپنی فطری کمزوری سے مغلوب ہو رہا تھا۔ وہ کمرے سے باہر نکلکر ہاؤس بوٹ کی چھت پر ٹہلنے لگا۔ دریا کا لامتناہی اور وسیع طول و عرض موجوں کا شور تھوڑے ہی فاصلے پر پہاڑوں کی سر بفلک چوٹیاں اور اُن پر بلند اور پُرشکوہ درختوں کے جھنڈ، نیلگوں آسمان کا زرنگار شامیانہ اور اس کا ہیبتناک حسن، جمشید نے خیال کیا کہ اگر دریا کی ایک معمولی سی لہر اُٹھکر اس کے ہاؤس بوٹ کو پاش پاش کر دے یا پہاڑ کا ایک معمولی سا ٹکڑا اس پر گر پڑے یا آسمان سے کوئی ستارہ ٹوٹ پڑے تو اس کی زندگی کا آخری باب وہیں ختم ہو جائے! اس نے فطرت کی بے پناہ قوتوں کو محسوس کیا۔ اور ایک پجاری کی طرح اس کے حضور میں جھک گیا۔

"لیکن اس سے میرے نظریے پر تو کوئی اثر نہیں پڑتا"
چند لمحوں کے سکوت کے بعد اس نے پھر اپنے سلسلۂ خیال کی ایک ایک کڑی کو جوڑتے ہوئے کہا " مانا کہ دریا کی ایک لہر، پہاڑ کا ایک پتھر، آسمان کا ایک ستارہ مجھے نیست و نابود کر سکتا ہے۔ لیکن کیا میں بھی ان دریاؤں ان پہاڑوں اور لاتعداد اشیا پر حکمرانی نہیں کرتا۔ جب تند اور پُر شور دریاؤں سے چند لہریں نکالتا ہوں۔ تو وہ بھی زچہ کی طرح نحیف و نزار ہو جاتا ہے۔ اور پھر اس کے سینے کو ہم کشتیوں اور جہازوں سے نہیں بلکہ خود اپنے پاؤں سے مسل دیتے ہیں۔ ڈنیامیٹ کی تھوڑی سی مقدار ان سر بفلک چوٹیوں کو زمین کے برابر کر سکتی ہے۔ فطرت میدانِ کارزار ہے۔ اور کامرانی کا سہرا طاقت کے سر پر ہے۔ جب دریا کسی شہر کو منہدم کر دیتا ہے۔ جب پہاڑ اپنی آتش فشانی سے کسی آبادی کو خاک سیاہ بنا دیتا ہے۔ اور جب کرۂ ارضی کی مخفی طاقتیں سمندر کو خشکی اور خشکی کو سمندر بنا دیتی ہیں، تو ہم ان تمام حادثات کو خدا کی موہوم ہستی سے منسوب کرتے ہیں۔ اگر فطرت کی طاقتوں کے مجموعے کا نام خدا ہے تو میں بھی فطرت کی ایک طاقت ہوں۔ ایک زبردست طاقت"

چاند کی طلائی کشتی آسمان کی نیلگوں لہروں میں تیر رہی تھی۔ تمام منظر اس کی رنگین اور پر سکون شعاعوں میں ملبوس تھا۔ جمشید جو فطرت کی قوتوں کی بحث سے تھک کر چور ہو رہا تھا۔ چندرما دیوی کے حسن کی دید میں محو ہو گیا۔ اسکی حرارت جو شدتِ تخیّل سے بہت بڑھ گئی تھی۔ آہستہ آہستہ تسکین میں تبدیل ہو گئی۔ وہ تفکرات کی سنگین گھاٹیوں سے نکلکر لطیف محسوسات و جذبات کی پُر بہار وادیوں میں خراماں تھا۔ پردۂ زنگاری کی دلفریب حسن آرائیوں میں وہ کسی معصوم دوشیزہ کی جھلک دیکھ رہا تھا۔ دریا کا منظر بھی کچھ کم دلاویز نہ تھا۔ پانی کی پُر سکون سطح ستاروں کی جھلملاہٹ برقی لمپوں کی پُر نور لہریں گنگا جمنی منظر پیدا کر رہی تھیں۔ دُور سرو و صنوبر کے شاندار درخت اور پہاڑوں کی سبزہ پوش چوٹیاں سنیما کا خوبصورت پردہ معلوم ہوتی تھیں۔ جمشید کا دل فرطِ محبت سے اچھل رہا تھا۔ وہ چاند ستاروں اور لہروں کو لپٹ لپٹ کر چومنا چاہتا تھا۔ تیرنے کا لباس پہنکر وہ ہاؤس بوٹ کی چھت سے دریا میں کُود پڑا۔

وہ نہایت ہی ازخود رفتہ تھا۔ جہاں جہاں چاند کا عکس پڑتا وہیں اس کو بار بار چومتا، وہ تیرتا نہ تھا۔ وہ لہروں سے لپٹ لپٹ کر ہم آغوش ہوتا تھا۔ وہ اسی بے خودی کے عالم میں دو اڑھائی میل تک چلا گیا۔ اس نے ایک لمحے کے لئے بھی نہ سوچا۔ کہ واپس آنا کس قدر مشکل ہے۔

(۲)

اس کے بازو جو پیہم فکر و تخیل کی کاوشوں کے باوجود ابھی تک کافی مضبوط تھے۔ اب تکان محسوس کر رہے تھے

دریا کی لہریں رفتہ رفتہ بڑھتی جاتی تھیں۔ ہوا کی تیزی بھی ناگوار ہو رہی تھی۔ آسمان ابر آلود ہو گیا۔ اور وہ منظر جو ابھی ابھی اسقدر دلآویز تھا۔ اب دہشتناک نظر آتا تھا۔ جمشید نے اپنی تمام قوت کو مجتمع کرتے ہوئے ہاتھ پاؤں مارنے شروع کئے۔ لیکن اب ہر لمحے کے بعد اس کی قوت جواب دیتی جاتی اور موجوں کی تندی بڑھتی جاتی تھی۔ اس نے مایوس ہو کر اپنے آپکو لہروں کے سپرد کر دیا۔ وہ بیہوش تھا۔ اور ایک تنکے کی طرح بہتا چلا جاتا تھا۔ دفعتاً وہ ایک ہاؤس بوٹ سے ٹکرایا اور ایک لمحے کے لئے اس کی آنکھیں کھل گئیں۔ اتفاقاً ایک رسی اس کے ہاتھ میں آگئی۔ اس کی کھوئی ہوئی طاقتیں پھر عود کر آئیں۔ اور وہ چھلانگ مار کر ہاؤس بوٹ کے عقب میں جہاں دروازہ وغیرہ نہیں ہوتا جا پڑا۔ مگر اسقدر طاقت کہاں کہ وہاں کھڑا ہو سکے۔ وہ لڑکھڑا کر دھم سے نیچے گر پڑا۔ بوٹ والوں نے زلزلہ سا محسوس کیا اور نوکر دھم کی آواز کو سنکر بھاگتا ہوا باہر آیا۔ الیکٹرک لیمپ کی روشنی میں اس نے دیکھا کہ ایک حسین اور رعنا قد انسان بیہوش پڑا ہے۔ اس کا زرد چہرہ جو نیلے ملبوس میں ابر آلودہ آسمان کے چاند کی طرح معلوم ہوتا تھا۔ اس کے بکھرے ہوئے بال اس کی سیاہ اور گداز آنکھیں جو لمبی اور گھنی پلکوں کے بوجھ سے دبی جاتی تھیں۔ وہ سمندر کا دیوتا معلوم ہوتا تھا۔ مگر ملازم کا دل خوف و تعجب سے دھک دھک کر رہا تھا۔

ملازم کی آواز پر شمشاد اور خورشید جو ابھی تک شطرنج کی بازی میں مشغول تھیں باہر نکل آئیں۔ وہ تینوں اس کو اٹھا کر اندر لے گئے۔ بازی قریب الاختتام تھی۔ خورشید کا فرزین مر چکا تھا۔ اور شمشاد کے دو رُخ بھی زیادہ تھے۔ شمشاد ملازم کو ہدایات دیکر پھر بازی میں مشغول ہو گئی۔ اس کے خیالات منتشر تھے۔ بساط پر اس کو مہروں کے بجائے عجیب عجیب تصویریں دکھائی دے رہی تھیں۔ ہر حال میں وہ کوئی نہ کوئی مہرہ ہار جاتی۔ حتےٰ کہ اس نے بے خبری کے عالم میں فرزین کو بھی پیدل کی زد میں رکھ دیا۔ خورشید نے جو نہایت بے بسی کی حالت میں تھی۔ جھپٹ کر فرزین کو اٹھا دیا۔ شمشاد نے ہرچند صدائے احتجاج بلند کی کہ یہ محض اتفاقی بات تھی۔ لیکن خورشید کے آہنی عزم کو کون توڑ سکتا تھا۔ چند ہی منٹوں میں بازی اُلٹ گئی۔ اور خورشید نے مات دیدی۔

بارش تھم چکی تھی۔ اور مطلع بھی صاف ہو رہا تھا۔ خورشید نے پانسو روپے کا نوٹ (جو اس بازی کی شرط تھی) اپنی جیب میں ڈالتے ہوئے شمشاد سے رخصت چاہی۔ کیونکہ وہ بھی برابر کے ہاؤس بوٹ میں مقیم تھی۔

شمشاد پانسو روپے ہار دینے کے باوجود راحت سی محسوس کرتی تھی۔ اس طالب علم کی طرح جو بُرے پرچے کرنے کے باوجود امتحان کے بعد صرف اس لئے راحت محسوس کرتا ہے۔ کہ وہ دو تین ماہ کی پیہم محنت سے گھبرا چکا تھا۔ وہ

بازی میں صرف اس لئے شریک ہوئی۔ کہ اب ایک دو منٹ کا کام تھا۔ اس لئے نہیں کہ وہی اس کو ضرور جیتے۔ اور اب جبکہ بازی ختم ہو چکی تھی۔ وہ مہروں کو ویسے ہی بکھرے ہوئے چھوڑ کر جمشید کے کمرے کی طرف چلی گئی۔ اس کی سانس اب بالکل درست تھی۔ نبض بھی اعتدال سے جاری تھی۔ وہ چہرہ جو چند منٹ پیشتر زرد اور دبلا سا معلوم ہوتا تھا۔ اب پھر شگفتہ و شاداب تھا۔ ملازم اونگھ رہا تھا۔ شمشاد نے اسے جھنجھوڑ کر کہا۔ "دیکھو تمام رات ان کی خبر گیری کرنا جب بھی ضرورت پڑے مجھے جگا لینا۔" شمشاد تمام رات بیخواب ہی رہی۔ گھنٹے دو گھنٹے کے بعد وہ جمشید کے کمرے میں جاکر اس کا حال دیکھتی۔ ملازم بھی آج اپنی مالکہ کی انتہائی ہمدردی دیکھ دیکھ کر حیران تھا۔

جمشید اس گہری نیند کا لطف اٹھا رہا تھا۔ جو انتہائی محنت اور مشقت کے بعد حاصل ہوتی ہے۔ خواب میں عموماً وہی خیالات جو عالم بیداری میں ہمارے دل و دماغ پر حاوی ہوتے ہیں۔ مختلف صورتوں میں بھیس نظر آتے رہتے ہیں۔ اس نے دیکھا کہ ایک وسیع خشک تالاب ہے جو مچھلیوں کی بجائے انسانوں سے لبریز ہے۔ درمیان میں ایک میز ہے۔ جس پر ایک سفید گٹھڑی سی پڑی ہوئی ہے۔ لوگ اس گٹھڑی کو نہایت احترام اور تعظیم کی نگاہوں سے دیکھ رہے ہیں۔ لوگوں کی حالت عجیب ہے۔ بعض اس کو دیکھ دیکھ کر کانپ رہے ہیں اور بعض نہایت فخر اور کامرانی کے عالم میں اس کے دائیں بائیں چاؤش کا کام کر رہے ہیں لیکن جمشید تالاب کے کنارے جو میز کی بلندی سے بہت اونچا ہے۔ کھڑا ہو کر ان تمام لوگوں کی طرف دیکھ دیکھ کر مسکرا رہا ہے۔ ایک شخص نے اس کو ملامت کرتے ہوئے کہا کہ نادان یہ قیامت کا منظر ہے۔ اور وہ درمیان کی میز پر باری تعالے متمکن ہیں۔ جمشید کے لبوں پر اب بھی ایک تبسم تھا۔ لیکن خوف آمیز۔ وہ کچھ کہنا ہی چاہتا تھا کہ تمام منظر بدل گیا۔ وہی تالاب ایک وسیع اور خوبصورت باغ میں تبدیل ہو گیا۔ انسانوں کے ہجوم کی بجائے خوشرنگ پھولوں اور خوش الحان پرندوں کی قطاریں تھیں اور وہ سطح جہاں خاک اڑ رہی تھی۔ اب سبزہ پوش تھی۔ پھولدار درخت اپنی شاخوں کو نہر کے کنارے پر جھکائے ہوئے تھے۔ اور انسانی پھولوں کے گلدستے خوبصورت اور نازک کشتیوں میں سیر سے لطف اندوز ہو رہے تھے یکایک چودھویں رات کا چاند آسمان کی بلندیوں سے نیچے اترتا دکھائی دینے لگا۔ اور تمام نگاہیں اس پر جمی ہوئی تھیں۔ چاند آہستہ آہستہ انسانی صورت اختیار کر رہا تھا۔ اور اب وہ ایک حسین و جمیل نازنین کی صورت میں تبدیل ہو گیا۔ وہ صورت فضا میں تیرتی ہوئی آ رہی تھی۔ اور آخر اسی میز پر جو اب بھی باغ کے وسط میں پڑی

ہُوئی تھی۔ آکر بیٹھ گئی۔ صرف اس کے سیاہ بال جو اس کی کمر سے نیچے تک لٹک رہے تھے۔ یا اس کی سیاہ اور گداز آنکھیں جو بادۂ فردوس کی نہریں معلوم ہوتی تھیں۔ باقی جسم کے حصّے کی عریانی اس کے نورانی ملبوس سے ڈھپی ہوئی تھی۔ جمشید اس منظر کو دیکھ کر دم بخود تھا۔ وہ کچھ کہنا چاہتا تھا تصویر اس کے نزدیک آتی جاتی تھی۔ حتیٰ کہ فاصلہ صرف دو تین گز کا رہ گیا۔

"میں پرستار ———" اُس نے آنکھوں کو ملکر دیکھا۔ کہ ہاؤس بوٹ کا ایک کمرہ ہے جس میں وہ ایک پُرتکلف بستر پر لیٹا ہُوا ہے اور اس ہاؤس بوٹ کی مالکہ اس کے سامنے کھڑی ہے جمشید حیران تھا اور شرمسار بھی۔ رات کے تمام واقعات کا دھندلا سا نقشہ اسکی آنکھوں کے سامنے پھر گیا۔ چند لمحوں کے بعد اس نے سنبھل کر کہا۔ "میں زندگی سے مایوس ہو چکا تھا۔ اور آج رات کے بعد کی زندگی کو میں آپ ہی کا عطیہ سمجھونگا ———"

شمشاد نے جو جھکی ہُوئی نگاہوں سے سُن رہی تھی۔ بات کاٹتے ہُوئے کہا۔ "ایک انسانی فرض ادا ہو گیا ہے میں شکریہ کی مستحق نہیں ہوں۔ آپ مجھے شرمسار نہ کیجئے کیونکہ اگر میں اس فرض کو پُورا نہ کرتی تو خدا اور مخلوق دونوں کی نگاہوں میں مجرم ٹھہرتی۔ ہاں یہ ضرور خوشی کی بات ہے کہ اس واقعہ سے ہمارے تعلقات ایک گونہ بڑھ جائینگے۔ جو ممکن ہے اس کے بغیر تمام عمر نہ پیدا ہوتے۔ اور اب ہم ایک دوسرے کے کام آسکینگے۔"

غموں کو بھلا دینا ہی اچھا ہے۔ کائنات اپنی صبح کی مُسکراہٹوں میں رات کی تمام بدعنوانیوں کو چھپا رہی تھی۔ دریا اس شخص کی طرح جو انتہائی غم و غُصّے کے لمحوں کے بعد دل کو ہلکا کرنے کے لیے محوِ ترنم ہو جاتا ہے نہایت آہستگی سے گاتا ہُوا بہہ رہا تھا۔ اور پرندے سرخوشی کے عالم میں اس طرح نغمہ سرا تھے۔ گویا رات کو کچھ ہُوا ہی نہیں۔

جمشید شمشاد کے جواب کو سُنکر عجیب کیف میں تھا۔ "اول تو آپ نے مجھے بچا کر ظلم کیا۔ یعنی مجھ پر احسان کیا۔ اور اب آپ مجھ پر دُگنا ظلم کر رہی ہیں۔ کیونکہ آپ اس احسان کو احسان بھی سمجھنا نہیں چاہتیں"۔ شمشاد نے اس کا کوئی جواب نہ دیا۔ "آپ کہاں ٹھہرے ہُوئے ہیں؟"

جمشید نے اپنا پُورا پتہ لکھ کر دیدیا۔ اور شکریہ ادا کرتے ہُوئے اجازت چاہی۔

(۲)

کئی دن گُزر گئے اور جمشید ان تمام واقعات کو فراموش کر کے پھر اپنی تصنیف و تالیف کے کام میں مشغول ہو گیا۔ الٰہیات کو وہ بیکار ثابت کر چکا تھا۔ اب دوسری منزل اس کے پیشِ نظر تھی۔ اور وہ زندگی کا مسئلہ تھا۔ وہ بچپن سے نہایت ہی خود سر واقع ہُوا تھا۔ وہ ہر بات کو صرف اسی

وقت مانتا تھا جبکہ دلائل سے اس کو سمجھ لے۔ وہ اس دنیا کو دوسرے لوگوں کی آنکھوں سے دیکھنا نہیں چاہتا تھا الٰہیات و اخلاقیات کے قوانین اس کے نزدیک ہمارے ہی وضع کردہ تھے۔ اور اس لئے قابل ترمیم۔ شام کے چار بج چکے تھے۔ اور وہ اپنے ہاؤس بوٹ کے ایک کمرے میں بیٹھکر کچھ لکھتا جاتا تھا۔

"ابتدائے آفرینش سے الٰہیات کی مملکت پر جو حملے انسانی عقل نے کئے ہیں۔ وہ محتاجِ بیان نہیں۔ اور ان کا نتیجہ بھی اظہر من الشمس ہے۔ آج وہ وقت آ پہنچا ہے جبکہ ہمیں ان تمام مباحث کو قلم انداز کر دینا چاہیئے۔ اور خود اپنے اور اپنے گرد و نواح کے متعلق غور و فکر کرنا چاہیئے ہمیں اس سے کیا فایدہ ہے کہ ہم کونسی دُنیا سے آئے ہیں۔ یا کونسی دُنیا میں جائینگے۔ البتہ یہ سوال نہایت اہم ہے کہ ہم کہاں ہیں؟ ہماری تمامتر توجہ صرف اسی کرۂ ارضی پر مرکوز ہونا چاہیئے۔ جس پر ہم بستے ہیں، اس مملکت کے قوانین کیا ہیں؟ یہی ہے اب ہماری عقل و دانش کے تیروں کا نشانہ، ہندوستان میں بسنے والوں کی کیا غرض ہے امریکہ یا جرمنی کے کیا قوانین ہیں۔ جبتک ہم اپنے مُلک کے قوانین کو اچھی طرح نہ سمجھیں ہماری زندگی خطرے میں ہے"

اس کا قلم میدان فصاحت میں نہایت شان سے قدم بڑھا تھا کہ محمود نے اس کے شانوں کو ہلا کر اس کے تمام خیالات کو منتشر کر دیا۔ اگر اس وقت محمود کی بجائے کوئی اور ہوتا تو جمشید اس کو کمرے سے باہر نکال دیتا۔ یہ امتیاز صرف محمود ہی کو حاصل تھا۔ کہ جب چاہے جمشید کو ستائے۔ دونوں ایک دوسرے کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر مسکرا رہے تھے۔

محمود۔ "کوئی شیریں آواز سُنے ہُوئے مدت گزر گئی ہے روح خشک صحرا کی طرح بنجر محسوس ہوتی ہے۔

جمشید۔ "خدارا اپنا مدعا کہو۔ تمہاری پیچیدہ باتوں کی مجھے تو سمجھ نہیں آتی۔"

محمود۔ "کہوں کیا، یار سُنا ہے۔ ہمارے قریب ہی میں ایک رقاصہ رہتی ہے۔ اس کے حسن کی تعریف بھی بہت سُن چکا ہوں۔ اور اس کے گانے کی آواز تو خود میں نے اپنے کانوں سے ادھر سے گُزرتے ہُوئے سُنی ہے۔ سبحان اللہ! جمشید عالمِ بالا میں پُہنچ جاؤ گے۔"

جمشید۔ "جانے بھی دو۔ بندۂ خدا تمہاری تمام زندگی بس انہیں خرابات ہی میں گزر جائیگی۔ باپ دادا کی جائداد اب کہاں ہے۔ جو یوں گلچھرے اُڑاتے پھروگے۔ وہ بھی تم نے چند ہی سالوں میں نشاط آباد کی نذر کر دی ہے۔

محمود۔ "صوفیانہ مواعظ تو خیر جانے دو۔ تم جو ہر سال کئی کئی سو کی کتابیں منگواتے رہتے ہو بھلا بتاؤ کہ اس سے کیا فایدہ ہوتا ہے۔ تمام دن کڑھتے رہتے ہو۔ صورت تم

نے بگاڑلی ہے۔ صحت تمہاری درست نہیں ہے۔ چڑچڑے
سے ہوگئے ہو۔ یہی ہے نا کہ تم کوئی کتاب لکھ دوگے۔ تو بھلا
اس سے بھی کیا حاصل، اب تک کونسی بات نہیں لکھی گئی
جو تم لکھوگے۔ پھر اس دردِ سر کے کیا معنی چلو کچھ زندگی کا
لطف بھی اُٹھاؤ۔

جمشید جو اس تمام گفتگو کو سُنتے ہُوئے اس رات کے
مناظر دیکھ رہا تھا۔ اب آمادہ تھا۔ وہ بھی غور و فکر کی پیہم محنتوں سے
اُکتا چکا تھا۔ اور اب ستانے کیلئے کوئی مشغلہ پیدا کرنا چاہتا تھا۔

خورشید کا دھکتا ہوا کندنی چہرہ آتشی گلابی ساڑی
میں شعلۂ جانسوز کی طرح لپکتا ہوا معلوم ہوتا تھا۔ اس کی
مخمور آنکھیں اس کے سرخ لب جن پر ہمیشہ ایک جذبات انگیز تبسم
کھیلتا پھرتا تھا۔ اس کا سڈول اور جامہ زیب بدن اور اس
کا نکلتا ہوا قد، جب وہ گاتی تو شعلہ جوالہ معلوم ہوتی تھی۔
دنیا کا تمام سوز اور اضطراب اس کے ساز کے ارتعاش
میں سما جاتا اور ایسا معلوم ہوتا کہ اس کا حسنِ عالم سوز
کائنات کو پھونک ڈالے گا۔ شام کے وقت خورشید اپنے
مرصع کمرے میں ایک گاؤ تکیہ کے سہارے بیٹھی ہوئی اپنے
ساز کو درست کر رہی تھی۔ کہ جمشید اور محمود دونوں اندر داخل
ہوئے۔ ابتدائی علیک سلیک اور رسمی سوال و جواب کے
بعد خورشید نے دونوں صاحبوں کے نام دریافت کئے صرف
محمود ہی گفتگو کرتا تھا۔ جمشید کا دل داخل ہوتے ہی دھک دھک
کر رہا تھا۔ وہ وہاں سے چلے جانا چاہتا تھا۔ لیکن نہیں جا سکتا
تھا۔ وہ اس فتنۂ حسن کو نہیں دیکھنا چاہتا تھا۔ مگر اس کی
آنکھیں اسی پر جمی ہوتی تھیں۔ اسکے کان ان آوازوں کو نہیں
سُننا چاہتے تھے۔ مگر وہ صرف انہیں آوازوں کو سُنتے تھے
وہ اپنے دل کو خاموش کرنا چاہتا تھا۔ مگر وہ یکسر اضطراب
تھا۔ اُس نے ہر چند اپنے فلسفے کی رو سے اُسے نہ صرف
انسان بلکہ ایک کمزور اور ضعیف ہستی یعنی عورت ثابت
کیا۔ مگر وہ اس وقت جھکا جاتا تھا۔ اس تنکے کی طرح جو شعلے
کی بھڑک سے خود بخود اس کی طرف کھنچا آتا ہے۔

محمود کی فرمائش پر خورشید نے یہ رباعی گائی۔

آمد سحرے ندا ز میخانۂ ما
کاے رندِ خراباتی دیوانۂ ما
برخیز کہ پر کنند پیمانہ زمے
زاں پیش کہ پر کنند پیمانۂ ما

اس نے گاتے ہُوئے ایک تصویر کی طرف اشارہ
کیا۔ جو اس کے سامنے کی دیوار پر آویزاں تھی ——
خمخانۂ کائنات میں صبوحی کا دور ہے ایک نو شگفتہ دوشیزہ
ایسے پُر تکلف بستر پر انگڑائی لے رہی ہے۔ حسن و شباب
کی مستی آنکھوں کا خمار۔ وہ ایک چھلکتا ہوا جام معلوم ہوتا ہے
اس کا عاشق ایک کاسۂ زریں جو ارغوانی آتشِ سیال سے لبریز
ہے پیش کر رہا ہے۔ اور نیچے مندرجہ بالا رباعی درج تھی۔

محمود جو لطیف جذبات اور تخیلات سے قریباً بالکل عاری تھا۔ ان تصویروں کو دیکھ دیکھ کر جھوم رہا تھا۔ وہ کبھی خورشید کو اور کبھی اس تصویر کو دیکھتا۔ لیکن جمشید خاموش تھا وہ نہیں جانتا تھا کہ وہ کہاں ہے۔ خورشید جو محمود کے چھچھورپن سے بہت بیزار ہو رہی تھی۔ اب جمشید کی طرف متوجہ ہوتی۔ وہ آنکھیں جو پہلے دہکتے ہوتے انگارے معلوم ہوتی تھیں۔ اب گل لالہ کی طرح شگفتہ تھیں۔ خورشید نے مسکرا کر کہا۔

"جمشید صاحب! کیا یہ تصویر آپ کو پسند نہیں ہے"

جمشید کچھ کہنے کی کوشش کر رہا تھا کہ محمود بول اٹھا۔

"فلسفی صاحب سے آپ حسن کے متعلق کیا دریافت فرماتی ہیں۔ میں تو اس منظر کو دیکھ کر گھایل ہو گیا ہوں۔ اے کاش میں اس خوش قسمت مرد کی طرح ہوتا ـــــ خیر آپ کچھ اور سنائیے"

خورشید نے پھر ساز کو چھیڑا اور اپنی بلند آواز کی گونج سے فضا کو بیتاب کر دیا۔

بعزم توبہ سحر گفتم استخارہ کنم
بہارِ توبہ شکن میرسد چہ چارہ کنم
گدائے میکدہ ام لیک وقت مستی بیں
کہ ناز برفلک وحکم برستارہ کنم
بہ تختِ گل بنشانم بتے چو سلطانے
زسنبل وسمنش سازِ طوق و یارہ کنم

جمشید نے جس کی خورشید کی تلطف آمیز نگاہوں نے اب بہت جرأت بڑھا دی تھی۔ آخری شعر پر کہا۔ "شاعر کا تخیل کسقدر لطیف اور شگفتہ ہے۔ معشوق کو جو پاکبازی اور حسن میں پھول جیسا ہی ہونا چاہیئے پھولوں کے تخت پر بٹھاتا ہے اور پھر اس کو سونے چاندی کے زیورات اور جواہرات نہیں بلکہ سنبل اور سمن کے گجرے اور ہار پہناتا ہے۔"

خورشید نے اس فقرے کی داد اپنے پرکیف تبسم سے دی۔ لیکن محمود نے کہا۔ "شکر ہے ہمارے فلسفی صاحب کی مہر سکوت بھی ٹوٹی۔

(۴)

جمشید ابھی بچہ ہی تھا۔ کہ اس کی ماں کا انتقال ہو گیا۔ وہ اپنی والدہ کا ایک ہی بیٹا تھا۔ اس کے باپ نے اپنی پہلی بیوی کی وفات کے ایک دو سال بعد ہی دوسری شادی کر لی۔ اور اس سے اولاد بھی پیدا ہوتی گئی۔ جمشید اپنے گھر میں اتنے بھائیوں اور بہنوں کے باوجود تنہا تھا۔ کیونکہ اس کی سوتیلی ماں کا سلوک اس سے ناگفتہ بہ تھا۔ اس کا باپ بھی اب بے اعتنائی سے پیش آتا تھا۔ کیونکہ ان لوگوں کی باگ ڈور صرف ان کی بیویوں کے ہاتھوں میں ہوتی ہے۔ اور موجودہ بیوی جمشید کی ماں نہ تھی۔ ان کا گھرانہ بھی کچھ الگ تھلگ سا تھا۔ اول تو ان کی رشتہ داری ہی بہت کم تھی۔ پھر جو کچھ بھی تھی، وہ بھی نفرت و عداوت کی، اس کا نتیجہ یہ ہوا۔ کہ جمشید تمام

دن یا تو باہر سیر و تفریح کے لئے رہتا یا الگ اپنے کمرے
میں بیٹھا کتابوں میں مشغول، وہ کافی ذہین تھا۔ اس نے
چند ہی سالوں میں کئی کتابیں پڑھ ڈالیں۔ فلسفے کی طرف
اسے فطرتاً میلان تھا۔ اور یہی وہ حالات ہیں جن میں فلسفہ
کی پوری نشو و نما ہو سکتی ہے۔ اس نے فلسفے کی بے شمار
کتابیں پڑھیں۔ اس کی قابلیت کو اس چار دیواری کے
بسنے والوں کے سوا جس میں وہ رہا کرتا تھا سب محسوس
کرتے تھے۔

جس شخص کی تربیت کی رفتار ایسی ہو۔ وہ "قدرتاً"
صنف نازک سے متنفر ہو جاتا ہے۔ اس صنف کا سب سے
پہلا فرد جس سے جمشید کو پالا پڑا، اس کی ماں تھی۔ اور وہ
اس کو ایک خونخوار درندہ نظر آتی تھی۔ یہی تھا اس کا پہلا تجربہ
اور اس کی بنا پر وہ عورت کی ذات سے متنفر تھا۔ وہ اس کو
تمام معصیتوں کا منبع اور اس کی تخلیق کو خدا کی سب سے بڑی
غلطی قرار دیتا تھا۔ اس کی خود پرستی، انتقام پسندی کینہ اور
ذلیل آرزوئیں اس کے لئے ناقابل برداشت تھیں۔ وہ اسکو
جہالت اور خود سری کا مجموعہ سمجھتا تھا۔ جب جنگلوں، اور
پہاڑوں اور دریاؤں کے دلکش مناظر کو وہ دیکھ دیکھ کر
بیخود سا ہو جاتا، تو چلا کر پکار اٹھتا "اگر عورت صفحہ ہستی
سے نیست و نابود ہو جائے تو یہ دنیا کسقدر خوبصورت اور
پاکیزہ ہو۔" اب وہ بائیسویں سال میں تھا اور حسن، صحت
اور طاقت کے باوجود وہ ابھی تک اپنے فلسفے پر قائم تھا۔
جب شام کو مال روڈ کا دلچسپ مرقع اپنی گوناگوں نظر فریبیوں
اور متحرک تصویروں کے ساتھ اس کی نظروں سے گزرتا تو اس
کا دل نفرت اور حقارت کے جذبات سے پر ہو جاتا۔ وہ
معصومیت جو اس کو فطرت کے دیگر مناظر میں بیخود بنا دیتی
تھی۔ ہر چہرے میں مفقود تھی۔ وہ زہر آلودہ پھول تھے۔

طوفانی رات کے واقعات کو اگرچہ وہ صرفِ فراموشی
کر چکا تھا۔ لیکن خورشید کی ملاقات کے بعد اب وہ تمام
منظر اس کی آنکھوں کے سامنے پھر گیا۔ خورشید اس کی
نگاہوں میں پسندیدہ نہ تھی۔ لیکن اس کی الوداعی مسکراتی ہوئی
نگاہیں اس کے دل کو بے قرار کئے دیتی تھیں۔ وہ اس سے
خوفزدہ تھا۔ لیکن پھر بھی نامعلوم طور پر اسی کی جانب کھنچا جاتا
تھا۔ اس کی زندگی میں عظیم الشان انقلاب پیدا ہو رہا تھا۔
اور وہ دل جو ایک مدت سے اس جذبہ سے خالی تھا۔ اب
ہر شے کیلئے مضطرب ہو جاتا۔ اس کو خورشید سے محبت
نہ تھی۔ لیکن چونکہ وہ پہلی ہستی تھی۔ جس نے اُسکے خوابیدہ محسوسات
کو چھیڑا تھا۔ اس لئے وہ اسی کی جانب کشاں کشاں جا رہا
تھا۔

شمشاد سے رخصت ہوتے دو ہفتے گزر چکے تھے۔
اور اگرچہ اس دوران میں بھی کبھی کبھی وہ اس سے ملنے کا خیال
کرتا۔ لیکن اپنے فلسفیانہ انہماک اور فطری تساہل کی وجہ سے

لیت و لعل کرتا رہا۔ اور جوں جوں وقت گزرتا جاتا اس کا تغافل ملاقات کو اور بھی التوا میں ڈالتا جاتا۔ آخر ایک روز اس نے جانے کا عزم صمیم کر لیا۔ وہ تیاری میں مشغول ہی تھا کہ اس کے ملازم نے اس کو ایک رقعہ دیا۔

"آج کی دعوت قبول فرمایئے۔ مَیں پورے آٹھ بجے تک اپنے ہاؤس بوٹ میں آپ کی منتظر رہوں گی۔ نہایت ضروری ہے۔

آپکی خورشید

جمشید پر اس رقعہ کو پڑھ کر چند لمحوں کے لئے سکوت سا طاری ہو گیا۔ وہ حیران تھا کہ کیا کیا جائے ——— "لیکن شمشاد سے مَیں نے وعدہ تو نہیں کیا تھا۔ اس لئے اگر وہاں نہ جاؤں۔ تو مَیں اخلاقی طور پر ہرگز مجرم نہیں ہوں۔ خورشید مجھے بلا رہی ہے۔ اور وہاں نہ جانا تہذیب اور اخلاق کے عین مخالف ہے۔" اس نے اپنی منطق کو کام میں لا کر اپنے دل کو خورشید کی جانب جانے پر راضی کر لیا۔

خورشید سفید باریک ریشم کی ساری میں ملبوس اپنے کمرے کی میز اور کرسیوں کو خود ہی درست کر رہی تھی۔ وہ ہر لمحہ آئینے میں اپنے گیسوؤں کے حلقوں کو دیکھ لیتی۔ اور ہر بار ان کو نئے انداز سے آراستہ کرتی۔ اُس کا رنگ آج زیادہ دمک رہا تھا۔ اس کا چہرہ سفید ملبوس میں بجلی کے قمقمے کی طرح معلوم ہوتا تھا۔ وہ زیر لب گنگناتے ہوئے اپنے کام میں مشغول تھی کہ جمشید صاحب اندر داخل ہوئے خورشید نے نہایت گرمجوشی سے مصافحہ کرتے ہوئے کہا۔" آپ خوب وقت پر پہنچے۔ آٹھ بجنے میں ابھی نصف گھنٹہ باقی ہے۔"

جمشید نے مُسکرا کر کہا۔" مَیں یہاں آنے کے لئے تیار ہو ہی رہا تھا کہ آپ کا رقعہ پہنچا۔ اس لئے اس کے فوراً ہی بعد حاضر ہو گیا ہوں۔"

دونوں ادھر اُدھر کی گفتگو کرتے ہوئے کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ خورشید آج ہر لحہ اپنے مہمان کو خوش کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔ جمشید پر گھبراہٹ کی کیفیت طاری تھی۔ اس کا دل آج بھی بیقرار تھا۔ لیکن خوف سے نہیں بلکہ محبت سے، موسم وغیرہ کی گفتگو کرتے ہوئے اُنھوں نے کھانا ختم کر لیا۔ اب جام جم کا دور شروع ہوا۔ اور لال پری جو پہلے کتی پردوں میں محجوب ایک کونے میں پڑی ہوئی تھی۔ اب جام و مینا کے شفاف پردوں میں جھلکنے لگی۔ جمشید شراب پینے کا عادی نہ تھا۔ لیکن کبھی کبھی احباب کے اصرار پر نوش کر لیا کرتا تھا خورشید نے اپنے ہاتھ سے دو گلاس بھرے۔ اور پھر خود اپنے ہاتھوں سے اس کو پیش کیا۔ جمشید جو خورشید کی گفتگو اور اس کی تلطف آمیز نگاہوں سے پہلے ہی مخمور ہو رہا تھا۔ غٹ غٹ چڑھا گیا۔ خورشید بھی اپنا گلاس ختم کر چکی تھی۔ جوانی کا حسن اور سنگار خود ہی کچھ کم نہیں ہوتا لیکن آتش سیال

سونے پر سہاگہ ہو جاتی ہے۔ خورشید کا رنگ جو پہلے ہی کندن کی طرح دمکتا تھا۔ اب نہایت شگفتہ اور ملیح ہو رہا تھا۔ اس کی سیاہ اور شوخ آنکھیں اب بہت کشادہ اور روشن ہو رہی تھیں۔ جمشید بھی اب وہ ضعیف القلب جمشید نہ تھا۔ اس کی آنکھیں چمک رہی تھیں۔ اور اب وہ بھی نہایت ہی بے تکلف تھا۔ چاند ابر کی باریک چلمن سے اہل زمین کی ہنگامہ آرائیوں کو جھانک رہا تھا۔ اور یہ دونوں مستان عشق و شباب دُنیا و مافیہا سے بے خبر حافظ اور عمر خیام کی غزلیں اور رباعیاں پڑھتے ہوئے اس آگ کو نگلتے جاتے تھے۔

خورشید۔ "تم کسقدر خوبصورت ہو۔ جمشید جب تم سامنے آتے ہو تو میں اپنی ہستی کو تمہاری خواب آلودہ نگاہوں کے قابو میں پاتی ہوں ـــــ"

جمشید نے بات کاٹتے ہوئے۔ "کیا خورشید اب آسمان سے اُتر کر زمین پر چمکا کریگا آپ دولت و حسن کی مملکت کی شہنشاہ ہیں۔ مجھ سے گدائے بے نوا کو آپ کیوں ناحق بناتی ہیں۔"

خورشید۔ تمہاری ایک تبسم آمیز نگاہ میرے تمام خزانوں سے زیادہ قیمتی ہے جب میں تمہیں دیکھتی ہوں۔ تو دُنیا معمول سے زیادہ روشن اور رنگین نظر آتی ہے۔

محبت کے عہد و پیمان ہو رہے تھے۔ خورشید اگر "معشوق شوخ" تھی تو جمشید بھی "عاشق دیوانہ" بنا ہوا تھا۔ وہ دونوں غیر محسوس طور سے ایک دوسرے کی جانب کھنچے جاتے تھے۔

خورشید جمشید کے آغوش میں تھی معلوم نہیں کب سے، یہ پہلا موقع تھا جبکہ جمشید نے کسی عورت کی ہم آغوشی کی ولولہ انگیز حرارت کو محسوس کیا۔ وہ بیخود تھا۔ شراب اسکے دماغ کو پہلے ہی معطل کر چکی تھی۔ لیکن اب وہ بالکل ہی بے قابو تھا۔ خورشید کے ارغوانی لب جن سے بادہ خوشگوار کی لپٹیں آ رہی تھیں۔ اب اس کے لبوں کے بہت ہی قریب آ گئے تھے۔ اس نے ان کو چوم لیا ـــــ لیکن جس طرح ہم رسّی کی جگہ سانپ کو پکڑ لیتے ہیں۔ اور کسی بے ضرر تار کی جگہ برقی تار کو چھو لیتے ہیں۔ اسی طرح جب اس کے لب خورشید کے لبوں سے مس ہوئے تو اس نے خوف و اضطراب کے عالم میں دفعتاً اس کو اپنے دونوں بازوؤں سے پکڑ کر فرش پر پٹک دیا۔ اور اس کو وہیں نیم غشی اور نیم بیداری کی حالت میں چھوڑ کر بھاگ نکلا۔

(۵)

جمشید کی طبیعت اب اُکھڑ چکی تھی۔ وہ عجیب کشمکش میں تھا۔ فلسفے کی کتابیں اب اس کو ڈراونی نظر آتی تھیں۔ وہ کچھ بھی نہیں کر سکتا تھا۔ خورشید کی ملاقات نے اس کے خیالات کے شیرازے کو بالکل بکھیر دیا۔ معلوم نہیں کس عالم میں وہ اس کو یوں جھٹک کر بھاگ آیا تھا۔ جب خورشید کی تصویر اس کی آنکھوں کے سامنے آتی تو وہ کانپ اُٹھتا۔ اس کی

تیز اور شعلہ فشاں آنکھوں سے تصوّر میں بھی اپنی آنکھیں نہیں ملا سکتا تھا۔ وہ اب اپنی ہلاکت کا منتظر تھا۔

اس ہیجان طبعی کے عالم میں وہ اپنے دار المطالعہ میں دِل بہلانے کے لیئے اخبار ٹائمز کے اوراق اُلٹ رہا تھا ایک صفحہ پر اس کی نگاہیں رُک گئیں۔ اس پُورے صفحہ پر ایک تصویر تھی ــــــ صبح کا سہانا وقت ہے۔ دریائے حُسن خراماں خراماں بہہ رہا ہے۔ سر سبز ٹیلے کے اردگرد کئی چشمے طواف میں مشغول ہیں۔ ایک چٹان پر ایک دوشیزہ آسمان کی طرف نظریں گاڑے کھڑی ہے۔ اس کے سیاہ اور دراز بال جو اس کے کندھوں پر پھیلے ہُوئے ہیں۔ اسکی پر سکون اور گداز آنکھیں، اس کا سفید ملبوس۔ گویا صبح کی تمام رعنائیاں سمٹ کر اس پیکر میں سما گئی تھیں۔

جمشید کئی لمحوں تک اس تصویر کو دیکھتا رہا۔ اس نے اپنی موجودہ زندگی اور اس دوشیزہ کی زندگی کا معائنہ کیا۔ وہ یکسر اضطراب و پریشانی تھا۔ اور وہ امن و سکون کی دیوی اس کی نگاہیں اس تصویر پر جمی ہُوئی تھیں۔ اور اس طوفانی رات کے واقعات ایک ایک کر کے اس کے دماغ میں تازہ ہو رہے تھے۔ وہ اس تصویر کو دیکھ رہا تھا۔ اور شمشاد کی تصوّر غیر معلوم طور سے اسی صفحہ پر منقوش ہو رہی تھی "کسقدر مشابہت ہے۔" جمشید نے بلند آواز سے کہا۔ اور اب وہ شمشاد ہی کی تصویر تھی۔ وہ ہر چند اپنے دماغ کو سمجھاتا کہ ٹائمز میں اس کی تصویر کا کیا کام۔ لیکن اس کی نگاہیں شمشاد کی تصویر ہی کو دیکھ رہی تھیں۔ اس کی خاموش آنکھیں جمشید کو عرق انفعال میں غرق کر رہی تھیں۔ پندرہ بیس دن گُذر چُکے تھے۔ اور وہ ابھی تک اس کے ہاں ایک دفعہ بھی نہیں گیا تھا۔ آج خورشید کی جانب سے وہ بالکل فارغ ہو چکا تھا۔ اور اب کوئی طاقت اس کو وہاں نہیں لیجا سکتی تھی حقیقت میں وہ وہاں جانے سے ڈرتا تھا۔ وہ انہیں خیالات میں مستغرق تھا کہ پھر محمود نے پیچھے سے آکر اس کے شانوں کو اس طرح جھنجھوڑا کہ اس کے تمام خیالات خزاں رسیدہ درخت کے پتّوں کی طرح منتشر ہو گئے۔

محمود۔ "ہر وقت کی دماغ سوزی بھی اچھی نہیں۔ کتاب کی قیمت تمہیں ممکن نہیں ایک ہزار سے زیادہ مل سکے۔ چلو یار مَیں تم کو ایک ہزار روپیہ دے دُونگا۔ مگر تمہیں روپے کی ضرورت ہی کیا ہے۔ کافی مالدار ہو۔ مگر جس کی قسمت میں کڑھنا ہی لکھا ہو اس کا کیا علاج ہو سکتا ہے۔

جمشید۔ کونسی کتاب کا ذکر کرتے ہو؟ یاد ش بخیر وہ تو میں پانچ سات صفحوں ہی پر ختم کر چکا ہوں۔

محمود۔ تو چلو نا پھر ذرا خورشید کے ہاں چلیں۔ اس رات تو قیامت ہی ہو گئی۔ معلوم نہیں اس عورت میں کیا سحر ہے۔

جمشید (چونک کر) "خورشید!" کے ہاں، نہیں محمود مَیں کہیں بھی نہیں جا سکتا۔

آج مجھے ایک نہایت ضروری کام کے لئے باہر جانا ہے۔

محمود نے بہت کوشش کی کہ اپنے دوست کے اس عزم کو توڑ ڈالے اور وہ توڑ بھی ڈالتا۔ لیکن جب جمشید کو گزشتہ واقعات کا خیال آتا تو وہ کانپ اُٹھتا اسکو ایسا محسوس ہوتا تھا۔ کہ وہ اس کو شعلے کی طرح پھونک ڈالے گی اور اس کی مسحور کن آنکھیں اس کی رُوح کو اس کے بدن سے کھینچ لینگی۔ محمود آخر ناراض ہو کر اکیلا ہی چلا گیا۔

شمشاد بھی نشاط آباد کی ایک حسن فروش تھی لیکن اس کی صورت اس کے طرز و انداز اور اس کے محسوسات اپنے ہم مشربوں سے بالکل مختلف تھے۔ وہ نہایت شرمیلی تھی اور اگرچہ اس کے حسن و نغمے کی بہت دھوم تھی۔ لیکن پھر بھی وہ شوخ نہ تھی۔ محفل برخاست ہو جانے کے بعد وہ مغموم سی ہو جاتی۔ اور پہروں سوچ میں ڈوبی رہتی۔ جس رات اُس نے جمشید کی جان بچائی وہ بہت خوش تھی، وہ ایسا محسوس کرتی تھی۔ کہ جس تصویر کو وہ اپنے عالمِ خیال میں ڈھونڈا کرتی تھی اس کو غیب سے عطا ہو گئی ہے۔ اس کو دیکھتے ہی اس کی تصویر اس کے دل پر منقوش ہو گئی لیکن وہ خاموش تھی۔ اس نے اگرچہ جمشید کو وداع کرتے ہُوئے اس سے اس کا پُورا پتہ دریافت کر لیا تھا۔ جس میں کچھ ایمائے محبت تھا۔ لیکن وہ پھر بھی کنارہ گیر رہتی۔ محبت بھی شراب ہے۔ اور جس طرح شراب انہیں مخصوص جذبات و محسوسات کو زیادہ نمایاں کرتی ہے۔ جن سے اس کا پینے والا متصف ہوتا ہے۔ اسی طرح محبت بھی خاموش کو زیادہ خاموش اور شوریدہ سر کو زیادہ شوریدہ سر بنا دیتی ہے۔

شمشاد فطرتاً خاموش اور خود دار تھی۔ اور محبت نے اس کو زیادہ خاموش اور خود دار بنا دیا۔ وہ جمشید کو رقعات کے ذریعے بلا سکتی تھی اور ممکن نہ تھا کہ جمشید انکار کر دیتا۔ وہ خود اس کے ہاں جا سکتی تھی۔ اور ممکن نہ تھا کہ جمشید اسکو وہاں سے باہر نکال دیتا۔ لیکن وہ خاموش تھی۔ اور اپنے مقدس جذبات سے یوں کھیلنا پسند نہ کرتی تھی۔

وہ ہر شام ہاؤس بوٹ کی چھت پر بیٹھ کر دریا کا منظر دیکھتی اور رات کو کچھ گنگناتے گنگناتے سو جاتی اور ہر صبح اس کا آغوش جمشید کی محبت میں وا ہو جاتا، اس کو معلوم تھا۔ کہ جمشید کا خورشید کے ہاں آنا جانا ہے اس کو معلوم تھا کہ خورشید کن زبردست طاقتوں کی مالک ہے وہ خود اپنے آپ کو خورشید کے سامنے ایک بے ارادہ ہستی محسوس کیا کرتی تھی۔ اور اس لئے اس کے خطرات ان گنت تھے۔ لیکن وہ پھر بھی خاموش تھی۔ وہ جمشید کو ایسی جنگوں سے جیتنا نہ چاہتی تھی۔ اگر جمشید خورشید کی بغل میں تھا۔ تو کیا ممکن تھا کہ اس طرح جمشید کی تصویر اس کے دل کے آئینے سے جدا ہو سکے۔ جوں جوں دن گزرتے جاتے یاس و ناامیدی اس کی زندگی پر چھائی جاتی اور اب جبکہ

پُورے بیس روز گزر چکے تھے۔ وہ نہایت مضمحل اور اداس تھی حسبِ معمول وہ اپنے ہاؤس بوٹ کی چھت پر بیٹھی کچھ گنگنا رہی اور اپنے دل کو بہلانے کے لئے ایک تصویر کو دیکھ رہی تھی ــــ

شام کا منظر ہے اور ایک سوگوار نازنین مایوس نگاہوں کو آسمان کی طرف گاڑے ہُوئے اپنے ساز کو چھیڑ رہی ہے نیچے "ایّامِ گزشتہ کی یاد" لکھا ہُوا تھا۔ یہ تصویر اس کے حسبِ حال تھی۔ اور جس طرح ایک مصیبت زدہ دوسرے مصیبت زدہ کو دیکھ کر کچھ تسکین حاصل کرتا ہے اس طرح وہ بھی کچھ سکون محسوس کر رہی تھی۔

جمشید ہاؤس بوٹ کے اندر داخل ہُوا لیکن وہاں کوئی نہ تھا۔ وہ ملازم سے گفتگو کر رہا تھا کہ شمشاد اس کی آواز سُنکر لپکتی ہُوئی نیچے آگئی۔ دونوں کی آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا رہے تھے۔ لیکن ایک کی آنکھوں میں فرطِ مسرت اور دوسرے کی آنکھوں میں احساسِ ندامت ۔ وہ چند لمحوں کے لئے بالکل خاموش تھے۔ شمشاد کا رنگ اس مریض کی طرح نکھر رہا تھا جو غسلِ صحت کرتا ہے مگر جمشید گردن جھکائے خاموش تھا۔ دل اس کا بھی بھرا ہُوا تھا۔ لیکن ندامت آمیز محبت سے آخر جمشید نے اس سلسلۂ سکوت کو توڑنا چاہا۔ "مَیں چاہتا ہوں کہ ــ" اس کی زبان رُک گئی ـــــ اس نے اس فقرے کو پُورا کرنے کی بیکار کوششیں کیں۔ جو الفاظ اس کے لبوں سے نکلتے، وہی ٹوٹ پھُوٹ کر آنسوؤں میں بہہ جاتے۔

شمشاد اس منظر کو دیکھ دیکھ کر نہایت متاثر ہو رہی تھی۔ اور اگرچہ وہ بھی بہت رونا چاہتی تھی۔ لیکن اس مایوس شخص کی طرح جس کو اچانک اس کا گم شدہ یا مفقودالخبر دوست مِل جاتا ہے۔ وہ خورشید کی شکست اور اپنی فتح کی خوشی میں آنسو بہانا چاہتی تھی۔ محبت کا ماتم اور محبت کی خوشیاں دونوں آنسوؤں ہی سے کی جاتی ہیں۔ لیکن ان دونوں آنسوؤں میں کتنا فرق ہے؟ ایک زہرِ ہلاہل کا قطرہ ہے اور دوسرا فردوس بریں کی نہروں کا۔

شام ہو رہی تھی اور ہاؤس بوٹ کے اندر وہ حبس سا محسوس کر رہے تھے۔

شمشاد نے کہا۔ "چلئے ذرا کشتی پر سیر کریں۔ یہاں تو دم گھٹا جاتا ہے۔"

جمشید نے صرف اپنی خاموشی سے اس کی تائید کی اور وہ دونوں کشتی میں سوار ہو کر دریا کی سیر میں مشغول ہو گئے۔ چودھویں رات کا چاند پہاڑیوں کے عقب سے بلند ہو رہا تھا۔ اور کائنات کو جو دل بھر میدانِ کارزار بنی ہُوئی تھی۔ پھر فردوسِ تسکین بنا رہا تھا۔ لیکن اگر آج تاریک رات ہوتی اور ستاروں کے قمقمے بھی تاریک بادلوں کے پردوں میں درخشاں ہوتے تو کیا یہ دونوں ایسے ہی

مطمئن اور پُرسکون نہ ہوتے۔ چاند تسکین کا شاہزادہ ہے لیکن اس رات جبکہ جمشید خورشید کو جھٹک کر واپس آ رہا تھا۔ جمشید کا دل کیوں محشرِ اضطراب بنا ہُوا تھا۔ پانی تر اور آگ گرم، لیکن غصّے کے وقت وہی گھونٹ کیوں گرم محسوس ہوتے ہیں۔ اور جب ہمیں کوئی دوسری جانب سے خود ہی پُکار پُکار کر بُلاتا ہے تو پھر درمیان کی آگ ہمیں کیوں پھُولوں کا ڈھیر نظر آتی ہے؟

فطرت خود ہی نہایت بے تکلف ہے۔ اور جب دو ناآشنا فطرت کے آغوش میں ہوتے ہیں۔ تو وہ بھی غیر معلوم طور پر بے تکلف ہو جاتے ہیں۔ چند ہی لمحوں میں گفتگو کا سلسلہ چھڑ گیا۔ ہوا کے خوشگوار جھونکے اور چاندنی رنگین اور پُرسکون شعاعوں میں "افسانہ از افسانہ می خیزد" کا سلسلہ بڑھتا جاتا تھا۔ جمشید نے طوفانی رات کا خواب سُنایا۔ اور پھر اخبار ٹائمز کی تصویر کا واقعہ، شمشاد کی گردن نسوانی فخر و غرور سے خود بخود بلند ہو رہی تھی۔ اور وہ سفید و سُرخ ہنس کی طرح پانی میں تیرتی ہوئی معلوم ہوتی تھی۔ اُس نے خورشید کی ملاقاتوں کو دُہرایا۔ اور شمشاد سُن سُن کر کبھی تو خوشی سے اور کبھی خوف سے کانپ اُٹھتی دونوں نے اپنی اپنی بیس روزہ زندگی کی داستانیں سنائیں۔ اور اب وہ محبت سے ہم آغوش تھے۔ "کسقدر فرق ہے اِس آغوشِ محبت اور اُس آغوشِ محبت میں؟" جمشید اپنے سر کو شمشاد کے بازوؤں پر رکھے ہُوئے سوچ رہا تھا۔ "کسقدر فرق ہے۔ خورشید اور شمشاد کے حسن میں! ایک شراب دوآتشہ ہے اور دوسری پوتّر دودھ، ایک گُلِ لالہ اور دوسری یاسمن، ایک آفتاب ہے اور دوسری چودھویں رات کا چاند، ایک آگ ہے اور دوسری نور، انہیں خیالات میں اس کی آنکھ جھپک گئی۔

شمشاد محبت اور عقیدت سے کبھی اپنے محبوب کے چہرے کو اور کبھی ماہِ کامل کو دیکھتی اور پھر اپنے ہی خیال میں دونوں کا مقابلہ کرتی اور جب وہ اپنی منطق سے جمشید کے حسن کو بہت بالاتر ثابت کرتی تو حیا آمیز محبت سے اس کا چہرہ تمتما اُٹھتا۔

جمشید نے خواب میں دیکھا وہ شمشاد کے ہمراہ ایک بلند سرسبز ٹیلے پر محوِ خرام ہے۔ پہاڑ کے دامن میں دریا بہہ رہا ہے۔ اور اس کی لہریں اس کے پتھروں سے اچھل اچھل کر کھیل رہی ہیں۔ دریا کے دونوں کنارے سرو و صنوبر کے بلند قامت اور شاہانہ درختوں سے مرصع ہیں۔ اس کی سطح پر بھی کنول کے پھُول ہی کھلے ہوتے ہیں۔ وہ دونوں بازوؤں میں بازو ڈالے اس منظر سے لطف اندوز ہو رہے ہیں۔ کہ یکایک کسی نے پیچھے سے آ کر جمشید کو نیچے دھکیل دیا۔ جمشید نے دریا میں گرتے ہی مُڑ کر دیکھا کہ خورشید شمشاد کو بھی نیچے دھکیلنے کی کوشش کر رہی ہے۔ جمشید

نے لجاجت سے چلا کر کہا " خورشید ! خور ــــ

شمشاد جو جمشید کے چہرے کی حالت غور سے دیکھ رہی تھی۔ خورشید کا نام سُنکر چونک اُٹھی۔ جس طرح لاجونتی انسانی جسم کے مس سے مرجھا جاتی ہے۔ اسی طرح شمشاد بھی اس آواز کو سُنکر مرجھا گئی اور اس کے بازو بے اختیار جمشید کے سر کے نیچے سے سرک گئے۔

(۶)

محمود اور جمشید بچپن میں ایک ساتھ کھیلا کرتے تھے۔ وہ دونوں ایک ہی محلے کے رہنے والے تھے۔ اور دونوں کے باپ بھی آپس میں دوست تھے۔ محمود کا باپ ایک متمول سوداگر تھا۔ اور چونکہ محمود اپنے والدین کا ایک ہی بیٹا تھا۔ اس لئے اس کی ہر خواہش ایک حکم تھی۔ اور اس کی ہر آرزو کا پورا ہونا اس کے والدین کا فرض۔ اسی وجہ سے وہ نہایت ضدی اور خودسر تھا۔ اور چاہتا تھا کہ اس کے احباب بھی اس کے احکام سے سرتابی نہ کریں۔ اگرچہ دونوں کی دماغی اور قلبی کیفیات بہت ہی مختلف تھیں۔ لیکن پھر بھی وہ دوست تھے۔ اور ان کو ایک دوسرے سے نہایت گہری محبت تھی۔

جمشید آخر ایم۔ اے کرنے کے بعد پروفیسر ہو گیا اور محمود جو انٹرنس پاس کرنے کے بعد آوارہ سا ہو گیا تھا اب بھی آوارہ ہی تھا۔ باپ کی موت کے بعد اسکے حصے میں کشیر جائداد آئی۔ اور اب برائے نام اپنے باپ کی دُکان بھی چلاتا تھا۔ دونوں کشمیر میں بھی ایک ساتھ ہی آئے ہُوئے تھے۔ ایک فلسفے کی کتاب لکھنے اور دوسرا قالینوں کی خرید و فروخت کے پردے میں شہوانی خواہشات کو پورا کرنے کے لئے۔ چونکہ دونوں کے مقاصد بالکل مختلف تھے۔ اس لئے محمود نے جمشید کے ساتھ ٹھہرنا مناسب نہ سمجھا۔ اور کچھ بہانہ تراش کے علیحدہ بوٹ لے لیا۔

محمود اور جمشید، خورشید کے ہاں سے مختلف اثرات لیکر لوٹے۔ ایک اس شمع کا پروانہ تھا اور دوسرا اس دہکتے ہُوئے جہنّم سے خائف۔ محمود کا وہاں ہر روز کا آنا جانا ہو گیا۔ لیکن جب بھی وہ وہاں جاتا تو خورشید جمشید کے بارے میں سوالات کرتی۔ اور جب وہ سوالات ختم ہو جاتے تو پھر بھی محمود کی طرف ملتفت نہ ہوتی۔ اس کا اوچھاپن اور اس کی دماغی سطح کی پستی خورشید جیسی روشن دماغ اور ذہین عورت کیلئے ناقابلِ برداشت تھی۔ وہ جانتی تھی کہ محمود اس کے لئے دیوانہ ہو رہا ہے لیکن وہ اس مٹی کے تودے کو کیا کرتی۔ ایسے کئی ناتراشیدہ نوجوان اس سے محبت کر چکے تھے۔ اور اب وہ سیر ہو چکی تھی۔ اس کو روپوں کی ضرورت نہ تھی۔ اس کو محبت بھرے الفاظ سُننے کی خواہش نہ تھی۔ وہ اپنی تعریف سُنتے سُنتے اُکتا چکی تھی اب وہ خود مقید ہونا چاہتی تھی۔ وہ ایسی ہستی کی متلاشی تھی۔ جس کے پاؤں میں وہ سر پٹک پٹک کر جان دیدے۔ وہ حکمرانی کرتے کرتے تھک گئی تھی۔ اور اب وہ ان احکام کی منتظر تھی۔

جن کے آگے وہ بے بس ہو جاتے۔ اس کو اب اپنی پرستش کرانے میں لطف نہ ملتا تھا۔ اور وہ چاہتی تھی کہ ایک عقیدتمند پجاری کی طرح باقی کی تمام زندگی صرف کر دے اس لئے محمود کی والہانہ محبت اس کی بیجا خوشامد اور اس کی اوچھی اور بے معنی تعریفیں خورشید پر اُلٹا اثر دکھاتیں۔ اور جوں جوں محمود اس کے پاؤں میں گرتا جاتا تھا وہ اس کو حقارت سے ٹھکراتی جاتی تھی محمود کی آگ ان بے التفاتیوں سے اور زیادہ بھڑک اُٹھتی۔ وہ دیوانہ تھا لیکن خورشید اب خود دیوانہ بننا چاہتی تھی۔

آخر محمود نے جمشید کو ساتھ لے جانا چاہا لیکن جب جمشید نے انکار کر دیا۔ تو وہ مایوسی کے اس انتہائی درجہ پر تھا۔ جہاں خودکشی کے سوا کوئی چارہ نہیں ہوتا۔ محمود نے کہا کہ اگر مرونگا بھی تو خورشید کے سر چڑھ کر اس لئے وہ جھلّاتے ہُوئے درندے کی طرح خورشید کی طرف چلا گیا لیکن وہ یہ دیکھ کر حیران تھا کہ خورشید نہایت تپاک سے مل رہی ہے (محبت بدگمانیوں اور اندیشوں کے لئے زہرِ ہلاہل ہے) اور اس لئے محمود نے اس کو اپنے ہی جذب دل کا نتیجہ سمجھا۔

خورشید نے نہایت گرمجوشی سے کہا " آپ اپنے دعوؤں میں بالکل سچے نکلے۔ مَیں تو اتنی مدّت صرف آپ کو آزما رہی تھی۔"

محمود کا چہرہ تمتما اٹھا اور وہ فرطِ محبت سے پھر اس کے پاؤں پر گر پڑا۔ خورشید نے خود اس کو اپنے ہاتھوں سے اُٹھا کر اپنے آغوش میں لے لیا۔

خورشید نے مزاج پرسی کے بعد کھانا منگوایا لیکن کون کھا سکتا تھا۔ دو چار لقمے توڑ کر محمود سیر ہو گیا۔ خورشید نے ایک بوتل کا کارک اُڑایا اور دو گلاسوں کو ارغوانی بنا دیا محمود آج بیخود تھا۔ اور کبھی کبھی اس کو وہم ہونے لگتا کہ کہیں یہ خواب ہی نہ ہو۔ وہ پُرانا بادہ خوار تھا اُس نے ایک ہی سانس میں تمام گلاس کو خالی کر دیا۔ اس کا مرجھایا ہُوا چہرہ گلاب کے پُھول کی طرح شگفتہ تھا اور اس کی آنکھیں نہایت چمکیلی' وہ دونوں بہت مدت تک پیتے اور پلاتے رہے۔ آخر خورشید نے کہا۔" محمود کیا واقعی تم کو مجھ سے محبت ہے ؟

محمود نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔" کیا ابھی تک شک کی گنجائش باقی ہے"

خورشید۔" مجھے خود اقرار ہے۔ اور میرے دل کی گہرائیوں سے یقین کی صدا اُٹھتی ہے لیکن ———"

محمود (بات کاٹتے ہوئے) " خدارا یہ لیکن اب کہاں سے پیدا ہو گیا۔

خورشید (بات کو جاری رکھتے ہُوئے) " لیکن اگر آپ میری ایک بات پر عمل کریں' تو مَیں بلا تاخیر آپکی ہو جاؤنگی"۔

محمود (جوشِ محبت سے) " کہو خدارا جلدی کہو' تمہارے لئے مَیں طوفانی سمندر اور دہکتے ہُوئے شعلوں میں کُود سکتا ہوں"۔

خورشید کی آنکھیں کامرانی سے چمک اٹھیں "تو کیا تم وعدہ کرتے ہو"

محمود۔ "ہاں اپنی عزّت کی قسم کھا کر وعدہ کرتا ہوں۔"

"تو کیا جمشید کو ہلاک کر سکتے ہو؟" خورشید نے جھٹ پٹ پوچھا۔

محمود یہ سُنکر چونک اُٹھا۔ اور عین اس وقت شمشاد چونک اٹھی تھی جبکہ جمشید خواب میں خورشید ــــــ خور کہہ رہا تھا۔ شراب کا تمام نشہ کافور ہوگیا۔ اور اب وہ ہوش سنبھال رہا تھا۔ وہ مذبذب نگاہوں سے خورشید کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اور اس وقت کا منتظر تھا۔ جبکہ خورشید کہدے کہ یہ سب مذاق تھا۔ لیکن خورشید کی بھڑکتی ہوئی آنکھیں اس کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔

"تو کیا محبت کے تمام دعوے ختم ہو گئے۔ او کمینے اور ذلیل شخص نکل جا' میری بارگاہ میں تجھے ہرگز رسائی نہیں ہوسکیگی۔"

محمود خاموش تھا اور نہیں سمجھتا تھا کہ کیا جواب دے یکایک اس کو جمشید کا انکار یاد آگیا۔ اور اس انکار کو اس نے ایسا پلّے باندھا کہ اب وہ بھی جمشید سے انتقام لینے کے لئے آمادہ ہو رہا تھا۔

جب خورشید نے کہا۔ "کہ تمہیں اس بارگاہ میں ہرگز رسائی نہیں ہو سکتی" تو محمود خورشید کے احکام کی تعمیل کرنے کا فیصلہ کر چکا تھا۔

"ہاں! تمہارے لئے مَیں یہ بھی کر گزرونگا" محمود اور خورشید اس گفتگو میں مشغول تھے۔ اور جمشید کانپتی ہوئی آواز میں شمشاد کو خواب کا تمام ماجرا سُنا رہا تھا۔

(۷)

اب جمشید اور شمشاد ہر روز سیر کے لئے اکٹھے ہی جاتے۔ وہ بہت خوش تھے۔ جیسے کہ دو محبت کرنیوالوں کو ہونا چاہیے۔ جب وہ آپس میں ملتے ہیں۔ سرینگر کے تو تمام مقام دیکھ چکے تھے۔ نشاط باغ، شاہی چشمہ اور شالامار باغ کی سیریں کرتے کرتے وہ اُکتا چکے تھے۔ شمشاد نے ایک دن کہا۔ کہیں باہر چلیں۔ یہاں کے لیل و نہار میں اب کوئی دلچسپی باقی نہیں رہی"۔ جمشید اور شمشاد دونوں نے مضافات میں جانے کا فیصلہ کر لیا اور اس لئے دوسرے ہی روز وہ اسلام آباد' مٹن اور اچھابل کے دورے کے لئے تیار ہو گئے۔ اُنہوں نے تمام ضروری سامان مہیّا کر لیا۔ اور خیمے وغیرہ بھی لے لئے۔ کیونکہ ان مقامات کے آس پاس نہ تو کوئی ہوٹل ہیں۔ اور نہ اچھی سرائیں' اور سیر کا لطف اسی میں ہے۔ کہ وہاں کم از کم دو دو تین تین روز تک قیام کیا جاتے۔ راستے میں عجیب عجیب منظر تھے۔ دُور پہاڑوں پر برف پگھل رہی تھی۔ اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کوئی اپنے سُنہری بال

بکھیرے ہوئے دھوپ میں خشک کر رہا ہے۔ چپے چپے پر چشموں اور آبشاروں کی صدائیں تھیں۔ ہر طرف پانی کی چھوٹی چھوٹی نالیاں بہہ رہی تھیں۔ وہ "وادی شاداں" کے ان مناظر سے لطف اندوز ہوتے ہوئے اسلام آباد پہنچے۔ یہ ایک چھوٹا سا قصبہ ہے۔ جس کا اندرونی حصّہ غلاظت اور تعفن میں سرینگر کے اندرونی حصّے سے کچھ کم نہیں لیکن ان انسانی آبادیوں کو چھوڑکر وہ بھی آب و سبزہ کا مرقع ہے۔ اس کے ایک سرے پر ہندوؤں کا ایک مندر ہے۔ جس کے اردگرد پانی ہی بہتا ہے۔ اور جس کے سامنے وسیع اور خوبصورت تالاب ہے۔ وہاں دو دن کے قیام کے بعد وہ مٹن کی طرف روانہ ہوئے۔ راستے میں کورو پانڈو کے وقت کے غار اور ایک پتھر کے مندر کو جو عین پہاڑ کے پہلو میں تراشا ہوا ہے دیکھتے ہوئے وہ ہندوؤں کے اس متبرک مقام پر پہنچے۔ پجاری نصف میل پیشتر ہی تانگے کے آگے پیچھے بھاگ رہے تھے۔ جب تانگہ وہاں پہنچا تو ایک جم غفیر ان کے گرد تھا۔ یہ سب پجاری تھے۔ اور اپنی سندیں اور مختلف سربرآوردہ اشخاص کے تصدیقی پرچے دکھا رہے تھے۔ وہاں بھی پانی اور سبزے کی کثرت تھی مندر کے اندر ایک تالاب ہے۔ جس میں گوناگوں الوان کی مچھلیاں پلی ہوئی ہیں۔ پجاری گندم کی چپاتیاں لئے ہوئے آجاتے ہیں۔ اور زائرین کے ہاتھوں بیچتے ہیں۔ یا ان کی اجازت

سے خود ہی تالاب میں پھینک دیتے ہیں۔ اور پھر ان سے قیمت یا انعام وصول کر لیتے ہیں۔ جب چپاتی پانی میں پھینکتے ہیں تو تمام مچھلیاں اس پر جھپٹ پڑتی ہیں۔ ایک لمحے کے لئے تالاب میں طوفان سا برپا ہو جاتا ہے۔ وہ آپس میں لڑتی ہیں۔ اور چونکہ ایک ہی چپاتی ہوتی ہے۔ سب ایک ہی جگہ اکٹھی ہو جاتی ہیں۔ شمشاد نے کہا۔ یہ پجاری بھی اپنی مچھلیوں کی طرح مسافروں پر جھپٹ پڑتے ہیں۔ جمشید نے جو اس منظر کو دیکھ دیکھ کر پھر اپنے فلسفیانہ عالم میں چلا گیا تھا۔ کہا "دنیا کی تمام کشمکش انفرادی، قومی یا ملکی بھی اسی اصول پر ہے۔ وہاں چپاتی کی بجائے کوئی اور چیز رکھ دی جاتی ہے اور جس طرح ہم ان مچھلیوں کی کشمکش کو دیکھ دیکھ کر ہنس رہے ہیں۔ اسی طرح وہ ہستیاں جو ہم انسانوں سے بالاتر ہیں، ہماری لڑائیوں اور خونریزیوں کو دیکھ دیکھ کر مسکراتی ہیں"۔ مندر کے عقب میں چند سرسبز ٹیلے تھے۔ تالاب کا تماشہ دیکھنے کے بعد وہ وہاں چلے گئے۔ اور آفتاب کو وہیں وداع کیا۔ اس مقام کی ہوا اسقدر خوشگوار تھی کہ وہ دونوں وہاں تین چار روز کے لئے ٹھہرے۔ وہاں سے انہوں نے اچھابل کا عزم کیا۔ اور چند ہی گھنٹوں میں وہاں پہنچ گئے۔ یہ ان تینوں مقامات میں زیادہ خوبصورت اور دلفریب مقام ہے۔ اس کا راستہ بھی چشموں اور آبشاروں سے معمور ہے اس مقام کے بالکل قریب ایک خوبصورت باغ ہے مسافر

صرف اس باغ کو اچھابل کہدیتے ہیں۔ کیونکہ اس کے علاوہ
تمام قصبہ اسلام آباد کے اندرونی حصّہ کی طرح ہی ہے۔ یہ
باغ زائرین کا استقبال اپنی پُرشور آبشار سے کرتا ہے اور
یہ آبشار اس تالاب میں گرتی ہے۔ جو اس باغ کے سامنے
واقع ہے۔ باغ میں کئی تالاب ہیں۔ جن پر چنار کے گھنے
سایہ دار درخت جُھکے رہتے ہیں۔ مختلف رنگوں کے پُھول
پرندوں کے نغمے جو آبشاروں کی صداؤں میں مل جل جاتے
ہیں۔ چنار کے گھنے اور بے شمار درخت، مچھلیوں کی آنکھ مچولی
سبزے کی فراوانی اور نزاہت اور پھر اس کے عقب میں
چیر کے خوبصورت درختوں سے لدا ہُوا ٹیلا نہایت
خوشگوار منظر ہے۔ باغ کا ایک حصّہ مچھلیوں کی بقاو حفاظت
کے لئے مخصوص ہے۔ وہاں بھی پانیوں کا شور اور سبزے
کی فراوانی ہے۔ جب ٹیلے پر چڑھتے ہیں تو ہوا چیر کے
درختوں سے مس کرتی ہُوئی نہایت ولولہ انگیز محسوس ہوتی
ہے۔ رگوں میں خون دوڑتا ہے۔ اور چہرے پر سرخی پھیل
جاتی ہے۔ اسی ٹیلے کے پانیوں سے تمام باغ سیراب
ہوتا ہے۔ اس کا پانی نہایت ہی خنک اور شیریں ہے۔
جمشید نے کہا کہ یہاں کم از کم ایک ہفتے کے لئے
قیام ہونا چاہئے۔ انہوں نے باغ کے عین سامنے اپنے
خیمے نصب کر لئے وہ ہر صبح اور ہر شام اس ٹیلے پر بیٹھ کر
آفتاب کا استقبال اور اس کو وداع کرتے کئی کئی گھنٹوں
تک وہیں بیٹھے گزشتہ اور آئندہ زندگی کے متعلق گفتگو کرتے
رہتے۔ شمشاد کو اب جمشید کی محبت کا پُورا یقین تھا۔ اس لئے
اُس نے ایک روز کہا۔ "محبت کی بارگاہ میں ظلمت و نور
شاہی و گدائی اور شرافت و رذالت ایک ہی ہیں۔ جمشید
مجھے تم سے اور تمہیں مجھ سے محبت ہے۔ لیکن اب تک
تم مجھے ایک حسن فروش ہی تصوّر کرتے رہے ہو۔ اور حقیقت
بھی یہی ہے لیکن اگر میری داستان سُنو تو تم شاید خوشی اور
افسوس کے آنسو بہاؤ۔ میرا باپ ایک مشہور بیرسٹر تھا جس
کا نام لیکر اب مَیں اس کی رُوح کو تکلیف نہیں دینا چاہتی۔ وُہ
پچیس برس کی عمر میں انتقال کر گیا۔ اس کی بیوی جو حسین
جمیل اور صحت مند تھی۔ سولہ سال کی عمر میں بیوہ ہو گئی
اور اب تم سُنکر حیران ہو گے کہ میرا باپ اور میری ماں دونوں
برہمن تھے۔ اور اگرچہ میرا باپ تو نہایت روشن خیال تھا
لیکن اس کے سسرال والے پُرانی لکیر کے فقیر تھے۔ اس لئے
اُنہوں نے اپنی لڑکی کو دوسری شادی کرنے کی اجازت
نہ دی۔ شاید آپ کو معلوم نہ ہو۔ لیکن جو حال بیواؤں کا ہندوؤں
کی سوسائٹی میں ہوتا ہے وہ ناگفتہ بہ ہے۔ گھر کے تمام
ادنے اور رذیل کام انہیں کے سپرد ہوتے ہیں۔ اور پھر
کھانے کو سب سے بُری خوراک اور پہننے کو پھٹے پُرانے
اور میلے کچیلے کپڑے دِئے جاتے ہیں۔ فطرت ان زنجیروں
میں کب تک جکڑی جاسکتی ہے۔ شاید تم میری داستان

کے انجام کو خود ہی سمجھ گئے ہو گے" شمشاد یہ باتیں کر رہی تھی اور اس کی آنکھیں نمناک تھیں۔ جمشید حیرت اور استعجاب سے مُنہ کھولے ہُوئے سُن رہا تھا۔

جمشید نے سنبھل کر کہا۔" ہاں دنیا کے انقلابات ایسے ہی ہیں۔ جب ابراہیم آذر کے ہاں پیدا ہو سکتا ہے جب نوح کا بیٹا کافر ہی رہ سکتا ہے۔ جب لنکن سا گداگر امریکہ کا صدر بن سکتا ہے۔ جب شہنشاہ نپولین ایک معمولی قیدی کی حیثیت میں اس زندگی کو خیرباد کہتا ہے تو کوئی تعجب نہیں اگر تمہاری خاندانی زندگی میں ایسے انقلابات پیدا ہو گئے۔ لوگ حسن فروشوں کو نفرت اور حقارت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ لیکن اگر انہیں زہد و تقویٰ کے مجسموں کی ایسے ہی حالات میں تربیت کی جائے تو وہ دُنیا میں کیا کچھ گل نہ کھلائیں۔ اگر غریب کو اس لئے حقیر سمجھا جائے کہ وہ غریب کے ہاں پیدا ہُوا ہے۔ یا جاہل کو اسلئے ٹھکرا دیا جائے کہ وہ جاہل کے ہاں پیدا ہُوا ہے تو اس سے زیادہ غلطی کونسی ہو سکتی ہے۔ اگر یہ اس غریب یا جاہل شخص کے اختیار کی بات ہوتی تو وہ کبھی اپنے موجودہ والدین کے ہاں پیدا نہ ہوتا۔ پیدائش بچپن اور جوانی کے حالات ہی ایسے ہوتے ہیں۔ کوئی اختیار نہیں ہوتا۔ اور جو ہماری زندگیوں کو مخصوص سانچوں میں ڈھال دیتے ہیں کیا ہم اس عورت سے زہد و تقویٰ کی توقع کر سکتے ہیں۔ جو ایک فاحشہ عورت کے ہاں پیدا ہوتی ہے۔ جس کے کان سب سے پہلے ساز اور سارنگی کی صدائیں سُنتے ہیں اور جس کی آنکھیں سب سے پہلے جام و مینا اور بوس و کنار کے مناظر دیکھتی ہیں۔ پھر اس کا بچپن بھی انہیں رنگ رلیوں کو دیکھتے ہُوئے گزر جاتا ہے۔ اور جب شباب حسن و کشش کے تمام خزانوں کو اس کی ہر ادا پر نثار کر دیتا ہے۔ تو پھر کیا تعجب ہے اگر وہ عفت و عصمت کو چند لمحوں کی لذت کے لئے فروخت کر دیتی ہے۔ کیا وہ اس کے علاوہ کچھ اور بھی کر سکتی ہے۔ تو پھر اس مجبور و لاچار ہستی کو کیوں ہدف ملامت بنایا جائے۔"

اس کی آواز بہت بلند ہو رہی تھی اور وہ ابھی اس مضمون پر بہت کچھ کہنا چاہتا تھا۔ لیکن شمشاد نے بات کاٹتے ہُوئے کہا۔" شام ہو چکی ہے۔ اور اب ہمیں واپس لوٹنا چاہیئے۔ شام کے وقت مَیں تو ان درختوں کو دیکھ دیکھ سنسنی سی محسوس کرتی ہوں۔ صبح کے وقت یہی درخت آغوش محبت کھولے ہُوئے معلوم ہوتے ہیں۔ لیکن اس وقت کسقدر ہیبتناک ہیں۔"

(۸)

" اگرچہ آسمانی قوانین کے ماتحت ہماری زندگیاں صحیح طور پر وابستہ ہیں۔ لیکن اب ان کو انسانی قوانین کے تحت میں لے آنا چاہیئے۔"

جمشید اور شمشاد اچھابل باغ کے اس ٹیلے پر بیٹھے ہوئے تھے کہ جمشید نے خاموشی کے سلسلے کو توڑتے ہوئے کہا۔

شمشاد (فرطِ مسرت سے) تو دیر کس بات کی ہے۔ کل صبح ہی یہ بات بھی طے ہو جاتے۔ اُف میرا دل ان رسومات سے کس قدر گریز کرتا ہے۔ اس لئے نہیں کہ میں اپنے تعلقات کو دشوار کرنا نہیں چاہتی۔ بلکہ صرف اس لئے کہ ہمارے تعلقات جو آسمانی بادشاہت کے نزدیک مستحکم اور مقدس ہیں۔ ابھی تک ان ارضی دائم التغیر اور فانی قوانین کے منت کش ہیں"

جمشید، "تو پھر کل ٹھیک ہے تاکہ پھر ہماری زندگیاں مادی اور روحانی نگاہ میں بالکل ایک ہی ہو جائیں۔

وہ دونوں چند لمحوں کے لئے خاموش تھے۔ شمشاد چشمے کو دیکھ رہی تھی۔ اور اس کا خیال مستقبل کے تاریک پردوں کو زرنگار بنا رہا تھا۔ اس کی انگلیاں پتھر سے کھیل رہی تھیں۔ اور وہ اپنی پنسل سے ان پر مختلف نقوش بناتی جاتی تھی۔ حتٰے کہ اس نے دیکھا کہ تمام دھواں ملکر ایک جگہ فضا میں معلق ہو گیا ہے۔ اس نے وہاں ایک خیالی محل تعمیر کیا۔ جہاں وہ اور شمشاد دونوں بیٹھے ہوئے تھے۔ یکایک وہ تمام دھواں ایک بلبلے کی طرح پھوٹ کر ادھر اُدھر بکھر گیا۔

وہ دونوں انہیں موہوم محلات کی تعمیر میں مشغول تھے کہ یکایک کسی نے پیچھے سے جمشید کو نیچے دھکیل دیا وہ لڑھکتا لڑھکتا چشمے کے پانی میں آگرا۔ ابھی وہ ہوش میں تھا کہ اُس نے مڑ کر دیکھا۔ خورشید اور محمود شمشاد کو نیچے دھکیل رہے ہیں۔ اس کے مُنہ سے بے اختیار چیخ نکلی۔ خورشید خور ـــــ وہ یہ کہتا کہتا بیہوش ہو کر ایک بلبلے کی طرح پانی میں فنا ہو گیا۔ شمشاد پتھر کا بُت بنی ہوئی تھی۔ وہ خورشید اور محمود کے زور لگانے کے بغیر ہی نیچے لڑھک رہی تھی۔

محمود نے دیوانہ وار قہقہہ لگا کر کہا "بس شرط پوری ہو گئی"

خورشید صرف شمشاد کو ہلاک کرنا چاہتی تھی لیکن جب اُسنے جمشید کو فنا ہوتے دیکھا اور خود اسکے لبوں سے اپنا نام سُنا تو اس کی محبت پھر دو چند ہو کر عود کر آئی۔ محمود کو وہ نہایت ہی بدبخت سمجھتی تھی۔ اور بالخصوص اب جبکہ اُس نے اپنے عزیز ترین دوست کو بھی دغا دی خورشید نے پستول کا ایک فائر کرتے ہوئے کہا "ہاں تمام شرطیں پوری ہو گئیں۔ اور اب تمہارا کام بھی تمام ہونا چاہئے" اور محمود بھی لڑھکتا لڑھکتا اپنے دوست جمشید سے جا ملا۔ تاریکی پھیل رہی تھی اور خورشید ان تینوں کو دیر تک دیکھتی رہی۔ حتیٰ کہ وہ صرف بلبلے دکھائی دینے لگے۔ چند ہی لمحوں میں وہ بلبلے بھی غائب ہو گئے اور اب تاریکی، دہشت اور سنسناہٹ کے سوا کچھ نہ تھا۔ وہ بھی اسی تاریکی میں درختوں کے جھنڈ میں کہیں غائب ہو گئی۔

اثر صہبائی

تخیلات

تو جو ہو پاس بلائیں نہ پری سے بھی آنکھ
تیرے ہوتے نکریں بات کسی حور سے ہم

یہی عالم ہے تو ہو جائیگا پیدا اک حشر
اپنے نالوں کو ملا دینگے کبھی صور سے ہم

رکھتے ہیں اپنے مقدر سے تمنا اتنی
دیکھ لیں جلوۂ دیدار کبھی دور سے ہم

بادہ و جام کی ساقی ہے تمنا کس کو
مست و بیخود ہیں تری نرگس مخمور سے ہم

سہل تھی عشق کی ہر منزلِ دشوار مگر
پھر گئی تیری نگہ ہو گئے مجبور سے ہم

سرفروشی کے لئے شرط ہے ایمائے حبیب
ورنہ بیگانہ نہیں شیوۂ منصور سے ہم

اختلافِ جذبات باتحاد قوافی

مرا سینہ ہے مشرق آفتاب داغ ہجراں کا
طلوعِ صبح محشر چاک ہے میرے گریباں کا
ناسخ

ازل سے سلسلہ ہے اس جنونِ فتنہ ساماں کا
شگافِ خامۂ کن چاک ہے میرے گریباں کا
اسیر

جنوں سے دیکھو رتبہ مرے حال پریشاں کا
قدم بوسی کو آیا چاک تا دامن گریباں کا
جرأت

خدا جانے یہ دل کشتہ ہے کس اندازِ داماں کا
کہ ہے چاک کفن کی شکل چاک اس کے گریباں کا
مصحفی

رواں رکھتا ہے خوں آنکھوں سے ہجر اک مہر تاباں کا
شفق آلودہ رہتا ہے ہلال اپنے گریباں کا
آتش

شامی

نفسیات اور مومن

انسان کی حیات شاعرہ میں جسقدر افعال ممد و معاون ثابت ہوتے ہیں۔ ان میں سے مفردات جذبات یعنی لذت والم کا رتبہ سب سے اہم ہے۔ اس حقیقت کی تہ میں یہ نکتہ مضمر ہے کہ انسان کی حیاتِ شاعرہ کو تکمیل تک پہنچانے کے لئے چند ایسے احساسات کی ضرورت ہے۔ جو مفردہ طور پر اس کی فطرت میں ودیعت کئے گئے ہوں۔ اور جو اس کے اعصاب میں اس طرح جاگزیں ہو چکے ہوں کہ وہ آسانی سے ان کے ذریعے انتشار اور اجتماع کی ان قوتوں میں تمیز کر سکے جو بالواسطہ یا بلاواسطہ اس کی زندگی کے لئے تخریبی یا تعمیری عنصر رکھتی ہوں۔ اس کام کو پورا کرنے کے لئے لذت والم کے احساسات خلق کئے گئے ہیں۔ ان کے ذریعے ہم ہر وقت ان افعال میں تمیز کر سکتے ہیں۔ جو ہمارے لئے مضرت رساں ہوں۔ جو چیزیں کسی حیثیت سے اذیت و انقباض پیدا کرنے کی محرک ہوتی ہیں یا جن سے ہمیں کسی صورت میں کوئی جسمانی یا ذہنی کرب پہنچتا ہے۔ بالعموم وہی ہماری حیات کے لئے مضرت رساں ثابت ہوتی ہیں۔ اور از بسکہ انسان ہمیشہ انہی احساسات کی پیروی کرتا ہے۔ جن کی وجہ سے اسے انبساط میسر ہو۔ فطرت نے لذت والم کو ہمارا رہبر مقرر کر دیا ہے۔ کہ ہم ان کے ذریعے معاونِ حیات افعال سے مدد لے سکیں۔ اور مضرِ حیاتِ افعال کو ترک کر سکیں۔ یہی احساسات جب جذبات بن جاتے ہیں۔ تو غم و مسرت کہلاتے ہیں۔ اس سے ثابت ہوا کہ غم و مسرت ہی ایسے جذبات ہیں جو حیاتِ شاعرہ کی تکوین کے ساتھ ہی وجود میں آتے ہیں

یہاں ایک دلچسپ سوال پیدا ہوتا ہے کہ غم و مسرت کے جذبات میں سے کونسا جذبہ انسانی فطرت میں سب سے پہلے پیدا ہوتا ہے۔ ماہرین کے ایک گروہ کا خیال ہے کہ غم کو مسرت پر تقدم حاصل ہے۔ وہ اپنے نظریے پر یہ دلیل قطعی لاتے ہیں۔ کہ بچہ دنیا میں آتے ہی روتا ہے دوسرا گروہ اس کے مقابلے میں یہ کہتا ہے۔ کہ بچہ اس وجہ سے نہیں روتا۔ کہ غم کو مسرت پر تقدم حاصل ہے۔ بلکہ ماحول کی اجنبیت کی وجہ سے مجبور ہو کر بہر صورت کوئی بھی نظریہ درست ہو لیکن اس بات سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ غم انسان کی حیاتِ شاعرہ میں روحِ رواں کی طرح جاری و ساری ہے۔ غالب کا یہ شعر آپ نے سن ہی رکھا ہوگا۔ ے

قیدِ حیات و بندِ غم اصل میں دونوں ایک ہیں
موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں

لیکن مومن کا مندرجہ ذیل شعر نفسیاتی عنصر کی زیادہ مفصل تشریح کرتا ہے۔ کہتا ہے ؎

درد ہے جاں کے عوض ہر رگ و پے میں ساری
چارہ گر ہم نہیں ہونے کے جو درماں ہوگا

غم کی تمام کیفیات کے متعلق ایک اور شعر بھی ہے ہر چند کہ اس کی کوئی مکمل نفسیاتی تحلیل نہیں کی جا سکتی۔ لیکن بن کہے رہ نہیں سکتا۔ کیونکہ غم کے ارتقا کے متعلق اس میں بھی کافی مواد موجود ہے۔ کہتے ہیں ؎

دت کی آس پہ جینا شب ہجراں ہوگا
آخر امید ہی سے چارۂ حرماں ہوگا

جذبات کے ارتقا کا سب سے اہم قانون شاید یہ نکتہ ہے۔ کہ جذبہ کے طاری ہونے کے بعد انسان اپنے تمام تجربات کو جذبے کے رنگ میں محسوس کرتا ہے۔ جس وقت انسان ایک قوی جذبے سے متاثر ہو چکتا ہے۔ تو پھر وہ دُنیا کی ہر ایک شے کو اپنے جذبے کے زاویۂ نگاہ سے دیکھتا ہے۔ شگفتگی کا دور طاری ہو تو کائنات مسکراتی ہوئی دکھائی دیتی ہے اور غم طاری ہو۔ تو دو جہان آنکھوں میں تاریک معلوم ہوتے ہیں۔ شاعر چونکہ عام آدمیوں سے زیادہ حساس ہوتا ہے اس لئے اس کی یہ حالت بہت سریع اور تیز ہوتی ہے دورۂ غم میں شفق پھولے۔ تو اسے اپنی آرزوؤں کا خون جھلکتا ہُوا نظر آتا ہے۔ مینہ برسے تو اسے اپنے آنسوؤں کی جھڑی یاد آتی ہے۔ پھول مُسکرائیں تو اسے زہر خند معلوم ہوتا ہے۔ یہ کوئی شاعرانہ مبالغہ نہیں حقیقت میں انسان انتہائے غم میں اسی طرح محسوس کرتا ہے۔ مومن کے چند ایک شعر سُنئے ؎

یہ گلستاں سرائے تماشا نہیں رہا
وہ تو بہارِ گلشنِ دُنیا نہیں رہا

افسوس کوئی پردہ نشیں پردہ در نہیں
وہ حسن جس سے عشق ہو رسوا نہیں رہا

حیف اپنی تلخ کامی و شوریدہ طالعی
جس سے کہ زندگی کا مزا تھا نہیں رہا

اے چرخ چاہنے سے رہے روزگار کو
کیا چاہیں روزگارِ تمنا نہیں رہا

اپنی خرابیوں کو کہاں جاکے روئیے
وہ شمع روئے انجمن آرا نہیں رہا

دل میں جگہ نہ ہونے کا کس سے گلہ کروں
وہ قدر دانِ شکوۂ بے جا نہیں رہا

کس کو گلے لگائیے اے شوق ہم کنار
وہ خوش گلوئے سینہ مصفا نہیں رہا

کس سے نبھا ہے کہ سوائے وفات کے
دُنیا میں ہائے نام وفا کا نہیں رہا
اب کس کو دیکھئے کہ کسی کو نہ دیکھئے
وہ پردہ سوزِ چشمِ تماشا نہیں رہا
اس نورِ چشمِ حسن کو کیونکر نہ روئیے
آنکھوں میں آئے اب کوئی ایسا نہیں رہا

مندرجہ بالا نکتے کے ضمن میں ایک اور لطیف حقیقت پنہاں ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ جذبہ اور وقوف میں نسبتِ معکوس پائی جاتی ہے۔ ہر چند کہ جذبات اور وقوف کو قطعاً ایک دوسرے سے علیحدہ نہیں کیا جاسکتا۔ لیکن یہ ایک باطل نما حقیقت ہے۔ کہ انسان کے جذبات جسقدر تیز و تند ہوتے چلے جاتے ہیں۔ اسی قدر تفکر کے قوائے معطل ہوتے جاتے ہیں۔ اس حالت میں انسان کئی ایسی باتیں کہہ بیٹھتا ہے۔ کئی ایسے افعال کر بیٹھتا ہے۔ جو اسے وقوف کی حالت میں یقیناً مضحک معلوم ہوتے ہیں۔ حالی کا مندرجہ ذیل شعر اس حقیقت کا آئینہ دار ہے۔ کہ اکثر اوقات جذبات وقوف سے اس قدر دُور جا پڑتے ہیں۔ کہ ضمناً کئی دوسرے جذبات پر بھی حاوی ہو جاتے ہیں۔ شاعر میں اور محبوب میں رنجش ہو گئی ہے۔ کسی خاص جذبے کے زیرِ اثر آدابِ محبت فراموش ہو جاتے ہیں۔ اور شاعر کئی ایسی باتیں کہہ بیٹھتا ہے۔ جن کے متعلق حالتِ وقوف میں ایسے پچھتانا پڑتا ہے ؎

رات ان کو بات بات پہ سو سو دئے جواب
مجھ کو خود اپنی ذات پہ ایسا گماں نہ تھا

غالب کا ایک شعر اس سے بھی زیادہ لطیف ہے۔ محبوب ان سے اندازِ طنز میں باتیں کر رہا ہے اور وہ جذبہ عشق کے ماتحت اس کی باتوں میں بغیر انتہا کئے اس کی ہاں میں ہاں ملاتے جاتے ہیں۔ اور چونکہ ہیں اُس وقت جب موقع ہاتھ سے نکل جاتا ہے فرماتے ہیں ؎

نہ کہو طعن سے پھر تو کہ ہم ستمگر ہیں
ہمیں تو خو ہے کہ جو کچھ کہو بجا کہئے

ایک اس سے بھی زیادہ لطیف شعر تو مشہورِ عام ہو گیا ہے ؎

گدا سمجھ کے وہ چپ تھا مری جو شامت آئی
اُٹھا اور اُٹھ کے قدم میں نے پاسباں کے لئے

مومن کے ہاں بھی شاذ و شاذ ایسی مثالیں پائی جاتی ہیں۔ لیکن حقیقت یہ ہے۔ کہ وہ نفسیاتی نکتہ نگاہ سے ایسی دلچسپ اور جاذب نظر نہیں۔ وہ ایک شعر لکھے دیتا ہوں ؎

ٹکٹکی لگائی ہے اب تو گو ہو رسوائی
تا وہ گر ادھر دیکھیں مجھ کو دیکھنا دیکھیں

دونوں کا ایک حال ہی یہ مدعا ہو کاش
میرا خط اس نے بھیج دیا کیوں جواب میں

دیا اس بدگماں کو طعنہ غیر
غضب ہے کیا کہوں اپنی زباں کو

جذبات کی تکوین کے لئے ضروری ہے کہ نفس انسانی کسی جذبے سے متاثر ہونے کے لئے تاثر سے پیشتر کسی اور قوی تر جذبے سے متاثر نہ ہو۔ ورنہ ظاہر ہے کہ جس جذبہ کو تاخر حاصل ہے۔ وہ بالعموم قوی تر جذبے کے ماتحت رہ کر کام کریگا۔ اگر غور سے دیکھا جائے تو حقیقت میں یہ اُسی قانون کی تشریح ہے۔ جس کی وجہ سے انسان کوئی جذبہ طاری ہونے کے بعد تمام چیزوں کو اپنے جذبات کے زاویہ نگاہ سے دیکھتا ہے۔ اس حقیقت کا بیان اس شعر میں کیا گیا ہے۔ کہ

دشنام یار۔ طبع حزیں پر گراں نہیں
اے ہم نفس نزاکت آواز دیکھنا

انسان کی فطرت میں انانیت کا جذبہ ایک ایسا جذبہ ہے۔ کہ اگر انسانی مجموعہ اعمال کا تجزیہ کیا جائے تو آخر کار معلوم ہوگا کہ بہت سے افعال کے لئے محرک عمل اسی جذبے کی ایک صنف ہوتی ہے۔ یعنی خود نمائی۔ انانیت دو طرح کی ہوتی ہے۔ ایجابی اور سلبی۔ انانیت ایجابی بنفسہٖ دو اصناف میں منقسم ہے۔ ایک صنف غرور کہلاتی ہے۔ دوسری خود نمائی۔ جس وقت انسان دوسروں کی تعریف سے بے نیاز ہو کر اپنی ذات پر اعتماد رکھے تو اس کیفیّت کو غرور کہا جاتا ہے۔ لیکن جب انسان اپنے ذاتی محاسن کے متعلق دوسروں سے داد طلب ہو تو یہی جذبہ خود نمائی کہلاتا ہے۔ اوّل الذکر جذبہ بالعموم مردوں میں اور آخر الذکر بالعموم عورتوں میں پایا جاتا ہے۔ صنف نازک کی اسی کمزوری سے کتنی بار فایدہ اُٹھایا جا چکا ہے۔ مومن بھی ایک جگہ اس حقیقت کا اظہار کرتا ہے ؎

غیر کو سینہ گلے سے سیمبر دکھلا دیا
تم نے کیا کچھ کس کو اپنی بات پر دکھلا دیا

"خورشید"

برقِ بلا

کیسا عجیب سفر تھا۔ خاصکر آغاز نہایت دلفریب تھا۔ اپنی طرف سے مَیں یہ کہہ سکتا ہوں کہ مَیں نے کوئی بحری سفر ایسے مبارک تاثرات کے ساتھ اس وقت تک نہ کیا تھا۔ پرآونس بہت تیز، آرام دہ اور بحراوقیانوس میں سفر کرنے والا جہاز ہے۔ اور اُس کے ملاح اور کپتان نہایت خوش مزاج، اور شگفتہ طبیعت ہیں۔ اس موقع پر مسافروں کی تعداد مختصر تھی۔ باہمی تعارف کے مراسم ادا ہونے شروع ہُوئے جس طرح کوئی شخص کسی غیر معلوم جزیرہ میں پُہنچکر وہاں کے باشندوں سے دوستی پیدا کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ ہم لوگ بھی تمام دُنیا سے علیحدہ ہو کر ایک دوسرے سے متعارف ہونے کیلئے مجبور تھے چنانچہ رفتہ رفتہ ہماری ملاقاتیں بے تکلفانہ ہوتی گئیں۔ کیا آپ نے کبھی اس نکتہ کی محیر العقول ندرت پر غور کیا ہے۔ کہ ایک مختصر جماعت جس کا ہر فرد ایک روز قبل ایک دوسرے کی صورت سے ناآشنا تھا یک بیک چند روز کے لئے بحرِ ناپیدا کنار اور فلک دوّار کے درمیان سمندر کے طوفان خیز تلاطم، موجوں کے مہیب حملوں، باد مخالف کے پُر غیظ جھونکوں یا سکون آب کی پریشان کن خاموشی سے مقابلہ کرنے کے لئے اکٹھی ہو جائے؟

فی الحقیقت ہستی بذات خود اپنی نوعیت، طوفان خیز تلاطم، اہمیت۔ یکسانی اور گوناگونی کے اجتماع میں ایک مختصر غم افزا افسانہ کی حیثیت رکھتی ہے۔ اور غالباً یہی وجہ ہے کہ ہم اپنی مختصر چند روزہ زندگی کے لمحاتِ طرب کو انتہائی تنوع سے استعمال کرتے ہیں۔

حال ہی میں ایک ایسی ایجاد ہُوئی ہے جس نے بحری سفر میں حیرت انگیز انقلاب پیدا کر دیا ہے۔ یہانتک کہ یہ چھوٹا سا متحرک اور تیرنے والا جزیرہ جسے ہم اسوقت تک دُنیا سے علیحدہ خیال کرتے تھے۔ اب دُنیا سے وابستہ رہتا ہے۔ وہ کیا؟ لاسلکی پیغام رسانی کا آلہ ہم کو اس کا پیغام ایسے پُراسرار طریق سے معلوم ہوتا ہے کہ ہم اُسے بجا طور پر دوسری دُنیا کا پیغام کہہ سکتے ہیں۔ قوت متخیلہ بھی ان تاروں کا تصوّر کرنے سے لاچار ہے۔ جس کے بازوؤں پر یہ نادیدہ حقیقت پرواز کرتی ہُوئی ہم تک پہنچتی ہے۔ یہ راز نہایت ناقابلِ فہم اور شاعرانہ انداز لئے ہُوتے ہے۔ اور سوائے اس کے کہ ہم اسے ہوائی تاروں سے تشبیہ دیکر دل بہلالیں اور کوئی صورت اس معجزہ کی تفصیل بیان کرنے کی نہیں ہو سکتی۔ چنانچہ ہمیں روانگی کے بعد ہی ایسا معلوم ہونے لگا

کہ گا ہے گا ہے ہمارے عقب میں کسی کی یاد کرنے والی آواز آرہی ہے۔ اور کبھی کبھی کسی دوست کی آواز اس برِ اعظم سے ہمارے پاس پُہنچ جاتی جس کو ہم چھوڑ آئے تھے۔ دو دوستوں نے تو مجھ سے گفتگو کی۔ اور دس بیس نے مبارکباد یا جُدائی پر رنج وافسوس کے پیغامات ارسال کئے۔

دوسرے دن ایک طوفان خیز شام کو جب ہم لوگ ساحلِ فرانس سے پانچ سو میل کے فاصلہ پر تھے۔ لاسلکی پیام نے ہم لوگوں کو حسب ذیل اطلاع دی۔

"آرسین لوپن آپ کے جہاز کے درجہ اوّل میں سفر کر رہا ہے۔ اُس کے بال سنہرے اور داہنے بازو پر ایک زخم ہے اُس کے نام کا آغاز رسے" عین اسی وقت ایک دہشت خیز چمک سوادِ فلک میں نمودار ہوئی۔ برقی لہریں بند ہوگئیں۔ اور بقیہ پیغام ہم لوگوں تک پہنچنے سے قاصر رہا۔ ہم لوگوں کو صرف آرسین لوپن کے اختیار کردہ نام کا صرف پہلا حرف جس کے پردہ میں وہ اپنی حقیقت کو پوشیدہ رکھتے ہوئے سفر کر رہا تھا معلوم ہوسکا۔

اگر خبر اس کے علاوہ کچھ اور ہوتی تو اس میں ذرا کلام نہیں کہ یہ راز محرر تار برقی کپتان اور اس کے ماتحت افسروں کے علاوہ اور کسی کو معلوم نہ ہوسکتا لیکن بعض ایسے واقعات ہیں جو سخت سے سخت فیصلہ کو بھی تذبذب میں ڈالدیتے ہیں اس سے پیشتر کہ خورشید خاور اپنے رُخِ تاباں کو نقاب پوش کرے کوئی بھی نہ بتا سکتا تھا۔ کہ آخر یہ خبر کس طرح اور کیونکر ہمارے جہاز میں پھیل گئی۔ مگر امر واقعہ یہ تھا۔ کہ شام سے پیشتر ہم سب لوگوں کو علم ہوگیا کہ مشہور و معروف آرسین لوپن ہمارے درمیان موجود ہے۔

آرسین لوپن اور ہمارے درمیان! وہ پُراسرار نقب زن جس کے کارنامے مہینوں سے تمام اخبارات میں شائع ہورہے تھے۔ وہ محیر العقول ہستی جس کے مقابل ضعیف گینمارڈ، ہمارا بہترین سراغرساں تا زیست دشمنی کا پیغام لیکر میدان میں اُترا تھا۔ اور جس کے افسانے آجتک ایسے دلفریب انداز سے بیان کئے جاتے ہیں۔ آرسین لوپن وہ نکتہ سنج شریف انسان، جو اپنی دست درازیاں شہر کے مشہور و معروف محلات۔ مکلّف و مزیّن باوضع نشستگاہوں تک محدود رکھتا ہے۔ اور جو ایک شب۔ بیرن اسکارسینس کے محل میں نقب لگانے کے بعد اپنا ملاقاتی کارڈ چھوڑ کر خالی ہاتھ چلتا بنا تھا۔

آرسین لوپن
شریف بدمعاش

اس کے نیچے یہ الفاظ پنسل سے اضافہ کر دئے گئے تھے:

"جب آپ نادراشیاء رکھنا پسند کرینگے میں حاضر ہوجاؤنگا"

آرسین لوپن، وہ ہزاروں بہروپ میں ظاہر ہونے والی ہستی، کبھی موٹر کا ڈرائیور، کبھی مارسیلز کا قلی، تو کبھی روسی ڈاکٹر،

اور کبھی اسپین کا مشہور معرکہ آرا تیر انداز!

ذرا اُس وقت کے منظر کا تصور کیجئے:- آرسین لوپن
بحر اوقیانس میں رواں جہاز کے محدود رقبہ کے اندر چل پھر رہا ہے
یہی نہیں بلکہ اس سے بھی کہیں زیادہ محدود اور مختصر احاطہ کے
اندر جو صرف درجہ اوّل کے مسافروں کے لئے مخصوص تھا۔
جہاں ہر وقت کوئی نہ کوئی اس سے مل سکتا ہے۔ یعنی جہاز
کا کوئی کمرہ یا نشستگاہ یا تمبا کو نوشی کا کمرہ! کیا وہ شریف آدمی
جو اس جگہ تفریح میں مشغول ہے۔ آرسین لوپن نہیں۔ یا یہی
قریب والا شخص، یا میرے پاس میز کے قریب بیٹھا ہوا
آدمی میرے کمرہ ہی کا دوسرا ساتھی مسافر۔

اور ذرا خیال فرمایئے کہ تذبذب پانچ روز تک قائم
رہنے والا ہے۔ دوسرے دن مس نیلی نے کہا۔" اُف یہ
نہایت پریشان کن ہے۔ مجھے امید ہے کہ وہ اُسکو گرفتار
کر لینگے!" پھر میری طرف مُڑ کر کہا۔" موسیو رڈی اینڈریز
کچھ فرمایئے۔ آپ تو کپتان کے نہایت گہرے دوستوں میں
سے ہیں۔ کیا آپ نے اس کے بارے میں کچھ بھی نہیں سُنا؟"

اگر صرف مس نیلی انڈرڈاون کو خوش ہی کرنا منظور ہوتا
تو میری عین خواہش تھی کہ میں اس سے چھیڑ چھاڑ کرتا رہوں
وُہ اُن بے بہا ہستیوں میں سے ایک تھی۔ جس کے حُسن
جہاں سوز پر تمام آنکھیں خواہ ان کا مرکز نگاہ دوسرا ہی ہو۔
فطرتاً اُٹھنے لگتی ہیں۔ اُس کی چشم سیہ گوں کی خوبصورتی ایسی ہی
درخشاں اور تاباں تھی جس طرح اُس کی قسمت کا ستارہ۔
جذبات سے پُر اور تعریفی نگاہیں ڈالنے والوں کا ایک مجمع
ہر وقت اُس کے حُسن کی مدح سرائی کرتا تھا۔

اُس نے اپنی فرانسیسی مادرِ مہربان کے سایۂ عاطفت
میں شہر پیرس میں تربیت پائی تھی۔ اور اب وہ اپنے
والد بزرگوار انڈرڈاون امریکن کروڑپتی سے ملنے کیلئے
شیکاگو جا رہی تھی۔ اور اُس کی ایک سہیلی خاتون گیرلینڈ
اُس کے ہمراہ بطور ہمسفر ساتھ تھی۔

مجھے شروع ہی سے اُس کے ساتھ ایک گونہ رغبت
ہو گئی تھی۔ لیکن بحری سفر کی عجلت آفرین بے تکلفی و دوستی
سونے پر سہاگہ ہو گئی۔ اور اس کی کشش نے میرے دل پر
سکہ جما لیا۔ جب کبھی اس سے میری آنکھیں دو چار ہوتیں
تو اس کی ہر معمولی ادا میرے جذبات کو برانگیختہ اور دلی جوش
کو بے چین کرنے کے لئے کافی ہوتی۔ وہ میرے اظہارِ محبت
کو خندہ پیشانی اور دلربایانہ انداز دوشیزگی سے قبول کرتی۔
وہ میری مزاج آفرین باتوں پر قہقہے لگاتی۔ اور میرے افسانوں کو بڑے
اشتیاق سے بغور سُنتی اور میری ہر بات کا جواب بڑی ہمدردی
اور فیاضی سے دیتی۔

صرف ایک رقیب تھا جسے دیکھ کر مجھے ایک فکر سی
پیدا ہو جاتی۔ ایک حسین خوشرو جوان۔ موجودہ تہذیب اور
وضع کے مطابق بہترین پوشاک میں ملبوس۔ خوش اطوار اور

با اخلاق، جس کی سادہ لوحی اور انداز خاموشی اکثر اوقات میرے عجیب وغریب دلفریب انداز سے بھی زیادہ جاذب نظر ثابت ہوتے۔

جس وقت مس انڈرڈاون نے مجھ سے یہ بات کی تو وہ بھی اس کے گرد "تعریفی گروہ" میں شامل تھا۔ ہم لوگ نہایت آرام سے اپنی اپنی کرسیوں پر جہاز کے تختے پر بیٹھے تھے۔ گزشتہ دن کے طوفان کے بعد مطلع صاف ہو چکا تھا۔ اور اس وقت شام کا سماں بہت ہی دلفریب تھا۔

میں نے جوابدیا۔ "میں نے تفصیل سے کوئی بات نہیں سُنی۔" "لیکن ہم اپنی ذاتی تحقیقات ٹھیک اُسی طریقہ سے جس طرح سے پُرانا تجربہ کار گینارڈ۔ لوپن کا جانی دشمن کرتا ہے۔ کیوں نہ شروع کر دیں ؟"

"میں کہتی ہوں، میرا خیال ہے کہ آپ بہت عجلت سے کام لے رہے ہیں !"

"یہ کیوں ؟ کیا یہ مسئلہ اسقدر پیچیدہ ہے ؟"

"نہایت پیچیدہ"

"یہ غالباً آپ صرف اس وجہ سے کہتی ہیں کہ وہ تمام ضروری باتیں جو اس کے حل کے لئے ہمارے پاس موجود ہیں آپ فراموش کر دی ہیں۔"

"اول یہ کہ لوپن ایسا نام اختیار کر کے سفر کر رہا ہے جس کا حرف اوّل 'ر' ہے۔"

"یہ تو بیکار سی بات ہے"

"پھر وہ تنہا سفر کر رہا ہے۔"

"ہاں ! اگر آپ اس کو کافی تفصیل تصوّر فرماتے ہیں !"

"تیسرے یہ کہ وہ خوبصورت ہے۔"

"اچھا پھر ؟"

"یہ کہ ہم کو صرف درجہ اوّل کے مسافروں کی فہرست دیکھ کر اُسی سے پتہ لگانا شروع کرنا چاہیئے۔"

فہرست میری جیب میں تھی۔ میں نے اُسے نکالا اور اُس پر سرسری نگاہ ڈالی۔

"اچھا، سب سے پہلے میں دیکھتا ہوں کہ صرف تیرہ آدمی ایسے ہیں۔ جن کا نام 'ر' سے شروع ہوتا ہے۔"

"صرف تیرہ ؟"

"ہاں درجہ اوّل میں ان تیرہ 'ر' سے شروع ہونے والوں میں جیسا کہ آپ خود ملاحظہ فرما سکتی ہیں۔ نو تو ایسے ہیں جو اپنی بیوی بچّوں اور ملازمین کے ہمراہ ہیں۔ اب صرف چار مسافر ایسے باقی بچتے ہیں جو تن تنہا سفر کر رہے ہیں ....

مارکوئیس ڈی ریوڈن۔"

"سفارتخانہ کا سکرٹری" مس انڈرڈاون نے کہا "میں اُس سے اچھی طرح واقف ہوں۔"

"میجر راسن"

کسی نے کہا "یہ میرا چچا ہے۔"

"سائٹر ریوولٹا۔"

"واہ جناب!" ہم میں سے کسی نے چلا کر کہا۔ وہ کوئی اطالوی تھا۔ جس کی لانبی سیاہ داڑھی سارے چہرہ کو چھپائے ہوئے تھی۔

مس انڈرڈاون ہنسی نہ ضبط کر سکی۔

"یہ معزز شخص تو قطعی طور پر خوبصورت نہیں!"

میں نے کہنا شروع کیا "پھر ہم کو یہ کہنا پڑتا ہے کہ مجرم فہرست کا آخری آدمی ہے۔"

"وہ کون ہے؟"

"موسیو روزاتن۔ کیا کوئی صاحب موسیو روزاتن سے واقف ہیں؟"

کسی نے جواب نہیں دیا۔ لیکن مس انڈرڈاون اُس سادہ لوح، خاموش مزاج شخص کی طرف مڑی جس کی فوری موجودگی نے عارضی طور پر میرے دل میں ایک اضطراب سا پیدا کر دیا۔ اور کہنے لگی:۔

"جناب موسیو روزاتن کیا آپ اپنی صفائی میں کچھ نہیں کہنا چاہتے؟"

سب لوگوں کی نظریں اُس پر جم گئیں۔ وہ ایک خوبصورت نوجوان تھا۔

میں اس کا اقرار کرتا ہوں کہ ایک برقی لہر سی میرے جسم میں دوڑ گئی۔ اور مجھے اس گہرے سکوت میں ایسا محسوس ہوا۔ کہ کم و بیش ہر شخص پر اس کا اثر تھا۔ لیکن بات کچھ بھی نہ تھی کیونکہ اُس کی کوئی حرکت ایسی نہ تھی جس پر ہمیں شک تک کی گنجائش ہوتی۔

"کیا میرے مُنہ میں زبان نہیں" اُس نے جواب دیا۔ "اچھا آپ کو معلوم ہونا چاہئے۔ کہ انہیں باتوں کے زیر اثر کہ میرا نام کیا ہے۔ میرے چہرہ اور بالوں کی رنگت کیسی ہے اور نیز یہ کہ میں تنہا خود ہی سفر کر رہا ہوں۔ میں نے بذات خود اسی طرح کی تفتیش کی اور اسی نتیجہ پر پہنچا۔ اس لئے میرا ذاتی خیال ہے کہ مجھ کو ضرور گرفتار ہونا چاہئے۔"

ان الفاظ کو ادا کرتے وقت اس کے چہرہ کی رنگت عجیب تھی۔ اُس کے زرد پتلے ہونٹ اور بھی زیادہ زرد اور پتلے ہو گئے تھے۔ اور اُس کی آنکھوں سے خون جھلک رہا تھا اس میں ذرا بھی کلام نہیں کہ وہ ہم لوگوں سے مذاق کر رہا تھا۔ تاہم اس کے ظاہری انداز و وضع نے ہم لوگوں پر کافی اثر کیا۔

مس انڈرڈاون نے معصومانہ انداز سے دریافت کیا۔

"لیکن کیا آپ کے کوئی زخم ہے؟"

اُس نے کہا۔ "یہی تو بات ہے۔ زخم ہی غائب ہے۔" سنجیدگی کے ساتھ اس نے آستین چڑھالی لیکن ایک فوری خیال میرے دماغ میں آیا۔ میری نگاہیں مس انڈرڈاون سے دوچار ہوئیں۔ اُس نے اپنا بایاں بازو دکھایا تھا۔

میں خود ہی اس امر پر غور کرنے والا تھا۔ کہ اتنے میں ایک نیا واقعہ پیش آگیا۔ جس نے ہم لوگوں کا خیال اپنی طرف

مبدل کر لیا۔ لیڈی گرلینڈ مس انڈر ڈاؤن کی ہمسفر دوڑتی ہوئی سامنے آئی۔

وہ نہایت پریشانی کی حالت میں تھی۔ اس کے ہمسفر مسافر اس کے گرد جمع تھے۔ کئی بار کوشش کرنے کے بعد وہ اتنا کہہ سکی۔

"میرے جواہرات! میرے بیش بہا موتی! میرے قیمتی زیورات، ہائے! وہ سب چوری گئے!"

نہیں وہ سب چوری نہیں گئے تھے۔ جیسا کہ بعد میں ہم لوگوں کو معلوم ہوا۔ بلکہ اس سے بھی زیادہ تعجب خیز بات رونما تھی۔ وہ یہ کہ چور نے انتخاب سے کام لیا تھا۔

الماس کے نگوں۔ ناتراشیدہ لعل و یاقوت کے آویزوں ہاروں اور کڑوں میں سے اس نے سب سے وزنی چیزوں کو نہیں چرایا تھا۔ بلکہ سب سے نادر اور قیمتی جواہرات کو جو حقیقت میں نہایت قیمتی مگر سب سے کم جگہ لینے والے تھے۔ ان کے خانے خالی پڑے تھے۔ ہم سب لوگوں نے جواہرات چوری جانے کے بعد ان کو خالی پڑا ہوا دیکھا۔ ان کی مثال اس وقت بعینہ اس پھول کے مانند تھی جس کی بہترین پنکھڑیاں بیرحمی سے نوچ لی گئی ہوں۔

مزہ یہ کہ اس کام کی انجام دہی اس نے دن دہاڑے کی۔ جب خاتون گرلینڈ چاء نوشی میں مشغول تھی۔ وہ کمرہ میں داخل ہوا اور جواہرات کا بکس کھولکر باطمینان انتخاب کرکے چلتا بنا۔

ہم سب لوگوں نے یہی شور مچایا لیکن سرقہ کے معلوم ہو جانے پر سب کی یہی متفقہ رائے تھی کہ یہ کام آرسین لوپن کا تھا۔ اور درحقیقت یہ سرقہ اس کے معمول کے مطابق پر اسرار واقعات کے زیر اثر نہایت منطقی طور پر عمل میں آیا تھا۔ کیونکہ ہم لوگوں کو معلوم ہوا کہ کل زیورات اور جواہرات وغیرہ کے بار کو پوشیدہ کرنا ایک اہم کام تھا۔ اس لئے اس نے چیدہ چیدہ موتیوں، لعل و یاقوت وغیرہ کا انتخاب کرکے اپنی تکلیف میں کافی کمی کر لی تھی۔ کھانے کے وقت ایسا ہوا کہ روزان کے دونوں طرف ایک ایک کرسی خالی پڑی رہی۔ اور شام کے وقت ہم لوگوں کو اطلاع ملی کہ کپتان نے اس کو طلب کیا تھا اس کی گرفتاری سے جس کے بارے میں کسی کو ذرا بھی کلام نہ تھا۔ لوگوں کو حقیقی مسرت حاصل ہوئی۔ آخر ہم لوگوں نے خیال کیا کہ اب سب مسافر چین کی نیند سو سکتے ہیں ہم لوگ کمرہ نشستگاہ میں پہیلیاں اور معمے بوجھتے رہے۔ خاصکر مس انڈر ڈاؤن کی طرز گفتگو نہایت خوش کن اور مسرت آمیز تھی۔ جس سے مجھے صاف طور پر واضح ہو گیا۔ کہ خواہ مسٹر روزان کے رویہ نے اس کو پہلے متاثر کیا ہو۔ مگر اب وہ اسکا خیال نہیں کرتی۔ اس کے سحر آفرین حسن نے مجھے مکمل طور پر مسخر کر لیا۔ رات کو جب چاند کی نزہت بخش ضیا باری تمام عالم کو بقعۂ نور بنائے ہوئے تھی میں نے اس کو اپنے جوش دل اور وارفتگی کی داستان عشق سنا کر اپنے آپکو اس کا جان نثار، والہ و شیدا

ظاہر کیا۔ دوسرے دن اس خبر نے کہ روزاتن کے خلاف جو الزامات عاید کئے گئے تھے۔ وہ ناکافی ثابت ہوتے اور وہ آزاد کر دیا گیا۔ عوام میں ایک عجیب کھلبلی اور سنسنی پھیلا دی۔

یہ معلوم ہوا کہ وہ ایک بہت ہی مالدار تاجر کا لڑکا تھا اُس نے کاغذات، جو بالکل صحیح حالت میں تھے پیش کئے علاوہ ازیں اُس کے بازو پر زخم کے نشان کا پتہ تک نہ تھا۔

"شاید بلکہ یقیناً!" روزاتن کے مخالفین نے چلّا کر کہا۔ "ولایت کا سارٹیفکیٹ!" اجی نہیں! توبہ کرو۔ آرسین لوپن اس قسم کے درجنوں پیش کر سکتا ہے۔ اب رہا زخم جس کا ذرا بھی نشان اُس کے بازو پر نہیں پایا جاتا۔ اُس نے اسکے نشانات بھی ضائع کر دئے ہونگے۔"

کسی نے کہا۔ یہ ثابت ہو چکا ہے۔ کہ سرقہ کے وقت روزاتن ڈک پر تفریح میں مشغول تھا۔ اس کے جواب میں یہ کہا گیا کہ آرسین لوپن جیسی شخصیت کے آدمی کے لئے یہ ضروری نہیں کہ وہ خود بھی ارتکاب جرم کے وقت موجود رہے۔ اور آخرکار تمام دیگر خیالات کے علاوہ ایک بات ایسی تھی جس پر وہمی سے وہمی آدمی کو بھی حرف گیری کا موقع نہ تھا۔ وہ کیا؛ بجز روزاتن کے اور کون شخص ایسا تھا۔ جو تنہا سفر کر رہا تھا جس کے بال سنہرے اور جس کا نام ر سے شروع ہوتا تھا؛ سوائے روزاتن کے اور کس کا حلیہ تلغراف کے بیان کردہ حلیہ کے مطابق تھا۔

اور جب روزاتن ناشتہ کے چند منٹ قبل نہایت آزادی سے ہمارے مجمع میں داخل ہوا۔ تو خاتون گرلینڈ اور مس انڈرڈاون خاموشی سے اُٹھکر چلتی بنیں۔

ایک گھنٹہ بعد ایک قلمی نوشتہ جہاز کے ہر فرد، ملاح، کپتان وغیرہ اور ہر درجہ کے مسافروں کو ملا۔ جس میں حسب ذیل اعلان شائع تھا:۔ "ایم لوئیس روزاتن اُس شخص کو جو آرسین لوپن کا یا گم شدہ جواہرات کے سارق کا پتہ بتائیگا دس ہزار فرانک انعام دینے کا اعلان کرتا ہے۔"

"اگر کوئی شخص اس بدمعاش کے خلاف میری مدد نہیں کریگا" روزاتن نے کپتان سے کہا "تو پھر میں خود اُس سے نپٹونگا۔"

روزاتن اور آرسین لوپن کے درمیان مقابلہ یا پھر یہ بات تھوڑے عرصے کے بعد پایۂ تکمیل تک پہنچ گئی۔ بذاتِ خود آرسین لوپن اور آرسین لوپن کا مقابلہ تھا۔

دو دن تک برابر یہ سلسلہ جاری رہا۔ روزاتن ادھر اُدھر داہنے بائیں ملاحوں سے گفتگو کرتا، لوگوں سے سوال کرتا ہوا۔ اور خفیہ طریق سے ہر شخص کی سُن گن لگاتا ہوا دیکھا گیا۔ اُس کا سایہ شب کی خاموشی میں بھی اپنے شکار کی جستجو میں دیکھا گیا۔

اپنی جانب سے کپتان نے ہر ممکن بیدار مغزی، اور محنت و کوشش سے کام لیا۔ جہاز پراونس کا چپہ چپہ ہر گوشہ اور مقام چھان ڈالا گیا۔ ہر نشست کے کمرہ کی بلا کسی تخصیص کے

تلاشی لی گئی۔ اور ہر اُس چیز اور جگہ کی جہاں ذرا بھی گم شدہ اشیاء کی پوشیدگی کا گمان ہو سکتا تھا۔ حتےٰ کہ لیڈی گرلینڈ کے کمرہ کی بھی نہایت عرقریزی اور احتیاط کے ساتھ دیکھ بھال کی گئی۔

مس انڈرڈاون نے کہا۔ "یقیناً وہ لوگ کچھ نہ کچھ پاکے رہیں گے۔ خواہ وہ ساحر ہی کیوں نہ ہو۔ مگر وہ جواہرات اور موتیوں کو فضا میں غائب نہیں کر سکتا"

مَیں نے جواب دیا۔ "بیشک اُن لوگوں کو کامیاب ہونا چاہیئے۔ ورنہ لوگ چلکر ہماری ٹوپیوں، کپڑوں اور اُن چیزوں کی جو ہر وقت ہمارے ساتھ وابستہ رہتی ہیں۔ تلاشی لینا شروع کر دینگے" اور اس کو اپنی ۵ × ۴ انچ طویل و عریض فوٹو کا کوڈک کمرہ جس سے مَیں نے اُس کی ہر حالت اور صورت کی تصویر اُتاری تھی۔ دکھلاتے ہُوئے کہا۔ "کیوں! اتنے چھوٹے کیمرہ میں بھی خاتون گرلینڈ کے کل جواہرات پوشیدہ رکھے جا سکتے ہیں۔ اس لئے کہ ادھر آپ نے تصویر لینے کا بہانہ کیا اور وہاں کل تلاشی وغیرہ ہو چکی"

"تاہم مَیں نے لوگوں کو کہتے سُنا ہے کہ ہر سارق کچھ نہ کچھ نشانات ضرور چھوڑ جاتا ہے"

"لیکن ایک ایسا بھی ہے۔ جو کبھی کسی قسم کا نشان نہیں چھوڑتا یعنے آرسین لوپن"

"یہ کیوں؟"

"کیوں؟ اس لئے کہ وہ صرف اس جرم ہی کے بارے میں جس کا وہ ارتکاب کرتا ہے۔ تجاویز اور تدابیر نہیں سوچتا بلکہ اُن تمام نکتوں پر غور کرتا ہے۔ جو اس کے خلاف عمل میں لائے جا سکتے ہیں"

"پہلے تو آپ نہایت رازداری سے کام لے رہے تھے"

"آہ اُس وقت تک مَیں نے اُسکو کام کرتے نہیں دیکھا تھا"

"اچھا تو اس لئے آپ خیال کرتے ہیں کہ . . . ."

"مَیں خیال کرتا ہوں کہ ہم لوگ بیکار اپنا وقت ضائع کر رہے ہیں"

سچی بات تو یہ ہے کہ اس تمام تحقیقات اور تفتیش سے کچھ بھی امید افزا نتیجہ برآمد نہیں ہُوا۔ یا اگر کچھ نکلا تو وہ اس قابل نہ تھا کہ اس سے کچھ کامیابی کی امید ہوتی۔ اسی اثناء میں کپتان کی گھڑی بھی چوری گئی۔

اس واقعہ نے اور بھی آگ لگا دی۔ اس کے جوش میں اور بھی اضافہ ہو گیا۔ اُس نے روزاتن کی جس سے وہ کئی بار مل چکا تھا۔ اور زیادہ سختی اور ہوشیاری سے نگہداشت شروع کر دی۔ دوسرے دن گھڑی ایک دوسرے افسر کے کالر میں پائی گئی

یہ سب نہایت تعجب خیز تھا۔ مگر اس سے ایک چور کی دسترس اور مہارت تامہ کا ثبوت ملتا تھا۔ بلکہ اگر یہ کہنا مبالغہ نہ ہو تو یقیناً اُس سے انتہائے کمال مترشح تھا۔ وہ اپنے پیشہ کو نہ صرف ضروریاتِ زندگی کے حصول کے لئے کرتا تھا بلکہ دلچسپی کے لئے بھی اُس نے ایک ایسے ایکٹر کی طرح جو مذاقیہ حرکات

کرتے وقت نہایت شاداں و فرحاں رہتا ہے اور مضحکہ خیز گفتگو کے دوران
میں خود دل ہی دل میں مزے لیتا ہے۔ اپنے خیالات کا اظہار کیا تھا
ہاں وہ اپنے طریقوں میں ایک مسلم الثبوت اُستاد تھا۔ اور جب
میں نے روزاتن کو بہت زیادہ سرگرم اور مصروف دیکھا اور اسکی دو رُخہ
حکمت عملی پر نظر ڈالی جو عجیب الخلقت آرسین لوپن کی خاص صفت
تھی۔ تو میں بھی بلا اظہار تعجب باز نہ رہ سکا۔

امریکہ پہنچنے سے ایک روز قبل شب کو ڈیک کے محافظ
نے تاریک ترین حصّہ میں کسی کے کراہنے کی آواز سُنی۔ وہ آگے
بڑھا۔ اُس جگہ پہنچکر کیا دیکھتا ہے کہ ایک شخص عرشہ جہاز پر لیٹا
ہُوا ہے۔ اس کا سر ایک سبز مفلر میں لپٹا ہُوا ہے۔ اور دونوں
ہاتھ رسّی سے بندھے ہیں۔ اُس نے اس کو آزاد کیا۔ اُٹھایا
اور لخلخہ سُنگھایا۔ یہ شخص روزاتن تھا!

ہاں یہ روزاتن ہی تھا جو اپنی تفتیش کے دوران میں پابہ جولاں
کرکے لُوٹ لیا گیا تھا۔ ایک ملاقاتی کارڈ اس کے لباس میں
معمولی پن سے اٹکا ہوا تھا جس پر یہ عبارت درج تھی "آرسین لوپن
دلی شکریہ کے ساتھ مسٹر روزاتن کے دس ہزار فرانک قبول کرتا ہے"۔
فی الواقعہ مسروقہ پاکٹ بک میں بیس ہزار فرانک کے نوٹ تھے۔
اب مزہ دیکھئے۔ کہ اس بدنصیب شخص پر خود ہی اپنے کو اس مصنوعی
صورت میں ظاہر کرنیکا الزام لگایا گیا۔ لیکن اس واقعہ کے باوجود
کہ اس طریقہ سے خود ہی ہاتھ پیر باندھ لینا غیر ممکن ہے۔ یہ صاف
ثابت ہوگیا تھا۔ کہ کارڈ کی تحریر روزاتن کے خط نوشت سے
بالکل مختلف تھی۔ برخلاف اس کے یہ تحریر آرسین لوپن کے
طرز خط سے جو جہاز میں ایک پُرانے اخبار میں لکھا پایا گیا تھا بالکل مشابہ
تھی۔ پس اب یہ امر طے شدہ تھا کہ روزاتن آرسین لوپن نہیں
بلکہ روزاتن روزاتن ہی تھا۔ شہر بورڈیو کے ایک تاجر کا لڑکا
خاصکر اس سنسنی خیز واقعہ سے آرسین لوپن کی موجودگی کا اب
اور زیادہ وثوق کے ساتھ یقین ہوگیا۔

سب لوگوں کے دلوں پر ہیبت طاری ہوگئی۔ اب
کوئی مسافر یکہ و تنہا نہ اپنے کمرے میں ٹھہرنے اور نہ جہاز کے
کسی دُور کے حصّہ میں تفریحاً جانے کی جُرأت کرتا تھا۔ جن کو
باہم ایک دوسرے پر یقین تھا وہ چولی دامن کی طرح ہر وقت
ساتھ رہتے۔ اور بایں ہمہ ایک قسم کی طبعی بدگمانی حتےٰ کہ
اپنے بہترین شناساؤں کی طرف سے بھی پھیلی ہوئی تھی۔ یہ
خطرہ کسی ایک شخص کی طرف سے نہیں تھا۔ بلکہ سب کی نظریں
ہر ایک فرد پر لگی ہُوئی تھیں۔ اس لئے خطرہ نسبتاً زیادہ ہوگیا
تھا۔ اب ہر شخص آرسین لوپن معلوم ہوتا تھا۔ ہمارے غیر معمولی
پریشان کن خیالات نے اس محیر العقول ہستی کو ہماری نظروں
میں فوق الفطرت ہستی بنا دیا۔ ہم نے سمجھ لیا کہ وہ ہر قسم کے
بھروپ بدلنے پر قادر ہے۔ خواہ میجر راسن ہو یا مارکوئیس
ڈی راور ڈان، یا اور کوئی شخص، بہرحال لاسلکی پیغام کے
مطابق یہ ضروری نہیں رہا کہ اس کے نام کا پہلا حرف ر ہی ہو،
اور وہ تنہا سفر کر رہا ہو۔ بلکہ اب ہمارا ہر شناسا آرسین لوپن تھا۔

یہانتک کہ وہ لوگ بھی جو مع اپنے اہل وعیال اور ملازمین کے سفر کر رہے تھے۔ مشکوک نظروں سے دیکھے جانے لگے۔

لاسلکی پیام نے ہم لوگوں کو کوئی مزید خبر نہیں دی۔ یا کم از کم کپتان نے اُس کو ہم لوگوں تک نہیں پہنچایا۔ اس خاموشی سے ہم لوگوں کی کچھ بھی تسکین نہیں ہوئی۔

بلحاظ واقعات یہ زیادہ تعجب خیز نہ تھا۔ کہ گزشتہ دن سے لوگ انتہائی درجہ پریشان اور خائف تھے۔ مسافروں کو ہر وقت کسی نئے ارتکاب جرم کا کھٹکا لگا رہتا تھا۔ اور اُن کا خیال تھا کہ اس مرتبہ صرف سرقہ کی واردات یا زدوکوب کا ارتکاب نہ ہوگا۔ بلکہ ایک سنگین جرم قتل وقوع میں آئے گا۔ کوئی بھی یہ تسلیم کرنے کو تیار نہ تھا کہ آرسین لوپن صرف ان دو معمولی واقعات پر قانع رہیگا۔ وہ جہاز کا مطلق العنان مالک تھا۔ اُسنے جہاز کے افسروں کو کٹھ پتلی بنا رکھا تھا۔ اس کو صرف اتنی ضرورت تھی۔ کہ وہ اپنی خواہش کا اظہار کرے بس جو کچھ وہ چاہتا تھا اپنی حسب خواہش کر سکتا تھا۔ ہمارا جان و مال سب اسی کے قبضہ میں تھا۔

اس کا میں خود اقرار کرتا ہوں کہ ہمارے لئے یہ گھڑیاں نہایت خوش کن اور فرحت بخش تھیں۔ کیونکہ خاتون نیلی انڈر ڈاؤن کا مجھ پر اعتماد کرنا ہر شخص کے مرعوب کرنے کو کافی تھا۔ اوّل تو عورتوں کا نظرتاً بزدل ہونا۔ دوسرے ان واقعات کا اثر۔ وہ ڈر کر میرے پہلو میں پناہ لینے کے لئے آئی۔ اور میں اس کے لئے ہزار جان سے آمادہ و تیار تھا۔

میں دل وجان سے آرسین لوپن کو دعائیں دے رہا تھا۔ کیا اس کا موجب اس کی ذات نہ تھی۔ جس نے ہم کو یوں یکجا اور شیر و شکر کر دیا؟ کیا یہ اُس کی عنایات کا نتیجہ نہ تھا کہ میں نے اُن امید افزا خیالات کا مزہ حاصل کیا؟ کیسے خیالات محبت کے نغمہائے دلفریب اور اُن کا لطف بلکہ اس سے بھی زیادہ دلآویز، میں معترف ہوں۔ خاندان ڈی اینڈریزیز شریف یو آؤن نسل سے ہے۔ لیکن اُس کی شرافت حسبی ونسبی کے شہرے کم ہو چکے تھے۔ اور ایک معزز خاتون سے یہ بات چنداں بعید نہ تھی۔ کہ وہ ایک گمنام خاندان کے فرد سے رشتہ جوڑنا بے غیرتی سمجھے۔

نہ میں اس کا قائل تھا کہ یہ خیالات نیلی کو برافروختہ کرتے ہیں۔ اس کی مخمور انکھڑیوں نے مجھے اجازت دے رکھی تھی۔ کہ میں اس کی پرستش کروں۔ اس کے نغمہائے شیریں میرے دل میں امید وبیم کے دریا موجزن کرتے تھے۔

ہم آخری لمحہ تک اپنی کہنیاں آہنی جنگلوں پر رکھے ہوئے پہلو بہ پہلو ایک ساتھ کھڑے رہے۔ یہانتک کہ امریکہ کا ساحل صاف نظر آنے لگا۔ تفتیش ختم ہو چکی تھی۔ ہر شخص محو انتظار نظر آرہا تھا۔ درجہ اوّل سے لیکر تیسرے درجہ تک کے مسافروں میں سے ہر شخص اس وقت کا نہایت بے چینی سے منتظر تھا۔ جبکہ جلد تر یہ عقدہ لاینحل کھلے۔

آرسین لوپن کون تھا؟ وہ کس نام سے ملقب اور کس قسم کی پوشاک میں ملبوس سفر کر رہا تھا؟

انکشاف کی گھڑی آن پہنچی۔ اگر میں سو سال بھی زندہ رہوں تب بھی اس واقعہ کی معمولی سی معمولی بات بھی لوح دل سے محو نہیں ہو سکتی۔

"نیلی تمہارا چہرہ کیسا زرد معلوم ہوتا ہے!" وہ نیم غشی کی حالت میں میرے بازو پر جھکی ہوئی تھی۔

"اور آپ بھی تو اوہو آپ کی بھی صورت کیسی تبدیل ہو گئی ہے؟ اس نے جواب دیا۔

"خیال کیجئے! یہ کیسا پرجوش اور نازک وقت ہے۔ مگر میں آپ کے پہلو بہ پہلو اس کے گزارنے میں بیحد خوش ہوں۔ نیلی مجھے تعجب ہے۔ کہ تمہارا دماغ کسی وقت بھی۔"

"بدحواسی و سراسیمگی کے زیر اثر" وہ ایک لفظ بھی نہیں سن سکتی تھی۔ جہاز لنگر انداز ہو گیا۔ لیکن قبل اس کے کہ ہم اس سے اترنے کی اجازت پاتیں بہت سے لوگ محکمہ چنگی کے حکام باوردی افسر، چٹھی رساں وغیرہ جہاز پر آ موجود ہوئے۔

نیلی نے کہا:۔

"اب اگر یہ سننے میں آتے۔ کہ آرسین لوپن اس عرصہ میں بچ نکلا۔ تو مجھے ذرا بھی حیرت نہیں ہو گی۔

"اس نے بے عزتی پر موت کو ترجیح دی ہو گی۔ اور گرفتاری سے یہ بہتر سمجھا ہو گا۔ کہ بحر اوقیانوس میں کود کر جان دیدے!"

"دیکھئے مذاق نہ کیجئے" اس نے آزردہ ہو کر کہا۔

یکبارگی میں اچھل پڑا۔ اور اس کے جواب میں کہا۔

"کیا آپ اس چھوٹے قد والے ضعیف انسان کو تختوں پر کھڑا دیکھ رہی ہیں؟"

"ہاں ہاں! اس سبز فراک کوٹ والے کو جو چھاتہ لگائے کھڑا ہے؟"

"ہاں وہی، یہی گینمارڈ ہے۔"

"گینمارڈ؟"

"ہاں وہ مشہور سراغرساں جس نے عہد کیا ہے کہ وہ خود اپنے ہاتھوں آرسین لوپن کو گرفتار کریگا۔ اوہو.... اب میں سمجھا کہ ہم لوگوں کو سمندر کے اس ساحل سے کوئی خبر کیوں نہیں پہنچی۔ گینمارڈ یہاں موجود تھا۔ اور وہ اپنے معاملات میں کسی دوسرے شخص کی مداخلت پسند نہیں کرتا۔"

"تو پھر آرسین لوپن کا گرفتار ہونا یقینی ہے؟"

"یہ کون کہہ سکتا ہے؟ میرا یقین ہے کہ گینمارڈ نے اس کو بجز مختلف صورتوں اور نقلی بھیسوں کے کبھی نہیں دیکھا۔ بغیر اس کے دریافت کئے ہوئے کہ وہ کس نام سے سفر کر رہا ہے ......"

اس نے نسوانی شوق و استعجاب کے زیر اثر کہا۔ "اوہ"

"میں اُس کی گرفتاری دیکھنے کی بیحد مشتاق ہوں!"

میں نے جواب دیا "ذرا صبر کیجیئے" "اس میں کوئی کلام نہیں کہ آرسین لوپن اپنے دشمن کی موجودگی معلوم کر چکا ہے۔ وہ سب سے آخر میں جب اس بڈھے خرانٹ کی آنکھیں تھک چکی ہونگی۔ یہاں سے کھسکیگا۔

مسافر تختوں پر سے گزرنے لگے گینمارڈ دوسری جانب رُخ کئے اپنے چھاتہ پر جھکا ہوا کچھ ایسے انداز سے کھڑا تھا۔ گویا وہ ان گزرنے والے مسافروں کے دو طرفہ جھنڈ سے کچھ سروکار ہی نہیں رکھتا۔ میں نے دیکھا کہ جہاز کے افسروں میں سے ایک اس کے عقب میں کھڑا وقتاً فوقتاً اُس سے سرگوشی کرتا جاتا تھا۔

جب مارکوئیس ڈی راوردان، میجر راسن، ریوالٹا اطالوی اور بہت سے دیگر اشخاص گزر چکے، تو میں نے روزاین کو آگے بڑھتے دیکھا۔

غریب روزاین نے ابھی تک اس سفر کی آفات ناگہانی کو فراموش نہیں کیا تھا۔

"بہت ممکن ہے آرسین لوپن یہی ہو" نیلی نے کہا "آپ کا کیا خیال ہے؟"

"میں خیال کرتا ہوں کہ گینمارڈ اور روزاین کی شکلیں ایک ہی تصویر میں موجود ہونا بہت ہی دلچسپی کا باعث ہونگی۔ کیا آپ کیمرہ لینے کی زحمت گوارا فرمائینگی؟

میں نے کیمرہ اُس کے ہاتھ میں دیدیا۔ لیکن اس کے استعمال کئے جانے کے وقت سے کہیں بعد روزاین اُنکے پاس سے گزرا۔ افسر نے آہستہ سے کچھ گینمارڈ کے کان میں کہا۔ گینمارڈ نے شانوں کو حرکت دی اور روزاین بھی آگے بڑھ گیا۔

اُف، خدایا! پھر آرسین لوپن کون تھا۔

"ہاں" نیلی نے بآواز بلند کہا "آخر وہ کون ہے!"

اب کل بیس اشخاص رہ گئے تھے۔ نیلی نے فرداً فرداً ہر شخص پر متجسسانہ اور پریشان کن نظر ڈالی۔ کیونکہ "وہ" ان بیس میں سے کوئی بھی نہ تھا۔

میں نے اس سے کہا

"ہم اور زیادہ نہیں ٹھہر سکتے"۔

وہ آگے بڑھی میں اس کے پیچھے ہولیا۔ لیکن ہم دس قدم بھی نہ چلے تھے کہ گینمارڈ ہمارے راستہ میں حائل ہوگیا۔

میں نے چلاّ کر کہا۔ "یہ کیا بات ہے؟"

"جناب ذرا ایک لمحہ ٹھہریے۔ آپ کو اسقدر عجلت ہی کیا ہے؟"

"میں اس دوشیزہ خاتون کا محافظ ہوں"۔

اُس نے دوبارہ اور زیادہ تحکمانہ لہجہ میں کہا۔ "بس ایک لمحہ"

اُس نے انتہائی غور سے مجھے از سرتاپا دیکھا اور پھر

نگاہیں دو چار کرتے ہوئے کہا۔

"آرسین لوپن، میرا خیال ہے؟"

مَیں نے قہقہہ لگایا

"نہیں جناب، مَیں بیچارہ تو برنارڈ ڈی اینڈریزی ہوں"

"خوب، آج تین سال ہوتے ہیں کہ برنارڈ ڈی اینڈریزی مقدونیہ میں مر چکا۔"

"اگر برنارڈ ڈی اینڈریزی مر چکا ہوتا تو مَیں یہاں کیسے موجود ہو سکتا تھا۔ لہٰذا وہ مرا نہیں۔ یہ لیجئے میرے کاغذات موجود ہیں۔"

"یہ سب اسی کے کاغذات ہیں۔ اور مَیں نہایت خندہ پیشانی سے جناب کو بتاؤنگا کہ یہ کیسے آپ کے قبضہ میں آئے۔"

"لیکن آپ پاگل ہو گئے! آرسین لوپن تو اپنا سفر حرفِ 'ر' سے شروع ہونے والے نام سے کر رہا ہے۔"

"جی ہاں! یہ بھی جناب ہی کی افترا پردازیوں کی ایک نئی جدت ہے۔ کہ غلط افواہ مشہور کر کے لوگوں کو مغالطہ میں ڈال دیا۔ تم میں جوہر قابل ہے، لیکن اس مرتبہ تمہاری قسمت کا پانسہ پلٹا ہے۔ آؤ۔ لوگ جان تو لیں کہ ابکی مرتبہ برے پھنسے"

مَیں نے ایک سکنڈ پس و پیش کیا ہی تھا کہ اُس نے ایک خاص ضرب میرے داہنے بازو پر لگائی۔ مَیں درد سے چیخ اُٹھا۔ اُس نے اسی غیر مندمل زخم پر جس کا ذکر تار میں کیا گیا تھا۔ یہ ضرب لگائی تھی۔

اب بجز اس کے احکام کی پابندی کے اور کوئی چارہ نہ تھا۔ مَیں مس انڈرڈاؤن کی طرف مخاطب ہوا۔ اُس کا چہرہ سفید ہو گیا تھا۔ وہ اپنی جگہ ساکت کھڑی ہوئی کانپ رہی تھی۔ ہماری نگاہیں دو چار ہوئیں اور پھر اُس کی نظر اس کیمرہ پر جو مَیں نے اُس کو دیا تھا پڑی۔ اُس نے ایک فوری حرکت کی اور مَیں اس کا خیال، اور وہ یقین جو اس کے دل میں جا گزیں ہو چکا تھا۔ سمجھ گیا۔ ہاں یہی مقام تھا... اُن تنگ تختوں کے درمیان جو سیاہ قیمتی چمڑے سے ڈھکے ہوئے کیمرہ کے اندر منڈھے ہوئے تھے۔ جس کے لئے مَیں نے پہلے ہی سے یہ احتیاط برتی تھی۔ کہ قبل اس کے گینمارڈ مجھ کو گرفتار کرے۔ کیمرہ نیلی کو سونپ دوں۔ یہی وہ جگہ تھی کہ جہاں سٹر روزائن کے بیس ہزار فرانک اور خاتون گرلینڈ کے بیش بہا موتی، اور جواہرات پوشیدہ تھے۔

مَیں حلفیہ کہتا ہوں کہ اس نازک وقت میں کہ گینمارڈ اور اس کے دو ہمراہی میرے گرد موجود تھے۔ مجھے کسی بات کی پروا نہ تھی۔ اپنی گرفتاری، اپنے ساتھیوں کی مخالفت اور اسی قسم کی دیگر باتوں کا ذرا بھی خیال نہ تھا۔ مَیں صرف یہ دیکھ رہا تھا۔ کہ نیلی انڈرڈاؤن اُس شے کے بارے میں جو مَیں نے اس کو دی ہے۔ کیا طرزِ عمل اختیار کرتی ہے۔

یہی ایک شے تھی جو میرے خلاف مکمل شہادت

پیش کر سکتی تھی۔ اب آیا نیلی اُس کو پیش کرے گی یا نہیں۔۔؟ یہی خیال مجھے ستا رہا تھا۔

"کیا وہ میرے ساتھ بیوفائی کریگی؟ کیا وہ مجھ کو برباد کریگی؟ کیا وہ دُشمن جان کی طرح عمل کریگی۔ یا ایک ایسی خاتون کی طرح جس کی حقارت، نسوانی جذبات اور ہمدردی کے نمایاں احساسات کے زیر اثر رحمدلی میں تبدیل ہو جایا کرتی ہے؟"

وہ میرے سامنے سے گزری، مَیں بلا کسی گفتگو کے بہت جُھک کر آداب بجا لایا۔ دوسرے مسافروں کے ساتھ میرا کیمرہ ہاتھ میں لئے وہ تختوں کی طرف بڑھی۔ مَیں نے اپنے جی میں خیال کیا "وہ عوام میں اس کو لیکر جانے کی جرأت نہ کرے گی وہ ابھی ایک گھنٹہ بعد مجھ کو دیدیگی"۔

لیکن تختوں کے درمیانی حصّہ پر پہنچکر اس نے بظاہر بے توجہانہ انداز سے کیمرہ کو جہاز اور خشکی کے درمیان پانی میں پھینک دیا۔ اس کے بعد مَیں اس کو ٹکٹکی لگائے دیکھتا رہا اس کی دلفریب صورت مجمع میں غائب ہو گئی۔ ایکبار پھر نظر پڑی اور دوبارہ چھپ گئی۔ یہ کل باتیں میرے لئے نہایت مفید تھیں۔ ایک لمحہ کے لئے مَیں نہایت غمگین اور ملول بُت بنا تختہ جہاز پہ کھڑا رہا۔ مگر اس وقت بھی دل میں طرح طرح کا جوش اور اضطراب پیدا ہو رہا تھا۔ اس کے بعد گینمارڈ کو انتہائی حیرت میں مبتلا کرتے ہُوئے مَیں نے ایک آہِ سرد بھری اور کہا۔

"حضرت معاف کیجئے۔۔۔ اینجانب ہی شریف چور آرسین لوپن ہیں"۔

یہ الفاظ تھے جن میں آرسین لوپن نے اپنی داستانِ گرفتاری موسمِ سرما کی ایک رات کو میرے روبرو بیان کی اتفاقات زمانہ اور پے در پے واقعات نے جنہیں مَیں اپنے افسانہ "ابتدائے زندگی" میں بیان کر چکا ہوں۔ ہمارے درمیان ایک رشتہ جسے مَیں دوستی کے نام سے یاد کرتا ہوں۔ قائم کر دیا ہے۔ ہاں! مجھے اس امر پر فخر ہے۔ کہ آرسین لوپن میرے ساتھ دوستانہ برتاؤ کر کے میری عزّت افزائی کرتا ہے۔ اور یہ صرف اسی دوستی کا نتیجہ ہے۔ کہ وہ اکثر اوقات بلا کسی اطلاع کے میرے پُر سکون خاموش مطالعہ میں اپنی نوجوانی کی اُمنگوں، اپنی پُر شوق زندگی کی تابناکی۔ اپنی عقل رسا کے کارناموں سے تنوع پیدا کر دیتا ہے۔ کیونکہ اُسنے آجتک تقدیر کے ہاتھوں شکست پانے کی ذلت حاصل نہیں کی۔ ہمیشہ فتح و کامرانی اُسکے شاملِ حال رہی اس کا حلیہ؟ بھلا مَیں کیسے اس کا نقشہ کھینچ سکتا ہوں

مَیں نے آرسین لوپن کو بیسیوں بار دیکھا ہے۔ اور ہر بار ایک نئی انسانی شخصیت میرے روبرو موجود ہُوتی۔ یا یوں کہئے کہ وہی ہستی مختلف شکلوں میں اور ہر بار نئی جدّت کے ساتھ ہر بار چہرہ کی نرالی شکل، اپنے خاص انداز، اطوار اور اوصاف

کے ساتھ۔

اس نے ایک بار مجھ سے کہا۔ "خود مجھے یہ معلوم نہیں کہ میری اصلی شکل کیا ہے۔ میں آئینہ میں دیکھ کر خود اپنے آپ کو نہیں پہچان سکتا۔"

بس ایک خیالی نقشہ ہے۔ تاہم ان لوگوں کے لئے بجنسہٖ صحیح جو اُس سے واقفیت رکھتے ہیں۔ اور اُن کے لئے بھی جو اس کے غیر محدود ذرائع، اُس کے صبر آزما کارناموں اُس کی محیر العقول تبدیلیوں حتےٰ کہ چہرے کے عجیب ردّ و بدل اور اُس کی ظاہری صورت سے واقف ہیں۔

اس نے دریافت کیا۔ "کیا مَیں صرف ایک ہی طرح کی مقررّہ صورت اختیار کرلوں؟ مَیں اُن خطرات کو جو ایک شخصیت پر ہمیشہ کے لیئے وابستہ ہوتے ہیں نظرانداز کردوں؟ یہ سمجھ لیجئے۔ کہ میرے افعال ہی میری شکل و صورت ہیں۔"

بعدازاں اُس نے فخریہ طور پر ان الفاظ کا اضافہ کیا۔

"یہ بہت ہی بہتر ہے کہ لوگ کبھی یہ کہنے کے قابل نہ ہوں کہ" وہ آرسین لوپن جا رہا ہے"۔ اس سے زیادہ دلچسپ یہ ہے کہ وہ بلاشک و شبہہ یہ چیخ اُٹھیں کہ" یہ کام آرسین لوپن کے سوا کسی کا نہیں۔"

سلیم نیدوردی

محسوساتِ جلیل

وہ فرطِ بیکسی ہے کہ اب کیا کہیں جسے
اتنا نہیں ہے کوئی کہ اپنا کہیں جسے

پانے لگا ہے لطفِ خلشہائے بیحسی
وہ دِل کہ حیات کی دُنیا کہیں جسے

ہر پردہ حجاب میں اے حسنِ بے نقاب
دیکھا ہے یوں تجھے کہ نہ دیکھا کہیں جسے

پھر جوش پر ہے سینۂ محزوں میں آج کل
اِک شوقِ موجۂ لبِ دریا کہیں جسے

اب آرزو ہے دِل کو کہ پھر وہ نگاہِ ناز
وہ درد دے کہ غم کا مداوا کہیں جسے

اکثر ہوا ہے رفعتِ پرواز میں جلیل
طے کر گیا ہوں اوجِ ثریا کہیں جسے

جلیل قدوائی

ایک تصویر کو دیکھ کر

ورق ہے یہ آئینہ دار لطافت غضب ہیں یہ نقش و نگار لطافت
کمال نزاکت ۔ بہار لطافت رواں ہے کوئی آبشار لطافت

وفور جنونِ محبت سے رنگیں
مصوّر کے خونِ محبت سے رنگیں

وہ نقشہ کہ چشم تماشا پریشاں وہ صورت کہ صورتگرِ حسن حیراں
جمالِ پرستاں بہارِ گلستاں سراپا یہ تصویر ہے صبح خنداں

جوانی بھی ایسی کہ فانی نہیں ہے
قیامت ہے برپا جوانی نہیں ہے

ستارے ہیں افشاں کے لوح جبیں پر اُتر آئی رونق فلک کی زمیں پر
عیاں ہیں شکن گیسوئے عنبریں پر جمے کیا نظر اس رُخ آتشیں پر

گلابی لبوں پر ضیائے تبسّم
جنوں خیز ہے یہ ادائے تبسّم

یہ کافر نگاہیں یہ بینوش آنکھیں شراب تخیّل سے مدہوش آنکھیں
غرور مسرت سے بیہوش آنکھیں ازل تک رہینگی وفا کوش آنکھیں

فنا کے تصوّر سے آزاد ہے تُو
محبّت کی بستی میں آباد ہے تُو

یہ ہنگامۂ عاشقی کے زمانے اِدھر سے تقاضے اُدھر سے بہانے
وفا کے تماشے جنوں کے ترانے زبانوں پہ رہ جائینگے بس فسانے

مگر تیری آنکھوں کی مستی رہیگی
شرابِ محبّت برستی رہے گی

عابد

جانِ آرزو

پھر برقِ شعلہ ریز کو جنبش ہے چرخ پر
رقصاں ہے پھر بہ شعلۂ عریانِ آرزو

پھر ماہتاب بامِ فلک پر ہے جلوہ ریز
پھر ضوفشاں ہے شمعِ شبستانِ آرزو

پھر باصرہ نواز ستارے چمک اُٹھے
پھر شعلہ زا ہے سوزشِ پنہانِ آرزو

پھر یاد آگیا کوئی محفل فروزِ حسن
پھر بڑھ رہی ہے رونقِ ایوانِ آرزو

پھر بڑھ گئیں کسی کے تصور کی شوخیاں
پھر تازہ کشمکش میں پھنسی جانِ آرزو

رُخصت ہوئی مناظرِ لطف آفریں کی سیر
اب مَیں ہوں اور کاوشِ پنہانِ آرزو

جمعیتِ نشاط کا ساماں کہاں نصیب
اِک دل ہے اب سو وہ بھی پریشانِ آرزو

فرحت

نوائے راز

گرمیٔ چشمِ شوق سے آج کمال ہوگیا
رنگِ جمال بڑھ گیا، بڑھ کے جلال ہوگیا

دل سے تھی ایک دلّگی عالمِ عقل و ہوش میں
آہ! جنونِ عشق میں وہ بھی وبال ہوگیا

حسن ہُوا ضیا فگن میرے دل و دماغ پر
میرا ہر اک خیال خود اپنی مثال ہوگیا

چشمِ حقیقت آشنا کھُل گئی انفعال سے
آئینہ میرے قلب پر ماضی و حال ہوگیا

کرتے ہیں غیر ہمدمی دیکھ کے میری خستگی
آہ! فراقِ یار میں رازؔ یہ حال ہوگیا!!

رازؔ

روداد محبّت

مُصنّفہ ٹالسٹائی — حصّہ دوم — مترجمہ رازؔ چاندپوری

تیسرا باب

اس وقت سے ہماری طرزِ زندگی اور ہمارے تعلقات بالکل تبدیل ہو گئے۔ مثلِ سابق اب ہمارا ایک جگہ خلوت نشین ہونا خوشگوار نہ رہا۔ بدگمانیاں پیدا ہوتیں اور ہم ان کو نظرانداز کر دیتے۔ اب بہ نسبت اس کے کہ ہم دونوں تنہا بیٹھ کر گفتگو کریں، یہ اچھا معلوم ہوتا تھا۔ کہ کسی تیسرے شخص کی موجودگی میں ہمکلام ہوں

جب دیہاتی زندگی یا محفلِ رقص کا ذکر چھڑ جاتا، تو ہم کو محسوس ہوتا کہ ہم خطرناک موضوع پر گفتگو کر رہے ہیں اور ہم ایک دوسرے کی طرف نظر نہ کرتے۔

ہم دونوں کو معلوم ہوتا تھا کہ ہمارے اختلاف کی یہی وجہ ہے اور ہم اس سے بچنے کی کوشش کرتے۔

مجھے بتایا گیا تھا کہ وہ مغرور اور مغلوب الغضب ہے اور میرے لئے لازمی ہے۔ کہ مَیں اس کو ناخوش ہونے کا موقع نہ دُوں۔ اس کو سمجھایا گیا تھا کہ مَیں بغیر سوسائٹی کے نہیں رہ سکتی۔ اور دیہاتی زندگی میری حالت کے مناسب نہیں ہے۔ اور یہ لازمی تھا کہ اس ناگوار صحبت کا خاتمہ کر دیا جائے۔ ہم دونوں نے کبھی ان معاملات پر دو بدو گفتگو نہیں کی۔ اور ایک دوسرے کے خیالات کا غلط اندازہ کیا۔

مُدّت سے ہم نے ایک دوسرے کو دُنیا کی بہترین ہستی سمجھنا چھوڑ دیا تھا۔ بلکہ ہم دوسروں سے اپنا مقابلہ کرتے اور ایک دوسرے کے متعلق جو کچھ رائے قائم کرتے اس کو پوشیدہ رکھتے۔

پیٹرسبرگ سے روانہ ہونے سے پہلے میری طبیعت خراب ہو گئی اور دیہات واپس جانے کے بجائے ہم نے شہر کے نزدیک موسم گرما میں رہنے کے قابل جگہ حاصل کر لی اور میرا شوہر اپنی والدہ سے ملنے کے لئے تنہا چلا گیا۔ جب وہ جانے والا تھا تو مَیں اس کے ساتھ جانے کیلئے کافی طور پر صحتیاب ہو چکی تھی۔ لیکن اس نے اصرار کیا کہ تم کو یہیں پر قیام کرنا چاہئے۔ اور یہ عذر پیش کیا۔ کہ اسکو میری تندرستی کی طرف سے خطرہ ہے۔ مجھ کو معلوم ہُوا کہ دراصل اس کو میری صحت کی زیادہ پروا نہ تھی۔ بلکہ اس کو یہ خیال تھا کہ ہم دیہات میں جا کر خوش و خرّم نہ رہ سکیں گے۔

میں نے اس کے ہمراہ جانے پر اصرار نہ کیا۔ اور وہیں ٹھہر گئی۔ اس کے بغیر ہر چیز بے لطف تھی۔ مگر جب وہ واپس آ گیا، تو مجھے محسوس ہوا کہ اس کے آنے سے میری زندگی میں کوئی تغیر پیدا نہ ہوا جیسا پہلے ہوتا تھا۔ ہمارے وہ اگلے تعلقات، جبکہ ہر خیال جس سے اس کا تعلق نہ ہوتا تھا ایک گناہ معلوم ہوتا تھا۔ اور جبکہ اس کے ہر کام اور ہر لفظ میں مجھے کمال معلوم ہوتا تھا۔ اور اس حالتِ مسرت میں، ایک دوسرے سے نظر ملا کر ہم ذرا ذرا سی بات پر مسرور ہو جاتے تھے۔ اب غیر محسوس طریقہ پر تبدیل ہو گئے تھے اور ہم نہیں کہہ سکتے تھے کہ وہ زمانہ کہاں چلا گیا تھا۔

ہم دونوں میں سے ہر ایک کی دلچسپیاں اور مشاغل جداگانہ تھے۔ جن میں ہم دونوں ایک دوسرے کے شریک نہ ہوتے تھے اور نیز اب یہ خیال بھی تکلیف دہ نہ رہا تھا کہ ہم دونوں اپنے اپنے جداگانہ عالم میں رہتے ہیں۔ جس سے دوسرے کو کوئی تعلق نہیں ہے۔ یہ خیال راسخ ہوتا گیا۔ اور ایک سال کے بعد جب ایک دوسرے کی طرف دیکھتے تھے تو ہماری آنکھوں میں مسرت کی جھلک نہ پیدا ہوتی تھی۔

اس کی وہ طفلانہ شوخیاں جن میں ہم دونوں شریک رہتے تھے۔ اب بالکل جاتی رہی تھیں۔ اس کی کمزوریاں جو میرے اندر حقارت آمیز جذبات پیدا کر دیا کرتی تھیں۔ اور ہر چیز سے بے تعلقی اب مفقود ہو چکی تھی۔ اس کی وہ پُر معنی نظر جو پہلے مجھے پریشان کر کے مسرور بنا دیا کرتی تھی۔ اب باقی نہ رہی تھی۔ اب ہم نماز میں یا باہمی خوشی میں ایک دوسرے کے شریکِ حال نہ ہوتے تھے۔ اور دراصل اب ہم ایک دوسرے سے بہت کم ملتے تھے۔ وہ متواتر باہر سفر میں رہنے لگا۔ اور مجھے تنہا چھوڑ کر جانا اس کے لئے شاق نہ تھا۔ میں برابر سوسائٹی میں شریک ہوتی تھی۔ اور وہاں مجھے اس کی موجودگی کی ضرورت نہ تھی۔

اب ہم آپس میں مکالمہ و مباحثہ نہ کرتے تھے۔ میں اس کی ضرورت بہم پہنچانے کی کوشش کرتی تھی۔ اور وہ میری تمام ضروریات کو پورا کر دیتا تھا۔ اور بظاہر ابھی تک ہم ایک دوسرے سے محبت کا برتاؤ کرتے تھے۔

اگرچہ ہمیں ایک جگہ بیٹھنے کا اتفاق بہت کم ہوتا تھا لیکن جب کبھی ہم ایک جگہ بیٹھتے تھے تو مجھے اپنی تنہائی کے مقابلہ میں کسی قسم کی خاص مسرت یا جوش یا پریشانی کا احساس نہ ہوتا تھا۔ میں اچھی طرح سمجھتی تھی کہ میرا شوہر کوئی اجنبی شخص نہیں ہے۔ بلکہ وہ میرا شوہر ہے۔ اور ایک لائق شخص ہے۔ جس سے میں اس طرح واقف ہوں جس طرح خود اپنی ذات سے۔

مجھے اس سے بجز اس کے کہ وہ میرا شوہر ہے اور

کسی قسم کی امید نہ تھی۔ مجھے معلوم ہوتا تھا۔ کہ میرا یہ خیال بہت درست ہے۔ نیز یہ کہ ہمارے درمیان گویا کبھی کوئی تعلق ہی نہ تھا اور نہ آئندہ ہو سکتا تھا۔

جب وہ باہر جاتا تھا اور خصوصاً جب پہلی بار وُہ مجھ سے جُدا ہُوا تو تنہائی کی وجہ سے مجھے بہت پریشانی ہُوئی۔ اور جب اس کا سہارا جاتا رہتا تو مجھے حقیقت حال معلوم ہوتی۔ حالانکہ مَیں ابھی تک اس کو نہ سمجھ سکی تھی۔ جب وہ واپس آتا تو مَیں ایک حالت مسرت میں اپنے آپ کو اس کی آغوشِ محبت کے سپرد کر دیتی۔ مگر دو گھنٹے کے اندر ہی یہ جوش مسرت سرد پڑ جاتا اور میرا دماغ سکون پذیر ہو جاتا۔ اور اس سے کہنے کے لئے میرے دِل میں کوئی بات باقی نہ رہتی۔

محبت کے ان خاموش لمحوں میں جن سے ہم کبھی کبھی لطف اندوز ہوتے تھے۔ مجھے محسوس ہوتا تھا۔ کہ کوئی نہ کوئی بات ضرور ہے۔ جس کی وجہ سے میرے دل میں ایک درد سا اُٹھتا ہے۔ اور مجھے معلوم ہوتا تھا کہ اس کی نگاہوں سے بھی اس کا اظہار ہوتا ہے۔ مجھے محسوس ہوتا تھا کہ یہ محبت محدود ہے جس سے زیادہ وہ کچھ نہیں چاہتا اور جس کے لئے مجھ میں کافی قوت موجود ہے۔ بعض اوقات مجھے ایک قسم کا ملال ہوتا۔ مگر مَیں کبھی اس کے اسباب پر غور کرنے میں اپنا وقت ضائع نہ کرتی۔ اور مَیں ان تمام دلچسپیوں میں جو میرے احاطۂ قدرت میں تھیں مصروف رہ کر اس مبہم افسردگی

کو اپنے دل سے دُور کرنے کی کوشش کرتی۔

سوسائٹی کی زندگی نے جس کی نمائش سے پہلے ہی دن میں مغلوب ہو گئی تھی۔ اور جس کی چاپلوسی کی طاقت نے میری خودداری کو شکست کر دیا تھا۔ بہت جلد میرے خیالات پر پُورا قبضہ کر لیا تھا۔ وہ میری فطرت ثانیہ بن گئی تھی۔ اس نے مجھے اپنے دام میں گرفتار کر لیا تھا اور میرے تمام نیک خیالات پر غاصبانہ قبضہ جما لیا تھا۔

مَیں کبھی تنہا نہ رہتی تھی۔ اور اپنی حالت کا صحیح اندازہ کرتے ہُوئے ڈرتی تھی۔ صبح سے شام اور رات گئے تک مَیں اِدھر اُدھر صحبتوں میں اپنا وقت گزارتی تھی۔ اور جب کبھی مجھے باہر جانے کا اتفاق نہ ہوتا تھا تو کسی نہ کسی شغل میں ضرور مصروف رہتی تھی۔ مَیں نہ تو خوش و خرّم تھی نہ افسردہ و رنجیدہ بلکہ مَیں جانتی تھی کہ میری حالت ہمیشہ ایسی ہی رہے گی۔ اور اس میں کبھی کوئی تبدیلی واقع نہ ہو گی۔

اس طرح تین سال گزر گئے۔ اور ہمارے تعلقات بدستور قائم رہے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ سب چیزوں پر سکوت و جمود طاری ہے۔ اور ان میں کوئی تبدیلی قبول کرنے کی صلاحیت نہیں ہے۔ نہ وہ ترقی کر سکتی ہیں نہ تنزل پذیر ہو سکتی ہیں۔

ہماری اس سہ سالہ ازدواجی زندگی میں دو خاص واقعات پیش آئے۔ لیکن اُن میں سے کسی نے بھی میری حالت میں کوئی تغیّر نہ پیدا کیا۔

پہلا واقعہ میرے پہلے بچہ کی پیدائش تھا۔ اور دوسرا ٹاٹیانہ کی موت۔ اوّل اوّل ماں ہونے کے احساس نے مجھ پر اسقدر غلبہ پایا اور میرا دل ایسی غیر معمولی لذت سے لبریز ہوگیا۔ کہ مجھے یہ محسوس ہونے لگا کہ اب میری زندگی کا ایک نیا دور شروع ہونے والا ہے۔ مگر دو ماہ کے بعد جب میں پھر گھر سے باہر نکلنے کے قابل ہوگئی تو یہ جوش دن بدن سرد پڑتا گیا۔ اور عادت و فرائض کی بے کیف بجا آوری میں تبدیل ہوگیا

اس کے برخلاف میرے پہلے لڑکے کی پیدائش کے وقت سے میرا شوہر پرانی طرز زندگی پر پھر کاربند ہوگیا۔ اور اطمینان و سکون کے ساتھ گھر رہنے لگا۔ اُس نے اپنی تمام محبت و مسرت اس بچہ کے لئے وقف کردی۔

جب میں کسی محفل رقص میں شریک ہونے کی غرض سے نیا لباس پہنتی اور اپنے جگر پارے کے اُوپر صلیب کا نشان بنانے کے لئے دایہ خانہ میں جاتی۔ تو اکثر اپنے شوہر کو وہاں موجود پاتی۔ وہ ملامت آمیز تیز نظر میرے چہرہ پر جما دیتا اور میرا ضمیر مجھ کو ملامت کرنے لگتا۔ میں اپنے نور نظر کے ساتھ اپنی بے اعتنائی پر افسوس کرتی اور اپنے دل میں کہتی "کیا یہ ممکن ہے کہ میں اور عورتوں سے زیادہ بُری ہوں؟" پھر میں اپنے دل سے پوچھتی "لیکن میں کیا کرسکتی ہوں؟ مجھے اپنے بچہ سے محبت ہے۔ مگر میں اپنا تمام وقت اس کے لئے صرف نہیں کرسکتی' اس طرح تو میں چند ہی روز میں اُکتا جاؤں گی۔ اور کچھ بھی ہو میں تو نمائش کو پسند کرتی ہوں"۔

اس کی والدہ کی رحلت اس کے لئے ایک جانکاہ صدمہ تھی۔ اور جیسا کہ وہ کہا کرتا تھا بغیر اپنی ماں کے نکولسکوئی میں رہنا اس کے لئے بہت دشوار تھا۔ لیکن اگرچہ میں بھی اس کی مفارقت سے رنجیدہ تھی۔ اور اپنے شوہر سے ہمدردی رکھتی تھی۔ تاہم اب دیہات میں مجھے پہلے سے زیادہ مسرت اور راحت حاصل تھی۔

اس تین سال کے عرصہ میں ہم زیادہ تر شہر میں رہے اور ایک موسم گرما میں صرف دو ماہ دیہات میں بسر کئے اور تیسرے سال ہم باہر چلے گئے۔

ہم نے موسم گرما ساحلی مقامات میں گزارا۔

اس وقت میری عمر اکیس سال کی تھی۔ میں سمجھتی ہوں کہ اس وقت ہماری مالی حالت بہت اچھی تھی۔ میں خانگی زندگی میں اس چیز سے زیادہ جو مجھے پہلے حاصل ہوچکی تھی کسی اور شے کے حاصل کرنے کی آرزو مند نہ تھی۔ مجھے محسوس ہوتا تھا کہ ہر وہ شخص جس کو میں جانتی ہوں مجھ سے محبت رکھتا ہے۔ میری صحت بہت اچھی تھی۔ ساحلی مقامات میں میرا لباس سب سے بہتر ہوتا تھا اور مجھے اس بات کا احساس تھا کہ میں حسین ہوں موسم خوشگوار رہتا' ایک عجیب دلکش و لطیف منظر میرے اردگرد تھا اور میں بہت ہی مسرور تھی۔

میں اسی طرح خوش و خرم تھی جیسی نکولسکوئی میں رہا کرتی

تھی۔ اور جب مجھے اس امر کا احساس ہوا کرتا تھا کہ میں مسرور ہوں۔ اور اس لئے مسرور ہوں کہ اس کی مستحق بھی ہوں۔ اس وقت میری مسرت غیر محدود ہوتی۔ اور اس میں ترقی کرنے کی صلاحیت موجود ہوتی اور مجھے اور زیادہ خوشی حاصل کرنے کی خواہش رہتی تھی۔

اس کے بعد میری حالت میں تغیر پیدا ہو گیا۔ مگر اس موسم گرما میں بھی ہر چیز خوشگوار تھی۔ میرے دل میں کوئی آرزو اور تمنا نہ تھی۔ اور مجھے کسی بات کا خوف نہ تھا۔ مجھے محسوس ہوتا تھا کہ میری زندگی مکمل اور میرا قلب پُرسکون ہے۔

ان تمام نوعمر اشخاص میں جو اس موقع پر موجود تھے۔ کوئی بھی ایسا نہ تھا۔ جس کو میں کسی خاص قابلیت کے لحاظ سے منتخب کرتی، یہاں تک کہ میں کسی کو اپنے سفیر "ک" پر۔ جو میری طرف خصوصیت سے مائل تھا۔ ترجیح نہ دے سکتی تھی۔

کوئی شخص بالکل نوعمر تھا اور کوئی بہت ضعیف۔ وہاں ایک خوبصورت بالوں والا انگریز اور ایک فرانسیسی بھی تھا۔ یہ لوگ شاہی عہدہ دار تھے۔ مجھے کسی سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ مگر تاہم ان سب کا ہونا میرے لئے ضروری تھا۔ ان سب کی حالت یکساں تھی۔ اور کوئی خاص بات قابلِ تعریف نہ تھی۔ پھر بھی یہ سب کے سب اس محفل عشرت کے رُکن تھے۔ جو میری مسرت کی سرمایہ دار تھی۔

ان میں سے صرف ایک اطالوی نوجوان مارچیز ڈی نے بیہودہ طریقہ سے میری مدح سرائی کر کے دوسروں کے مقابلہ میں میرے دل میں زیادہ جگہ پیدا کر لی تھی۔ وہ میری ہمراہی کے کسی موقع کو بھی ضائع نہ کرتا تھا۔ محفل رقص میں وہ مجھے اپنا شریک بناتا، میرے ساتھ سیر کو جاتا باجہ بجاتا اور مجھ سے کہا کرتا تھا۔ کہ تم بہت خوبصورت ہو۔

بارہا میں نے اس کو اپنے مکان کے گرد گھومتے دیکھا اور اکثر اس کی تیز نگاہوں کی ناخوشگوار جسارت سے مجبور ہو کر میں اُس کے سامنے سے ہٹ جانے پر مجبور ہوئی۔

وہ نوعمر حسین اور خوش وضع تھا۔ اس کا انداز تبسم اور اس کی جبین کے نقوش تعجب انگیز طریقہ پر میرے شوہر سے مشابہ تھے۔ مگر اس سے زیادہ جاذب توجہ۔ اگرچہ اس کے لبوں اس کی نظروں اور زنخدان میں میرے شوہر کے برخلاف بجائے نیکی، دلکشی اور حقیقی سکون کے ایک قسم کی درشتی اور وحشت پائی جاتی تھی۔ مگر مجھے اس مشابہت پر تعجب تھا۔ مجھے محسوس ہوتا کہ وہ مجھ سے محبت کرتا ہے۔ بعض اوقات میں اس سے ہمدردی سے پیش آتی۔ اور اس کو تسلی دیتی، تاکہ وہ میرا ایک قابلِ اعتماد دوست بن جائے۔ مگر حقیقت یہ ہے۔ کہ وہ اس برتاؤ سے رنجیدہ اور افسردہ ہو جاتا اور اپنے پوشیدہ جذبات محبت سے مجھے پریشان کرتا اور ان کے اظہار کے لئے ہمیشہ تیار رہتا۔

میں نے اس کے جذبات کی پروا نہ کی مگر مجھے اس شخص

سے خوف معلوم ہونے لگا۔ اور اپنے ضمیر کے خلاف اکثر مجھے اس کا خیال رہنے لگا۔ میرا شوہر اس سے متعارف ہو چکا تھا اور اپنے دوسرے شناساؤں کے مقابلہ میں اس کے ساتھ بے پروائی اور مغرورانہ انداز سے پیش آتا تھا۔

اس موسم کے اختتام پر میں بیمار ہو گئی اور دو ہفتہ تک اپنے کمرہ سے باہر نہ نکل سکی۔ جب میں بیماری سے اُٹھ کر پہلی بار ایک دن شام کے وقت گانا سُننے کے لئے باہر نکلی تو مجھے معلوم ہُوا کہ میری علالت کے زمانہ میں ایک مشہور مجسّمۂ حُسن لیڈی آلیس، جس کی آمد کے لئے زمانہ چشم براہ تھا، آ گئی ہے۔ لوگ میرے گرد جمع ہو گئے اور گرمجوشی سے مجھے مبارکباد دی۔ مگر اس نووارد حسینہ کی جانب عوام کا رجحان بہت زیادہ تھا۔ جہانتک میں نے اندازہ کیا لوگ صرف اس خاتون اور اس کے حسن ہی کا ذکر کر رہے تھے۔ میں نے اس کو دیکھا۔ دراصل اس کے حسن میں دلکشی کی شان تھی۔ مگر میں نے اس کے چہرہ پر غرور کے نشانات پاتے جس کا اثر میرے دل پر کچھ اچھا نہ ہُوا۔ اور لوگوں سے میں نے اپنے خیال کا اظہار کر دیا۔

پہلے جو چیزیں مجھے نظر فریب اور مسرور کن معلوم ہوتی تھیں آج ان پر افسردگی اور پژمردگی چھائی ہُوئی تھی۔ دوسرے دن لیڈی آلیس نے قلعہ کی سیر کا انتظام کیا۔ مگر میں نے وہاں جانے سے انکار کر دیا۔ قریب قریب صرف میں ہی ایک ایسی ہستی تھی جو وہاں نہ گئی۔ اور اب ہر چیز میری نظر میں تبدیل ہو گئی تھی۔ ہر شخص اور ہر شے مجھے لغو اور تکلیف دہ معلوم ہوتی تھی۔ میں پریشان ہو گئی اور میری خواہش ہُوئی کہ جسقدر جلد ممکن ہو سکے مجھے روس واپس چلا جانا چاہیئے۔

میرے دِل میں ایک عجیب شرارت آمیز جذبہ تھا مگر ابھی تک مجھے اس کا یقین نہ تھا۔ میں نے بہانہ کیا کہ میری طبیعت ناساز ہے اور میں نے بڑے بڑے مجمعوں میں جانا بند کر دیا۔ البتہ کبھی کبھی صبح کے وقت میں تفریح کے لئے باہر جاتی یا اپنی شناسا لیڈی ایل ایم کے ہمراہ سوار ہو کر نواح شہر میں گھومنے کے لئے چلی جاتی۔ اس زمانہ میں میرا شوہر وہاں موجود نہ تھا۔ وہ چند روز کے لئے ہیڈلبرگ چلا گیا تھا اور میرا علاج ختم ہونے پر مجھ کو اپنے ہمراہ لیکر روس کو واپس جانے والا تھا۔

ایک بار لیڈی آلیس نے سب لوگوں کو ایک تفریح کی مہم پر چلنے کی ترغیب دی اور دوپہر کے کھانے کے بعد ایل ایم اور میں قلعہ کی طرف روانہ ہُوئے۔ جب ہم اپنی گاڑی میں آہستہ آہستہ چکّردار بلند راستہ پر صدیوں کے پُرانے شاہ بلوط کے درختوں کے درمیان سے گزر رہے تھے اور ان کے درمیان سے ہیڈلن کے گرد و نواح کا خوشنما منظر غروب ہوتے ہُوئے آفتاب کی شعاعوں سے چمکتا ہُوا دُور تک نظر آ رہا تھا۔ تو ہم ایسی متانت کے ساتھ سرگرم کلام تھے

کہ آج سے پہلے کبھی ایسا اتفاق نہ ہوا تھا۔ ایل ایم کو اگرچہ میں پہلے سے جانتی تھی۔ مگر آج وہ پہلی بار ایک حسین اور ذہین عورت معلوم ہوئی۔ جس کو ہر شخص اپنا رازدار بنا سکتا تھا۔ اور جسکے ساتھ دوستانہ تعلقات قائم کئے جا سکتے تھے۔

ہم نے اپنے خانگی معاملات اپنے بچوں اور بیڈن کی غیر دلچسپ صحبتوں کے متعلق گفتگو کی۔ ہم دونوں کی خواہش تھی۔ کہ روس میں اپنے اپنے دیہاتی مکانوں کو واپس جائیں اور ہم پر ایک خاص قسم کا مسرت بخش و الم انگیز جذبہ طاری ہو گیا۔

ان سنجیدہ خیالات اور جذبات کی حالت میں ہم قلعہ میں پہنچ گئے۔ قلعہ کے اندر سایہ اور ٹھنڈک تھی۔ اور آفتاب کی شعاعیں کھنڈروں پر پھیلی ہوئی تھیں۔

ہم نے لوگوں کے قدموں کی آہٹ اور آوازیں سنیں۔

پھاٹک سے ہم بیڈن کا وہ دلفریب منظر دیکھ رہے تھے جو کم از کم ہم روسیوں کی نظر میں بہت فرحت بخش تھا۔ ہم دم لینے کے لئے ٹھہر گئے اور خاموشی کے ساتھ غروب ہونے والے آفتاب کی طرف دیکھنے لگے۔

آوازیں زیادہ زور سے آنے لگیں۔ اور مجھے معلوم ہوا کہ کوئی میرا نام لے رہا ہے۔ میری توجہ اس طرف مبذول ہوئی اور میں کان لگا کر ہر ایک بات سننے لگی۔ ان آوازوں سے میرے کان آشنا تھے۔ یہ آوازیں مارچیز ڈی اور۔ اُس کے فرانسیسی دوست کی تھیں۔ جن سے میں واقف تھی۔ وہ میرے اور لیڈی آیس کے متعلق گفتگو کر رہے تھے۔

فرانسیسی ہم دونوں کا تقابل کر کے ہماری نمایاں خوبیاں بیان کر رہا تھا۔ اُس نے کوئی بُری بات نہ کہی مگر اسکی گفتگو سُنکر میرا خون جوش مارنے لگا۔ اس نے میری اور لیڈی آیس کی دلکش اداؤں کی تعریف ان الفاظ میں کی۔ کہ میں ایک بچہ کی ماں بن چکی ہوں اور لیڈی آیس کی عمر ابھی انیس سال کی ہے۔ میرے بال بہت خوبصورت ہیں۔ مگر ان کے مقابلہ میں تمہاری دوست کی کوئی حقیقت نہیں۔ وہ روس کی معمولی بیگمات میں سے ہے۔ جو آجکل یہاں بڑی تعداد میں جمع ہو رہی ہیں۔

اس نے یہ کہہ کر اپنی گفتگو کو ختم کر دیا کہ میں نے یہ بہت اچھا کیا کہ لیڈی ایس کی حریف نہ بنی اور جہانتک بیڈن سے تعلق ہے۔ اب میرا زمانہ ختم ہو گیا ہے۔

اس نے مکاری سے ہنستے ہوئے کہا۔ "مجھے اس کی حالت پر افسوس ہے۔ اُس کے لئے بہتر یہ ہے کہ تمہارے اُوپر قناعت کر لے۔"

اس نے اطالوی لہجہ میں وحشیانہ طور پر کہا۔ "اگر وہ یہاں سے چلی جائیگی تو میں بھی اس کا تعاقب کرونگا۔"

فرانسیسی نے طنز یہ کہا۔ "اللہ اللہ وہ کیسی خوش نصیب عورت ہے! تم کو ابھی تک اس سے محبت ہے۔"

اطالوی نے کہا۔ "محبت" اور وہ خاموش ہوگیا — "میں محبت کرنے سے باز نہیں رہ سکتا۔ بغیر محبت کے زندگی بے لطف ہے۔ زندگی کو دلچسپ بنانے کے لئے محبت ہی کارآمد چیز ہے میری دلچسپیوں کا سلسلہ غیر منقطع رہ گیا۔ اور میں اس کو آخری دم تک نبھاؤنگا"

فرانسیسی نے کہا۔ "تم بڑے خوش نصیب ہو"

ہم کچھ اور نہ سُن سکے۔ کیونکہ وہ اس گوشہ سے چلے گئے تھے۔ اور جلد ہی ان کے قدموں کی آواز دوسری طرف سُنائی دینے لگی۔ وہ زینہ سے نیچے اُترے۔ اور چند لمحوں میں ایک طرف کے دروازہ سے اندر داخل ہوئے۔ اور ہم کو دیکھ کر حیرت واستعجاب میں ششدر کھڑے رہ گئے۔ جب مارچیز میرے پاس آیا تو مجھے شرم معلوم ہوئی۔ اور قلعہ سے باہر نکلتے وقت جب اُس نے اپنا ہاتھ میرے ہاتھ میں ڈال لیا تو مجھے خوف معلوم ہونے لگا۔ میں اس کی امداد سے انکار نہ کرسکی۔ اور ہم دونوں ایل ایم کے پیچھے روانہ ہوئے۔ جو اپنے دوست کے ساتھ آگے آگے گاڑی کی طرف جارہی تھی۔

فرانسیسی نے میرے متعلق جو کچھ کہا تھا۔ اُس سے مجھے بے حد صدمہ تھا۔ اگرچہ میں جانتی تھی، کہ میرے خیالات بھی اپنے متعلق یہی ہیں۔ لیکن پھر بھی مارچیز کے گستاخانہ الفاظ نے مجھے حیرت زدہ اور پریشان کردیا تھا۔ مجھے اس خیال سے کہ میں نے اس کی گفتگو سن لی تھی افسوس ہوا۔ مگر پھر بھی اس کو میرے سامنے آتے ہوئے ذرا بھی شرم نہ معلوم ہوئی۔ میں اس کو اپنے اسقدر نزدیک دیکھکر برافروختہ ہوگئی۔ اور بغیر اس کی طرف دیکھے یا اس کی بات کا جواب دئے اس طرح اس کے ہاتھ میں ہاتھ ڈالے ہوئے کہ اس کی بات نہ سُن سکوں ایل ایم اور فرانسیسی کے پیچھے جلد جلد قدم بڑھانے لگی۔ گویا میں اس کی کوئی بات سُننا نہیں چاہتی ہوں۔

مارچیز نے منظر کی دلفریبی، اتفاقیہ مجھ سے ملنے کی خوشی اور نیز بہت سی دوسری باتوں کا ذکر کیا۔ مگر میں نے مطلق توجہ نہیں کی۔ کہ وہ کیا کہہ رہا ہے۔ میں اس وقت اپنے شوہر، اپنے لختِ جگر اور روس کے خیالات میں محو تھی۔ اور حجاب، ہمدردی اور خواہشات کے عجیب اثرات سے متاثر ہورہی تھی۔ میں حتی الامکان جلد سے جلد گھر پہنچنے کے لئے بیتاب تھی۔ تاکہ ہوٹل کی خلوت میں بیٹھ کر ان خیالات پر غور کرسکوں۔ جو یکایک میرے دماغ میں پیدا ہوگئے تھے۔ مگر ایل ایم آہستہ آہستہ چل رہی تھی، اور گاڑی ہنوز فاصلہ پر تھی۔ مجھے محسوس ہوتا کہ میرا ساتھی بے دلی کیساتھ آہستہ آہستہ قدم اُٹھا رہا ہے۔ گویا وہ مجھے قصداً پیچھے رکھنا چاہتا ہے۔

میں نے اپنے دل میں کہا۔ "ایسا نہیں ہونا چاہئے" اور زیادہ تیزی سے چلنے کی کوشش کرنے لگی۔ مگر اُس نے

مجھے تیز چلنے سے روکا۔ اور میرا ہاتھ دبایا۔ ایل ایم موڑ پر پہنچکر نظر سے غائب ہوگئی، ہم بالکل تنہا رہ گئے اور میں خوف کے مارے کانپنے لگی۔ میں نے افسردگی کے ساتھ کہا۔ "مجھے معاف کرو" اور اس کے ہاتھ سے اپنا ہاتھ چھڑانے کی کوشش کی۔ مگر میری آستین کی جھالر اس کے بٹن میں اُلجھ گئی۔ وہ اپنا سر جھکا کر جھالر علیحدہ کرنے لگا۔ اور اس کی بغیر دستانوں کی اُنگلیاں میرے ہاتھوں سے مس ہوگئیں۔ اور ایک عجیب نئے جذبہ سے جس میں نہ خوف تھا نہ مسرت، میں کانپنے لگی میں نے اس کی طرف دیکھا تاکہ اس حقارت کو جو اسکی طرف سے میرے دل میں پیدا ہوگئی ہے۔ ظاہر کردوں لیکن میری نگاہیں اس کو ظاہر نہ کرسکیں۔ بلکہ اس سے صرف خوف اور پریشانی کا اظہار ہوسکا۔

اس کی اشک آلود للچائی ہوئی نظریں میرے چہرہ گردن اور سینہ پر پڑیں۔ اُس نے اپنے دونوں ہاتھوں سے میری کلائی تھام لی۔ اُس کے لب وا ہوئے۔ اور اُس نے محبت کا اظہار کیا۔ اُس نے کہا۔ "دُنیا میں میرے لئے تم سب کچھ ہو۔" اور اُس کے لب میرے لبوں سے مل گئے اُس نے زور سے میرے ہاتھوں کو دبایا۔ اور میرے بدن میں ایک آگ سی لگ گئی۔

ایک آتش سوزاں میری رگ رگ میں سرایت کر گئی میری آنکھوں کے تلے اندھیرا آگیا۔ میں کانپنے لگی اور وہ الفاظ جن سے میں اس کو اس حرکت سے باز رکھنا چاہتی تھی حلق میں پھنسکر رہ گئے۔ یک بیک مجھے اپنے رخسار پر بوسہ کی گرمی محسوس ہوئی۔ میں ٹھہر گئی اور اس کی طرف دیکھنے لگی۔ میری زبان سے کوئی لفظ نہ نکل سکا۔ میں نے کوئی حرکت نہ کی۔ اور پریشانی کے عالم میں انتظار کرنے لگی۔ میرے دل میں خواہش پیدا ہوئی —— لیکن کس بات کی؟

یہ سب کچھ صرف ایک لمحہ میں ختم ہوگیا۔ مگر یہ لمحہ بہت ہی خطرناک تھا۔ اس وقت مجھے اس شخص کی حالت پر غور کرنے کا موقع ملا۔ اُس کے چہرہ سے اسکے دلی جذبات ظاہر تھے۔ اس کے کشیدہ ابرو اس کی ٹوپی کے نیچے چمک رہے تھے۔ اور شل میرے شوہر کے معلوم ہوتے تھے۔ اسکی خوبصورت ستواں ناک اور کشادہ نتھنے، اس کی لمبی مونچھیں جو دونوں طرف بل کھائی ہوئی تھیں۔ اس کی شاہانہ شان، اس کی صاف زنخداں اور اس کی سُرخ گردن الغرض اس کے سب اعضا پر میں نے نگاہ ڈالی۔ اور وہ مجھے اسقدر اجنبی معلوم ہوا۔ کہ مجھے اس سے نفرت ہوگئی۔ اور اس سے خوف معلوم ہونے لگا۔ مگر اس وقت میں اس اجنبی کے جوش سرگرمی سے مغلوب ہوگئی تھی۔

مجھے اس کے بوسہ کا جواب بوسہ سے اور اُس کے گورے گورے ہاتھوں کی گرفت کا بدلہ اپنے ہاتھوں کی گرفت سے لینے کی آرزو ہوئی۔ اور جب اُس نے ایک

خاص انداز سے انگڑائی لی۔ تو مجھے اپنے آپ کو اس ممنوع غار مسرت میں دھکیل دینے کی زبردست خواہش ہوئی۔

میں نے اپنے دل میں کہا "میں بڑی بدنصیب ہوں تو پھر اس بدنصیبی اور مایوسی کے بار کو جو میرے شانوں پر ہے۔ اور زیادہ کیوں نہ بڑھ جانے دوں"

اُس نے اپنا ایک ہاتھ میری کمر میں ڈال دیا۔ اور اپنے چہرہ کو میرے چہرہ پر جھکا دیا۔

میں نے اپنے دل میں کہا۔ "اور بھی زیادہ شرم اور گناہ کا بار میرے سر پر کیوں نہ رکھ دیا جائے؟"

اُس نے ایسے لہجہ میں جو میرے شوہر سے مشابہ تھا میرے کان میں کہا۔ "میری پیاری" اور مجھے اپنے شوہر اور بچہ کی وہ محبت یاد آئی۔ جو کچھ دنوں پہلے میرے دل میں تھی۔ اور اب ہمیشہ کے لئے میں اس سے محروم ہو چکی تھی۔

لیکن اس وقت یکایک ہم نے ایل ایم کی آواز سنی۔ جو راستہ کے گھماؤ پر کھڑی ہوئی مجھے بلا رہی تھی۔ اس کی آواز سُن کر میرے ہوش و حواس درست ہوئے۔ میں نے اس کی گرفت سے رہائی حاصل کی اور بغیر اس کی طرف دیکھے ہوئے ایل ایم کی طرف دوڑی۔ اُس نے اپنی ٹوپی اُتاری۔ اور مسکرا کر کچھ کہا۔ وہ اس ناقابلِ بیان نفرت کو جو اس وقت اس کی طرف سے میرے دل میں پیدا ہو گئی تھی۔ بالکل نہ سمجھ سکا۔

مجھے اپنی موجودہ زندگی ناخوشگوار، اپنا مستقبل یاس انگیز اور ماضی تاریک معلوم ہونے لگا۔ ایل ایم نے سلسلۂ کلام شروع کیا۔ مگر میں نے اس کا ایک لفظ بھی نہ سُنا۔ مجھے ایسا محسوس ہُوا کہ وہ اس حقارت کو جو میری طرف سے اس کے دل میں پیدا ہو گئی تھی۔ چھپانے کے لئے مجھ سے ہمدردی کا اظہار کر رہی تھی۔ اس کے ہر لفظ اور اس کی ہر نظر سے مجھے ملامت اور اہانت آمیز ہمدردی کا احساس ہوا۔ اس قابلِ نفرت بوسہ نے میرے رُخسار میں سوزش پیدا کر دی تھی۔ اور اپنے شوہر اور بچہ کا خیال میرے لئے ناقابلِ برداشت تھا۔

مجھے امید تھی کہ میں اپنے کمرہ کی تنہائی میں بیٹھ کر اپنی موجودہ حالت پر غور کر سکوں گی۔ مگر تنہا رہنا بھی میرے لئے خطرناک تھا۔ میں نے چائے بھی نہ پی اور بغیر کسی وجہ کے میں نے ایک حالت اضطراب میں جلد جلد اپنا سامان باندھنا شروع کیا۔ تاکہ میں شام کی گاڑی سے ہیڈلبرگ جا سکوں جہاں میرا شوہر تھا۔

جب میں ایک خالی درجہ میں اپنی خادمہ کے ساتھ باطمینان بیٹھ گئی۔ ٹرین روانہ ہو گئی۔ اور کھڑکی سے ہوا کے سرد جھونکے اندر آ کر میرے جسم سے مس ہونے لگے، تو میرے ہوش و حواس درست ہوئے۔ اور مجھے اپنے ماضی و مستقبل پر غور کرنے کا موقع ملا۔

میری تمام ازدواجی زندگی پیٹرسبرگ میں آنے کے
وقت سے اس وقت تک یکایک ایک نئی شان سے میرے
پیشِ نظر ہوگئی۔ اور میرے قلب پر ایک بار سا محسوس ہونے
لگا۔ مجھے پہلی بار اپنی ابتدائی ازدواجی زندگی جو ہم نے دیہات
میں بسر کی تھی۔ اور اپنے منصوبے یاد آئے۔ اور پہلی بار میرے
دل میں یہ خیال پیدا ہوا۔ کہ وہ ان ایّام میں کس طرح خوش و خرم
زندگی بسر کر چکا ہے۔ اور مجھے محسوس ہوا کہ میں اسکی خطاوار ہوں
میں نے اپنے دل میں کہا۔ "لیکن اُس نے مجھے سوسائٹی
میں شریک ہونے سے کیوں نہ باز رکھا۔ اور اُس نے مجھے
کیوں فریب دیا؟ اُس نے کیوں مجھ سے صلح نہیں کی؟ اس
نے کیوں مجھ کو ذلیل کیا؟ اور اس نے کیوں اپنی محبّت کی
قوت کو مجھ پر استعمال نہیں کیا؟ یا کیا حقیقت میں اس کو مجھ
سے محبّت نہیں ہے؟" لیکن خواہ وہ کتنا ہی قصوروار کیوں نہ
ہو، پھر بھی مجھے اس خیال نے پریشان بنا رکھا تھا کہ ایک
غیر آدمی نے میرے رخسار کا بوسہ لیا تھا۔ اور ابھی تک مجھے
اس کی گرمی محسوس ہورہی تھی۔

"جسقدر ہیڈلبرگ نزدیک ہوتا گیا اُسیقدر صاف
طور پر مجھے اپنے شوہر کا تصوّر بندھا۔ اور اسی قدر آنے والی
ملاقات سے مجھے خوف معلوم ہونے لگا۔ میں نے سوچا کہ
میں اس سے سب کچھ کہہ دونگی۔ ندامت کے آنسو برساؤنگی۔
اور وہ مجھے معاف کردیگا۔

جیسے ہی میں اپنے شوہر کے کمرہ میں داخل ہوئی۔
اور اس کے متین مگر متعجب چہرہ پر میری نظر پڑی تو مجھے
معلوم ہوا کہ نہ مجھے اُس سے کچھ کہنا ہے نہ اپنے قصور کا
اعتراف کرنا ہے۔ اور نہ اس سے معافی مانگنی ہے اور میرا
غمِ پنہاں بدستور میرے دل ہی میں رہیگا۔

اُس نے پوچھا۔ "تم یہاں کیوں آگئیں؟ میں تو خود
کل تمہارے پاس جانے کا ارادہ کر رہا تھا۔" مگر میرے چہرہ
کو غور سے دیکھ کر وہ خوفزدہ ہوگیا۔

اس نے کہا۔ "کیا معاملہ ہے؟ کیا قصّہ ہے؟"

میں نے اپنے آنسوؤں کو بمشکل روکتے ہوئے کہا۔
"کچھ نہیں، میں ہمیشہ کے لئے چلی آئی ہوں۔ کل ہی وطن واپس
چلو۔"

وہ کچھ دیر تک خاموش بیٹھا ہوا مجھے غور سے دیکھتا رہا
اور پھر مجھ سے پوچھنے لگا۔ "اچھا اب بتاؤ کہ کیا بات ہے؟"
میں محجوب ہوگئی۔ اور اپنی نگاہ نیچی کرلی۔ غصّہ کی وجہ سے
اس کی آنکھوں سے شعلہ نکلنے لگے۔

مجھے اس کے شکوک کا اندازہ کرکے خوف معلوم ہونے
لگا۔ اور میں نے مکّاری سے کہا۔ "کوئی بات نہیں ہے، مجھے
تنہائی کی وجہ سے تکلیف تھی۔ اور مجھے اپنی طرز زندگی اور
تمہارا خیال پریشان کرنے لگا تھا۔ آخر میں کبتک تمہاری
گنہگار بنی رہونگی؟ تم اس جگہ میرے ساتھ کیوں آئے جہاں

آنے کو تمہاری طبیعت نہ چاہتی تھی؟" میں نے کہا۔ "میں تمہاری بوم ہوں" اور میری آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ میں نے پھر کہا۔ "چلو دیہات کو واپس چلیں۔ اور اپنی بقیہ زندگی وہاں بسر کریں۔"

اُس نے افسردگی کے ساتھ کہا۔ "ان باتوں کو چھوڑ دو۔ میں خوش ہوں۔ کہ تم دیہات واپس چلنے کے لئے آمادہ ہو۔ کیونکہ ہمارے پاس سرمایہ ختم ہو چکا ہے۔ لیکن وہاں رہنے کا خیال محض ایک فریب ہے۔ میں جانتا ہوں کہ دیہات میں ٹھہرنا تمہارے لئے مناسب نہیں ہے۔ خیر اب تم تھوڑی سی چائے پی لو۔ تاکہ تمہارے قلب کو سکون حاصل ہو۔" یہ کہکر وہ اپنے خادم کو بلانے کے لئے اُٹھا۔

مجھے اس کے خیالات کا اندازہ کر کے اور اس کی نگاہوں سے ظاہر ہونے والے شکوک کو دیکھ کر خوف معلوم ہونے لگا مجھے معلوم ہو گیا۔ کہ اس کو میری باتوں پر یقین نہیں ہے۔ اور وہ میری حالت کو مشکوک اور قابل نفرین سمجھتا ہے۔ وہ میرا مطلب نہیں سمجھا اور نہ سمجھنا چاہتا ہے۔

میں نے کہا کہ میں وطن جا کر اپنے بچّہ کو دیکھونگی اور یہ کہکر اُس کے پاس سے جُدا ہو گئی۔ اس وقت میرے دل میں صرف یہ خواہش تھی کہ میں تنہائی میں روؤں۔ اور خوب دل کھول کر روؤں۔

(باقی پھر)

حقیقت حیات

سرزمینِ دل عدم آباد کا ویرانہ ہے　　زندگی کھوئی ہوئی ہستی کا اِک افسانہ ہے

خود شناسی خود فراموشی کی ہے بیّن دلیل　　رہنے والا آپ میں خود آپ سے بیگانہ ہے

زندگی کا عین مقصد ہے حصولِ بے خودی　　واقفِ رازِ حقیقت ساکنِ میخانہ ہے

دِل کی ہر دھڑکن ہے شکوہ اضطرابِ زیست کا　　جس کو ہم پہلو سمجھتے ہیں وہ ماتم خانہ ہے

خود فراموشی ہے جینا۔ بیخودی ہے زندگی　　ہوشمندِ آرزو لایعقل و دیوانہ ہے

دُشمنِ نظارہ ہے شمعِ طرب کی روشنی　　نور زارِ زندگی تاریکئ غمخانہ ہے

ہے نہاں ہادیؔ فنائے ذات میں سامانِ زیست
وجہ سازِ کامرانی سوزشِ پروانہ ہے

ہادی مچھلی شہری

نقد و نظر

نوبہار:- "مدینۃ العلم" علیگڈھ کا ماہوار رسالہ ہے "مدیر احسان علی کوثر۔ نگراں عابداللہ افسر صاحب بی۔اے۔ پہلا پرچہ پیش نظر ہے۔ شروع میں ایک تصویر" برسات میں یہ کیا ہوتا ہے" طباعت خراب ہونے کی وجہ سے کچھ مبہم سی ہوگئی ہے۔ اس لئے صنعتی نقطہ نگاہ سے اس پر کوئی اظہار خیال نہیں کیا جاسکتا۔ ادبی نقطہ نگاہ سے اس کی توضیح عطا صاحب کی ایک نظم کر رہی ہے۔ "نوبہار کا اجرا" کے زیر عنوان رسمیات ادارت کے اس عنصر کی توضیح ہے جسے "اعلان مقاصد" کہتے ہیں۔ اسی عنوان کے ماتحت مدیر صاحب موصوف نے انگریزی جرائد کی پیروی میں مستقل مضامین کے عنوان مقرر کئے ہیں۔ جن پر مشہور انشاپردازوں کو قلم اٹھانے کی دعوت دی گئی ہے۔ یہ عنوانات بہت جاذب نظر اور باوقار معلوم ہوتے ہیں۔ مثلاً انسانی فطرت کا مطالعہ ایک عالم دین کی نظر سے۔ ایک طبیب کی نظر سے۔ ایک وکیل کی نظر سے۔ عورت کے اندر میں کیا خوبی پسند کرتا ہوں وغیرہ لیکن ہمیں افسوس سے اس حقیقت کا اعتراف کرنا پڑتا ہے۔ کہ جناب ہادی مچھلی شہری کے مضمون کے علاوہ جن مضامین نگاروں نے انسانی فطرت کے مطالعے پر، مضامین سپرد قلم فرماتے ہیں۔ ان میں اس پر مغز سنجیدگی اور جامعیت کا شائبہ تک بھی نہیں۔ جو ان عنوانات کا سب سے ضروری عنصر ہے۔ اور سوائے زندگی کے ایک دو پہلوؤں کے مضامین نگار اصحاب نے بالکل توجہ نہیں کی۔ نوبہار کے مقاصد میں افسانوں کو عروج کمال تک پہنچانا بھی شامل ہے لیکن موجودہ نمبر میں اس مقصد کی تکمیل کی طرف کوئی قدم نہیں بڑھایا گیا۔ یعنی افسانہ سرے ہی سے معدوم ہے آفسر صاحب کے غیر مطبوعہ ڈرامے "دارا شکوہ" سے ایک منظر نقل کیا ہے۔ مدیر صاحب کے نزدیک یہ ڈراما ایک ادبی شاہکار ہے۔ جہانتک ڈرامے کے تمام لوازم فن کا تعلق ہے۔ صرف ایک منظر سے "ارتقائے سیرت" اور مکان و زمان کے اصول بنیادی کی مطابقت کے متعلق کوئی اندازہ نہیں لگایا جاسکتا۔ زبان اس منظر کی اہمیت کے لحاظ سے بہت سست ہے اور ہم قوافی فقرات تراشنے کی خاطر الفاظ کی مناسب کھپت سے جزوی طور پر بے نیاز ہونا پڑا ہے۔ ہم ڈرامے میں اس فرسودہ روش کے التزام کو ناپسند کرتے ہیں۔ اور موجودہ ادیبوں سے بھی توقع رکھتے ہیں۔ کہ وہ ان تمام معیوب "لوازم" کو یکقلم ترک فرمائینگے۔ غزلیں عام طور پر اچھی ہیں۔ خاصکر فانی صاحب اور ہادی صاحب کی غزلیں۔ جناب ابوالانشا برزخی کے فرضی نام